ہند کی معاشی حالت

سلسلۂ نصابیات علم معاشیات جامعہ عثمانیہ

ہند کی معاشی حالت

(شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت)

تصنیف

ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ

ترجمہ

مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ایم۔ اے' ال ال۔ بی

پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی
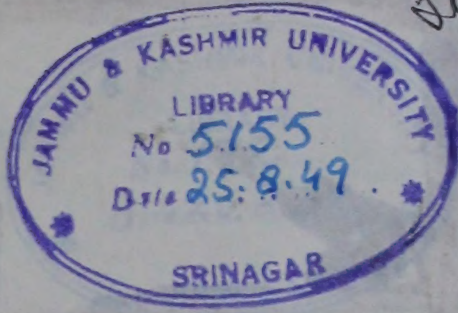
سنہ ۱۳۴۸ھ سنہ ۱۳۳۹ف سنہ ۱۹۲۹ء

دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

مقدمہ منجانب مترجم

تاریخ ہند پر اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مورلینڈ صاحب کی کتاب "انڈیا اٹ دی ڈیتھ آف اکبر" جس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی معاشی زندگی کا خاکہ پیش کرنا اس کتاب کا مقصد ہے۔ دیسی زبانوں کی معاصر تصانیف کو مستثنیٰ کر کے مورلینڈ صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں تقریباً تمام اہم مآخذ سے مدد لی ہے۔ اور نہایت جانفشانی کے ساتھ اس زمانے کے ہندوستانیوں کی معاشی زندگی کے کم وبیش ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ ہند کے اس مشہور دور کے منتشر معاشی معلومات کو اس طرح اکٹھا کرنے پر قابل مؤلف کا جسقدر احسان مانا جائے کم ہے اور ان کی محنت و استقلال کی جس قدر تعریف کی جائے واجبی ہے۔ لیکن جو مخصوص نقطۂ نظر انھوں نے اس بارے میں اختیار کیا ہے اور جس کا جگہ جگہ کثرت کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے کم از کم راقم الحروف کے خیال میں اس کتاب کی وقعت بہت کچھ گھٹ گئی ہے۔

کتاب کے خاص کر ان حصوں پر جن کا تعلق ملک کے نظم ونسق، طریق معدلت، امن واماں کی حالت، اور باشندوں کی خوشحالی سے ہے، ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو مؤلف کی ایک کمزوری نمایاں طور پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے دور متعلقہ کی ہر چیز کو گھٹا کر پیش کرنا اور دور حاضرہ کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر دکھانا یہ مورلینڈ صاحب کا خاص مقصد معلوم ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی اچھی بات قرون وسطیٰ کے حکمرانوں اور ارباب

حل وعقد میں نظر بھی آتی ہے تو اسے ذاتی نام ونمود اور شہرت طلبی کے ساتھ منسوب کر کے اس کی واجبی قدر ومنزلت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر طریق معدلت کو لیجئے۔ بلاشبہ اُس زمانے میں نہ آج کل کی طرح باقاعدہ عدالتیں تھیں اور نہ ان کی ہدایت کے لئے ایسے لمبے چوڑے قوانین اور ضابطے موجود تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فیصلہ کرنے والے اکثر عہدہ دار رشوت لیا کرتے ہوں اور دولتمند اور بااثر اشخاص بغیر سزا پائے چھوٹ جاتے ہوں۔ لیکن دوسری طرف موجودہ طریق معدلت میں فریقین کو نظام قانون کی طوالت اور عدالتوں کے ملتویات کی وجہ سے جو چیراسی اور وکیلوں کی جیبیں بھرنے میں جو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے' اس کی وجہ سے انصاف رسی کا طریق' خواہ وہ کتنا ہی مکمل اور باقاعدہ سہی' غیر مستطیع اشخاص کی دسترس سے باہر ہے۔ اگر مسٹر مورلینڈ ان ان امور پر بھی غور کرتے تو غالباً ان کی تحریر میں اس قدر سختی نہ پائی جاتی۔

اسی طرح مورلینڈ صاحب نے اس امن و امان کو جو عام باشندوں اور خاص کر تجارت پیشہ طبقے کو اس زمانے میں حاصل تھا' انتہا درجہ گھٹا کر بیان کیا ہے۔ اس بارے میں انھوں نے دو دعوے کیے ہیں اور بدقسمتی سے وہ دونوں غلط ہیں' پہلا دعویٰ یہ ہے کہ جو دولتمند تاجر مرجاتے تھے' ان کا سارا مال ومتاع حکومت ضبط کر لیتی تھی۔ اس دعوے کی قطعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کا مال ومتاع ضبط ہونے کے تو اکثر حوالے ملتے ہیں لیکن تجارت پیشہ طبقے کی کمائیوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہو' اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دوسری غلطی جو اس بارے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے سرحدی علاقوں کی بدامنی کو ساری سلطنت کے اندر مروج بنایا گیا ہے اور ولیم ہاکنس اور سالبینک کے جو بیانات اس کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں' دوسرے معاصر اسناد سے ان کی قطعاً توثیق نہیں ہوتی۔

باشندوں کی معیار زندگی کے متعلق مورلینڈ صاحب نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اپنی قطعی رائے کا اظہار کیا ہے:۔

"ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آیا انھیں کھانے کے لئے اب سے کم ملتا تھا یا زیادہ۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کپڑے ان کے پاس بمقابل آج کل کے کم ہوتے تھے اور جہاں تک ظروف خانہ داری اور چھوٹی موٹی اشیائے راحت کا تعلق ہے' ان کی حالت یقیناً اب سے

زیادہ خراب تھی۔ اور قومی خدمات اور فوائد کی شکل میں تو انھیں قطعاً کوئی بات حاصل نہیں تھی۔ یہ تو خود تصویر ہے۔ اب اس کے پس منظر قحط سالی کی تاریکی ہے۔ اور خود اس لفظ کے معنی گزشتہ ایک صدی کے عرصے میں متغیر ہو چکے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ایک طویل مدت تک اس سے مراد ایک مکمل گو عارضی معاشی ابتری ہوتی تھی جس کی نمایاں خصوصیات خواہ کتنی ہی ناگوار سہی، نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ مکانات کی بربادی، بچوں کا غلاموں کی حیثیت سے فروخت ہونا، خوراک کی تلاش میں مایوس کن سرگردانی اور بالآخر بھوکوں مرنا، یا اگر ممکن ہو تو مردم خوری اختیار کرنا، یہ تھے اس دور کی قحط سالی کے لوازم، ان مسلسل بیانات سے جن کے لئے کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے مؤلف کے ذہنی تعصب کی ایک اچھی مثال دستیاب ہوتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر قرون وسطیٰ کی تاریخ ہند کے معاشی معلومات جمع کرنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش خالص علمی تحقیق کی غرض سے کی جاتی۔ قرون ماضیہ کی خواہ مخواہ تعریف یا تحقیر کرنا، علمی نقطۂ نظر سے تاریخی واقعات کی تحقیق میں سخت مزاحم ہوتا ہے۔ اگر اس کمزوری کو نظر انداز کر دیا جائے تو مور لینڈ صاحب کی یہ تصنیف بلاشبہ ہماری تعریف کی مستحق ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ معاشی تاریخ ہند کے بعض مشکل ترین مسائل کو سلجھانے کی اس میں پہلی مرتبہ کوشش کی گئی ہے۔

تمہید
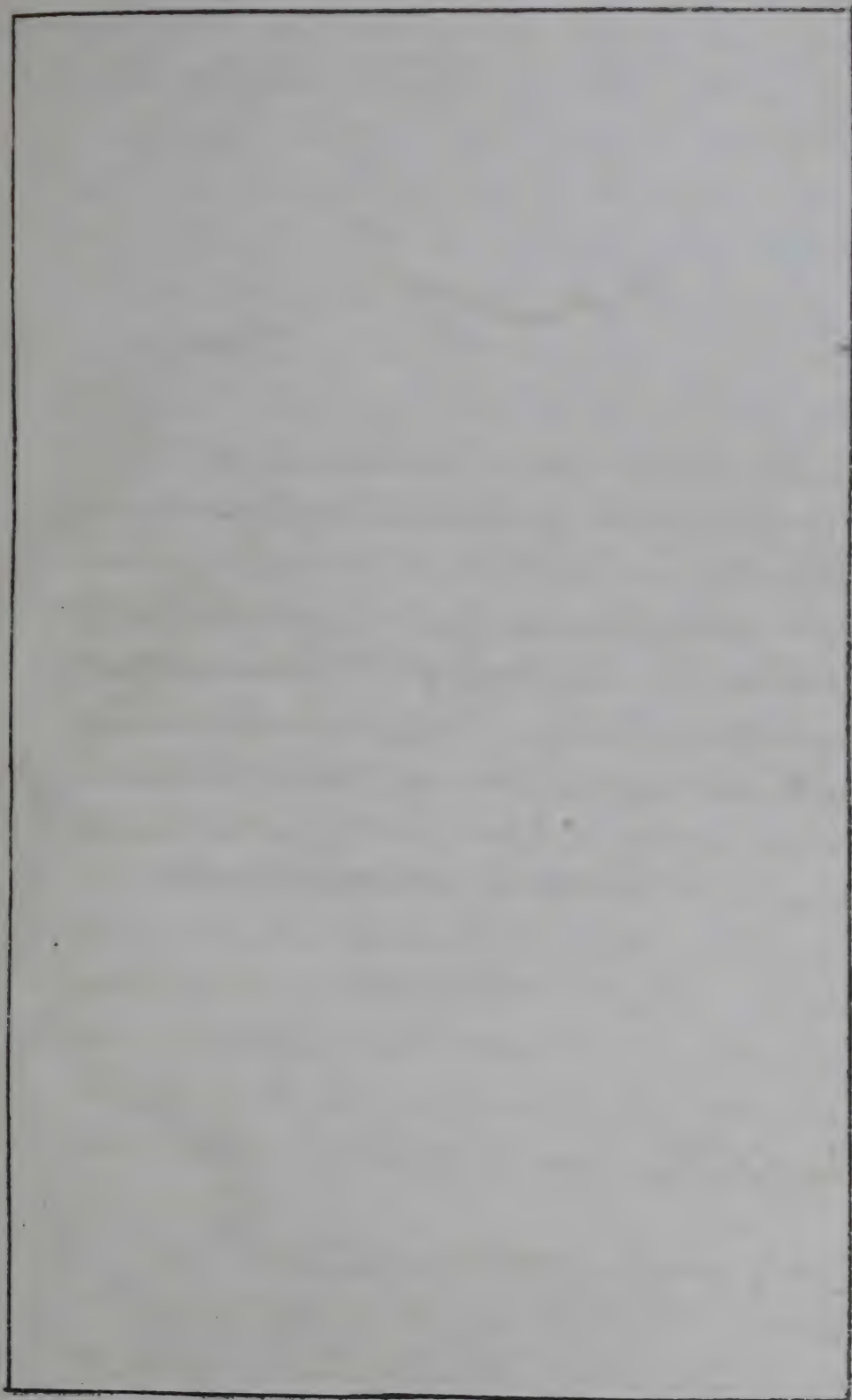
سترھویں صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان کی معاشی زندگی کا ایک خاکہ پیش کرنا ہی اس کتاب کا مقصد ہے۔ یہہ وہ زمانہ تھا جس کے کچھ ہی بعد پہلی مرتبہ اُن جدید قوتوں کا ظہور ہوا جو اس ملک کی ترقی پر روز افزوں اور بالآخر نہایت زبردست اثر ڈالنے والی تھیں۔ اگر کسی تدریجی تغیر کیلئے کوئی ٹھیک تاریخ مُعین کر دینا جائز قرار دیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۶۰۸ء میں جبکہ انگریزی جہاز ہیکٹر (Hector) سورت پہنچا تو ہندوستان کی تاریخ وسطی ختم اور تاریخ جدید شروع ہوی۔ اس تاریخ سے آغاز کرتے ہوے بعد کی تین صدیوں کے معاشی حالات کا پتہ لگانا ممکن ہے اور وہ اس طور پر کہ پہلے سیاحوں کے تذکروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی خطوط سے مدد لی جائے اور پھر زمانۂ مابعد کی زیادہ مفصل اور وافر سرکاری روئدادوں اور مطبوعات کا مُطالعہ کیا جائے۔ اس طرح ہمارے مدارس اور ہماری جامعات کو مطالعہ کرنے کے لئے تاریخ کا ایک اچھا خاصا دور مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا آغاز مناسب طریقہ پر کیا جا سکے۔ اسی مناسب آغاز کی ضرورت کو رفع کرنا اس کتاب کا منشا ہے۔ چنانچہ اِس میں اکبر کے دور حکومت کے اختتام پر جو معاشی صورت حال تھی اس کی کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے قدیم تر زمانوں کے حالات کا ایسا ہی مطالعہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی مواد موجود نہیں ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی یہہ مواد شاید ہی مل سکے۔ البتہ سولھویں صدی کے اختتامی سالوں کے متعلق جو کچھ واقفیت ہمیں حاصل ہے وہ ہماری اس کوشش کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

آیا یہہ کوشش کامیاب ہے اس سوال کا تعلق ناظرین سے ہے۔ جو مواد ہم نے استعمال کیا ہے وہ ہمیں اس بات کے لئے کافی معلوم ہوتا ہے کہ اُسپر ہندوستان کی معاشی زندگی کی اہم خصوصیات کے متعلق ایک مربوط و مسلسل کیفیت کی بنیاد رکھی جائے لیکن ہم یہہ دعوی نہیں کر سکتے کہ جو کیفیت

اب پیش کی جارہی ہے وہ قطعی ہے۔ وہ صرف ایک خاکہ ہے نہ کہ کوئی مکمل تصویر۔ چنانچہ بعض اسناد کے زیادہ عمیق مطالعہ کی گنجایش موجود ہے اور بہت سے ایسے ذرائع باقی ہیں جہاں فی الحال ہیں رسائی حاصل نہیں ہے۔ مثلاً پرتگالی نظم ونسق اور جسویٹ پادریوں کے کاغذات یا شرق اور جنوب اور مغرب کی دیسی زبانوں کے ادبیات۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے مزید واقعات کے انکشاف کی ہم بجا طور پر توقع کرسکتے ہیں۔ پس اس دور کی مزید تحقیق کے لئے بہت سے مواقع موجود ہیں اور ہندوستانی جامعات میں آجکل معاشیات کے جو شعبے قائم ہورہے ہیں وہ اس قسم کی تحقیق و تلاش کے لئے بہت موزوں ہیں۔ اگرچہ اس بات کے لئے بدیہی دلائل موجود ہیں کہ جب تک ذرائع معلومات کی مزید چھان بین نہ کرلی جائے یہہ اشاعت ملتوی رہے تاہم زیادہ فائدہ اسی میں نظر آتا ہے کہ جب تک یہہ شعبے کام کرنے لگیں اس وقت تک استعمال کرنے کے لئے یہہ خاکہ پیش کردیا جائے۔ وہ کم از کم بطور ایک ڈھانچے کے جس پر مزید نتائج مرتب کئے جاسکیں اور بطور مضامین تحقیق طلب کی ایک فہرست کے کام دیسکے گا۔

نقطۂ نظر کے متعلق بھی چند الفاظ ضروری ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ایسے ناظرین کے نقطۂ نظر سے لکھیں جو ہندوستان کے جدید حالات سے ایک عام واقفیت رکھتے ہوں اور واقعات گزشتہ کو زمانۂ موجودہ کی اصطلاح میں اس طرز پر بیان کریں جس سے آجکل کے لوگ مانوس ہوں۔ بالفاظ دیگر ہماری یہہ کوشش ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے مابین یعنی جنگ عظیم کی پیدا کی ہوئی گھانی معاشی مزاحمتوں کے وقوع سے قبل جو حالات تھے ان کے لحاظ سے یہہ کیفیت پیش کریں۔ لیکن چونکہ پچھلے دور کے حالات بہت کچھ مبالغہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے موازنہ یا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہندوستان کی عجیب وغریب قابلیتیں مغرب سے آنے والے سیاحوں کے تخیل میں ہیجان پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ لہذا اگر ہم صنعتوں کے معنی موجودہ معیار کے لحاظ سے قرار دیں گے تو اندیشہ ہے کہ سولھویں صدی کی لفاظی اور عبارت آرائی کی بدولت ہم سخت غلط فہمی میں پڑجائیں۔ ایسی حالت میں اصلاح کا جو تنہا ذریعہ ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی نگاہ مقداروں پر رکھیں۔ چنانچہ شروع سے آخر تک ہم نے یہی کوشش کی ہے کہ معاشی زندگی کے مختلف عاملین کے متعلق واقعی یا اضافی (جو بھی امور معلومہ کے لحاظ سے ممکن ہو) عددی تخمینے حاصل کریں۔ اس قسم کے سیاسی علم حساب کے خطرات کو صرف وہی لوگ بہترین طور پر محسوس کرسکتے ہیں جنھوں نے کہ اس کی مشق کی ہے۔ اور نہ ہمیں یہ امید ہے کہ ہم ان تمام خطرات سے بچ گئے ہیں۔ لہذا اس قسم کے تخمینے پیش کرنے کا صرف یہہ فائدہ ہے کہ شاید ان کی بدولت زمانۂ گزشتہ کا اصلی منظر

زیادہ قریب سے دیکھنے میں ناظرین کو مدد مل سکے۔ اور اگرچہ وہ واقعات سے مختلف ہوں تاہم اُن سے بالعموم زیرِ غور مقداروں کی اہمیت کا پتہ چل جائے گا۔ اور ان کی بدولت کم از کم اس مضمون کے ایک ایسے پہلو کی طرف تو ضرور توجہ منعطف ہو جائے گی جس کو عام مصنفین نے تقریباً پوری طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم صرف یہہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہہ تخمینے اصلی حالات کے قریب قریب سمجھے جائیں اور جن ناظرین کو وہ خلافِ قیاس نظر آئیں انھیں چاہئے کہ اصلی اسناد کی روشنی میں انکی جانچ پڑتال کریں۔

لیکن یہہ نامناسب ہوگا اگر ہم بطور تنبیہ چند الفاظ کا اضافہ نہ کریں تاکہ جو کوئی اس دعوت کو قبول کرے وہ اس سے مستفید ہو سکے۔ منجملہ اُن مشکلات کے جن سے یہہ دور گھرا ہوا ہے ایک مشکل یہہ ہے کہ ہماری اسناد میں جو زبانیں استعمال کی گئی ہیں وہ بہت مختلف ہیں۔ انگریزی فرانسیسی لاطینی۔ فارسی اور پرتگالی زبانوں میں ہم تلاش کر چکے ہیں اور ہم نے دیکھا کہ ترجموں کے استعمال میں (جہاں کہیں وہ موجود ہوں) نہایت احتیاط برتنی چاہئے۔ ممکن ہے کہ معمولی اغراض کے لئے وہ کافی طور پر صحیح ہوں اور پھر بھی الفاظ کا اصطلاحی مفہوم جس سے معاشیئین کو خاص طور پر سروکار ہوتا ہے۔ مفقود ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہہ بھی ممکن ہے کہ سولھویں صدی کے کسی مصنف کے نزدیک خاص خاص الفاظ کے جو معنی ہوں اس کو بڑی سے بڑی مستند لغت بھی ٹھیک طور پر ظاہر نہ کر سکے۔ لہذا جہاں کہیں ممکن ہو سکے اصلی کتاب تک پہنچنا مناسب ہے اور اگر اطالوی ہسپانوی اور روسی سیاحوں کی حد تک ہم خود ایسا کرنے سے قاصر رہے تو اس کی وجہہ یہہ ہے کہ ہم ان زبانوں سے ناواقف ہیں۔ ترجموں کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس کا اطلاق خاص کر آئین اکبری کے انگریزی ترجموں پر ہوتا ہے جن میں اکثر فقروں کا اصطلاحی مفہوم غائب ہو گیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس خاص دور کے مفصل مطالعہ کے لئے فارسی کی کچھ واقفیت کم از کم بحالت موجودہ ناگزیر سمجھنی چاہئے۔

جس مضمون پر ہم نے قلم اُٹھایا ہے وہ بہت وسیع ہے اور ہمیں علم و ادب کے غیر مانوس راستوں میں بہت کچھ تجسس کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ جس کسی سے ہم نے درخواست کی اس نے نہایت خلوص کے ساتھ ہماری مدد کی لہذا ہم اس موقع پر جملہ احباب و اغیار سے جن سے کہ ہمیں مدد ملی احسانمندی کا اظہار کرتے ہیں۔ مسٹر سی۔ ایم۔ نولز (شعبۂ معاشیات لنڈن) سر ڈیوڈ پرین اور ڈاکٹر اشاف (کیو)۔ ڈاکٹر بارنٹ (برٹش میوزیم) مسٹر پی۔ ایس۔ ایلن (مرٹن کالج آکسفورڈ) مسٹر آر۔ ڈبلیو۔ دانا (انسٹی ٹیوشن آف نیول آرکی ٹکٹ کے معتمد)

مسٹر جے۔ ایچ۔ ڈکنسن (مانچسٹر) اور مسٹر ایف۔ نوڈر (مانچسٹر چیمبر آف کامرس کے ہندوستانی شعبہ کے معتمد) و نیز ہم اپنے شریک ملازمت یعنی سابقہ موجودہ ارکان انڈین سیول سروس کے (جن کے متعلق بعض اوقات یہہ کہا جاتا ہے کہ انھیں مطالعہ اور تحقیق میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے) ممنون احسان ہیں۔ سر جارج گریرسن۔ سر ایڈورڈ میاک لگن۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ۔ مسٹر آر سیویل مسٹر ال۔ لانگورتھ ڈیمس۔ مسٹر آر۔ برن۔ مسٹر اے۔ سی چیٹرجی۔ مسٹر اے یوسف علی۔ مسٹر ڈیمی۔ ٹی۔ جیڈوک انڈین ٹریڈ کمشنر کے بھی ہم شکر گزار ہیں کہ انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ ہمیں اپنی معلومات سے مستفید کیا۔ اور آخر میں ہمیں مسٹر ڈبلیو۔ فوسٹر (انڈیا آفس) کی متواتر مہربانیوں کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ملک اور باشندے

پہلی فصل

ملک

اکبر کے دور حکومت کے اختتام پر ہندوستان کی معاشی زندگی کیسی تھی؟ اس کا ایک خاکہ پیش کرنا یعنی یہ ظاہر کرنا کہ لوگ کیونکر اپنی آمدنیوں کو خرچ کرتے تھے، اور ان آمدنیوں کے کیا کیا ذرائع تھے؟ اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے، کہ لفظ "ہندوستان" کا مفہوم واضح کر دیا جائے، کیونکہ آجکل اس لفظ کے جو معنی لئے جاتے ہیں، ہمیشہ سے اس کے وہی معنی نہیں رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں کسی معمولی یوروپین کے دل میں، اگر ہندوستان یا انڈیز کا کبھی کوئی خیال گذرتا ہوگا تو وہ غالباً کسی موہوم علاقے کا تصور کر لیتا ہوگا، جو شام سے جانب مشرق کسی طرف کو واقع ہے، اور جہاں سے مختلف قیمتی اشیاء اور خاصکر مصالحوں کی بہم رسانی کی جاتی ہے، جو اُس کی غذا تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ جغرافی انکشافات کی ترقی کی بدولت، انڈیز کو رفتہ رفتہ مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اور لفظ ہندوستان (کم از کم انگریزی استعمال میں)

باب ۱

بتدریج اول الذکر رقبے کے لئے مخصوص ہو گیا جس میں عام طور پر وہ تمام ملک شامل تھا جو خلیج فارس اور جزیرہ نمائے مالے کے مابین واقع ہے۔ اس وسیع رقبے کو ماہران جغرافیہ نے اور چھوٹے چھوٹے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور بالعموم دریائے سندھ اور گنگا کے دہانوں کو حد فاصل قرار دیا تھا چنانچہ سولھویں صدی کے بعض مصنفین نے ہندوستان "ثانی" یا "متوسط" کا جو ذکر کیا ہے وہ اس لفظ کے موجودہ مفہوم سے کم و بیش منطبق ہوتا ہے۔ لیکن پرتگالیوں نیز دوسری قوموں کے بعض سیاحوں نے جو پرتگالیوں کے زیر حفاظت اس ملک میں آئے تھے اس لفظ کے مفہوم کو بہت ہی تنگ کر دیا۔ اُن کے نزدیک ہندوستان سے مراد خاصکر مغربی ساحل اور وہ زمین تھی جو بالکل اس کے پیچھے ہی واقع ہے۔ چنانچہ (۲) ہم سندھ سے "ہندوستان" کی طرف یا "ہندوستان" سے بنگال کی طرف سیاحتوں کا حال پڑھتے ہیں۔ لہذا ہمیں چاہئے کہ اس طبقے کے مصنفین کا ٹھیک مطلب سمجھنے کے لئے احتیاط سے کام لیں۔ موجودہ کتاب میں ہم نے لفظ ہندوستان کو اُس کے جدید معنی میں جس سے آجکل عام طور پر لوگ آشنا ہیں، استعمال کیا ہے یعنی اُس سے مراد وہ ملک ہے جو سمندر کے اور کوہ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے، اور جو مغرب میں بلوچستان اور مشرق میں چٹاگانگ کے قرب و جوار سے آگے ایشیا کے دوسرے علاقوں کی طرف نہیں بڑھتا۔ موجودہ سلطنت ہند میں برما بھی شامل ہے لیکن آجکل جو علاقہ اس نام سے موسوم ہے وہ سولھویں صدی میں چند سلطنتوں پر مشتمل تھا جو ہندوستان سے قطعاً آزاد تھیں۔ ہمارے موجودہ اغراض کے لئے زیادہ سہولت اسی میں ہے کہ وہ ایک غیر علاقہ تصور کیا جائے۔ پس اس کتاب کا موضوع اُس ملک کی معاشی زندگی ہے جس کے حدود اوپر ظاہر کر دئے گئے ہیں، یا عام طور پر موجودہ سلطنت ہند کی معاشی زندگی ہے جس میں دیسی ریاستیں شامل سمجھی جائیں لیکن جس سے صوبہ برما خارج تصور کیا جائے۔

جس زمانے کی ہم کیفیت لکھ رہے ہیں اُس وقت اِس رقبے کا بہت بڑا حصہ شمال میں سلطنت مغلیہ اور جنوب میں ہندو علاقوں اور دکن کی مسلمان حکومتوں کے مابین منقسم تھا۔ ہندو علاقوں کو اس زمانے تک بھی سلطنت وجیانگر کے نام سے یاد کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ اس سلطنت کی فوجی قوت کا جنگ تالیکوٹ (۱۵۶۵ عیسوی) میں قطعی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا لیکن جو کچھ علاقے باقی رہ گئے تھے اُن پر یہ خاندان اپنی

باب ۱

سیادت کا مدعی تھا، چنانچہ اکبر کی وفات کے بعد کچھ مدت تک "نرسنگا" کے مروجہ نام سے ہم کتابوں میں اس سلطنت کا حال پڑھتے ہیں لیکن یہ سیادت محض نام کی تھی، اور شاہی حکام یا مقامی رئیسوں کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی، اور یہ لوگ زیادہ تر اپنے آپ کو قوی بنانے اپنے ماتحت علاقے کو وسعت دینے میں لگے رہتے تھے۔ دکن کی مسلمان سلطنتیں ابھی تک قطعی طور پر مغلوں کی مطیع نہیں ہوئی تھیں، ان کے منجملہ ایک سلطنت یعنی احمد نگر کو اکبر کے دور کے آخری حصے میں ایک صوبہ بنالیا گیا تھا لیکن چند سال بعد دوبارہ اس کی آزادی قائم ہوگئی۔ ایک اور سلطنت یعنی خاندیش (نسبتاً) زیادہ قطعیت کے ساتھ لیکن پھر بھی نامکمل طریقے پر سلطنت مغلیہ کا ایک جزو بنائی گئی تھی بقیہ سلطنتیں، یعنی گولکنڈہ، بیجاپور، (۴۳) اور بیدر، جداگانہ اور آزاد ریاستیں تھیں۔

سلطنت مغلیہ جو تقریباً تمام بقیہ ہندوستان پر حاوی تھی، اس وقت تک ابھی ایک نئی چیز تھی۔ ۱۵۵۶ء میں جب اکبر تخت نشین ہوا تو آگرے اور پشاور کے درمیانی ملک کے چند حصوں پر، نیز اس علاقے میں، جو اب افغانستان کہلاتا ہے، اس کا قبضہ صد درجہ غیر مستقل تھا اور اس کے طویل دور حکومت میں جو علاقے فتح کئے گئے تھے، وہ اس کے اختتام کے وقت کسی طرح بھی مکمل طور پر شامل نہیں ہوئے تھے۔ نظم و نسق کے بارے میں جو صورت حال اس وقت موجود تھی اس کا بعض اوقات برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے باہمی اختلاط سے جس سے آجکل لوگ ناآشنا نہیں ہیں، مقابلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تشبیہ کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مغلوں کے زمانے میں نظم و نسق سے مراد زیادہ تر تحصیل مالگزاری تھی، اور اس دور میں نظم و نسق کا مقصد ہی یہ تھا کہ شاہنشاہ یا اس کے عمال (نامزد کردہ اشخاص nominess) خاص کاشتکاروں سے مالگزاری جمع کریں لیکن عملاً یہ مقصد ہمیشہ قابل حصول نہیں ہوتا تھا چنانچہ سلطنت کے مختلف علاقوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ مقامی نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو بجا طور پر "زمیندار" کہلاتے ہیں۔ اکبری دور کے مصنف جس طرح اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، اس لحاظ سے اسکا مفہوم آجکل کے قابض زمین سے عموماً کسی قدر مختلف ہے، لیکن لازمی طور پر ان زمینداروں کو شہزادوں یا رئیسوں کے مساوی تصور کرنا غلطی ہوگی۔ معطی لہ یا عہدہ دار کے ماسوا، یہ لفظ ہر ایسے شخص پر حاوی ہے جو کسانوں اور شاہنشاہ کے مابین قائم ہو، خواہ اس کے معنی موجودہ مفہوم کے مطابق ایک قابض زمین کے ہوں، یا اس سے مراد کوئی رئیس

باب ۱

باغی ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایک خود مختار بادشاہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اکبر کا نظم و نسق نہایت سختی کے ساتھ عمل تھا؛ جو رئیس یا راجہ مطیع ہو جائے اور ایک معقول مالگزاری ادا کرنے کا اقرار کرے وہ عام طور پر مجاز تھا کہ اپنی حاکمانہ حیثیت برقرار رکھے۔ اس کے برعکس جو مخالف یا باغی ہوتا، وہ مار ڈالا جاتا، قید کر لیا جاتا، یا نکال دیا جاتا تھا، اور اس کی زمینیں براہ راست سرکاری نگرانی میں لے لی جاتی تھیں۔ لہذا زمینداروں کا وجود بجائے خود کسی خاص دستوری انتظام کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ گنگا کے میدان میں جہاں اکبر کی سیادت قطعی طور پر قائم ہو چکی تھی، ہم ان کا ذکر سنتے ہیں۔ سرحدی علاقوں میں بھی جہاں اس کی حکومت صرف برائے نام تھی، ہم ان کا حال پڑھتے ہیں۔ ہم انھیں راجپوتانے میں بھی پاتے ہیں، نیز الہ آباد و بنارس کے جنوب کے پہاڑی ملک میں جہاں اکبر کا نظم و نسق حالات و قرائن کی وجہ سے اس بات پر مجبور تھا کہ ایک کم و بیش مشتبہ حیثیت ہی پر قانع رہے۔ زمینداروں کا وجود ہمیں اس امر کی یاد دلاتا ہے کہ سلطنت یکسانیت کی حالت سے بہت دور تھی، اور اگر منفرد اشخاص کی حیثیتوں کا تفصیلی علم حاصل ہوتا تو غالباً ہمیں پتا چلتا کہ کس قدر مختلف قسموں کی اعلیٰ حقیقتیں موجود تھیں۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو آجکل قابضان زمین کہلائیں گے، اور دوسری طرف وہ حکمران تھے جو شاہنشاہ کے ماتحت حلیف تھے، اور جن کے مابین رشتۂ اتصال صرف مالگزاری یا خراج ادا کرنے کا عام فریضہ تھا۔

(۴)

اِن خاص خاص حصوں کے علاوہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ملک بھر میں منتشر تھیں اور جن میں سے بعض معاشی نقطۂ نظر سے اہم تھیں وجیانگر کی قوت زیادہ تر اندرون میں تھی اور مغربی ساحل پر اس زمانے میں سیاسی صورت حال پیچیدہ تھی۔ گوا اور دوسری نوآبادیات میں پرتگال بہ حیثیت ایک شاہی قوت کے قائم ہو چکے تھے۔ دریائی قزاقوں کے سردار جن کی حالت کسی آئندہ باب میں بیان کی جائے گی، کسی اعلیٰ حکومت کے مطیع نہیں تھے۔ اور زاموری حاکم کالیکٹ نے بھی ایک خود مختارانہ حیثیت اختیار کر رکھی تھی، کبھی تو وہ پرتگالیوں سے الجھتا تھا، اور کبھی علانیہ مخالفت کرنے لگتا تھا، لیکن قزاقوں کی جماعتوں کو ہمیشہ در پردہ مدد دیا کرتا تھا۔ مشرقی ساحل پر صورت حال کسی قدر باقاعدہ تھی، اگرچہ پرتگالی بے ضابطہ طور پر

باب

وجیانگر کے علاقے کے بعض حصوں پر متصرف ہو گئے تھے۔ لیکن شمال میں اور آگے چند چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں نظر آتی ہیں جو گولکنڈے اور مغلوں کے صوبۂ اوڑیسہ کے درمیان واقع تھیں۔

شمالی ہندوستان میں علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا وجود اس زمانے میں محض ایک لفظی سوال تھا۔ جو زمیندار مغل بادشاہ کو مالگزاری ادا کرتا تھا اس کی حیثیت صاف طور پر ایک ماتحت کی سی تھی اور اگر وہ بادشاہت کا مدعی بننا چاہتا تو اس کے لئے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ مالگزاری ادا کرنے سے انکار کردے یا اس کا ادا کرنا ترک کردے لیکن اس طرح مالگزاری ادا نہ کرنے کے اور بھی مختلف اسباب ہو سکتے ہیں اور یہ بات مطابق قیاس ہے کہ راجپوتانہ، متوسط ہند، اور چھوٹے ناگپور میں متعدد سردار اور قبیلے اس قسم کے موجود تھے جن کی حیثیت دستوری قانون دانوں کے نزدیک بالکل بے قاعدہ تصور کی جائیگی۔ کیونکہ وہ کبھی تو مقررہ مالگزاری ادا کرتے تھے، اور کبھی علانیہ بغاوت کر بیٹھتے تھے، اور کبھی انھیں عملاً اس وجہ سے پوری آزادی حاصل رہتی تھی کہ حکومت مغلیہ کے حکام ان کی سرکوبی کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنا مشکل سے خالی نہ سمجھتے تھے۔ لیکن ریاست کچھ جو دریائے برہمپترا کی وادی میں واقع ہے، اس عام بیان سے مستثنیٰ ہے۔ مغل خود اس پر اپنی عملداری کے مدعی نہیں تھے۔ (۵)

جو نقشہ اس باب کے شروع میں لگایا گیا ہے، اس میں ہم نے بجز چند کے، ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ظاہر نہیں کیا ہے، اور نہ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ بڑے بڑے علاقوں کے حدود بھی بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دئیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حدود بسا اوقات مبہم ہوتے ہیں، اور اکثر صورتوں میں صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں سرحد غیر معین تھی، اور عام طور پر تو دونوں فریق عملداری کے مدعی رہتے تھے، لیکن دراصل کبھی ایک کی عملداری رہتی تھی، اور کبھی دوسرے کی۔ سلطنت مغلیہ کے حدود پر سرسری نظر ڈالنے سے اس بیان کی ایک مثال ملے گی اور اس زمانے کے سیاسی حالات کو سمجھنے میں ناظرین کو اس سے مدد ملے گی۔ مغرب کی جانب اکبر کی سلطنت میں اس علاقے کا جو اب بلوچستان کہلاتا ہے، ایک حصہ شامل تھا، لیکن حقیقی عملداری کی مغربی حد کسی مستند کتاب میں جو ہمیں مل سکی، ٹھیک ٹھیک ظاہر نہیں کی گئی۔ شمال کی جانب

باب ۱

سلطنت میں وہ علاقہ شامل تھا جو کابل سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے، اور جو اب افغانستان کہا جاتا ہے۔ لیکن سیاحوں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ دریائے انڈس کے مغرب میں جو پہاڑی ملک واقع ہے، وہ آجکل کی طرح اُس وقت بھی کم و بیش خود مختار تھا۔ اور مغلوں کی زیادہ سے زیادہ یہ کوشش رہتی تھی کہ قافلوں کیلئے دروں میں سے ہو کر جو راستے جاتے ہیں انھیں بالکل بند نہ ہونے دیں۔ کشمیر کا جنوبی حصہ موثر طریقہ پر مغلوں کے زیر انتظام تھا، اور جنوبی کمایون کے بعض حصص کے متعلق بھی غالباً یہی بیان صحیح ہے، لیکن اس پہاڑی علاقے کا زیادہ حصہ در اصل کسی کے زیر اثر نہیں تھا۔ کمایون سے جانب مشرق دریائے برہمپترا کی وادی تک سلطنت کی شمالی علامت ہمالیہ کے جنگلات پر مشتمل تھی۔ وادی برہمپترا کے پاس سے سرحد جنوب کی طرف مڑتی تھی اور ریاست کچ اور اُس علاقے سے ملی ہوئی چلی جاتی تھی جس پر چٹاگانگ پہاڑی کے قبیلوں کا قبضہ تھا۔ اس مقام سے مستند راویوں کے مابین اختلاف ہے لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ چٹاگانگ سلطنت سے خارج تھا، اور عملی طور پر اکبر کی عملداری غالباً دریائے میگھنا کی شاخ تک محدود تھی۔ میگھنا سے پوری کے کسی قدر جنوب تک سرحد ساحل سے ملی ہوئی چلی جاتی تھی، اور یہاں سے جانب مغرب مڑ کر جزیرہ نمائے ہند کے آر پار بمبئی تک چلی جاتی تھی۔ دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان کی حالت غیر یقینی ہے؛ اس علاقے کے بعض سردار تو یقیناً خود مختار تھے، اور بقیہ مالگزاری ادا کرتے تھے لہذا صرف اندازے سے ایک حد کھینچی جاسکتی ہے۔ پھر سرحد کم و بیش گوداوری سے ملی ہوئی احمد نگر کو جاتی تھی، اور سورت اور بمبئی کے مابین مغربی ساحل تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن ہندوستان کے اس حصے میں سلطنت کی توسیع برسر ترقی تھی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے سب سے آخر میں جو مقامات فتح کئے گئے تھے وہ ابھی پورے طور پر شامل نہیں ہوئے تھے۔ (۶)

سرحدوں کی غیر یقینی حالت جس کی ایک مثال ابھی دی گئی ہے، زیادہ تر سیاسی مورخ کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے، اور ہمارے موجودہ معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے بھی ان سرحدوں کی کوئی خاص اہمیت تھی یا نہیں۔ سولھویں صدی کے نصف اول میں وجیانگر کی زندگی کے

تقریباً مکمل حالات ہمارے پاس موجود نہیں۔ دکن کی ریاستہائے گولکنڈہ و بیجاپور کی زندگی کا بھی کچھ حال ہمیں معلوم ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان مقامات کی زندگی اکبر کی سلطنت کی زندگی سے ضروری امور میں مختلف تھی۔ نظم و نسق کی خوبی تو ایک مقام سے دوسرے مقام پر اور ایک وقت سے دوسرے وقت میں بدلتی جاتی تھی، لیکن اس کا ڈھانچہ زیادہ تر ایک سا تھا اور اس کے تحت رہکر باشندے جہاں تک ممکن ہو اچھی زندگی بسر کرتے تھے؛ لہذا ہم علٰحدہ علٰحدہ ہر خطے کی زندگی کی کیفیت بیان نہیں کریں گے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ملک بھر میں اختلاف کی بجائے یکسانیت زیادہ حاوی تھی اور جو کچھ مواد میسر ہے اس کو اچھی طرح کام میں لاکر بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی حالت کا ایک خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

پس سیاسی حدود کو خارج از بحث کر کے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکبر کی وفات کے وقت ہندوستان کی سرزمین کس چیز سے مشابہہ تھی؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی وہ بہت کچھ اُس ہندوستان سے مشابہہ تھی جس کا ہمیں آجکل علم ہے۔ بلاشبہہ کئی اہم فرق ضرور موجود ہیں جن کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے، مثلاً اس زمانے میں ریلیں نہیں تھیں، پنجاب اور صوبجات متحدہ میں نہروں کا جو عظیم الشان انتظام ہے وہ اسوقت موجود نہیں تھا، پختہ سڑکیں کہیں نظر نہ آتی تھیں، گو خشکی کے سفر کے خاص خاص راستے بعض صورتوں میں تو دو رویہ درختوں کے باعث، لیکن عام طور پر اُن محصورہ مقامات کی وجہ سے، جو سرائے کہلاتے تھے اور جن میں مسافر اور تجار نسبتاً زیادہ امن و حفاظت کے ساتھ رات بسر کرتے تھے، واضح طور پر معلوم رہتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں یہ راستے کم از کم بعض صورتوں میں تو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے موزوں تھے چنانچہ وقتاً فوقتاً گاڑیوں کی لانبی لانبی قطاریں ان راستوں پر دیکھنے میں آتی تھیں لیکن گولکنڈے سے جنوب کی طرف راس کماری تک گاڑیاں قطعاً نامعلوم تھیں اور بار برداری کے جانور یا حمال صرف یہی خشکی پر نقل و حمل کے ذرائع تھے۔ دریائے سندھ، گنگا اور جمنا جو جہازرانی کے قابل ہیں اُس زمانے میں نہایت اہم راستے تھے اور وزنی چیزوں کی نقل و حمل کا بہت بڑا حصہ کل شمالی ہندوستان میں انھیں کے ذریعہ طے ہوتا تھا، اور بنگال کے دریائی راستے شاید اب سے زیادہ اُس زمانے میں مستعمل ہوتے تھے۔

(۷)

اُس زمانے میں یقیناً آجکل سے زیادہ جنگلات موجود تھے، لیکن یہ کیفیت ملک کے تمام حصوں کے متعلق یکساں طور پر صحیح نہیں ہے۔ بعض علاقوں میں تو جنگل غالب تھے اور جو کچھ آباد دیہات ان میں نظر آتے تھے، ان کے متعلق ٹھیک طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جنگل کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ لیکن اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے علاقوں مثلاً بنگال، گجرات، اور گنگا، کے بالائی میدان میں ملک کا اکثر حصہ باقاعدہ طور پر زیر کاشت تھا اور جنگلات کو مقابلۃً اب سے زیادہ وسیع سہی تاہم وہ اس سرزمین کی کوئی نمایاں خصوصیت نہیں تھے۔ شمالی ہندوستان کے تذکرہ میں ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ دامنِ کوہ کے جنگل صوبجاتِ متحدہ اور بہار کے اندر بمقابل زمانۂ حال کے اسوقت بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ جو علاقے انسانوں سے بسے ہوئے تھے، اور جن میں کاشتکاری کا کاروبار باقاعدہ طور پر جاری تھا، ان کی سرحد اندازاً ایک ایسے خط سے ظاہر کیجاسکتی ہے، جو بریلی گورکھپور اور مظفرپور سے جانب شمال بہت ہی تھوڑے فاصلے پر کھینچا جائے۔ جنگلات کی وسعت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مہلک جانور کثیر تعداد میں موجود تھے، گنگا اور جمنا کے جنوب کے پہاڑی ملک میں ہاتھیوں کے غول کا نظر آنا، ایک عام بات تھی۔ صوبۂ مالوہ میں شیر ببر کا شکار ہوسکتا تھا۔ گینڈے دریائے گاگرا پر پائے جاتے تھے۔ اور اگرچہ ہماری رائے میں بکثرت نہیں تاہم دریائے گنگا کے میدان کے بعض حصوں میں چیتے ہلاک کئے جاتے تھے۔ شاہی دارالخلافہ یعنی اکبرآباد کے قرب میں، اور غالباً حکومت کے دوسرے مرکزی مقاموں کے قریب بھی وسیع شکارگاہیں محفوظ رکھی جاتی تھیں، چنانچہ جہانگیر اپنے توزک میں بیان کرتا ہے کہ "کیونکر ہرن کثرت کے ساتھ اس کے کسی شکارگاہ سے مزروعہ خطوں میں نکل پڑے تھے" اور کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ انھیں کسی طرح ایذا پہنچا سکے"۔

اب جہاں تک آباد حصۂ ملک کا تعلق ہے اس کی عام صورت بھی موجودہ صورت حالات سے بہت کچھ مشابہہ تھی۔ کھیت عام طور پر غیرمحصورہ تھے اور اس زمانہ کے انگریز سیاحوں کی اصطلاح میں وہ "Champion country" کہلاتے تھے۔ جو فصلیں آجکل تیار کی جاتی ہیں یا جو درخت بوئے جاتے ہیں وہ بجز چند غیراہم مستثنیات کے

باب (۸)

اُس زمانے میں بھی پائے جاتے تھے۔ اور درختوں اور فصلوں کے علاوہ زمین کے منظر میں کوئی اور چیز ایسی نہیں ہے جو نظر کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہو۔ بلاشبہہ اُس زمانے میں نالی دار لوہے کی ایسی چھتیں نہیں تھیں جو آجکل بنگال اور ملک کے بعض دوسرے حصوں میں دیکھنے والے پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ مٹی یا اینٹوں کی دیواریں اور کھپریل یا پھوس کی چھتیں بہت عام تھیں۔ بود و باش ادنیٰ قسم کی تھی اور ساز و سامان کی بیحد قلت تھی۔ چنانچہ ان امور پر یورپ کے بعض اشخاص نے جنھیں عارضی طور پر یہاں کی مہمان نوازی سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہمارا لے زنی کی ہے۔ قصبوں اور شہروں کے متعلق غالباً اس سے بہت زیادہ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی۔ کانپور اور کراچی یہ سب اکبر کی وفات کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ اور موجودہ مدارس کے قائم مقام اس زمانے میں مائی لاپور اور سینٹ تھومی S. Thomé تھے۔ بعض قدیم شہر جو کسی زمانے میں دار الخلافہ رہ چکے تھے مثلاً قنوج اور وجیانگر پہلے ہی سے زوال پذیر حالت میں آ چکے تھے۔ دوسرے شہر مثلاً جون پور اپنی پچھلی اہمیت کو ابھی تک کچھ نہ کچھ برقرار رکھے ہوئے تھے اور فتح پور سیکری کو جو ان سب سے بعد دار الخلافہ بنایا گیا تھا آباد کرنے کے چند ہی سال بعد چھوڑ دیا گیا۔ دار الخلافہ شاہی آگرہ اور دکن کے دار الخلافے یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور اور صوبوں کے مرکزی مقامات مثلاً ملتان۔ لاہور۔ دہلی۔ الہ آباد۔ پٹنہ۔ اُجین احمد آباد اور اجمیر یہ سب بڑے بڑے اور نہایت آباد شہر تھے اور یورپ کے اہل نظر نے ان میں کے بڑے بڑے شہروں کا اپنے یہاں کے عظیم ترین شہروں مثلاً لندن یا پیرس یا قسطنطنیہ سے مقابلہ کرنے میں تامل نہیں کیا۔ ان ہندوستانی شہروں میں بالعموم ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو زمانۂ جدید کے "سیول اسٹیشن" یا نواح شہر کے مسکنوں کے قائم مقام ہو۔ وسیع باغات بالعموم شہر کی دیواروں سے باہر واقع ہوتے تھے لیکن کاروباری خاندان اور مقامات اندرون شہر ہی زیادہ محفوظ تھے اور اگرچہ شہر کے مکانات بعض اوقات بڑے بڑے اور عیش و عشرت کے سامان سے آراستہ ہوتے تھے تاہم باہر سے عام خور پران کی کچھ اہمیت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ فادر مانسریٹ جس نے سورت سے آگرے تک سفر کیا تھا اور اکبر کے براہ لاہور کابل تک کے سفر میں اس کے ہمراہ تھا اپنے مشاہدات کے نتائج کا حسب ذیل خلاصہ پیش کرتا ہے:- "فاصلے پر سے تو شہر

باب ۱

(۹)

دلکش نظر آتے ہیں لیکن اندر جا کر ان کی ساری شان و شوکت تنگ کوچوں اور باشندوں کے انبوہ میں غائب ہو جاتی ہے۔ مکانوں میں کوئی دریچہ نہیں ہوتا متمول اپنے احاطوں کے اندر باغات۔ کنٹے اور فوارے بناتے ہیں۔ لیکن بیرونی طور پر کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جو آنکھوں کو بھلی معلوم ہو۔ عام باشندے جھونپڑیوں اور چھپروں میں رہتے ہیں۔ اور ایک شہر کو دیکھ لینا گویا سب کو دیکھنے کے برابر ہے"! یہی کیفیت آجکل بھی ہندوستان کے اُن شہروں پر بہت کچھ قابل اطلاق ہے جو ابھی تک ماہرین شہر سازی کے ہاتھوں میں نہیں آئے ہیں یا جن میں مشہور و معروف اینگلو انڈین طرز کے سکونتی رقبوں کا نشوو نما نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان کے پڑوسیوں کے بارے میں بھی چند الفاظ ضروری ہیں۔ مغرب کی جانب ایران ایک بڑی طاقتور سلطنت تھی مغلوں کے ساتھ تو اس کے دوستانہ تعلقات تھے لیکن ترکوں سے وہ برسر پیکار تھی۔ ترک اس بات میں کوشاں تھے کہ جنوب اور مشرق میں اپنے حدود کی توسیع کریں چنانچہ ساحل عربستان پر وہ اپنی سیاوت قائم کر چکے تھے۔ شمال مغرب کی طرف بخارا واقع تھا جو ایران کی طرح ہندوستان کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ تبت کے متعلق بجز چند موہوم قصوں کے ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ بنگال اور چین کے درمیان قافلے کا ایک راستہ نظری طور پر تو موجود تھا لیکن ہمیں کوئی تحریر اس بارے میں نہیں ملی کہ اس زمانے میں وہ در اصل استعمال بھی کیا جاتا تھا یا نہیں، چنانچہ آگرے سے جو لوگ چین کا سفر کرنے والے تھے انھیں مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ کابل کے راستے سے اور مشرق و مغرب کی بڑی سڑک سے جو وسط ایشیا میں سے ہو کر گذری ہے سفر کریں[1]۔ بنگال کے مشرق میں ارکان کی سلطنت تھی اور اس کے جنوب مشرق میں پیگو تھا۔ یہی دونوں ریاستیں اُس ملک کے بہت بڑے حصے پر حاوی تھیں جو اب برما کہلاتا ہے۔ تباہ کن جنگوں کے ایک طویل سلسلے کا یہ نتیجہ تھا کہ پیگو اس زمانے میں ویران ہو گیا تھا اراکان کا علاقہ خوشحال معلوم ہوتا تھا اور اس کے بادشاہ کے متعلق (غالباً کسی قدر مبالغے کے ساتھ) یہ بیان کیا گیا ہے کہ عظیم الشان

[1] لیکن چین کی آمد و رفت زیادہ تر سمندر کی راہ سے ہوتی تھی جس کی کیفیت آئندہ کسی باب میں بیان کی جائیگی

باب ۱

مغل بادشاہ کے بعد وہی ہندوستان میں سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔ لیکن شمال کے راستے سے ان کی آمد و رفت غیر اہم تھی پس ایران اور بخارا کی آمد و رفت کو چھوڑ کر ہندوستان کے تعلقات دوسری اقوام کے ساتھ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی خشکی کے راستے سے نہیں بلکہ سمندر کے ذریعے سے قائم تھے اور چونکہ ان کا دارومدار خاصکر تجارت پر تھا لہذا مناسب یہ ہے کہ یہاں ان کی کیفیت لکھنے سے قلم روک لیا جائے اور اُسے اس باب کے لئے محفوظ رکھا جائے جو اس مضمون سے متعلق ہے۔

باب ۱

(۱۰)

فصل دوم

باشندوں کی تعداد

یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ہمارے پاس اس قسم کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے جس سے سولھویں یا ستھرویں صدی میں ہندوستان کی آبادی ظاہر ہو سکے۔ ایسی کوئی تحریر ہمارے مطالعے میں نہیں آئی جو کسی حصہ ملک کی مردم شماری کے قریب قریب مساوی ہو۔ چنانچہ ہماری واقفیت زیادہ تر ان تخمینوں پر مشتمل ہے جو منفرد اشخاص نے مختلف ممالک کا مقابلہ کرنے میں قائم کیے ہیں اور جن میں بڑی بڑی غلطیوں کا احتمال ہے۔ اور یہ احتمال بمقابل اس زمانے کے یورپی ممالک کے ہندوستان میں غالباً بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے واقعہ نگار اس مسئلے پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ ان کے پاس مقابلہ کا کوئی معیار نہیں تھا۔ ہم سے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کثرتِ آبادی کی کیا حالت تھی۔ جو کچھ واقعات اس بارے میں ہم نے اُن سے جمع کیے ہیں اُن کی اہمیت کا اندازہ حسب ذیل مقولے سے ہو سکتا ہے جس کو ایم۔ ڈی فیریا سوسا نامی مورخ نے جو ستھرویں صدی کے آخر حصے میں گذرا ہے قلمبند کیا ہے۔ ہندوستان کے بیدین کہتے ہیں کہ خدا نے یہ خاص حقوق یا نعمتیں پانچ سلطنتوں کو عطا کی ہیں بنگالے کو لاتعداد سپاہی۔ اورکسہ کو ہاتھی۔ بسناگر کو ایسے لوگ جو ڈھال تلوار میں ماہر ہوں۔ دہلی کو شہروں کی کثرت۔ اور کو کو لاتعداد گھوڑے"(۱) یورپی سیاحوں کے مشاہدات سے کچھ مزید واقفیت حاصل کیجا سکتی ہے بشرطیکہ ہم مقابلے کا وہ معیار معلوم کر سکیں

(۱) یہ اقتباس پرتگالی ایشیا، مترجمہ اسٹیونس ا۔ ۴۱۵ سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے کہ اورکسہ سے مراد اڑیسہ ہے۔ بسناگر وجیانگر ہے۔ دہلی سے مطلب سلطنت مغلیہ ہے۔ اور کو سے غالباً کچھ مراد ہے جس کا حال سابقہ فصل میں لکھا گیا

باب ۱

جو ان کے دماغوں میں تھا۔ اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو کسی قدر غیر یقینی ہے کیونکہ مردم شماری کا طریقہ ابھی تک یورپ میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اور بعد کے لوگوں نے آبادی کے جو تخمینے کئے ہیں وہ کبھی کسی طرح پر بھی باہم مطابق نہیں ہوتے۔ شاید یہ کہنا خلاف انصاف نہیں ہے کہ جس زمانے کا ہم حال لکھ رہے ہیں اس وقت فرانس کی آبادی اپنی موجودہ مقدار سے تقریباً نصف تھی اور انگلستان کی آبادی غالباً صرف ⅕ تھی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مغربی یورپ کی حالت بہ حیثیت مجموعی ان کم و بیش وسیع حدود کے مابین تھی تو ہمیں اس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ حاصل ہو جاتا ہے کہ جس وقت ان سیاحوں نے مشرقی ممالک کے متعلق آبادی کی کثرت و قلت کا ذکر کیا تھا تو ان کے ذہنوں میں کیا معیار قائم تھا۔ ان کے مشاہدات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان کی آبادی موجودہ یورپ کے اندازے سے بڑی یا چھوٹی تھی بلکہ یہ آبادی اس یورپ کے مقابلہ میں بڑی یا چھوٹی تھی جس کی آبادی آجکل کے مقابلے میں نصف سے بھی بہت کم تھی۔

اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ کم از کم دو صدیوں تک تو وجیانگر کا علاقہ بہت کثرت کے ساتھ آباد تھا۔ کونٹی سنہ ۱۴۲۰ء کے کچھ ہی بعد لکھتا ہے کہ "لوگوں کی تعداد یقین سے بالاتر ہے"۔ ایرانی سفیر عبدالرزاق جو تقریباً اسی زمانے میں وجیانگر میں موجود تھا یہ لکھا ہے کہ اس سلطنت میں اس قدر کثیر آبادی ہے کہ اس کا کوئی اندازہ بیان میں آنا ممکن نہیں ہے۔ اور ایک صدی بعد پیس نے یہ رائے ظاہر کی کہ تمام ملک شہروں۔ قصبوں اور دیہات سمیت کثرت کے ساتھ آباد تھا۔ سنہ ۱۵۴۰ء کے قحط کے بعد جو ساحل کارومنڈل پر نہایت شدید تھا اس تعداد میں کچھ عارضی تخفیف ہو گئی ہو گی لیکن اس کے بعد ساٹھ سال کے دوران میں اس قسم کے نزول آفات کی کوئی کیفیت بھی نہیں ملتی ہے اور سنہ ۱۵۹۷ء کے قریب فرقۂ جسوئیٹ کے پادریوں کے مشاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیس نے جو کیفیت بیان کی تھی وہ اب بھی بہت کچھ قابل اطلاق تھی۔ منار میں موتیوں کی غوطہ گاہ نے جس کثیر مجمع کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اس کا اندازہ ۶۰۰۰۰ کیا جاتا ہے۔ اور پیمینٹا اور پیمین سا کے تذکروں کو پڑھکر یہ تصور ہوتا ہے کہ ملک کے کثیر التعداد قصبات میں جو مکمل طور پر باشندوں سے پُر ہیں۔ جہاں تک اس تنگ قطعۂ زمین کا تعلق ہے جو

(۱۱)

باب ۲

مغربی گھاٹ کے نیچے واقع ہے ایک کثیر آبادی کا وجود فرض کرلینا ضروری ہے تاکہ جو واقعات decadas میں منسج ہیں ان کی تشریح ہوسکے۔ مزید براں یورپی مورخین میں سے باربوسا ہمارے اس مروضے کی صریحاً تصدیق کرتا ہے۔

دکن کی سلطنتوں کے بارے میں بہت ہی تھوڑی شہادت ایسی ہے جو براہ راست ہمارے دور سے متعلق ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں روسی زائر سمی نکٹن نے چھوٹے قصبات کی تعداد پر اظہار رائے کیا اور کہا (اگر ترجمہ پر اعتماد کیا جائے) کہ "یہ زمین باشندوں سے بہت زیادہ بھر گئی ہے"۔ سولھویں صدی میں ایک طویل مدت تک ان سلطنتوں نے وجیانگر کے ساتھ ایک تلخ اور بالآخر کامیاب کشمکش جاری رکھی۔ لازمی طور پر وہ اس قابل ہوگئی کہ حسب ضرورت فوجوں میں بھرتی کرنے کے لئے اپنی اکثیر آبادی پر اعتماد کریں۔ اس کے علاوہ اکبر کی وفات سے نصف صدی بعد فرانسیسی سیاح تھیوونوٹ نے اورنگ آباد سے گولکنڈے تک آبادی کی کثرت دیکھی لیکن گولکنڈے سے جانب مشرق مچھلی پٹم تک آبادی کو قلیل پایا۔ دکن میں ٹیوورنیر کی سیاحتوں کے تذکرے سے ہمیں کثرت آبادی کا ایک عام تصور حاصل ہوجاتا ہے اور ہیرے کی کان پر لوگوں کے مجمعوں کا جو حال اس نے بیان کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس حصۂ ملک میں مزدوروں کی کوئی قلت نہیں تھی۔

جہاں تک سلطنت مغلیہ کا تعلق ہے ہمارے پاس ایسے اتفاقی اقوال کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو ان سیاحوں سے منسوب ہیں جنھوں نے چند خاص خاص راستوں پر سفر کیا تھا۔ سب سے پہلے ہم سورت سے آگرے تک کے سفر کو لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گجرات میں آبادی نہایت گنجان تھی۔ ڈی لاویل سورت کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "وہ بھی مثل دوسرے تمام شہروں اور مقامات کے بہت آباد ہے۔ ہندوستان میں ہر طرف باشندوں کی کثرت ہے"۔ یہ شخص ان مصنفین میں سے ہے جو لفظ ہندوستان کو نہایت تنگ معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں جو پرتگالیوں کا پسندیدہ طریق ہے اور اس کی سیاحتیں جانب شمال دور تک نہیں پھیلیں لیکن گجرات اور مغربی ساحل کے بارے میں اس کی شہادت ہمارے مفید مطلب ہے۔ فنچ نے سورت سے برہان پور تک کوچ کرتے ہوئے ایک شہر۔ سات

(۱۲)

باب ۱

"بڑے بڑے قصبات" اور تین اور "قصبات" شمار کئے۔ اور اس کی تحریروں کو پڑھکر ایک نہایت گنجان آبادی کا تصور ہوتا ہے۔ برہان پور سے جانب شمال گوالیار تک آبادی کم گنجان تھی۔ مالوے کے بعض حصے بلاشبہ بہت بڑھتے لیکن پلیٹو کے شمال اور جنوب دونوں جانب شکستہ حال ملک کا اکثر حصہ قریب قریب ویران تھا۔ اس کے علاوہ جو دوسرا راستہ میسر تھا وہ راجپوتانہ میں سے ہوکر گذرتا تھا اور شمال میں کم ازکم اجمیر تک تو وہ بالعموم غیر گنجان طریقے پر آباد تھا۔ اور ملک کے اس حصے میں سیاحوں نے کوئی قابل لحاظ بات نہیں پائی۔ برخلاف اس کے جو راستہ آگرے سے لاہور جاتا تھا وہ ایک نہایت گنجان آبادی میں سے ہوکر گذرتا تھا اور یہی کیفیت لاہور سے ملتان تک اور دریائے سندھ کے نیچے بھکر تک تھی۔ لیکن بھکر سے آگے سندھ کا اکثر حصہ غیر آباد تھا۔ یہاں بھی ایک راستہ اور موجود تھا جو ریگستان میں سے ہوکر اجمیر سے ٹھٹھہ کو جاتا تھا لیکن ملک کا جو حصہ ہمیں طے کرنا پڑتا تھا وہ حسب توقع یا تو غیر آباد تھا یا اس میں صرف خانہ بدوش قومیں رہتی تھیں۔

آگرے سے مشرق کی جانب جو راستے تھے ہمیں ان کے متعلق بہت کم واقفیت ہے۔ فنچ قنوج اور لکھنؤ میں سے ہوکر جونپور جانے کے لئے ایک راستے کا پتا دیتا ہے لیکن وہ ایک سماعی بات ہے اور ملک کی حالت پر اس سے بہت کم روشنی پڑتی ہے لیکن وہ بیان کرتا ہے کہ جونپور سے الہ آباد تک کی سڑک ایک مسلسل جنگل میں سے گذرتی تھی اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت آئندہ ظاہر ہوگی۔ فنچ نے چند سال پیشتر آگرے سے بنگال تک دریا کے ذریعے سفر کیا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ الہ آباد سے پٹنے تک ملک بہت آباد تھا۔ لیکن اس رائے کا اطلاق صرف دریا کے کنارے پر ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور کیفیت بہار اور صوبجات متحدہ کے مشرقی علاقے کے متعلق ہمیں نہیں مل سکی۔

یہاں تک تو ہم کو ملک کے مختلف حصوں میں آبادی کی کثرت کا ایک کم و بیش عام تصور حاصل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنگال۔ شمال مغربی میدان۔ گجرات (۱۳) اور جنوبی ہند۔ یہ حصے گنجان بلکہ بہت گنجان آباد تھے (بشرطیکہ ہم عصر اہل یورپ کے معیار سے اندازہ کیا جائے) جہاں تک بڑے بڑے شہروں کی وسعت کا تعلق ہے۔

باب ١

ممکن ہے کہ ہم صحیح حالت کے زیادہ قریب پہنچ جائیں۔ سیاحوں نے ہندوستانی شہروں کا مقابلہ دوسرے شہروں سے کیا جن سے وہ واقف تھے۔ اور گو اس طرح مقابلہ کرنے میں بڑی بڑی غلطیوں کا احتمال ہے تاہم اس بنا پر ان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا زمانۂ موجودہ ہی کی ایک مثال کو لیجئے۔ ہم کسی ایسے سیاح سے جو اعداد و شمار سے تیار نہ ہو یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ شمالی ہند کے بڑے بڑے شہروں کے مابین امتیاز کرے اس کو تو لاہور اور دہلی۔ آگرہ اور لکھنو سب تقریباً ایک ہی وسعت کے معلوم ہوں گے اس کے برعکس ایک معمولی ذہانت کا آدمی بھی یہ سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا کہ یہ سب مقامات اپنی آبادی کے لحاظ سے کلکتے اور بمبئی کے مقابلے میں بہت ادنیٰ اور جالندھر اور سہارنپور جیسے مقامات سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ہم بجا طور پر یہ خیال کر سکتے ہیں کہ پچھلے زمانے کے سیاح بھی اتنا ہی ٹھیک ٹھیک امتیاز کر سکتے تھے۔ عام طور پر وہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں کو یورپ کے سب سے بڑے شہروں کے ہم پلہ شمار کرتے تھے۔ چنانچہ جورڈین کہتا ہے کہ آگرہ دنیا کے بزرگ ترین شہروں میں سے ایک شہر تھا۔ کوریاٹ کہتا ہے کہ لاہور قسطنطنیہ سے بڑا تھا اور آگرہ اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کہ لاہور۔ پیلس کہتا ہے کہ وجیانگر اتنا بڑا تھا جتنا کہ روما۔ برنیئر (گو ہمارے دور سے کچھ بعد میں) کہتا ہے کہ دہلی پیرس سے کچھ کم نہیں تھی اور آگرہ دہلی سے بڑا تھا۔ رالف فچ کہتا ہے کہ آگرہ اور فتح پور سیکری اُن میں سے ہر ایک لندن سے بڑا تھا۔ مانسریٹ کہتا ہے کہ یورپ یا ایشیا کے کسی شہر کے مقابلے میں لاہور کا دوسرا نمبر نہیں تھا۔ اِن کے علاوہ اور سیاح بھی اسی طرح کی تشبیہات بیان کرتے ہیں۔ اب یورپ کے شہروں کی آبادی اِس زمانے میں کسی طرح ٹھیک ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے لیکن یہ کہنا قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ پیرس .... ۵ سے زیادہ باشندوں پر مشتمل نہیں تھا اور یہ کہ یورپ کے کسی اور شہر میں ..... ۲ سے زیادہ باشندے نہیں تھے۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے شہر غالباً ربع ملین سے نصف ملین تک کے معیار کے تھے اور یہ کہ کسی حال میں اُن کے باشندے اتنے کثیر نہیں تھے کہ انکا شمار ملین سے کیا جائے۔ (۱)

(۱) اِس زمانے میں یورپ کے شہروں کی آبادی پر ایک جرمن کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ لیواسیر نے پیرس کی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۷)

باب ۱

اس نتیجے سے خواہ وہ کتنا ہی موہوم سہی اتنا تو ضرور فائدہ ہوگا کہ اس زمانے میں جبکہ ہندوستان کے ساتھ آمد و رفت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی تھی یورپ میں جو مبالغہ آمیز خیالات پیدا ہوگئے تھے اور جو اب تک بھی کلیتہً رفع نہیں ہوئے ہیں ان کی تصحیح ہو جائیگی۔ سترھویں صدی کے وسط میں تھیونوٹ نے مشقت اٹھا کر ان میں سے بعض کہانیوں کی صحت کو جانچنے کی کوشش کی اور اُس نے جو نتائج اخذ کئے وہ عام طور پر اُس رائے کے موافق ہیں جو ابھی ظاہر کی گئی ہے۔ آگرے کے متعلق جو کہ ہندوستان کا غالباً سب سے بڑا شہر تھا وہ لکھتا ہے کہ وہ ایسا ہی آباد تھا جیسا کہ ایک بڑے شہر کو آباد ہونا چاہئے لیکن یہ قصہ جو اس زمانے میں مشہور تھا کہ وہاں سے ۲۰۰۰۰ مسلح آدمی مہیا کئے جا سکتے ہیں محض ایک مبالغہ تھا۔ اندرون شہر جو باغات تھے اُن سے وسعت کے متعلق غلط خیالات پیدا ہوتے تھے اور گلی کوچے اس قدر تنگ تھے کہ جب وہاں شاہی دربار موجود ہوتا تو اُن کا بھر جانا لازمی تھا گو دوسرے اوقات میں وہ خالی رہتے تھے۔ اسی طرح دہلی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے وہ ان لوگوں کی تعداد پر زیادہ زور دیتا ہے جو دربار میں رہتے تھے۔ اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دربار کے بغیر اس شہر کی بہت کم اہمیت تھی۔ اگر بادشاہ کی موجودگی میں آبادی کی تعداد ۴۰۰۰۰۰ ہوتی تھی تو جب بادشاہ کہیں اور ہوتا تھا تو یہ تعداد پہلے سے بھی کم رہ جاتی ہوگی۔ سترھویں صدی میں جس قسم کی مبالغہ آمیز باتیں کی جاتی تھیں ان کی مثال ایک واقعے سے ملتی ہے جس کو مختلف مصنفین نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ بنگال میں شہر گور کے اندر ۱۲۰۰۰۰۰ مکانات شامل تھے اور یہ ایک ایسی تعداد ہے جس سے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۶) آبادی کے متعلق کئی قسم کے تخمینے بیان کئے ہیں جن سے بہ حیثیت مجموعی یہ پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۶۰۰ء میں انتہائی تعداد ۴۰۰۰۰ تھی۔ گریگوروئس اپنی کتاب "تاریخ شہر روما در قرون وسطی" (ترجمۂ ہملٹن viii - ۲۰۷) میں ایک تخمینہ کا حوالہ دیتا ہے جس کو بظاہر وہ خود بھی تسلیم کرتا ہے۔ اس تخمینہ کے مطابق روما کی آبادی سنہ ۱۵۲۰ء میں ۸۵۰۰۰ بتائی گئی ہے۔ پیس نے وجیانگر کا جو حال بیان کیا ہے اس کی بھی تقریباً وہی تاریخ ہے۔ پیس یہ بھی بیان کرتا ہے (سیول صفحہ ۲۹۰) کہ وجیانگر میں ۱۰۰۰۰۰ سے زیادہ مکانات تھے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آبادی نصف ملین یا کچھ زیادہ تھی اور صحیح تعداد بھی غالباً اتنی ہی اعداد کے درمیان تھی۔

باب ۱

موجودہ لندن کے قریب قریب آبادی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پچھلی صدی میں
بیروس نامی پرتگالی واقعہ نگار نے اس کی آبادی ۲۰۰۰۰۰ بیان کی تھی اور چونکہ اس
عہد میں اس شہر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی لہذا یہی نتیجہ نکالنا مناسب ہے کہ بعد کے قصبے میں
مکانات کی جو تعداد ظاہر کی گئی ہے وہ یا تو ایک بے سروپا مبالغہ تھا یا جو مختلف
دار الخلافتیں اس کے پڑوس میں موجود تھیں ان سب کے کھنڈر بھی اس میں شمار کرلئے
گئے تھے۔ بہرحال ہمیں ایسے کوئی معقول وجوہ نہ مل سکے جن کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا جائے
۱۵ کہ ہندوستان کے کسی شہر میں دائمی طور پر نصف ملین کے برابر آبادی ہوگی۔ یہ امر
بیشک مطابق قیاس ہے کہ سپاہیوں یا زائرین کی درآمد کے باعث عارضی طور پر
لوگوں کی اس سے بھی زیادہ تعداد جمع ہو جائے جیسا کہ آجکل بھی واقع ہوتا ہے
لیکن جہاں مقصود باہمی مقابلہ کرنا ہو وہاں اس قسم کے اتفاقی امور کو نظرانداز کردینا
چاہیئے۔ موجودہ الہ آباد کی آبادی صحیح طور پر ۲۰۰۰۰۰ سے کم شمار کی جاتی ہے
حالانکہ کسی مذہبی تقریب پر وہاں ایک ملین سے بھی زیادہ لوگ جمع ہو سکتے ہیں
پس پچھلے زمانے میں ہندوستانی شہروں کی آبادی کا اندازہ کرتے وقت یہی
بنیاد اختیار کرنی چاہیئے۔

لہذا شہری آبادی کی وسعت کا ایک عام تصور اُن تفصیلات سے حاصل
ہو جاتا ہے جو ہمیں میسر ہیں۔ اب جہاں تک زرعی آبادی کا تعلق ہے اس مسئلے کی
نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کا فیصلہ اس قسم کی باتوں کو پیش نظر رکھکر نہیں کیا جاسکتا
بلکہ اس بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی اور طرف
نظر ڈالی جائے تاکہ جو مبہم نتائج ہمیں پہلے ہی سے حاصل ہو چکے ہیں ان میں کچھ مزید
صحت و تعین پیدا ہو سکے۔ اس قسم کی واقفیت دو ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے
یعنی فوجوں کی تعداد اور کاشت کی وسعت۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پہلے
ذریعے سے تو ہم جنوبی ہند کا کچھ حال معلوم کر سکتے ہیں اور دوسرے ذریعے سے
شمالی ہند کی صورت حال پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اب ہم علی الترتیب ان دونوں
ذرائع کی تحقیق کریں گے۔ لیکن ابتداہی میں یہ بات ضروری ہے کہ ان تخمینوں نیز
اسی طرح کے دوسرے تخمینوں میں جن کا ذکر آئندہ بابوں میں آئے گا کس حد تک

باب ا

صحت موجود ہو گی اس کے متعلق کچھ تنبیہ کر دی جائے اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر کسی قدر اعداد و شمار ضرور قلمبند کئے گئے تھے لیکن اصلی تحریریں ہماری دسترس سے باہر ہیں اور بسا اوقات ہم نہیں جانتے کہ وہ کس بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں۔ عام طور پر ہمیں ثانوی اور جزئی شہادت پر قناعت کرنا پڑتی ہے جو محصر کتابیں مصنفین کے بیان کردہ واقعات کی شکل میں موجود ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ ان لوگوں نے اعداد میں غلطی کی ہو یا ان کی حقیقی اہمیت کے سمجھنے میں انھیں دھوکا ہوا ہو۔ ہم تو ان کے بیانات کی تعبیر صرف مفروضات کی مدد سے کر سکتے ہیں لیکن خود یہ مفروضات اشتباہ سے بالکل پاک نہیں ہوتے۔ ہم بمشکل کبھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں نتیجہ یقینی ہے یا فلاں عدد بلا شک و شبہ صحیح ہے۔ ہمیں تو قرائن کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور وہ حدود تلاش کرنا پڑتے ہیں جن کے مابین اصلیت واقع ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اور معلومہ مفروضات۔ اور نتائج سب پر مساوی حقیقت سے نکتہ چینی کی جا سکتی ہے اور اگر کسی وقت یہ ظاہر ہو کہ ہم تعداد یا مقدار کے معاملات میں زیادہ بھروسے کے ساتھ کوئی بات بیان کر رہے ہیں تو ناظرین کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس احتیاط کا اطلاق شروع سے آخر تک ہوتا ہے اور یہ کہ ہم زمانۂ جدید کے اعداد و شمار والی معلومات کی وسیع سڑک پر سفر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسے جنگل میں راستہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں ابھی تک انسانوں کے قدم نہیں پہونچے ہیں۔

۱۲

جنوبی ہند میں تعداد افواج کے متعلق جو خبریں ہمارے پاس موجود ہیں وہ مسٹر سیویل کی بیان کی ہوئی ہیں جو بغیر کوئی عددی تخمینہ دیئے ہوئے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "تمام واقعہ نگاروں کو یہ یقین تھا کہ اگر بادشاہ وجیانگر چاہے تو لا تعداد مسلح اشخاص کو میدان میں اُتار سکتا ہے۔ غالباً یہ سب کے سب اچھی طرح مسلح یا ٹھیک طریقے پر تربیت یافتہ یا خوب قواعد داں نہ ہوں گے لیکن جہاں تک کثرت تعداد کا تعلق ہے اس میں کوئی معقول شبہ نہیں ہو سکتا"۔ جن بیانات پر یہ نتیجہ مبنی ہے وہ دو شعبوں میں منقسم ہوتے ہیں؛ بعض مستند مصنفین تو وجیانگر کی فوج کی کوئی برائے نام تعداد بتا دیتے ہیں اور بقیہ وہ تعداد بتاتے ہیں جو خاص خاص مواقع پر درحقیقت میدان میں موجود تھی اور جو شہادت ان دو عنوانوں کے تحت موجود ہے وہ بہ حیثیت

باب

مجموعی کافی طور پر مضبوط ہے۔ پانچ مصنف جن میں سے کم از کم چار تو آزاد تصور کئے جا سکتے ہیں فوج کی تعداد برائے نام تقریباً ایک ملین بتاتے ہیں لیکن ان میں سے دو اس قدر اور اضافہ کر دیتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو اس میں دو ملین تک اضافہ کیا جا سکتا ہے اب یہ ممکن ہے کہ اس طرح کے مکمل اعداد محض وہم و گمان پر مبنی اور اصلیت سے بالکل غیر متعلق ہوں لیکن ہمارے نزدیک یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ ایک مشہور و معروف واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ فوج کے بہت بڑے حصے کی تنظیم حصہ بندی کے طریق کے مطابق عمل میں آتی تھی۔ جس کی کسی آئندہ باب میں تشریح کی جائیگی۔ ہر شاہی افسر بہ طور شرط خدمت کے اس امر پہ مجبور تھا کہ عند الطلب سپاہیوں کی ایک معینہ تعداد بہم پہونچائے اور جو بیانات ہمارے زیر غور ہیں ان کی معقول ترین تشریح یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان فوجیوں کی مجموعی تعداد کاغذ پر تقریباً ایک ملین تک پہنچتی تھی اور یہ ایک ایسی بات تھی جو شہر میں عام طور پر معلوم تھی پس جتنے بھی اجنبی آتے تھے وہ اپنے سوالات کا تقریباً ایک ہی جواب پاتے تھے۔

اب رہا اس تعداد کو دگنی کرنے کا امکان یہ اُن اشخاص کی طرف سے اضافہ تھا جنھیں سلطنت کی شہرت و نیک نامی کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تشریح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک لاکھ فوج کبھی درحقیقت میدان میں اتری تھی۔ نونز ہم سے کہتا ہے اور ہم بھی یہ گمان کر سکتے ہیں کہ بعض افسر اپنی اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے جو تعداد مطلوب ہوتی تھی اس سے کم سپاہی رکھتے تھے پس ہمیں چاہئے کہ ایک ملین کی تعداد کو بطور ایک نظری حد کے تصور کریں جو شاید ملک کی قدرت ۱۷ سے تو زیادہ نہیں تھی لیکن جس کا کسی خاص فوج کشی کے موقعے پر میدان میں موجود ہونا خلاف قیاس تھا۔ نقل و حرکت کرنے والی فوجوں کی حقیقی تعداد کے متعلق جو کچھ تفصیلی خبریں ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ۱۵۲۲ء میں فوجوں کی صف آرائی کی کیفیت نونز نے جس مکمل طریقے پر بیان کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کو واقفیت حاصل کرنے کے لئے تفصیلی ذرائع میسر تھے۔ وہ اصلی فوج کے گیارہ علیحدہ علیحدہ حصوں کا ذکر کرتا ہے جن کا مجموعہ ۶۰۰۰۰۰ آدمیوں سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ۱۰۰۰ یا ۱۲۰۰ آدمیوں کے دوسرے رسالے تھے نیز ایک

باب ۱

نہایت زبردست دستہ ہراول کے طور پر موجود تھا۔ اس لحاظ سے ....۶۵ آدمی یا یوں کہئے کہ سلطنت کی حملہ برائے نام تعداد کا دو تہائی حصہ ایک نہایت ہی نازک موقع پر صف بستہ کر دیا گیا تھا۔ چالیس سال بعد تیلیکوٹ کے موقعے پر جبکہ سلطنت کو اس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ درپیش تھا ہمیں پرتگالی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی تعداد ...... ۷ تھی اور یہ ایک ایسی تعداد ہے جو آخری فوج کشی کے متعلق مسٹر سیوول کی بیان کردہ کیفیت سے عام طور پر منطبق ہوتی ہے۔ جبکہ کل فوج نے تین حصوں میں کوچ کیا تھا یعنی .....۱۲ سپاہیوں کا ایک ہراول۔ پھر ایک اور "بڑی فوج" اور پھر سلطنت کی جملہ "قوت"۔ ان آزادانہ بیانات سے فوجی تنظیم کا جو خیال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ اُن تمام معلومات کے مطابق ہے جو جنوبی ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت اور اس کے کاروبار کے متعلق ہمیں حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اُس تعلق کے بھی مطابق ہے جو وعدہ اور ایفائے وعدہ کے درمیان اُس زمانے میں مروج تھا۔ بالفاظ دیگر ایک بڑی فوج کا اہتمام کیا جاتا تھا اور نازک ترین مواقع پر تو شاید ہر تین مردوں میں سے دو صف بستہ کر دیئے جاتے تھے اور یہ غالباً اس وجہ سے کہ بعض رسالے حاضر نہیں ہوتے تھے اور بقیہ رسالوں کی تعداد ذمہ داری کی حد سے بہت کم ہوتی تھی (۱)

(۱) ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ٹالیکوٹ کے موقعے پر بادشاہ کے ذاتی سپاہی تقریباً پوری تعداد میں موجود تھے لیکن یہ سپاہی کل فوج کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ہوتے تھے۔ ذاتی سپاہیوں کی وہ تعداد جو چالیس سال قبل رائچور پر حملہ کرتے وقت کام میں لائی گئی تھی وہ ...۶۰۰ تھی۔ لیکن یہ ایک چیدہ قوت تھی (سیوول۔ ۳۲۷) اور مجموعی تعداد غالباً.....۱ کے قریب تھی جیسا کہ باربوسا نے بیان کیا ہے (صفحہ ۳۰۰) مسٹر لانگورتھ ڈیمس نے اس عبارت کا جو ترجمہ کیا ہے اُس میں وہ بیان کرتا ہے کہ اس عدد سے تربیت یافتہ فوج کی مجموعی تعداد ظاہر ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذاتی سپاہیوں سے متعلق ہے یعنی وہ سپاہی جن کی تنخواہ راست بادشاہ ادا کرتا تھا نہ کہ وہ جن کی تنخواہیں امراء ادا کرتے تھے۔ باربوسا (صفحہ ۳۰۰) کہتا ہے کہ یہ تعداد بادشاہ کی خدمت میں ہمیشہ رہتی تھی"۔ اور آگے چلکر (صفحہ ۳۰۶) وہ کہتا ہے کہ جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو یہی تعداد اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ وجیانگر کے تذکرہ میں امراء کے مہیا کئے ہوئے رسالوں کا وہ حوالہ نہیں دیتا۔

باب ۱

۱۸

دکن کی حریف فوجوں کے متعلق اسی طرح کے معلومات میسر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی کثیر التعداد ہی ہونگی کیونکہ انھوں نے اتنے سال تک کشمکش جاری رکھی اور بالآخر ایک فیصلہ کن نتیجہ حاصل کی۔ لیکن خاص خاص لڑائیوں کے جو غیر مکمل حالات ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مائل ہیں کہ شمالی فوجوں کی تعداد بالعموم کم ہوتی تھی اور یہ کہ اُن کی کامیابی کچھ تو ان کے سواروں کے زبردست رسالوں اور کچھ اُن کی اعلیٰ مہارت کا نتیجہ تھی۔ جنگ تالیکوٹ کا جو حال پرتگالیوں نے بیان کیا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ دکن کی تعداد وجیانگر سے نصف تھی۔ اور یہ تناسب بجائے خود بھی خلاف قیاس نہیں ہے۔ لیکن حملہ آور فوجوں کو اپنے مرکزوں سے موقعۂ جنگ تک کوچ کرنے میں جو نقصانات اٹھانا پڑتے تھے ان کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ پس دکن اور وجیانگر کو ملاکر یہ نتیجہ اخذ کرنا خلاف عقل نہیں ہے کہ ہندوستان کے اس حصے سے تقریباً ایک ملین آدمی فی الواقع میدان میں اُتارے جا سکتے تھے گو ایک طویل مدت تک اس تعداد کو برقرار رکھنا امکان سے باہر تھا اور اس تعداد کی فوجوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے ملک کے مردوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے کیونکہ وجیانگر کے بارے میں جو تعداد دیئے گئے ہیں وہ کثیر تعداد خدمتگاروں (Camp followers) کی خارج ہے اور مزید برآں جس قدر برہمن۔ تجار اور دستکار تھے وہ سب فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے اور یہ طبقے بحیثیت مجموعی آبادی کا بہت بڑا جزو ہوتے تھے۔ جس رقبے سے یہ فوجیں جمع کیجاتی تھیں اس میں مدراس پریزیڈنسی اور بمبئی پریزیڈنسی (باستثنائے سندھ) کا بہت بڑا حصہ اور میسور اور حیدرآباد کی ریاستیں شامل تھیں اور آخری مردم شماری کے مطابق اس رقبہ میں ساٹھ اور ستر ملین کے درمیان آبادی موجود تھی[1]۔ سوال یہ ہے کہ جو دور ہمارے زیرغور ہے اُس میں اس رقبے کی آبادی کی کیا تعداد تھی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ایسا کوئی مواد موجود نہیں ہے جس سے براہ راست یہ ظاہر ہوگا کہ اُن حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر رائج تھے ایک معینہ آبادی سے

(۱) جدید انتظامی اکائیوں (units) کے مطابق جن کے لحاظ سے آبادی تقسیم کی گئی ہے اس رقبہ کی ٹھیک ٹھیک صراحت کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ یہ تعداد انہی حدود کے مابین واقع ہوتی ہے۔

باب

کس قدر فوج تیار کی جا سکتی تھی ۔ اور جہاں تک یورپ کی تشبیہات کا تعلق ہے اُن کے استعمال میں کسی قدر احتیاط کی ضرورت ہے ۔ لیکن اس قدر تو یقین ہے کہ اس بارے میں یورپ کے تازہ ترین تجربے کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہئیے ۔ دنیا نے اب معلوم کر لیا ہے کہ جملہ آبادی کے چھٹے حصے کے برابر فوج مسلح کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس کے لئے کئی سال تک ترقی یافتہ تنظیم کی ضرورت ہے اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ ایسی قلیل المہلت اور فوری فوج کشیوں میں جیسی کہ ہندوستان میں ہوا کرتی تھیں اس قسم کا کوئی تناسب حاصل کیا جا سکے ۔ اس سے قریب تر مشابہت کے لئے اُس تعداد پر نظر ڈالنا چاہئیے جس کو جنگ چھڑتے ہی متحرک کرنے کے لئے یورپ کی ریاستیں تیار تھیں مطبوعہ اعداد کے موافق ۱۹۱۴ء سے قبل فرانس نے منجملہ ۱۲ کے ایک کو اور جرمنی نے منجملہ ۴۲ کے ایک کو متحرک کرنے کا انتظام کیا تھا پس اگر دکن اور وجیانگر میں فوجی بھرتی کا انتظام ایسا ہی کارگر اور عمدہ تھا جیسا کہ موجودہ فرانس اور جرمنی کا ہے تو ان کی متفقہ ایک ملین تعداد کا یہ مطلب ہوگا کہ آبادی تقریباً تیس ملین تھی ۔ اور اگر انتظام کی عمدگی کم تھی تو آبادی اور بھی زیادہ ہوگی ۔ ہندوستان میں اس زمانے میں انتظام کی خوبی کس حد تک پہنچ چکی تھی ۔ اس کا انحصار کلیتہً قیاس پر ہے ۔ ایک طرف تو حصہ رسدی کے طریق کا منشا یہ تھا کہ سپاہیوں کی طلب ملک کے تمام حصص پر منقسم ہو جائے اور یہ امر خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی حالت کا کوئی اعلیٰ معیار مطلوب تھا ۔ لیکن دوسری طرف جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مستثنیٰ طبقوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ اور ہم ذاتی طور پر تو بمشکل یہ یقین کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی طریق ان دونوں میں نسبتاً زیادہ کارگر اور عمدہ ہو سکتا ہے ۔ بہر حال اگر ہم اس نتیجے کو تسلیم کریں کہ دکن اور وجیانگر دونوں مل کر تخمیناً ایک ملین سپاہی میدان میں اتار سکتے تھے تو ہمیں اس بات سے اتفاق کرنا چاہئیے کہ ان کے پاس تیس ملین سے زائد (یا موجودہ تعداد کی تقریباً نصف) آبادی تھی ۔ لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں تک سپاہیوں کی بھرتی کا تعلق ہے ان کا فوجی نظام موجودہ یورپ کے مقابلے میں زیادہ کارگر تھا ۔ ظاہر ہے کہ جن واقعات پر یہ نتیجہ مبنی ہے وہ اُس دور سے حاصل کئے گئے ہیں جس کا خاتمہ ۱۵۶۵ء کی جنگ ٹیلیکوٹ پر ہوتا ہے ۔ لیکن جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے ۔ اُس

۱۹

ب تاریخ کے اور ختم صدی کے مابین کسی خطرناک مصیبت کا کوئی اندراج نہیں ہے اور چونکہ ملک کی آبادی کو گنجان نہیں کہا جا سکتا (کیونکہ اُس وقت اس کی آبادی موجودہ آبادی سے صرف نصف تھی) لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا حق بجانب نہ ہوگا کہ اس دوران میں تعداد گھٹ گئی تھی۔ بلکہ زیادہ معقول نتیجہ تو یہ ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہوگا۔

۲۰ پس جو کچھ واقفیت ہمیں حاصل ہے اُس سے ہماری رائے میں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جنوبی علاقوں کی آبادی کم از کم تیس ملین بلکہ غالباً اس سے بھی زیادہ تھی۔ شمالی ہندوستان کے متعلق اسی طرح کا کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا اور اس کے لئے یہ وجہ کافی ہے کہ مغل فوجوں کی تعداد نامعلوم ہے۔ اکبر کو کم از کم اپنے آخری زمانے میں تو اس بات کا موقع ہی نہیں ملا کہ اپنی پوری فوج میدان میں اتار دے۔ بلاشبہ اکثر وبیشتر بر سر پیکار رہتا تھا لیکن یہ کارروائیاں زیادہ تر ثانوی نوعیت کی ہوتی تھیں جن سے اُس کی پوری فوجی طاقت کا اندازہ کرنا ایسا ہی ناممکن تھا جیسا کہ موجودہ زمانے میں سرحد کی مہموں کو دیکھکر برطانوی ہند کی پوری فوجی قوت کا تخمینہ ناممکن ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کی فوجی تنظیم کے متعلق آئین اکبری میں بہت کچھ مواد موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کیفیت مکمل نہیں ہے اور ان تمام اعداد پر غور کرنے کے بعد جو ابوالفضل نے مہیا کئے ہیں ہم اپنے آپ کو مسٹر ارون کے اخذ کردہ نتیجہ سے اتفاق کرنے پر مجبور پاتے ہیں یعنی یہ کہ فوج کی تعداد کا کوئی ٹھیک تخمینہ نہیں کیا جا سکتا لیکن شمال کے بارے میں واقفیت کا ہمیں ایک دوسرا ذریعہ حاصل ہے جس کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے۔ کیونکہ آئین اکبری میں جو اعداد وشمار محفوظ ہیں اگر ان کی صحیح طریقے پر تشریح کی جائے تو وہ اس بات کے لئے کافی ہیں کہ اُن سے سلطنت مغلیہ کے اُن صوبوں میں جہاں تشخیص مالگزاری کا دستور العمل موثر طور پر نافذ کر دیا گیا تھا وسعت کاشت کا ایک عام تصور حاصل کیا جائے۔ بدقسمتی سے ابھی کسی نے تحقیق کے ساتھ ان اعداد وشمار کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ لہذا ہم اُن اعداد کے متعلق جو شمالی ہند کے ایک حصے سے متعلق ہیں صرف اپنی ذاتی تشریح پیش کر سکتے ہیں ہمارے نتائج حسب ذیل طریقے پر بیان کئے جا سکتے ہیں۔

(ا) صوبہ جات متحدہ کے مغربی حصے (جس سے مراد وہ رقبہ ہے جو ایک طرف دریائے جمنا اور دوسری طرف بریلی اور آگرے کے خط واصل کے مابین واقع ہے) کے بارے میں جو

اعداد و شمار موجود ہیں اُن کے تفصیلی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آباد علاقے میں زیر کاشت رقبہ موجودہ معیار کے تقریباً تین چوتھائی تھا۔ گنگا اور جمنا کے درمیانی خطے میں جو دوآب کہلاتا ہے ⅚ اور روہیلکھنڈ یعنی گنگا کے مشرقی علاقے میں تقریباً ½ کا تناسب تھا۔ مستقل کاشتکاری کا رقبہ نسبتاً کم تھا کیونکہ جیسا کہ سابقہ فصل میں بیان کر دیا گیا ہے ہمالیہ کے جنگلات کی حد بہ مقابل اِس زمانے کے اُس وقت گنگا سے قریب تر تھی لیکن دوآب و نیز وہ قطعۂ زمین جو گنگا کے بائیں کنارے پر واقع ہے تقریباً مکمل طور پر بھرے ہوئے تھے۔

(۲) پنجاب کے اعداد و شمار پر ایک عام نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوآب میں جو زراعت کی گنجائش تھی وہ جانب مغرب دریائے جمنا کے اُس پار کم از کم لاہور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے برعکس جنوبی اور مغربی پنجاب بہت کم آباد تھے۔

(۳) صوبہ جات متحدہ کے حصۂ متوسط کے بارے میں جو اعداد و شمار موجود ہیں ان میں ایسی مشکلات پیدا ہوتی ہیں جن پر ہم ابھی تک غالب نہیں آسکے۔ لیکن اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوآب میں آگرے سے جانب مشرق کاشت بہت سرعت کے ساتھ گھٹ رہی تھی۔

(۴) انھیں صوبجات کے مشرق میں گھاگرا کی شمالی کاشت کی مقدار بہت تھوڑی تھی۔ اور گھاگرا اور گنگا کے درمیان الہ آباد اور فیض آباد کے مابین ایک خط واصل کے مشرقی جانب تناسب ⅕ سے کم تھا۔

(۵) بہار کے اعداد کی ایک عام تحقیق کی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ⅕ کا یہ تناسب مونگیر تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس نقطے پر پہنچکر اعداد و شمار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کاشت کی کثرت کو کثرت آبادی میں مبدل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ باب میں ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ پہلے ہی بیان کر دیا جائے۔ یعنی یہ کہ گو بہت سی جزئی تبدیلیاں ہوئی ہیں تاہم ہندوستانی نظام زراعت کے خاص خاص امور گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں وہی رہے ہیں اور اِس وجہ سے جو رقبہ زیر کاشت لایا جاتا ہے اُس سے زرعی آبادی کی تعداد کا ایک سرسری تخمینہ ہو جاتا ہے۔ اگر عارضی طور پر یہ نتیجہ تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنگا کا مغربی میدان اکبر کے زمانے میں بھی

باب ۱

تقریباً ایسا ہی باشندوں سے پُر تھا جیسا کہ وہ اب ہے اور اس وجہ سے اگر سولھویں صدی کے یورپین معیار سے جانچا جائے تو وہ بہت ہی گنجان طور پر آباد تھا۔ اس کے برعکس گنگا کا مشرقی میدان بنگال کی سرحد تک موجودہ حالت کی طرح کوئی گنجان رقبہ نہیں تھا بلکہ اس سے موجودہ آبادی کے صرف ½ حصے کی پرورش ہوتی تھی۔ ہم پہلے ہی معلوم کر چکے ہیں کہ اول الذکر رقبے کے جس حصے میں یورپین سیّاح پہنچتے تھے۔ اس میں انھوں نے ایک نہایت گنجان آبادی دیکھی تھی۔ دوسری طرف یہاں ہمیں اس کیفیت کی تشریح مل جاتی ہے جو فنچ سے بیان کی گئی تھی۔ یعنی یہ کہ جونپور سے الہ آباد تک کی سڑک ایک لگاتار جنگل میں سے ہو کر گذرتی تھی۔ نیز اس واقعے کی جو اکبر نامے میں درج ہے گھاگرا کے جنوبی کنارے سے ملے ملے ایک کوچ کے دوران میں جنگلات طے کئے گئے اور مختلف عجیب عجیب درندے دیکھے گئے۔ یہی علاقہ اب اعظم گڈھ کے گنجان ضلع کی شکل میں موجود ہے پس جو نتائج اس عصر کے اعداد و شمار سے اخذ کئے گئے ہیں وہ کلیتہً غیر مصدقہ نہیں ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اگر اس دور کے لٹریچر کا مزید مطالعہ کیا جائے تو اسی نوعیت کے اور بیانات بھی بہم پہنچائے جا سکیں۔

اب اگر ہم ان نتائج کو گذشتہ مردم شماری کے اعداد پر منطبق کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ملتان سے مونگیر تک شمالی میدانوں کی آبادی اس دور میں جس سے یہ اعداد شمار متعلق ہیں، ۳۰ ملین سے خاصی زائد اور غالباً ۴۰ ملین سے کم تھی[1]۔ اس طرح شمالی اور جنوبی رقبوں کو ملا کر ہمیں بہر صورت ۶۰ ملین سے زائد آبادی نظر آتی ہے لیکن اس میں دو گنجان علاقوں یعنی بنگال اور گجرات کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور نہ نسبتاً کم آباد دکھن

(۱) اعداد و شمار کی تاریخ کا قطعی طور پر یقین نہیں ہے۔ لیکن وہ ۱۵۹۶ء کے قحط سے پہلے کے ہیں۔ اس قحط سے شمالی مغرب میں بہت سخت ہلاکت واقع ہوئی تھی اور اس وجہ سے آبادی ختم صدی پر بمقابل اس تعداد کے جو ان اعداد سے ظاہر ہوتی ہے لازمی طور پر کم ہوگی۔ یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس قحط سے ملک کا کس قدر وسیع حصہ متاثر ہوا تھا لیکن ہم خیال کرتے ہیں کہ جہاں تقریباً ۴۰ ملین حق بجانب ہوتے وہاں صرف ۳۰ ملین سے کچھ زائد شمار کر کے ہم نے اُسے کافی طور پر گھٹا دیا ہے۔ ہم ایسی کوئی بات نہیں معلوم کر سکے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ قحط بنگال یا گجرات تک پھیلا ہو۔

وسیع درمیانی رقبے کے کسی حصہ کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور اگر ان خارج شدہ خطوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان میں کم و بیش کم از کم ... ملین باشندے موجود ہوں گے جو اُس تمام جد و جہد میں مشغول رہتے تھے جس کا اظہار ہم عصر مصنفین نے کیا ہے۔ مجرد یہ تعداد بہت بڑی ہے اور اُس زمانے میں یورپ کے مشاہدہ کرنے والوں کو تقریباً ناقابل یقین معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں اسی رقبے کے اندر جو آبادی تھی اُس کے مقابلہ میں وہ صرف ایک تہائی ہے۔ اس سے بھی زائد تعداد کی موافقت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جا سکتی تھیں لیکن امور معلومہ کی نوعیت ہمیں اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ ہم غیر معین تخمینوں ہی پر قناعت کریں اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم مجموعی آبادی ... ملین فرض کر لیں تو کوئی بڑی غلطی کا خطرہ نہیں رہیگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد غور و احتیاط کے ساتھ شمار کرنے سے حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ جملہ واقعات متعلقہ پر جو ہمیں حاصل ہیں غور کرنے سے مطابق قیاس معلوم ہوتی ہے۔

فصل سوم

آبادی کے طبقے

جس آبادی کی تعداد کا حال معلوم کرنے کی ہم نے اب تک کوشش کی وہ ایک ہی قسم کے لوگوں پر مشتمل نہیں تھی۔ سب سے بڑی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان لوگوں میں ذات پات کا طریقہ جس طرح آجکل موجود ہے قریب قریب اسی طرح اس زمانے میں بھی موجود تھا۔ ذاتوں اور نسلوں کے اختلافات کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ اس زمانے کے سیاح بنیوں اور گجراتیوں کو برہمنوں اور راجپوتوں کے مقابلے میں بالکل جداگانہ ”قومیں“ تصور کرتے ہیں۔ بیکھ اس زمانے میں ہندوؤں ہی کا ایک طبقہ خیال کئے جاتے تھے اور معاشی نقطۂ نظر سے تو جنوب کے عیسائی بھی ضروری امور میں بہ ظاہر انھیں لوگوں کے مشابہ سمجھے جا سکتے ہیں جن کے درمیان وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہودی اور آرمینی تعداد میں تو بہت کم تھے لیکن تجارتی زندگی میں کافی اہمیت رکھتے تھے۔ پارسیوں کی حیثیت پورے طور پر واضح نہیں ہے۔ ~~سنہ~~ ۱۶۱۶ء کے قریب اپنے تجربات کا حال تحریر کرتے ہوئے ٹیری کہتا ہے کہ ”ان کا پیشہ عام طور پر ہر قسم کی کاشتکاری ہے۔“ اس کے کچھ زمانے کے بعد منڈی ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ کھجور کے درختوں کی کاشت کرتے ہیں۔ اور ماننریٹ تو ان میں (اور اپنے قول کے مطابق) بنیے دینوں کے بقیہ انبوہ میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ ہمارے خیال میں اس انبوہ سے ماننریٹ کا منشا ملک کی معمولی ہندو آبادی ہے جو نوساری کے اطراف واکناف میں رہتی تھی اور جن کے درمیان پارسی اس زمانے میں بسے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس تھیونٹ کے زمانے میں سورت جیسے مخصوص تجارتی شہر میں یہ لوگ بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور سولھویں صدی کے وسط میں گرینشیا ڈا اورٹا

باب ۲

کیمبے اور بسین میں بعض پارسیوں کو تاجروں کی حیثیت سے جانتا تھا جن کے متعلق اس کا بیان ہے کہ پرتگالی ان لوگوں کو یہودی خیال کرتے تھے۔ اس لیے بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں زراعت کو چھوڑ چھوڑ کر تجارتی زندگی کی طرف مائل ہو رہے تھے جس میں انھوں نے بعدازاں ایسی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔

آبادی کے دو اور جزو یعنی مسلمانوں اور پرتگالیوں پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہمیں چاہئیے کہ ساحل کے عربوں اور ایرانیوں اور شمالی ہند کے باشندوں میں امتیاز نہ کریں۔ اور پھر آخر الذکر کے بھی دو اور حصے ہونا چاہئیں۔ ایک تو وہ باشندے جو قدیم سے بسے ہوئے تھے اور دوسرے وہ لوگ جنھوں نے حال میں سکونت اختیار کی تھی۔ ۱۵۰۰ء کی ماسبق صدیوں میں عربوں اور ایرانیوں نے مزمبق سے لیکر آبنائے ملاکا تک پورے بحیرۂ ہند کی بحری تجارت میں ایک زبردست حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کے دونوں جانب بندرگاہوں پر جہاں جہاں وہ مقامی حکام کو فراہم کرسکے انھوں نے اپنی بستیاں قائم کر لی تھیں اور خود ان حکام کے نزدیک ان کی تجارت کی قدر اتنی زیادہ تھی کہ وہ عام طور پر خوشی کے ساتھ رکھے جاتے تھے اور کم از کم چند مقامات میں تو انھیں خاص خاص مراعات حاصل تھیں۔ ان بستیوں کی مسلمان آبادی سب کی سب دیسیوں کی نہیں تھی اور نہ اس کا کوئی بڑا حصہ پردیسیوں پر مشتمل تھا۔ یہ تجار ابتدا میں تو تجارت کی غرض سے آئے تھے لیکن انھوں نے اسی کے دوش بدوش اپنے دین کے مفاد کو نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ بندرگاہوں پر جہاں ان کی زیادہ آمد و رفت رہتی تھی تو مسلموں کی چھوٹی بڑی جماعتیں پائی جاتی تھیں جو آپس کے شادی بیاہ و نیز باشندگان ملک کے ساتھ بے قاعدہ اختلاط کے باعث بہت بڑھ گئی تھیں۔ سولھویں صدی کے اوائل میں پرتگالیوں نے ان مسلمانوں سے وہ زبردست تفوق چھین لیا جو انھیں بحیرۂ ہند میں حاصل تھا لیکن ان کو تجارت کے دائرے سے خارج کر دینے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے چنانچہ ہندوستان کے تقریباً ہر ایک بندرگاہ میں مسلمان نظر آتے ہیں بلکہ وہ بعض اُن مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں پرتگالیوں کی عملداری ہو گئی تھی۔ بندرگاہوں سے مسلمانوں نے خاصکر ان اشیاء کی تجارت کے لئے

۲۲

باب ۲

جو اُن کے جہاز ہندوستان کو لاتے تھے اندرون ملک داخل ہونا شروع کیا۔ چنانچہ وجیانگر کی خوشحالی کے زمانے میں وہاں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی موجود تھی۔

ان دریائی اثرات سے بالکل قطع نظر اکبر کی سلطنت قائم ہونے سے پیشتر پانچ یا چھ صدی کے دوران میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی۔ اور یہ لوگ بہت بڑے پیمانے پر یہاں کے باشندوں کو اپنا ہم مذہب بنا چکے تھے۔ جب مغل پہلی مرتبہ ہندوستان کی سرزمین پر نمودار ہوئے ہیں اس وقت تک قدیم آنے والوں کی اولاد یہاں کے باشندوں میں بہت کچھ مل جل گئی تھی اور بابر اور ہمایوں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں انھوں نے بالعموم ہندوستان کی طرفداری کی۔ اکبر کے زمانے میں یہ نوبت پہنچ چکی تھی کہ اگر ان اشخاص کے مقابلہ میں جو اس کے ساتھ یا اس کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستان آئے تھے۔ ان پرانے لوگوں کو ہندوستانی مسلمان کہا جائے تو خلاف صحت نہ ہوگا۔ اکبر کے دربار میں زیادہ تر پردیسی ہی تھے اور اس کی عمر کے آخری زمانے میں بھی ہندوستانی عنصر (ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر بھی) ایک بہت ہی چھوٹا جزو تھا۔[1] معاشی معاملات پر دربار کا جو کچھ اثر پڑتا تھا وہ غالب جماعت کا ہوتا تھا جس کے مذاق اور عادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پردیسی تاجروں کی سرپرستی اور پردیسی اشیا کے استعمال کی حمایت ہونے لگی جس کی توضیح آئندہ ابواب میں کی جائیگی۔[2]

۳۵

سولھویں صدی کے شروع ہونے پر پرتگالیوں کا ہندوستان میں داخل ہونا متعدد

(۱) اس بارے میں تفصیلی معلومات تیسری فصل میں درج کیے گئے ہیں۔

(۲) ہم عصر یوروپین تحریروں میں لفظ "مور" کے استعمال کے باعث مختلف مقامات کے اسلامی اثرات کا باہمی فرق و امتیاز ناپید ہو گیا ہے۔ پرتگالیوں نے اُن موروں سے جو شمالی افریقہ سے ان کے ملک میں داخل ہوئے تھے اسلام کے متعلق واقفیت حاصل کی اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ اُن کے نزدیک ہر مسلمان ایک مور اور اس وجہ سے ان کا دشمن تھا۔ مشرق کی طرف جانے والے ڈچ اور انگریز سیاحوں نے بھی اِس لفظ کو اس طرح استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ہمارے دور میں شروع سے آخر تک مور سے مراد محض ایک مسلمان ہے خواہ اس کا تعلق کسی نسل یا قوم سے ہو۔ ملاحظہ ہو ہابسن جابسن۔

باب ۱

اسباب کا نتیجہ تھا۔ اُس زمانے میں مشرقی ممالک کی اشیاء جو یورپ روانہ کیجاتی تھیں وہ بحیرۂ احمر یا خلیج فارس تک لیجائی جاتی تھیں۔ اور ترکی اور مصر کے مسلمان حکمرانوں کو بھاری محاصل ادا کرنے کے بعد اطالوی تاجروں کے ذریعے سے جو بحیرۂ روم کے مشرقی حصے کی تجارت کے مالک تھے تقسیم ہوتی تھیں پرتگالیوں کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان اشیاء کو اپنے ہی جہازوں میں راس امید پر سے لے جائیں۔ ایسا کرنے سے وہ بیک وقت اپنی دولتمندی میں اضافہ کر سکیں گے اور اسکے ساتھ مسلمان ریاستوں کی خوشحالی پر ایک کاری ضرب لگا سکینگے۔ کیونکہ اب تک بھی یہ ریاستیں نصرانیت کی دشمن سمجھی جاتی تھیں۔ مزید براں انھیں ایک ایسا مقام ہاتھ آنے کی توقع تھی جہاں سے وہ عیسائی مذہب کی اشاعت کر سکیں۔ غرض یہ کہ پرتگالیوں کی مہم میں تجارتی اور تبلیغی دونوں پہلو شامل تھے۔ انھوں نے خشکی پر سلطنت قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ ان کا مقصد اصلی ہندوستانی سمندروں میں ایسی عظمت و برتری حاصل کرنا تھا جس کی بدولت وہ دریائی تجارت کو اپنے قابو میں رکھ سکیں اور اس میں حسب منشاء ردّ و بدل کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی غرض سے بحری بستیاں قائم کیں جن کی حفاظت مضبوط قلعوں سے جو دشمن کے حملوں کی مدافعت کر سکیں کی جاتی تھی اور جو اس قدر وسیع تھیں کہ وہاں سے سپاہیوں اور ملاحوں کی کافی تعداد جس کی انھیں ضرورت پڑتی تھی مہیا ہو جاتی تھی۔ یہ بستیاں افریقہ کے مشرقی ساحل خلیج فارس کے دہانے اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر۔ نیز آبنائے ملاکا میں اور جانب مشرق اس حد سے بھی آگے موجود تھیں۔ گوا کا شہر ان کا صدر مقام تھا۔ مغربی ساحل کی چند اور بندرگاہوں پر بھی ان کا قبضہ تھا۔ اور خلیج کھمبے میں چونکہ ان کی کوئی قیام گاہ نہ تھی لہذا اس کی تجارت کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے انھوں نے ڈاماں اور ڈیو میں اپنی بستیاں قائم کی تھیں مشرقی ساحل پر گو بالکل باضابطہ نہیں تاہم کافی موثر طریقے سے ایس تھومی اور دوسرے مقامات میں اُن کے قدم جمے ہوئے تھے۔ انڈس اور گنگا کے دہانوں پر ان کی تجارت گاہیں قائم تھیں لیکن چٹاگانگ اور خلیج بنگالہ کے دوسرے مقامات پر پرتگالی رعایا کی کوئی باقاعدہ حیثیت نہیں تھی کیونکہ بحری قزاقی پر ان کی معاش کا بہت کچھ دارومدار تھا۔ ملک کے اندر وہ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے تھے۔ البتہ چند مقامات میں مثلاً لاہور وغیرہ میں ان کے نمایندے تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ اور اکبری دور کے

۲۹

باب ا

اختتام پر گوا کے مبلغ مدتہائے دراز تک شاہی دربار میں موجود رہتے تھے۔ مگران شالوں سے قطع نظر اندرون ملک انکی موجودگی کا اگر کوئی ثبوت ہمیں مل سکتا ہے تو وہ صرف ٹیری کا یہ ریمارک ہے کہ کبھی کبھی اس کو پرتگالی مل جاتے تھے جو اس سے امداد کے خواستگار ہوتے تھے۔" یہ بالعموم وہ لوگ ہوتے تھے جو کسی نہ کسی بستی سے نکل بھاگتے تھے یا کسی جرم کی سزا سے بچنے کے لئے روپوش ہو جاتے تھے۔

ہندوستان میں جو نسلیں پائی جاتی ہیں ان کا شمار مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ باہر سے لائے ہوئے غلاموں کا ذکر نہ کیا جائے۔ حبشیوں کی مانگ بہت زیادہ تھی چنانچہ اس زمانے کے تذکروں میں ان کا ذکر بعض اوقات نہایت ذمہ دارانہ خدمات پر بار بار ہماری نظر سے گذرتا ہے۔ باشندگان موزمبیق کی تو باقاعدہ تجارت موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایران اور اس کے آگے کے ممالک سے بھی غلاموں کی درآمد جاری تھی۔ آخر میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ عارضی طور پر سکونت پذیر اشخاص کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد موجود رہتی ہوگی۔ چنانچہ عربستان۔ آرمینیا۔ ایران اور شمال مغرب کے دوسرے ممالک کے تاجر اور اہل یورپ جو تفریح، کسب منفعت یا ہمت آزمائی کی خاطر سیاحت کرتے مختلف مقامات میں اتنی کثیر تعداد میں دکھائی دیتے تھے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مغربی ساحل پر چینیوں اور جاپانیوں کی موجودگی کا بھی کہیں کہیں حوالہ مل جاتا ہے۔ ہندوستان ہرگز ایک بند ملک نہیں تھا اور جس قوم کے افراد بھی سفر کے خطرات اور اس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوتے تھے وہ یقیناً ہندوستان تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

جب ہم باشندوں کی نسلی تقسیم کو چھوڑ کر معاشی تقسیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو جو بات سب سے پہلے اپنی طرف ہمیں متوجہ کر لیتی ہے وہ متوسط طبقوں کی نسبتاً ادنیٰ حالت ہے۔ برنیر نصف صدی کے بعد کی حالت کے متعلق لکھتا ہے کہ "دہلی میں کوئی درمیانی حالت نہیں ہے۔ ہر شخص یا تو اعلیٰ ترین طبقے کا ہے یا پھر مصیبت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔" ہمارے دور کے متعلق خاصکر جو حالات اور روایات موجود ہیں ان کے مطالعے سے بھی بالکل یہی کیفیت ذہن نشین ہوتی ہے۔[1] اس زمانے میں وہاں نہ دکلا موجو

(۱) ممکن ہے کہ اس بیان کا اطلاق بنگال پر بمقابلہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے کم ہو۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ

باب

تھے اور نہ پیشہ ور اساتذہ کی کوئی قابل لحاظ تعداد ہی پائی جاتی تھی۔ نہ اخبار نویس ہی تھے نہ اہل سیاست اور نہ انجینیر۔ نہ وہ معاشی فوائد جو کہ ریلوے ڈاک خانے یا آب پاشی کے ذریعے سے اس وقت حاصل ہیں، اُس وقت مہیا تھے، اور نہ بینکوں اور بڑے بڑے کارخانوں کے مماثل کوئی شے موجود تھی۔ جدید مفہوم کے مطابق نہ زمیندار تھے اور نہ ایسے خاندان جو سرمایہ داری پر زندگی بسر کرتے ہوں۔ اور اگر ہم متوسط طبقوں سے جیسے کہ وہ آجکل موجود ہیں اِن عناصر کو خارج کر دیں تو پھر بجز اُن خاندانوں کے جن کا مدار مختلف سرکاری خدمات پر ہوتا ہے کچھ بھی باقی نہیں ملے گا۔ آبادی کے بقیہ عناصر کی بالکل ٹھیک اور علمی تقسیم کیلئے ہمارے پاس مواد موجود نہیں ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ اغراض کے لئے سہل ترین صورت یہ ہے کہ دو شعبوں میں تقسیم کرکے ان عناصر کا مطالعہ کیا جائے۔ ان میں سے پہلا شعبہ تو خاصکر صرف دولت کے نقطۂ نظر سے دلچسپ ہے اور دوسرا شعبہ ان طبقوں پر مشتمل ہے جن کی خاص اہمیت پیدائش دولت میں پائی جاتی ہے۔ پہلے شعبہ میں (۱) اہل دربار اور شاہی عہدہ دار (۲) پیشہ ور اور مذہبی طبقے بشمول نقرا و تارکین دنیا۔ اور (۳) ملازمین خانگی اور غلام۔ شامل ہیں۔ دوسرے شعبے میں ہمیں اُن جماعتوں پر غور کرنا ہوگا جو (۱) زراعت (۲) صنعت اور (۳) تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں جو لوگ زمیندار کہلاتے تھے ان کی ٹھیک معاشی حیثیت کا مسئلہ بہت کچھ بحث طلب ہے۔ ان کے اشغال و افعال کے متعلق بہت کم حقیقی مواد موجود ہے اور جو تھوڑا مواد موجود بھی ہے اس کا ذکر زرعی مفاد کے سلسلے میں زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک اور جماعت جو اس تقسیم سے خارج ہے وہ ان فرقوں کی ہے جو پہاڑوں اور جنگلوں میں بود و باش رکھتی ہے لیکن جو کتابیں مستند مانی جاتی ہیں ان میں بہ مشکل ان جماعتوں کا حال دستیاب ہوتا ہے لہذا ایک معاشی تحقیق میں ان کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۔ ہم عصر بنگالی ادب سے ایک متوسط طبقہ کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہم اس بارے میں مزید تفصیل سے کام نہیں لے سکتے۔ جس قدر مستند کتابیں ہمیں مل سکی ہیں ان میں تو اس طرح کی خصوصیت کا قطعاً کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن وہ اسناد اس خاص مبحث پر قطعی یا فیصلہ کن نہیں ہیں۔

باب ۲

ترک کیا جا سکتا ہے۔(۱)

جو تقسیم ہم نے ابھی بیان کی ہے وہ اس کتاب کے بقیہ حصے کے لئے گویا ایک خاکے یا ڈھانچے کا کام دیگی لیکن پہلے شعبے کا مطالعہ شروع کرنے سے قبل نظم ونسق کی نوعیت کے تعلق جہاں تک کہ اس کا اثر پیدائش دولت کے حالات پر پڑتا ہے کچھ کہنا ضروری ہے چنانچہ آئندہ باب میں اس مضمون پر بحث کی گئی ہے۔

---

(۱) ان طبقوں کو جو کچھ اہمیت دی جاتی تھی اس کا کچھ اندازہ اُس قصے سے ہوتا ہے جو جہانگیر کے دور کے ابتدائی عہد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ شکار کے وقت جنگلی انسان اور درندے دونوں برابر برابر تصور کئے جاتے تھے۔ شکار کی ایک مرغوب شکل کمارگاہ تھی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ محافظین کی ایک صف کے ذریعے سے صحرا کا محاصرہ کرلیا جاتا تھا اور پھر اس قطعے کو بتدریج چھوٹا کیا جاتا تھا یہاں تک کہ شکار کی ایک بڑی تعداد ایک مناسب وسعت کے اندر محصور ہو جاتی تھی۔

فنچ ۱۶۱۰ء کے قریب بمقام آگرہ لکھتا ہے (پرچاس - ۱ - ۴ - ۴۳۰) "جو کچھ اس حصار کے اندر آجائے وہ صید شاہی کہلاتا ہے خواہ وہ انسان ہو یا درندہ .... جو درندے پکڑے جائیں وہ فروخت ہوتے ہیں اور ان کا روپیہ غریبوں کو دیدیا جاتا ہے۔ اور جو انسان پکڑے جاتے ہیں وہ بادشاہ کے غلام بنے رہتے ہیں جنھیں وہ ہر سال کابل کو روانہ کرتا ہے اور ان کے معاوضے میں گھوڑے اور کتے حاصل کرتا ہے یہ لوگ غریب خستہ حال اور چور ہوتے ہیں۔ صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے ہیں اور ان میں اور درندوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔" ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ قصہ صحیح ہے یا غلط فنچ کے علاوہ اور مصنفین نے بھی اُسے بیان کیا ہے۔ لیکن اس قصے کا کہا جانا ہی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ یہ بدنصیب لوگ اپنے زیادہ تہذیب یافتہ بھائیوں کی نظر میں کیا وقعت رکھتے تھے۔

باب ا

اسناد برائے باب اوّل

فصل ا:- لفظ "ہندوستان" کے مختلف مفہوموں کی کیفیت کے بارے میں ہابسن۔ جابسن میں ایک مضمون اسی عنوان سے درج ہے اس کا مطالعہ کیا جائے اسی زمانے میں وجیانگر کی حالت کے لئے سیویل صفحہ ۱۹۹ و ما بعد ملاحظہ ہو۔ پادری این پمینٹا نے اپنے ۱۵۹۹ء کے تبلیغی سفر کی رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ وجیانگر بادشاہوں کا بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ (پرچاس صفحہ ۱۷۴۱) اور پادری سیمن سا نے بھی اسی سال کی ایک تحریر میں دربار شاہی میں اپنے وارد ہونے کی کیفیت بیان کی ہے (پرچاس صفحہ ۱۷۶۲)

اکبری سلطنت کی دستوری تنظیم کے حالات آئین اکبری اور اکبر نامے کے تفصیلی مطالعے سے اخذ کرنا پڑتے ہیں۔ چند عبارتوں پر جو اس سے متعلق ہیں مسٹر یوسف علی اور مولف نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں بحث کی تھی (بابتہ جنوری ۱۹۱۸ء "اکبر کا طریق مالگزاری اراضی" وغیرہ)۔ چھوٹی چھوٹی ہندوستانی ریاستوں کے متعلق مغربی ساحل پر جو صورت حال تھی اس کا بہترین مطالعہ آخری ڈیکا داس جلد (۱۰ تا ۱۲) میں کیا جا سکتا ہے۔ اور مشرقی ساحل پر پرتگالیوں کی جد و جہد کا حوالہ کنزنت کے ساتھ اس کتاب اور پرچاس صفحہ ۱۷۰۷ میں دیا گیا ہے۔ اوڑیسہ کے جنوب میں ہندو ریاستوں کے وجود کا ذکر جہانگیر نے کیا ہے (توزک ۱-۴۳۴)۔ کچ کے بارے میں ملاحظہ ہو "کیفیت" بنگال مندرجۂ آئین (ترجمہ ۲-۱۱۷) فنچ کا سفر (پرچاس ۲-۱۰-۱۷۳۶) اور ہابسن جابسن (کوچ بہار)۔

مغلیہ سلطنت کی سرحدوں کے لئے ہم نے وہی نقشہ استعمال کیا ہے جو مسٹر ونسنٹ اسمتھ کی کتاب موسومہ اکبر مغل اعظم کے صفحہ ۳۲۲ کے ساتھ منسلک ہے۔ لیکن

باب ۱

تفصیلی امور زیادہ تر آئین اور بالخصوص "بارہ صوبوں کی کیفیت" سے ماخوذ ہیں۔ دریائے انڈس کے پرے جو پہاڑیاں ہیں وہاں کے حالات اسٹیل اور گروتھر (پرچاس ۱-۴-۵۲۱) جیسے سیاحوں کے تذکروں میں وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اب رہا بنگال کا وہ حصہ جو شاخ گنگ کے جانب مشرق واقع ہے اس کے متعلق چٹاگانگ تک کا علاقہ تو آئین اکبری کے مطابق۔ (ترجمہ ۲-۱۳۹) بنگال کی فہرست مالگزاری میں شامل ہے۔ بلکہ خود چٹاگانگ کو خاص طور پر دو مرتبہ سلطنت کا جزو بتایا گیا ہے (۲-۱۱۶ اور ۱۲۵) لیکن اسی میں یہ بھی ذکر ہے (۲-۱۱۹) کہ بندرگاہ پر اراکان کا قبضہ تھا۔ پیراڈ (ترجمہ۔۱-۳۲۶) جب ۱۶۰۷ء میں اسی بندرگاہ میں وارد ہوا تو اس نے دیکھا کہ اراکان کی ماتحتی میں ایک معمولی حیثیت کا بادشاہ اس پر قابض تھا۔ اسی طرح پادری آین ہمینٹا نے ۹۸-۱۵۹۷ء میں جیسویٹ پادریوں کے تذکروں کا جو حوالہ دیا ہے (دیکھئے صفحات ۷۳۰۔۷۳۳۔۸۴۰-۸۴۷) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دریائے ہوگلی کو چھوڑنے کے بعد ان لوگوں کو پھر کہیں مغلیہ عملداری کا پتہ نہیں چلا۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے جس حصۂ ملک کو طے کیا وہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی مملکتیں پائیں اور "اراکان۔ ٹپرہ کیچ کو ما اور بنگال کے نہایت عالی مرتبہ اور طاقتور بادشاہ" سے مراعات حاصل کیں۔ اس خطاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم دہانہ کے ایک حصہ پر تو ضرور اراکان کی عملداری تھی۔

جہاں تک مہاندی اور گوداوری کے درمیانی حصۂ ملک کا تعلق ہے وہاں مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے مذکورۂ بالا نقشہ میں گونڈوانہ کا علاقہ بتایا ہے (جو بعد میں ایک مغلیہ صوبہ ہو گیا تھا) جس پر اکثر خود مختار اور بعض باجگزار سردار" قابض تھے اور اس کو شمال میں الہ آباد تک پہنچایا ہے۔ آئین اکبری میں صوبجات ملحقہ کی سرحدوں کے متعلق جو "کیفیت" درج ہے اس کے بعض حصوں سے بھی اس توضیح کی اجمالی طور پر تصدیق ہوتی ہے۔ یہ امر کافی طور پر یقینی ہے کہ اس علاقہ کے بہت سے سردار اکبر کے مطیع نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس رقبہ کو بہ حیثیت مجموعی اس کی واقعی عملداری میں نہیں تو کم از کم اس کے حلقۂ اثر میں ضرور شامل کرنا چاہیئے۔

ہندوستان کی سطح کے متعلق ہم نے جو عام کیفیت بیان کی ہے وہ دراصل

باب

نتیجہ ہے اُن خیالات کا جو فہرست اسناد کے جملہ ہمعصر مصنفین کے بیانات پڑھکر ہمارے ذہن میں قائم ہوئے ہیں لہذا تفصیل کے ساتھ اُن حوالوں کے اقتباس پیش کرنا بے سود ہے جنوبی ہند کے ذرائع آمد و رفت میں گاڑیوں کی عدم موجودگی کی تصدیق خاصکر تھیونیر نے کی ہے صفحہ ۱۲۱۔ جنگلاتی زمین کی وسعت کا حوالہ ایلیٹ کی کتاب متعلق بہ نسل ہائے صوبۂ سرحدی (۲-۱۴۹) میں نیز مولف ہذا کے ایک مضمون میں جس کا عنوان "اکبر کی سلطنت کے زرعی اعداد و شمار" ہے اور جو صوبہ جات متحدہ کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل میں شائع ہو رہا ہے دیا گیا ہے۔

شمالی ہند میں شکار کے متعلق جہانگیر سے بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ متن کتاب میں جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ توزک ۱-۹۰ سے ماخوذ ہے۔ ہندوستانی شہروں کی حالت کے متعلق مانسریٹ کا خلاصہ صفحہ ۶۵۱ پر ہے بدقسمتی سے اس شخص کو جوکہ ایک نہایت ہی ہوشیار مشاہدہ کرنے والا تھا بمقابل دیہات کے صرف شہروں کے حالات سے زیادہ دلچسپی تھی۔

پڑوس کے ممالک کے بارے میں معمولی اسناد کے علاوہ چند اور حوالے بھی دئے جا سکتے ہیں۔ منجملہ اور مصنفین کے اسٹیل اور کروتھر (پرچاس ۱-۴-۵۲۲ و مابعد) بھی اس دور میں ایران کا کچھ حال بیان کرتے ہیں۔ ہندوستان کے شمال میں جو ملک واقع ہے اس کے لئے یول کی کتاب "کیتھے" ناگزیر ہے۔ ہندوستان سے چین تک خشکی کے جو راستے ہیں اُن پر اسی کے مطبوعہ خطوط ۷۹۸ و مابعد میں بحث کی گئی ہے۔ پیگو کی تباہی کا ذکر مختلف مصنفین نے کیا ہے۔ مگر تفصیلی امور پادری لے بونس (ہیے ۸۵۰) نے بیان کئے ہیں اور پرچاس (۲-۱۰-۱۷۴۸) میں اس مضمون کے متعلق اور معلومات کے ساتھ پادری مذکور کے خط کے ایک جزو کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ پیگو کے متعلق مختلف تفصیلی معلومات دسویں اور بارھویں ڈاکا ڈاس میں منتشر ہیں۔ مغل بادشاہ کے بعد ہی شاہ اراکان کا مرتبہ بتانے والا شخص پیرارڈ ہے۔ (ترجمہ ۱-۳۲۶) یہ ایک ٹھیک ٹھیک اور حقیقی باتیں لکھنے والا مصنف ہے چنانچہ وہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ چٹاگانگ میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ صرف اسی قدر معلوم کر سکا جسقدر کہ بندرگاہ میں کہا جاتا تھا۔ اور جو تفصیلی امور اس نے قلمبند کئے ہیں

باب ۲

اُن کی وہ تصدیق نہیں کرتا۔

فصل ۲

۴۔ فرانس کی آبادی کے بارے میں میں نے لوا سیر کی تقلید کی ہے۔ انگلستان کی آبادی کے متعلق کننگھم کے اعداد (۱ - ۳۳۱) اور مسز سی۔ ایم نولس کے مشوروں نے جو کہ لنڈن یونیورسٹی میں معاشی تاریخ کی ریڈر ہیں میری رہنمائی کی ہے۔ عام آبادی کے متعلق متن میں جو مشاہدات نقل کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل مصنفین سے ماخوذ ہیں: تیجر (کونتی ۲۶ - عبدالرزاق ۳۲ نکیٹین ۱۴) سیویل صفحہ ۲۳۷۔ ہے ۲۳۵ تا ۲۸۰۔ باربوسا ۲۹۴۔ تھیونوٹ ۴۔۱۰۴ - ۱۲۹ - ۲۳۱ - ۳۱۲۔ بیٹورنیر ۲۴۳ وما بعد۔ ڈلاویل ۳۰۔ تارزیک ۶۱ و ۶۹۔ پرچاس (فیچ ۱۔ ۴ - ۱۷۳۳ وما بعد۔ اسٹیل اور کروتھرا - ۴ - ۵۲۰ وما بعد - تیچ ۲ - ۱۰ - ۱۷۴۳ وما بعد) منڈے ۲۔ ۵۵۔ ۲۲۵ ـــ مناسب یہ ہے کہ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے سیاحوں کے تذکروں کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے تاکہ جن جن علاقوں میں سے ان کا گذر ہوا تھا وہاں کے صحیح حالات کا اندازہ ہوسکے۔

ہندوستانی شہروں کے حوالوں کے لئے ملاحظہ ہوں۔ جورڈین ۲۲۱۔ سیویل ۲۵۶۔ ہمرنیر ۲۸۲ و ۲۸۴۔ تارنرٹ ۶۲۲۔ پرچاس (کوریات ۱-۴-۳۹۴ وما بعد فیچ ۲-۱۰-۱۷۳۳) غور کی وسعت کے بارے میں جو مبالغہ آمیز بیان ہے وہ فیریا۔ دای سوسا کی کتاب (۱ - ۵ ۱۴) میں موجود ہے۔ ہیر اس کا تخمینہ ڈکاواس میں ہے (۴-۹- سی-۱) اور ہابسن اور جابسن نے غور کے عنوان میں اُسے نقل کیا ہے۔

وجیانگر کی فوج کی تعداد کے لئے ملاحظہ ہو سیویل ۱۴۷ تا ۱۵۰ اور وہ استثنا جو اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ ناکافی فوجیں رکھنے کے متعلق ملاحظہ ہو ایضاً ۳۸۴۔ اور خدمت سے مستثنیات کے لئے ایضاً ۲۷۹۔ اکبر کی فوج کی تعداد پر ارون ۸۷ وما بعد میں بحث کی گئی ہے اور یہ مواد آئین اکبری کی متعدد فصلوں میں منتشر ہے۔ آئین اکبری کے مندرجہ زرعی اعداد و شمار کا جو مطالعہ مؤلف ہذا نے کیا ہے اس کا حوالہ فصل ا کے تحت اوپر دیا جاچکا ہے۔

باب ۱

فصل ۳

فصل ۳۔ یورپ کے جس کسی مصنف نے ہندوستان کے حالات لکھنے کی کوشش کی ہے اُس نے یہاں کے طریق ذات پات کا ضرور حوالہ دیا ہے۔ پارسیوں کے بارے میں ملاحظہ ہوں ٹیری ۳۷۷۔ منڈے ۲۔ ۳۰۶۔ مانسریٹ ۵۵۔ بقیہ نوٹ ۲ ۶۔ گرتیشیاڈی اورٹا ۴۴۵۔ جورڈئین ۱۲۸۔

ہندوستان کے بندرگاہوں میں جو مسلمان بسے ہوئے تھے ان کا حوالہ باربوسا سے لیکر آخر تک تقریباً ہر کیفیت میں موجود ہے افریقیہ میں ان کی آبادیوں کے متعلق ملاحظہ ہو ڈکاڈا۔ ۱۔ ۱۔ ۲۴۔ مالیشیا میں اشاعت اسلام کے حالات کلیفورڈ کی کتاب "فردر انڈیا" ۱۶ و مابعد اور جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی (شاخ) بابتہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں موجود ہیں مغربی ساحل کے مسلمانوں کی حالت وھایٹ وے نے بیان کی ہے گوواکے مسلمانوں کے متعلق ملاحظہ ہو پرچاس ۲۔ ۱۰۰۵۔ اور وجیانگر کیلئے ملاحظہ ہو سیویل ۲۵۶ شمالی ہند کے مسلمانوں کی حالت کا پتہ اس دور کے اُن واقعات سے لگایا جاسکتا ہے جو ایلیٹ کی تاریخ ۴ تا ۶ اور اکبرنامہ اور آئین اکبری میں مذکور ہیں۔

ہندوستان میں پرتگالیوں کے عام حالات تو وھایٹ وے اور دانورس کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن زیادہ تفصیلی واقفیت کے لئے ڈکاڈاس اور دوسرے ہمعصر اسناد کا حوالہ ضروری ہے۔ اس دور میں ان کے مقبوضات کے لئے ملاحظہ ہو ڈکاڈا۔ ۱۔ ۱۔ ۲۴ و مابعد جہاں مشرقی ساحل اور مغربی ساحل کے حالات کا فرق بہت ہی واضح طور پر بتایا گیا ہے۔ دریائے انڈس کے بارے میں ملاحظہ ہو پرچاس ۱۔ ۴۔ ۴۹۶۔ دریائے گنگا اور چاٹگانگ کے لئے ملاحظہ ہو خاصکر ۲۷ تا ۳۳۷۔ ۴۰۰ ۴ تا ۴۷۸ و نیز پیرارڈ ترجمہ ۱۔ ۳۳۴۔ اکبر کے دربار میں عیسائی پادریوں کے مکمل حالات کے لئے ملاحظہ ہو ڈی۔ اسمتھ کی کتاب "اکبر" اور وہ حوالے جو اس میں دئے گئے ہیں اور ان میں بھی مانسریٹ خصوصیت کے ساتھ۔ اندرون ملک پرتگالیوں کے دکھائی دینے کے بارے میں ٹری نے جو حوالہ دیا ہے وہ صفحہ ۴۱۵ پر تحریر ہے۔

ہندوستان میں غیر ملکی اشخاص کی موجودگی کا اتفاقی ذکر اکثر و بیشتر اسناد میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو گرتیشیاڈی اورٹا ۲۴۴۔ فنچ درپرچاس ۱۔ ۴۔ ۴۲۷۔ پیرارڈ (ترجمہ ۲۔ ۳۸) گووا میں چینیوں اور جاپانیوں

باب

کی ایک کثیر تعداد کا ذکر کرتا ہے اور پادری جمینٹا نے یہ واقعہ قلمبند کیا ہے کہ ملیبار کے ایک مشہور بحری قزاق نے اپنے یہاں ایک چینی معتمد نوکر رکھا تھا۔

دوسرا باب

نظم و نسق

پہلی فصل

نظم و نسق کی نوعیت

نظم و نسق سے مراد وہ تنظیم اور طریقے ہیں جن کے مطابق ہر مملکت اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں نظم و نسق کی نوعیت کا مدار بڑی حد تک اُن مقاصد پر رہا ہے جو مملکت کے پیش نظر ہوتے تھے۔ اکبری دور میں ہندوستان کے اندر دو مقصد سب سے زیادہ اہم تھے: ایک کافی مقدار میں آمدنی کی تشخیص اور تحصیل دوسرے فوج کے لئے حسب ضرورت رسالوں کی بہم رسانی اور یہ دونوں اہم کام زیادہ تر عہدہ داروں ہی کی جماعت سے وابستہ رہتے تھے جو اکثر باقیماندہ فرائض بھی انجام دیتے تھے اور خاصکر اندرونی امن و امان برقرار رکھنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ اس لحاظ سے نظم و نسق اس زمانے میں موجود تھا وہ گویا مرکزی قسم کا نظم و نسق تھا جو ابھی تک ہندوستان کے اندر مروج ہے یہ ضرور ہے کہ سررشتہ جات کی کثرت۔ عدالتی اور انتظامی اختیارات کی جزوی علیحدگی اور مقامی حکومت خود اختیاری کے آغاز کے سبب سے نظم و نسق کی یہ نوعیت اب ایک حد تک چھپ گئی ہے۔ ہندوستان کے طریق نظم و نسق کی بنیاد اس امر پر تھی کہ مملکت کا کل رقبہ مختلف وسعت کے صوبوں اور ضلعوں میں

باب ۲

منقسم تھا اور ہر رقبے میں کچھ عہدہ دار مامور تھے تاکہ مرکزی حکومت کے احکام نافذ کریں۔ عہدہ داروں کے تقرر کی مختلف شرطیں ہوتی تھیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ملک کے جملہ عہدہ دار دو قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں جن کے باہمی فرق کو ہم "خام" اور "پختہ" عہدہ دار کہکر ظاہر کر سکتے ہیں۔ جس عہدہ دار کی جگہ "خام" ہوتی تھی اس کو معاوضہ میں تنخواہ دیجاتی تھی جو کم از کم نظری طور پر ایک مقررہ رقم ہوتی تھی۔ عہدہ دار کا یہ کام تھا کہ وہ جسقدر مالگذاری جمع کرے اپنے افسر اعلیٰ کو اس کا حساب دیدے۔ برخلاف اسکے جس عہدہ دار کی جگہ "پختہ" ہوتی تھی اس کا یہ کام تھا کہ اپنے افسر اعلیٰ کو ایک مقررہ رقم ادا کردے۔ اس کے علاوہ جسقدر مزید رقم وہ جمع کر سکے اس کا وہ خود مستحق ہوتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں تقرر کے یہ دونوں طریقے رائج تھے لیکن جو کچھ واقفیت ہمیں حاصل ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا طریقہ شمالی ہند میں رائج تھا اور دوسرا جنوب میں۔

نونیز نے جو صورت حال بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجیانگر کا علاقہ امرائے سلطنت کو بانٹ دیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ امرا "مثل لگان ادا کرنے والوں کے ہیں جو بادشاہ سے کل زمین حاصل کر کے اس پر قابض ہیں۔ نیز وہ بادشاہ کو (۶۰) لاکھ کا لگان ہر سال بطور حق شاہی کے ادا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان زمینوں سے (۱۲۰) لاکھ حاصل ہوتے ہیں جن میں سے (۶۰) لاکھ تو بادشاہ کو ادا کرنا پڑتے ہیں اور بقیہ وہ خود اپنے پاس رکھ لیتے ہیں تاکہ فوجوں کی تنخواہیں اور ہاتھیوں کے مصارف ادا کریں جن کا رکھنا ان پر لازم ہے۔ اس وجہ سے عام باشندوں پر بہت سختی ہوتی ہے کیونکہ جو لوگ زمینوں پر قابض ہیں وہ بہت ظالم ہیں"۔ بالفاظ دیگر جس امیر کے تفویض کوئی ضلع کر دیا جاتا تھا اس پر لازم تھا کہ ایک مقررہ رقم ادا کرے اور کچھ فوج بھی بہم پہونچائے۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا رہتا تھا وہ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ گو یہ کیفیت اس صدی کے ابتدائی حصہ سے متعلق ہے تاہم اغلب یہ ہے کہ یہی طریقہ آیندہ بھی باقی رہا ہوگا اور جب سلطنت کا قطعی طور پر خاتمہ ہوا تو اس سے محض یہی مراد تھی کہ امرا نے بالآخر مقررہ مالگزاری ادا کرنا بند کر دی اور اس طور پر ان علاقوں کے آزاد حکمران ہو گئے جو پہلے سے ان کے قبضے میں موجود تھے۔

سولھویں صدی کے ختم پر جو طرز نظم و نسق دکن کی سلطنتوں میں رائج تھا اسکی کوئی کیفیت معلوم نہیں ہوتی۔ باربوسا نے لکھا ہے کہ دکن کی پوری سلطنت مسلمان رئیسوں میں منقسم تھی اور یہ کہ بادشاہ حکومت میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا لیکن یہ بیان بہمنی سلطنت کے آخری دنوں کے متعلق ہے جو کہ اس وقت تیزی کے ساتھ منتشر ہو رہی تھی اور یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا جو نئی مملکتیں نمودار

باب ۲

ہوگئیں تھیں ان میں بھی اختیارات سپرد کرنے کے کسی ایسے ہی طریقہ پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ بہر حال اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ سترھویں صدی کے وسط تک کم از کم امرائے گولکنڈہ کو تو بہت بڑی آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ مغلیہ علاقے سے گذر کر دکن میں داخل ہوتے ہی تھیونوٹ کو فوراً ٹکس وصول کرنے والوں کی درشتی محسوس ہوئی جو ان رئیسوں کی جانب سے کام کرتے تھے جنہیں گاؤں عطا کئے گئے تھے۔ آگے چل کر وہ تحریر کرتا ہے کہ جو شخص سب سے بڑھکر بولی بولتا بادشاہ اس کو زمین عطا کرتا تھا یا اُن لوگوں کو جنھیں وہ پسند کرتا تھا۔ اور امرا اپنے اپنے عطیہا میں "غیر معمولی مطالبات" کرتے تھے اور مرکزی حکومت کی کمزوری کا نتیجہ یہ تھا کہ خود دارالسلطنت میں بھی یہ لوگ وقتاً فوقتاً مظالم کے مرتکب ہوتے تھے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ تھیونوٹ کی تحریر سے کچھ ہی قبل امرا کو یہ رتبہ حاصل ہوا ہو لیکن ہمارے خیال میں اغلب یہ ہے کہ یہ طریقہ قدیم سے موجود تھا اور یہ خیال کرنا حق بجانب ہے کہ بمبئی کے عرض البلد کے جنوب میں ہندوستان کا اکثر حصہ انہی امرا کے زیر حکومت تھا۔ جس وقت تک یہ لوگ مالگزاری ادا کرتے اور حسب ضرورت فوج موجود رکھتے اسوقت تک جو انکی طبیعت چاہتی کرسکتے تھے۔ بلاشبہ بادشاہ یا شاہنشاہ کو اس بات کا غیر محدود اختیار تھا کہ ان کے پانسوں کو پلٹ دے اور انھیں ان کی جگہوں سے ہٹادے لیکن کس حد تک یہ اختیارات عمل میں لائے جاتے تھے اس کا انحصار ہر حکمران کی شخصیت پر تھا۔ بہر حال یہی خیال کرنا ٹھیک ہے کہ معمولاً یہ اختیارات محفوظ رہتے تھے اور ملک کے روزانہ کاروبار میں نسبتاً ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔

سلطنت مغلیہ میں صورت حال اسقدر مختلف تھی کہ بالعموم عہدہ دار اُن شرائط پر مامور ہوتے تھے جن کی لفظ خام سے تعبیر کی گئی ہے اور یہ کہ اکبر کے زمانے میں سررشتہ دار تنظیم کے ابتدائی امور وجود میں آچکے تھے۔ اکبر نے اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا اور حاکم صوبہ اپنے علاقے کے ہر حصے کے نظم و نسق کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ لیکن نظم و نسق کا اقل ترین رقبہ در اصل سرکار یا ضلع ہوتا تھا اور ہر ضلع پہ عہدہ دار مال (مالگذاری) کے علاوہ ایک فوجی افسر (فوجدار) بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ خاص خاص شہر اور بندرگاہ جداگانہ عہدہ داروں کی نگرانی میں ہوتے تھے لیکن بحیثیت مجموعی کل سلطنت پر نظر ڈالی جائے تو بمقابل موجودہ صورت حالات کے ہندوستان میں فرائض کی تقسیم بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں کہا گیا ہے نظم و نسق کا جو مقصد پیش نظر تھا وہ اس بات کے موافق تھا کہ مملکت اور ہر منفرد کاشتکار کے مابین براہ راست

باب ۲

دوسری فصل

عدل و انصاف کی حالت

معاشی نقطۂ نظر سے نظم ونسق کے ڈھانچے کی تفصیلی کیفیت نسبتاً غیر اہم ہے۔ تاجر یا دولت پیدا کرنے والے کو خاص کر جن امور سے سروکار ہے وہ یہ ہیں کہ آیا انصاف حاصل ہو سکتا ہے اور اگر ہو سکتا ہے تو کیونکر۔ آیا سکونت اور کاروبار کیلئے شہر کافی طور پر محفوظ ہیں یا اور وہ کیا حالات ہیں جن کا اثر انسانوں کی آمد و رفت اور مال و اسباب کی نقل و حمل پر پڑتا ہے۔ ان سوالوں کے جوابات کی تلاش ہمیں خاصکر ان تاریخی یادداشتوں میں کرنا چاہئے جو بیرونی سیاحوں نے چھوڑی ہیں۔ کیونکہ خود ملک کے وقایع نگار ایسی باتوں کو پہلے ہی سے مسلمہ تصور کرتے ہیں اور جب کبھی وہ اُن امور کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں تو مقابلہ کے لئے ان کے پاس کوئی معیار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے بیانات میں خوشامد اور چاپلوسی کی رنگ آمیزی کا خوف علحدہ ہوتا ہے۔ بیرونی سیاحوں نے ہندوستان کے حالات کا مقابلہ اپنے اپنے وطنوں کے حالات سے جن سے وہ واقف تھے کیا ہے اور یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ سنہ ۱۶۰۰ء کے قریب مغربی یورپ کی حالت اس زمانے کی حالت سے بہت ہی مختلف تھی۔ انگلستان ہی کی مثال کو لیجئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں اسوقت تک عدل و انصاف کے معاملات میں ایمانداری اور غیر جانب داری قطعی طور پر قائم ہو چکی تھی یا نہیں اور جہاں تک سفر کے پر امن ہونے کا تعلق ہے یہ بھی زیادہ تر ریلوں کے بعد کی بات ہے۔ بہر حال نقطۂ نظر کے اثر کے لئے گنجائش چھوڑ کر ہمارے پاس ایسا کافی مواد موجود ہے جس کی مدد سے ہم ان حالات کے متعلق جن کے تحت کاروبار چلایا جاتے تھے ایک عام رائے قائم کر سکتے ہیں۔

یہ سوال کہ عدل و انصاف کس حد تک حاصل ہو سکتا تھا اس بارے میں سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب کبھی کوئی تاجر کسی معاہدے پر عمل کرانا یا اپنا قرضہ واپس لینا چاہتا تو وہ اپنا مقدمہ کسی پیشہ ور وکیل کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اس پیشے کا وجود ہی نہ تھا۔ اس کو بذات خود حاضر ہونا اور اپنے مقدمے کی پیروی کرنا پڑتا تھا

تعلق قائم رہے۔ مالگذاری کی تشخیص اور تحصیل پر مرکزی حکومت کی جانب سے نگرانی رکھی جائے اور عہدہ داروں پر جملہ محاصل کے تفصیلی حسابات کی ذمہ داری ہے۔ لیکن کسی طرح سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ عملاً یہ مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوا اور قیاس یہ ہے کہ اکثر علاقوں میں جہاں قطم ونسق زمینداروں کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا تھا وہ صرف ایک مقررہ مالگزاری ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔

سلطنت مغلیہ میں تحصیل مالگذاری اور سپاہیوں کی بہم رسانی ان دونوں امور کے درمیان اسقدر تعلق برقرار رکھا گیا کہ ہر سرکار یا ضلع کے نظم ونسق پر یہ ذمہ داری عاید کر دی گئی کہ وہ مقامی فوج جو کہ بومی کہلاتی تھی بہم پہنچائے جو زیادہ تر پیادہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن جس میں سوار اور ہاتھی بھی شامل ہوتے تھے اور بعض مقامات میں توپیں اور کشتیاں بھی لیکن لڑنے والی فوج کا بہت بڑا حصہ اس سے کسیقدر مختلف طریقے پر مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ یہ کہ جملہ عہدہ داران مملکت پر لازم تھا کہ اپنی اپنی نقد تنخواہوں کے تناسب سے رسالے موجود رکھیں یہ ذمہ داری محض شخص اور اس خاص مقام سے بالکل غیر متعلق ہوتی تھی جس میں عہدہ دار ملازم ہوتا تھا۔ اس تنظیم کی تشریح کسی آئندہ باب میں کی گئی ہے اور اس وقت یہ بتا دینا کافی ہے کہ گو اکبر کا نظام جنوبی ہند کے نظام سے اس حد تک مشابہ تھا کہ دونوں میں ایک حد تک فوجی بہم رسانی مقامی حکام پر لازم تھی تاہم اول الذکر کا مدار زیادہ تر ان رسالوں پر تھا جو براہ راست شاہنشاہ کے حکم کے تابع تھیں۔

عدالتی تنظیم میں اس زمانے تک بہت کم ترقی ہوئی تھی اور منفرد اشخاص کی شکایتوں کا رفع کرنا بادشاہ یا شاہنشاہ کا فرض تھا یعنی عملاً صاحب اختیار حکام کا۔ اکبر نے عدالتی عہدہ دار مقرر کئے تھے جو قاضی اور میر عدل کہلاتے تھے۔ لیکن ان کے اختیارات کی وسعت واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہے۔ اور یہ گمان ہے کہ ان کا تعلق زیادہ تر ان مسائل سے تھا جو اسلامی قانون سے پیدا ہوئے تھے۔ بہرحال سیاحوں نے جو مقدمہ بازی کی کیفیت بیان کی ہے خواہ وہ دیوانی ہو یا فوجداری بالعموم وہ صاحب اختیار عہدہ داروں اور زیادہ تر کوتوال یا حاکم صوبہ کے سامنے ہوتی تھی جو شمالی ہند کی طرح وجیانگر اور دکن میں بھی موجود نظر آتا ہے اور جس کے فرائض پر آئندہ عنوان کے تحت بحث کیجائیگی۔

باب ۲

یہ بات پہلے پہل تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن دنیا کا تجربہ یہ بتا چکا ہے کہ عملاً یہ ترکیب ٹھیک طور پر نہیں چلتی اور ہندوستان میں اہل مقدمات یہ جانتے تھے کہ ایک حق بجانب مقدمہ کے لئے بھی رشوت یا کسی نہ کسی طرح کے اثر کی ضرورت ہے۔ یا تو وہ اس حاکم کو جو مقدمہ کا فیصلہ کرنے والا ہو کچھ دے دلا دیں یا کسی بارسوخ شخص کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ حاکم متعلقہ سے ان کی سفارش کر دے۔ رشوت ستانی اس زمانے میں ہندوستان کے اندر تقریباً عام تھی۔ ذجہانگیر کے متعلق تو ٹیری نہیں صاف الفاظ میں یہ کہتا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں سر ٹامس رو نے بالکل یہی حالات دیکھے اور ان دو سندوں کے مابین ہمیں کوئی بیان ایسا نہیں ملتا جو اس کے مخالف ہو۔ رو البتہ ایک استثناء کا ذکر کرتا ہے کہ ایک شخص کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "وہ رشوت خوار نہیں ہے۔ اس کے ایماندار ہونے کی اطلاع ملی ہے"۔ لیکن جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے صرف یہی ایک استثناء ہے۔ یہی مصنف رسوخ کی قوت کی ایک عمدہ مثال دیتا ہے سلطنت مغلیہ میں ایسی کوئی عدالت نہ تھی جہاں انگریز تاجر اپنے قرضے واپس لے سکیں اور انتظامی عہدہ داروں نے ایک مدت دراز تک اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی البتہ جب رو نے وزیر سے دوستی پیدا کی تو معاملات زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھنے لگے۔ کوتوال کو ایک حکم دیا گیا جس کی بناء پر بدمعاملہ اشخاص فوراً گرفتار کر لئے گئے اور خود وزیر نے ان کے اعتراضات کا جلد جلد فیصلہ کر دیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اہل مقدمات زیادہ رشوت دیکر یا زیادہ اثر ڈالکر اپنے مخالفین کو نیچا دکھا سکتے تھے تو پھر اسقدر تو یقینی ہے کہ اس زمانے میں بمقابل آجکل کے زیادہ سرعت کے ساتھ فیصلے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ لیکن مقابل از قبل یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ آیا عہدہ داروں کو متحرک کرنا کچھ مفید بھی ہے یا نہیں (۱)۔

غیر ممالک کے اشخاص جنھوں نے یہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا کسی تحریری مجموعۂ قوانین کی عدم موجودگی پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا باشندگان ملک

(۱) اثر سے کام لینے کی ایک اور مثال معلوم کرنے کے لئے جو کسیقدر بعد کے زمانے سے متعلق ہے ملاحظہ ہو کلویت ۵-۲۰۴۔ کسی ہندوستانی کشتی کے کپتان کو کٹک پر آنیوالے انگریزی جہازوں کے خلاف کوئی شکایت تھی۔ اُس نے امراء میں سے ایک امیر کو کچھ فیس ادا کی تاکہ وہ اسکا مقدمہ عامل کے سامنے پیش کرے۔

باب ۲

کے لئے یہ کوئی بہت بڑی خرابی تھی پایا گیا۔ کیونکہ بادشاہ کی مرضی کو ہر چیز پر فوقیت حاصل تھی۔ اکبر کے اداروں کے سرکاری اندراجات میں ایسی باتیں بہت ہی کم ہیں جن کو دیوانی قانون کہا جاسکے لہٰذا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ عدالتیں اور عہدہ دار شاستر، شرع شریف، رسم و رواج اور اپنے اپنے ذاتی خیالات کی رہنمائی سے اپنا کام انجام دیتے تھے لیکن ہر حالت میں وہ اس شرط کے تابع تھے کہ ان کا کوئی فعل بادشاہ کی ناخوشی کا باعث نہ ہونے پائے۔ خانگی مرافعوں کی رسائی بادشاہ وقت کے پاس ممکن تو ضرور تھی چنانچہ ایسی مثالیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں جن میں اس قسم کے مرافعوں میں کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن فاصلے زیادہ تھے بعض بعض صورتوں میں سفر خطرناک تھا۔ اور جن اہل مقدمات کی تشفی نہیں ہوتی تھی وہ ہر صورت میں اچھی طرح غور کر لیتے ہوں گے کہ آیا مرافعہ کرنا مصارف و خطرات کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ مفید بھی ہوگا یا نہیں اس کے علاوہ اگر کہیں مرافعہ ناکام ہوا تو پھر مرافعہ کرنیوالے کا سخت مصیبت میں مبتلا ہو جانا بہت ہی قرین قیاس تھا۔ چنانچہ فنچ نے جہاں ان مشہور گھنٹوں کی کیفیت بیان کی ہے جو آگرے کے محل میں مرافعہ کرنیوالوں کے لئے لگائے گئے تھے وہاں وہ کہتا ہے "لیکن انھیں اس بات کا خوب اطمینان کر لینا چاہئے کہ ان کا مقدمہ صحیح ہے تاکہ بادشاہ کو تکلیف دینے کی گستاخی میں وہ سزا نہ پائیں" البتہ بجائے کسی ایک فرد کے جب کوئی بڑی جماعت حاکم اعلیٰ کے پاس مرافعہ دائر کرنے کی دھمکی دے تو اس کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی تھی۔ چنانچہ مالگزاری کے نظم و نسق میں عہدہ داران متعلقہ پر جماعتی دباؤ ڈالنے کی کوششوں کا ہمیں کہیں کہیں پتا چلتا ہے اور یہ ایک ایسی عادت ہے جو ملکی روایات میں ابھی تک موجود ہے اور جس کے عمل کی ایک روشن مثال ۱۶۱۴ء میں قلمبند کی گئی ہے۔ سورت کے محصول خانے کے ایک عہدہ دار نے اس سال کسی ممتاز ہندو تاجر پر کوئی تشدد کیا جس کی وجہ سے "عوام کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ ساری دکانیں بند کر دی گئیں۔ اور (رواج کے مطابق) عامل شہر کے پاس ایک عام شکایت کرنے کے بعد یہ لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن بہت کچھ سمجھا بجھا کر اور وعدے وعید کے بعد انھیں واپس لایا گیا" اگر کوئی اور ذریعہ نہ تھا تو کم از کم اس طریقے سے رائے عامہ کا اثر حق و انصاف کی حمایت میں کارگر ہوتا تھا۔ کیونکہ عہدہ داروں کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ بادشاہ کے دربار میں ان کی بدنامی نہ ہونے پائے۔

کاروباری اشخاص کو ڈگری کی تعمیل کی سب سے زیادہ پروا ہوتی ہے

انھیں اس قانون سے کوئی بحث نہیں ہوتی جس پر ڈگری مبنی ہوتی ہے اور نہ ان ذرائع پر وہ توجہ کرتے ہیں جن کی مدد سے ڈگری حاصل کی جائے۔ سلطنت مغلیہ میں ڈگری کی تعمیل کے طریقے نہایت وحشت تھے۔ نہ صرف قرضدار کا مال و اسباب اور اس کے مکانات و جائداد فروخت کردئے جاتے تھے بلکہ وہ اپنے خاندان اور غلاموں سمیت قید کر لیا جاتا تھا۔ وہ خود بھی غلام بناکر فروخت کیا جاتا تھا یا ڈگری کے عوض میں قرضخواہ کے حوالہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان طریقوں پر بلا روک ٹوک عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ اون کو کام میں لانے اور اس کے بعد آخر تک جاری رکھنے کے لئے رشوت اور رسوخ ضروری تھے لہذا عام نتیجہ یہ نکالنا چاہیے کہ گو منفرد اشخاص اپنے خانگی شکایات کی دادخواہی کیلئے حکومت سے توقع رکھ سکتے تھے تاہم کارروائیوں میں شروع سے آخر تک سخت احتیاط کرنے کی ضرورت ہوتی تھی ورنہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ بے سود ثابت نہ ہوں یا مصارف مطالبے سے بڑھ نہ جائیں۔

باب ۲

تیسری فصل

شہروں میں امن و امان کی حالت

جب ہم سے یہ پوچھا جائے کہ شہروں میں کاروباری اشخاص کی کیا حالت تھی تو جواب یقیناً یہ ہوگا کہ ہر چیز کا دار و مدار کوتوال کی یا جہاں کوتوال نہ ہو مقامی نظم و نسق کے نگرانکار عہدہ دار کی شخصیت پر تھا۔ کوتوال کے فرائض کی جو تشریح آئین اکبری میں موجود ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوتوال کی حیثیت جیسا کہ عام طور پر آج کل اس اصطلاح سے سمجھا جاتا ہے۔ محض شہر کی پولیس کے افسر اعلیٰ کی نہیں تھی۔ بے شک اسکا یہ فرض تھا کہ جرائم کو روکے اور ارتکاب جرم کا پتا لگائے لیکن اسکو یہ بھی اختیار تھا کہ مجرموں کو سزا دے۔ بہت سے کام جو اب مجالس بلدیہ کے سپرد ہیں ان کو انجام دے۔ قیمتوں کو باقاعدہ حالت میں رکھے۔ بیکاروں کو کام پر لگائے اور بہ حیثیت مجموعی گویا شہر کی روزانہ زندگی کے تقریباً ہر جزو معاملہ میں مداخلت کرے۔ جو قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں ان میں کسیقدر فصاحت و بلاغت سے کام لیا گیا ہے۔ لہذا ان کو پڑھتے وقت یہ لحاظ کرنا ضروری ہے کہ وہ محض اکبر کے ان اعلیٰ خیالات کا اظہار ہے جو شہر کی حکومت کے متعلق اس کے دماغ میں جاگزیں تھے۔ ہم بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آیا یہ خیالات اکثر عملاً پورے ہوتے تھے یا نہیں۔ تاہم اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان قواعد و ضوابط کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جب تک کہ کوتوال کو اپنے حکام بالادست کا اعتماد حاصل رہتا تھا وہ ایک نہایت زبردست و خود سر حاکم تھا اور منفرد شہریوں کی زندگی کو خوشگوار یا ناقابل برداشت بنا سکتا تھا۔ اس کے اختیارات میں تھا۔ رشوت ستانی اور رسوخ کی یقیناً بہت زیادہ گنجائش تھی تاہم جب تک کہ کوئی شخص اتنی احتیاط کرتا رہے کہ حکام وقت کے ساتھ دوستانہ تعلقات میں فرق نہ آنے پائے۔ وہ شہروں میں معقول آرام و آسائش کے ساتھ سکونت پذیر ہو سکتا اور کاروبار چلا سکتا تھا۔ اور جہاں تک غیر ملکی تاجروں کا تعلق ہے وہ امن و امان کی حالت دیکھکر بہ حیثیت مجموعی نہایت اچھا اثر لیتے تھے۔

شمال کیطرح دکن میں بھی کوتوال کا خطاب استعمال ہوتا تھا اور تھیونوٹ نے کوتوال گولکنڈہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کو شہر کا افسر اعلیٰ و نیز صدر منصف بتایا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ وجیانگر میں اس عہدے کے لئے کونسا نام استعمال ہوتا تھا لیکن اغلب ضرور ہے کہ وہاں بھی ایک ایسا ہی

باب ۲

گواہوں اور مشتبہ اشخاص کو اذیت جسمانی پہنچانا درحقیقت اُن دو طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا جن پر پولیس کے نظم و نسق کا بہت زیادہ دارومدار تھا۔ اور اُس زمانے میں یورپ کے بعض حصوں کی بھی یہی حالت تھی نظم و نسق کے عملدر آمد کی کیفیت بیان کرتے ہوئے تھیونو تفصیل کیساتھ اس طریقے کی توضیح کرتا ہے جس کے مطابق مشتبہ اشخاص کو کوڑے لگائے جاتے تھے اس اذیت کا سلسلہ کبھی کئی روز تک جاری رہتا تھا حتی کہ اقبال جرم کرا لیا جائے یا مال مسروقہ حاصل کر لیا جائے، یا شبہ کسی اور جانب منتقل ہو جائے۔ اذیت کے علاوہ پولس کا دارومدار جاسوسی پر بھی تھا اور اس بارے میں اکبر کے قواعد وضوابط بہت واضح اور مفصل ہیں شہر کے ہر محلہ میں ایک "غیر معروف شخص" بطور جاسوس کے مقرر ہوتا تھا۔ مسافر خانوں یا سراؤں میں جسقدر لوگ آتے تھے اُن کی نگرانی کیلئے سراغ رسان رکھے جاتے تھے۔ منفرد اشخاص کی زندگیوں کی احتیاط کے ساتھ تحقیق و تفتیش ہوتی تھی اور بہ حیثیت مجموعی کوتوال کا یہ فریضہ تھا کہ ہر بات سے واقف رہے اور اپنی واقفیت کی بنا پر عمل کرے۔

سزائیں ویسی ہی سخت تھیں جیسی کہ اس زمانے میں یورپ کے اندر پائی جاتی تھیں بلکہ شاید اُن سے بھی زیادہ ظالمانہ۔ انکی نوعیت مندرجہ ذیل اقتباس سے (جو شاہنشاہ جہانگیر کے تزک سے اخذ کیا گیا ہے اور ایک عادتی مجرم کی گرفتاری سے جو کہ کوتوال احمد آباد کے ذریعے عمل میں آئی تھی متعلق ہے) نہایت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ "اس نے پہلے بھی متعدد چوریاں کیں تھیں اور ہر موقع پر انھوں نے اس کا ایک عضو کاٹ ڈالا تھا، ایک مرتبہ اس کا سیدھا ہاتھ دوسری مرتبہ اس کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا تیسری مرتبہ اس کا بایاں کان۔ چوتھی مرتبہ انھوں نے اسکی ران کی رگ کاٹ دی اور آخری مرتبہ اس کی ناک۔ وہ باوجود اس تمام کارروائی کے اپنے کام سے باز نہیں آیا۔ چنانچہ کل ایک گھاس بیچنے والے کے مکان میں چوری کی نیت سے داخل ہوا۔ اتفاق سے مالک مکان اس کی تاک میں تھا اور اس کو پکڑ لیا۔ چور نے گھاس بیچنے والے کو ایک چاکو سے متعدد مرتبہ زخمی کیا اور اس کو مار ڈالا۔ شور و غوغا اور گڑبڑ مچنے میں اسکے رشتہ داروں نے چور پر حملہ کیا اور اُس کو پکڑ لیا۔ میں نے انھیں حکم دیا کہ وہ چور کو متوفی کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اس سے انتقام لے سکیں۔"

پس معلوم ہوا کہ انسداد جرم کے معاملات میں کوتوال کی ایک نہایت ہی زبردست حیثیت تھی۔ کیونکہ سراغ رسانی کیلئے اس کو جو اختیارات حاصل تھے وہ اس قسم کی سزاؤں کے

باب ۲

عہدہ دار زیادہ تر انھیں اصول پر جو بعد میں اکبر نے تیار کئے تھے شہر کا انتظام کرتا تھا۔ اور جو سیاح وہاں ہو آئے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ وہاں چور بہت کم تھے اور اجنبی تاجروں کے مال و اسباب کی اچھی طرح حفاظت کیجاتی تھی۔ اس آخری بیان کا اطلاق تو بہت عام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر سیاحوں کو کچھ نقصانات پہنچے ہوتے یا اُن پر کچھ مظالم کئے گئے ہوتے تو وہ نہایت احتیاط کے ساتھ ان امور کو قلمبند کرتے لہذا اُن کے سکوت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انھیں شکایت کی کوئی اہم وجہ نہیں تھی بالکل قرین عقل ہے لیکن ہندوستانی تاجروں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ کوتوال کو بلاشبہ بہت وسیع اختیارات حاصل تھے لیکن یہ امر کہ وہ اختیارات کس حد تک ایمانداری کے ساتھ استعمال کئے جاتے تھے محض قیاس پر مبنی رہے گا۔

البتہ ایک شرط جو کوتوال کی جگہ سے متعلق تھی قابل ذکر ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی وجہ سے ہندوستانی شہروں میں حفاظت مال و اسباب کے بارے میں کسیقدر مبالغہ آمیز خیالات پیدا ہو چکے ہیں۔ مختلف سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ کوتوال جو مال مسروقہ برآمد نہ کرسکے اس کی قیمت ادا کرنے کا وہ ذاتی طور پر ذمہ دار تھا۔ اور یہ کچھ محض سیاحوں کی کہانی نہیں ہے بلکہ خود اکبر کے ضوابط میں یہ درج ہے کہ کوتوال مسروقہ چیزیں برآمد کرے ورنہ وہ نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن سرقے کے خلاف اس سرکاری ضمانت کے طریقے کی عملی اہمیت بہت کم تھی تھیونوٹ کو سورت میں اس بات کا موقع ملا کہ اس طریقے کے عملدرآمد کی جانچ پڑتال کرے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو کوئی اس جگہ کو قبول کرتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کیونکر ایسی صورت میں رقم ادا کرنے کی ضرورت سے بچ جائے۔ چنانچہ وہ اس بارے میں ایک قصہ بیان کرتا ہے جس سے اس معاملے کی صحیح کیفیت معلوم ہوجاتی ہے جب تھیونانٹ سورت میں تھا تو ایک آرمینی تاجر کے ہاں ڈاکہ پڑا اور کوتوال کو ملزمین کا سراغ لگانے میں ناکامی ہوئی۔ آرمینی یہ چاہتا تھا کہ معاملے کو آگے بڑھائے چنانچہ (گورنر) حاکم شہر نے کوتوال سے کہدیا کہ خبردار بدنامی نہ ہونے پائے۔ اب کوتوال نے یہ تجویز کی کہ مستغیث کو کچھ جسمانی اذیت پہنچائی جائے تاکہ مال مسروقہ کی ٹھیک ٹھیک قیمت کے متعلق جو کسیقدر شبہہ باقی ہے وہ صاف ہوجائے گورنر نے اس طرز عمل کو پسند کیا جس کے بعد معاملہ ایک دم سے ختم ہوگیا۔ کیونکہ اذیت جسمانی کے خوف سے آرمینی نے اپنا استغاثہ واپس لے لیا تھیونوٹ کہتا ہے کہ کوتوال کے طرز عمل کا یہ ایک اچھا نمونہ ہے۔"

باب ۲

خوف سے اور بھی زیادہ قوی ہو جاتے تھے۔ لہٰذا ہمیں متعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اجنبی تاجروں کو مغلی
موجودگی حکومت کے نزدیک عام طور پر غنیمت خیال کیجاتی تھی اپنی جان و مال کی حفاظت کے متعلق
کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ معمولی حالات میں امن عمدہ طور سے برقرار رکھا جاتا
تھا تاہم مستقبل کے متعلق ہمیشہ ایک بے ثباتی کا احساس غالب رہتا تھا۔ حکومتیں آج کل کے مقابلے
میں کم مستحکم تھیں اور کسی شہر یا صوبے کے نظم و نسق کا یکایک بلا کسی کافی تنبیہ کے خاتمہ ہو سکتا تھا
اکبر کی سلطنت سنہ ۱۵۸۱ء تک بھی بنگال اور کابل کی بغاوتوں کی وجہ سے سخت خطرے میں تھی پھر
سنہ ۱۵۸۴ء میں گجرات کے اندر بغاوت کی وبا موجود تھی۔ اس کے بعد ایک تھوڑا ہی سا زمانہ کسیقدر
امن کیساتھ گذرا تھا کہ جہانگیر کے ابتدائی ایام میں دہلی سے لیکر بنگال تک مختلف مقامات پر
اندرونی بدامنیاں نمودار ہوگئیں۔ چنانچہ سر طامس رو جب اس شاہنشاہ کے پاس سفیر تھا
تو اسنے ان خانہ جنگیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن کا اسے خوف تھا انگریز تاجروں کیلئے ایک
خاص مسلک تجویز کر لیا تھا یعنے انھیں نصیحت کی تھی کہ وہ قرضے بہت کم دیں اور اپنے آپ کو
سارے ملک میں منتشر کرنے کی بجائے ایکہی جگہ مجتمع رکھیں اور یقین ہے کہ اس قسم کی مصلحتیں
ساری سلطنت میں ہندوستانی کاروباری اشخاص کے نزدیک بھی کافی اہمیت رکھتی ہونگی
ایک انگریز تاجر مسمی سالبینک نے سنہ ۱۶۱۶ء کے ایک سخت قحط کے دوران میں آگرے کیحالت کے
متعلق جو کیفیت قلمبند کی ہے اس سے ہم غالباً ان نتائج کا پتا لگا سکتے ہیں جو نظم و نسق کا یکایک
خاتمہ ہو جانے سے نمودار ہوتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی جان ہر وقت خطرے میں تھی اور اسکا
باعث چند شریر بدمعاشوں کی مطلق العنانی تھی۔ جب لوگ اپنے اپنے مکانوں سے چلے جاتے تو
یہ بدمعاش گھروں میں گھستے اور جو کچھ منقولہ مال و اسباب ہاتھ لگتا اسے لیجاتے تھے۔ اور یہ عملدرآمد
نہ صرف ان مکانوں ہی میں ہوتا تھا جہاں سے تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوتے تھے بلکہ دوسرے
مکانوں میں بھی جہاں کچھ لوگ اپنے مال و اسباب کی حفاظت کیلئے رہ جاتے تھے یہی صورت پیدا
ہوتی تھی گویا بالفاظ دیگر اس کے یہ معنی ہوئے کہ خود سلطنت کے صدر مقام میں بدامنی کی بلائیں
موجود تھیں (جس طرح کہ وہ آج کل بھی موجود ہیں) لیکن اس زمانے میں ان کی جد و جہد کے
مواقع نسبتاً بہت زیادہ تھے۔ ہر سمجھ رکھنے والے کاروباری آدمی کو لحاظ کرنا پڑتا تھا جب تک کہ
نظم و نسق مضبوطی کیساتھ قائم رہے اسکے لئے صرف یہ ہی کافی تھا کہ کوتوال اور اسکے چند در چند ماتحتین کیساتھ دوستانہ تعلقات برقرار
رکھے لیکن جب نظم و نسق کمزور ہو جائے جو کہ بالکل بعید از قیاس نہ تھا تو ایسی صورتوں میں اسکو اپنے آپ منتقل ہونے کیلئے تیار رہنا پڑتا تھا۔

باب ۲

چوتھی فصل

دیہات میں امن و امان کی حالت

بڑے شہروں سے باہر کوتوال کی طرح کا کوئی عہدہ دار نہیں تھا۔ اور قانون کی نگہداشت اور امن و امان برقرار رکھنے کی ذمہ داری کم از کم سلطنت مغلیہ میں تو نظم و نسق مالگذاری کے فرائض میں شامل تھی۔ دیہات میں بہ حیثیت مجموعی کس حد تک امن و امان حاصل تھا اس کا اندازہ صرف سیاحوں کے شاہدات سے کیا جا سکتا ہے ان لوگوں سے ہمیں جو کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں وہ بہت ناقص ہیں لیکن وہ اس رائے کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ حالات ایک مقام سے دوسرے مقام پر نیز ایک وقت سے دوسرے وقت میں بہت ہی مختلف ہوتے تھے پس مقامی عہدہ داروں کی شخصیت ہی غالباً سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز تھی۔ اس مسئلے کے متعلق شہادت کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کی گنجائش رکھنی چاہیئے کہ سترھویں صدی کے سیاح کا معیار آج کل کے سیاح کے معیار کا سا نہیں تھا۔ عام راستوں پر ڈکیتی کے واقعات یورپ میں بھی ویسے ہی عام تھے جیسے کہ ہندوستان میں۔ اور جو حالات اب تقریباً ناقابل برداشت سمجھے جائیں گے ممکن ہے کہ جہانگیر کے زمانے کا کوئی سیاح ان میں قابل اطمینان بیان کردے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر اہل یورپ جس نظر سے دیکھے جاتے تھے اسکا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ اب تک انھیں ایسی کوئی وقعت حاصل نہیں ہوئی تھی جیسی کہ بعد کی دو صدیوں کے تجربہ سے بتدریج قائم ہوتی گئی۔ سرکاری حلقوں میں یہ کسیقدر حقارت سے دیکھے جاتے تھے گویا وہ چند بیوپاری تھے جنکے پاس ممکن ہے کہ کچھ قابل خریداری اشیاء نکل آئیں اور جو غالباً اتنی حیثیت رکھتے تھے کہ کچھ روپیہ صرف کریں اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے نزدیک یہ اجنبی اشخاص گویا چند خطرناک عجائبات تھے۔ اس کے برخلاف اہل یورپ بہ حیثیت مجموعی ہندوستانیوں کو حقارت سے نہیں دیکھتے تھے۔ جو کچھ معلومات ہمیں میسر ہیں ان سے ایک طرح کی فراخ دلی کا پتا چلتا ہے اور جہاں کہیں کوئی ناموافق رائے ظاہر کی گئی ہے جیسا کہ روزنامچۂ سرٹامس رو کے آخری حصوں میں پایا جاتا ہے تو وہ تجربے پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ تعصب پر[1]

(۱) یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرتگال ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن ان کا یہ طرز عمل

باب ۲

وہ کہتا ہے کہ "یہاں بہادر رہتا ہے۔ وہ ایسے متعدد مضبوط قلعوں پر قابض ہے کہ بادشاہ بھی باوجود اپنی تمام قوت کے اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتا"(۱)۔ چھٹی منزل میں اُسکا گزر ایک "تکلیف دہ پتھریلی ندی پر سے ہوا"۔ اور ساتویں منزل پر وہ بہدوار میں ٹھہرا جو کہ "ایک غلیظ شہر تھا اور جہاں چور بھرے پڑے تھے"۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس مقام پر ایک چھوٹے سے راجہ کی عملداری کی حد تھی۔ اکبر نے سات سال تک اس کا محاصرہ کیا لیکن "بالآخر اس کے ساتھ مصالحت کر لینے پر مجبور ہو گیا" اور چند گاؤں اُسکے قبضے میں چھوڑ دیئے" تاکہ تجار امن کیساتھ اس میدان میں سے گزر سکیں"۔ اس کے بعد کی منزل نندربار کی سرزمین تھی یہ ایک اہم شہر تھا جس کے متعلق وہ کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد ایک ناپاک شہر ملتا ہے جس کے باشندے چور ہیں اور جہاں ایک گندہ قلعہ بھی موجود ہے" اسکے بعد جب اپنے کوچ کیا تو وہ ایک "بڑے اور ناپاک شہر" میں پہنچا جہاں خراب پانی پینے کی وجہ سے اُسے پیچش ہو گئی۔ اس کوچ میں اسکو ایک واقعہ پیش آیا۔ "راستے میں لنگل (نیمگل) کا عامل ملا اور وہ اپنے سے چند ایمان دار اشخاص کیساتھ مجھ سے کچھ روپیہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھکر کہ گولی بارود سے جواب ملنے کا اندیشہ ہے۔ اپنے ارادے سے باز آیا اور ہم بلا کسی تکلیف کے اپنی گاڑیاں بڑھا لے گئے"۔ اسکے بعد کا کوچ "چوروں کے راستے میں" سے تھا جس کے بعد وہ عامل نندربار کی جماعت کے ساتھ مل گیا۔ اُس زمانے میں سڑکیں خطرناک ہو گئیں تھیں۔ کیونکہ جہانگیر کے جنرل خانخاناں کو دکن میں شکست ہو چکی تھی اور وہ برہانپور کیطرف پلٹا تھا" اسکی وجہ سے دکھنی اسقدر گستاخ ہو گئے تھے کہ انھوں نے اس راستے پر حملے شروع کر دیئے تھے اور بہت سے مسافروں کو لوٹ لیا تھا"۔ اسکے بعد چار کوچ اور کرنا پڑے جن کے دوران میں فنچ پیچش کے ہاتھوں مرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر وہ برہانپور پہنچا جو جہانگیر کی دکنی فوجوں کا مرکز تھا اور جس پر اس زمانے میں حملہ کا بہت کچھ خطرہ تھا۔ "شہر بہت بڑا لیکن گندہ ہے پست ہے اور مضر صحت آب وہوا میں واقع ہوا ہے اور ایک غیر صحت بخش مقام ہے" اس کے پہنچنے کے دو روز بعد یہ خبر آئی کہ جن شہروں میں اس نے قیام کیا تھا ان کو دشمن نے تاخت وتاراج کر دیا۔ اس لحاظ سے وہ خوش قسمت تھا کہ اس نے اپنے سفر کا یہ حصہ طے کر لیا تھا۔

برہانپور کے پاس سڑک دریائے تاپتی سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور شمال مغرب کی سمت سلسلہ

(۱) بہادر کی بغاوت کا ذکر جہانگیر نے توزک میں کیا ہے ا۔ ۹۴۔ فنچ نے اس موقع پر انگریزی لفظ Keep استعمال کیا ہے جس کا قدیم مفہوم رہنا یا سکونت اختیار کرنا ہے۔

پس تجار یورپ بھی اس زمانے میں سفر کیلئے بالکل اسیطرح روانہ ہوتے تھے جس طرح کہ ایرانی، عرب یا ہندوستان کے دوسرے حصوں کے سیاح۔ لہذا اُن کے تجربوں کو اس زمانے اور اس مقام کے حالات کا نمونہ تسلیم کرنا کسیطرح نامناسب نہ ہوگا۔

ان تجربات پر غور کرنے کے لئے مثال کے طور پر ہم ایک تاجر مسمی ولیم فینچ کے سفرناموں کا مطالعہ کریں گے کیونکہ اس قسم کے تجربے اس کے روزنامچے میں درج ہیں جو اس کی سفری یادداشتوں سے مرتب کرکے شائع کئے گئے ہیں۔ جو جو تفصیلی باتیں فینچ کو دلچسپ معلوم ہوتی تھیں انھیں وہ نہایت احتیاط کیساتھ قلمبند کر لیتا تھا۔ اور ہمیں تو اس کے روزنامچے میں تعصب کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تیسرے دریائی سفر کے موقع پر وہ انگلستان سے روانہ ہوا اور اگست ۱۶۰۸ء میں ہندوستان پہنچا۔ سولہ مہینے کے بعد اس نے آگرے کا سفر کیا۔ اور نو ماہ تک اسی گرد و نواح میں قیام کرنے کے بعد نیل کی خریداری کرتے اور کمپنی کے دوسرے فرائض انجام دیتے ہوئے اس نے لاہور کی طرف کوچ کیا۔ جہاں اسکی ذاتی یادداشتیں ختم ہوتی ہیں۔ (گو سنی سنائی باتوں کی بنا پر وہ دوسرے مختلف راستوں کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے۔)[2] سورت سے آگرے تک دو مشہور راستے تھے۔ مغربی راستہ احمد آباد اور اجمیر سے ہو کر اور مشرقی راستہ برہانپور اور گوالیار ہوتا ہوا گذرتا تھا۔ فینچ نے آخری راستہ منتخب کیا۔ اور دریائے تاپتی کے کنارے کنارے سولہ منزلیں طے کرتا ہوا برہانپور پہنچا۔ پہلی چار منزلوں کے متعلق تو وہ کوئی دلچسپ بات بیان نہیں کرتا۔ پانچویں منزل میں وہ ایک شکستہ حال ملک میں پہنچا جس کے متعلق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) تمام دنیا کیلئے عام ہے کسی خاص نسل کیساتھ مخصوص نہیں وہ ہندوستانیوں کو ضرور ذلیل سمجھتے تھے لیکن اسلئے نہیں کہ وہ ہندوستانی تھے بلکہ اسلئے کہ وہ پرتگال نہ تھے۔ چنانچہ پیرارڈ اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کو صریحاً بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ پرتگالی ہندوستان میں "اپنے آپ کو انتہا درجہ قابل عزت و وقعت خیال کرتے ہیں وہ نہ صرف ہندوستانیوں کو بلکہ دوسری تمام یورپی اقوام کو بھی ذلیل سمجھتے ہیں"۔ (پیرارڈ ترجمہ ii-۱۲۰) اور انگریزوں کیساتھ ان کے طرز عمل کے جو واقعات موجود ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے (مثلاً ملاحظہ ہو ہارکنس کی روداد مندرجہ پرچاس ۱- iii- ۲۰۷)

(۲) جو اقتباسات اب آگے آئیں گے ان میں ہم نے فینچ ہی کی لطیف و دلکش زبان برقرار رکھی ہے لیکن اسکے املا اور اوقاف میں جدید طریقوں کے مطابق تبدیلی کر دی ہے۔

ست پورا اور دریائے نربدا کے آر پار کوہ وندھیا کی سیدھی اور بلند چڑھائیوں پر سے ہوتی ہوئی منڈو اور مالوہ کی طرف جاتی ہے۔ یہ پگڈنڈی کا راستہ بہت خراب تھا۔ کیونکہ یکے بعد دیگرے متعدد منزلوں کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس میں بار بار "پتھریلا اور چڑھائی کا راستہ" "پتھریلا تکلیف دہ راستہ" "خراب راستہ اور چڑھائی کا راستہ" غرض کہ اس طرح کے بہت سے فقرے پائے جاتے ہیں۔ اور منڈو کی چڑھائی بھی "ایک سخت ڈھلوان پتھریلے پہاڑ پر سے تھی اور راستہ صرف اتنا چوڑا تھا کہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک گاڑی گزر سکے"۔ منڈو کے بعد ایک اور خراب منزل تھی اور پھر اجین تک ایک اچھی سڑک موجود تھی فنچ نال برہانپور کے کیمپ میں داخل ہو گیا تھا۔ اور یہاں تک وہ چوروں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ لیکن جانب شمال گوالیار کی طرف جو دوسرا کوچ کیا گیا تو "اس نے راستے کو بہت زیادہ پتھریلا اور چوروں سے بھرا ہوا پایا" اور مسافروں کی ایک اور جماعت پہاڑی ڈاکوؤں کے ہاتھوں سے صرف اس وجہ سے بچ گئی کہ اس اثناء میں فنچ کی جماعت وہاں پہنچ گئی تھی۔ پھر بلا کسی حادثے کے دو کوچ اور ہوئے۔ اس کے بعد "آخری پانچ کوس کا راستہ تو چوروں سے بھرا ہوا۔ پہاڑی اور پتھریلا تھا لیکن بقیہ حصے میں خوشگوار میدان تھے"۔ اور پھر تین اور منزلوں کے بعد وہ سرونج پہونچ گیا۔ سرونج سے سیپری تک کا سفر آسان اور خوشگوار تھا البتہ آخری دن جو راستہ طے کیا گیا وہ پتھریلا۔ گنجان درختوں اور چوروں سے بھرا ہوا ویران راستہ تھا۔ "یہاں دو رات قبل ساٹھ یا ستر چوروں کی ایک جماعت نے یہ سمجھ کر کہ یہ کوئی دیر سے گزرنے والا قافلہ ہے (۱۵۰) پٹھان سپاہیوں پر اندھیری رات میں حملہ کر دیا اور جو گڑھا انھوں نے دوسروں کے لئے کھودا تھا اس میں وہ خود گر پڑے"۔ دوسری منزل جو نروار کی جانب تھی اس سے زیادہ خراب تھی جس کا "راستہ ویران۔ خطرناک اور چوروں سے بھرا ہوا تھا"۔ گو جنگل میں محافظوں کی چوکیاں موجود تھیں لیکن چوکیدار قابل اعتماد نہیں تھے۔ کیونکہ ان کو محافظ بنانا ایسا ہی تھا جیسا کہ بطخ کی رکھوالی لومڑی کے سپرد کرنا۔ نروار سے گوالیار تک کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور گوالیار سے آگرے تک صرف دریائے چنبل کے غاروں میں البتہ خطرات موجود تھے۔ سورت سے آگرے تک کے کل سفر میں تقریباً دس ہفتے لگے۔ اس کے کچھ دن بعد فنچ شہر بیانہ کے قریب جو آگرے کے جنوب مغرب میں واقع ہے نیل خریدتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان دنوں یہ شہر نیل کا ایک مشہور و معروف بازار تھا اس سفر کے متعلق اس کی جو یادداشتیں ہیں وہ زیادہ تر زراعت پیشہ لوگوں کے لئے دلچسپ

باب

ہو سکتی ہیں لیکن وہ بیان کرتا ہے کہ فتح پور سیکری "اب بھی خوبصورت لیکن ویران ہے" اور بیانہ کی حالت بھی جو اب تھی" وہ لکھتا ہے کہ بجز دو سراؤں اور ایک طویل بازار کے جہاں چند منتشر مکانات ہیں جن میں سے اکثر اچھے اچھے مکانات بالکل گر چکے ہیں اور بقیہ میں بجز بدمعاشوں اور چوروں کے کوئی سکونت پذیر نہیں ہے۔" آگرے سے پلٹ کر وہ لاہور کے قصد سے روانہ ہوا تا کہ کمپنی کے واجب الادا قرضے وصول کرے جمنا کے سیدھے کنارے پر سے دہلی تک کا کوچ بغیر کسی حادثے کے ختم ہوا لیکن شہر کے قریب ہی شمال کیجانب ملک میں کیقدر بے چینی رونما ہو گئی تھی۔ کہیں بادشاہ کے مرنے کی کوئی خبر مشہور ہو گئی تو بہت سے بدمعاش جھوٹی دہشت انگیز خبریں پھیلانے کیلئے نکل پڑے۔ چنانچہ ہم نے فوجدار دہلی کو دیکھا کہ کوئی دو ہزار سوار اور پیادوں کو لیکر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اور دوسرے روز صبح ناشتے کے وقت ایسا معلوم ہوا گویا چور ہمیں پریشان کرنے والے ہیں۔" پانی پت میں داخل ہوتے ہی اس نے "تقریباً ایک سو نو گرفتار شدہ چوروں کے سر دیکھے جن کے دھڑ برابر ایک میل تک سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔" کرنال کا راستہ بھی "چوروں سے خالی نہ تھا اور اگر ہماری بندوقیں آگ نہ برساتیں تو ہم پر حملہ ہو جاتا۔" لیکن کرنال سے لاہور تک کوئی خوف نہ تھا گو اس آخری مقام پر پہنچکر اس نے کابل میں بغاوت ہو جانے کی خبر سنی۔

پس فنچ کے تجربوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بلا کسی زبردست خطرے کے طول طویل فاصلوں کا سفر ممکن ضرور تھا لیکن احتیاط ہمیشہ ضروری تھی۔ پہاڑی مقامات اور گنجان جنگلوں میں تو ڈاکوؤں کا خوف لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن کھلے میدانوں میں بھی بعض اوقات ان کا نمودار ہو جانا ممکن تھا۔ ایک جھوٹی افواہ تمام دیہات میں آگ لگا دینے کیلئے کافی تھی اور خود سڑکوں کے چوکیداروں پر بھی کسیطرح پورا پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے سیاح بھی کم و بیش یہی حالات بیان کرتے ہیں۔ اُن میں سے بعض بمقابل دوسروں کے زیادہ خوش نصیب ہوتے تھے اور اسی کے مطابق اُن کے خیالات میں بھی ایک گونہ تفاوت نظر آتا ہے لیکن اُن کے تجربات کا عام نتیجہ آخری جملے میں گو مختصراً مگر بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا گیا ہے۔ ان تجربات میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ ڈرتھما اور نونز ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ سلطنت وجیانگر اپنی خوش حالی کے زمانے میں محفوظ و مامون تھی۔ لیکن ممکن ہے کہ مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے سے اس میں کچھ تنزل رونما ہو گیا ہو فنچ (۱۵۸۳ تا ۱۵۹۱)

پٹنے کے قریب چوروں کی کثرت کا ذکر کرتا ہے اور بنگال میں اس نے ہوگلی تک کا سفر جنگل کے راستے سے طے کیا کیونکہ معروف سڑک پر چوروں کا خوف زیادہ تھا۔ وی تھنگش (۱۶۱۴) نے اس بات کی کوشش کی کہ احمد آباد سے لاہیری بندر تک جو دریائے انڈس پر واقع ہے سفر کرے لیکن اس نے یہاں کی آبادی کو آئین و قوانین سے بالکل آزاد پایا اور بالآخر اپنی حفاظت کے لئے جو محافظ اس نے اجرت پر لے رکھا تھا اسی نے اس کو قید کر لیا۔ ۱۶۱۵ء کے قریب انگریز تاجروں نے سورت سے احمد آباد اور بروچ جانے والی سڑکوں کو ڈاکوؤں کے گروہوں کی وجہ سے انتہا درجہ خطرناک پایا۔ تقریباً اس زمانے میں اسٹیل اور کروتھر نے رپورٹ کی کہ آگرہ سے لاہور کی سڑک رات میں چوروں کی وجہ سے خطرناک تھی لیکن دن کے وقت محفوظ تھی" اور ۱۶۱۷ء میں گولکنڈے کا علاقہ جنگ و جدال اور بدامنیوں کے باعث شمال سے کلیتہً منقطع ہو چکا تھا۔ جہاں تک سیاحوں کے عام خیالات کا تعلق ہے ٹرمی (تقریباً ۱۶۱۶ء) کی موافق رائے کا مقابلہ ہاکنس کی رپورٹ سے (جو چند سال پیشتر کی ہے کیا جا سکتا ہے۔ ٹرمی اسکے کیمپ پر صرف ایک ہی بار حملہ ہوا تھا۔ ہاکنس کا بیان یہ ہے کہ "ملک چوروں اور باغیوں سے اسقدر بھرا ہوا ہے کہ اس کی (یعنی جہانگیر کی) سلطنت کے طول و عرض میں کوئی شخص بہت بڑی قوت کے بغیر دروازے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔"(۱) ہاکنس یہ تسلیم کرتا ہے کہ اکبر کی وفات کے بعد سے حالات میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن خود اکبر کے زمانے میں حالت پورے طور پر قابل اطمینان نہ تھی۔ کیونکہ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جو ابتدائی احکام نافذ کئے ان میں سے ایک کا منشا یہ تھا کہ جن جن سڑکوں پر چوریاں اور ڈاکے واقع ہوتے تھے ان پر نگرانی کے انتظامات کی اصلاح کیجائے۔ یہ مشتبہ ہے کہ آیا اُسکے احکام موثر بھی تھے یا نہیں لیکن انکا نافذ کیا جانا خود بتاتا ہے کہ معمولی حالات میں [illegible]

(۱) سالبنک تو اس سے بھی زیادہ ناموافق تصویر کھینچتا ہے وہ کہتا ہے "یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سفر کرنے کے لئے دنیا کا کوئی ملک اس ملک سے زیادہ پُر خطر نہیں ہے جس کا باعث وہ کئی ہزار خون چوسنے والے بدمعاش ہیں جو جیتل کے ٹکڑے کے ایک سکے کے لئے جو ایک پنی کے بھی ایک ثلث حصہ کے برابر ہوتا ہے کسی انسان کا گلہ کاٹ ڈالتے ہیں"۔ (خطوط [illegible] ۱۹۶) لیکن سالبنک نے جس زمانے میں یہ لکھا اُس وقت شکایت کا جذبہ یہ اسپر غالب تھا۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ کمپنی کی خدمت میں اس کو جن خطرات سے دوچار ہونا پڑا انہیں بیان کرنے میں اس نے مبالغے سے کام لیا ہے۔

باب ۲

پانچویں فصل

چنگی اور محاصل راہداری

اب چند الفاظ اس معاوضہ کے متعلق بھی ضروری ہیں جو تجارت پیشہ اشخاص کو امن و حفاظت کے بدلے میں دینا پڑتا تھا۔ مرکزی نظم ونسق کا طرز عمل اس زمانے میں بہ حیثیت مجموعی تجارت خارجہ کے موافق تھا۔ اور محاصل چنگی کے جو پیمانے مقرر تھے وہ بدیہی طور پر معتدل تھے ابوالفضل بیان کرتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں محاصل ڈھائی فیصدی سے زیادہ نہ تھے۔ اور درحقیقت جو محاصل ادا کئے جاتے تھے وہ بھی جہاں تک ہم مطالعہ کرتے ہیں اس سے کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتے[1] لیکن بندرگاہوں پر مقامی عہدہ داروں کی شخصیت بہت زیادہ قابل لحاظ ہوتی تھی۔ بالخصوص اسلئے بھی کہ چنگی کے محاصل کا بالعموم ٹھیکہ دیدیا جاتا تھا گویا ہندوستانی اصطلاح میں یہ خدمتیں پختہ تھیں۔ ہر منفرد عہدہ دار چاہے تو تاجروں کو خوشی سے آنے دے اور ان کے واسطے جملہ تجارتی سہولتیں بہم پہنچادے۔ یا چاہے تو ان کے مال کو ملک میں داخل ہونے سے قطعاً روک دے۔ یا چنگی کے علاوہ ان کے منافع کا ایک بڑا حصہ اپنی ذات کے لئے طلب کرے۔ چنگی کے عہدہ دار کی حیثیت کی ایک عمدہ مثال مندرجۂ ذیل قصے سے ملتی ہے ۱۶۱۳ء میں انگریز تاجروں نے اس بات کی کوشش کی لاہیری بندر واقع دریائے انڈس میں تجارت شروع کریں۔ اس بندرگاہ میں پرتگالیوں کی تجارت پہلے سے قائم تھی اور دوسرے قوم کے تاجروں کی مسابقت پر ان لوگوں نے بہت سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے عامل کو دھمکی دی کہ اگر وہ انگریزوں کو تجارت کرنے کی اجازت دے گا تو وہ اسکی بندرگاہ کو چھوڑ دیں گے۔ اب عامل سخت مشکل میں پڑ گیا کیونکہ وہ بڑی بڑی رقمیں محصول کی بابتہ ادا کرتے تھے اور چونکہ "وہ بادشاہ سے اس بندرگاہ کی چنگی کا ٹھیکہ

(۱) فنچ کہتا ہے کہ سورت کے محاصل کی شرحیں مال واسباب پر ۲½ فی صدی اشیائے خوراک پر ۳ فی صدی اور زر پر ۲ فی صدی تھیں (پرچاس ۱۲۱ : ۴۲۳) سترھویں صدی میں ان شرحوں میں اضافہ کیا گیا لیکن وہ بھی کچھ بہت زیادہ نہ تھا۔ تھیونوٹ کے زمانے میں وہ ۴ اور ۵ فیصدی کے بین بین تھیں۔ (تھیونوٹ صفحہ ۵) ۱۶۱۶ء میں مچھلی پٹنم کے بندرگاہ پر شرحیں ۳½ سے ۵ فیصدی تک تھیں (خطوط موصولہ۔

باب ۲

لے چکا تھا جس کے معاوضے میں اُسے ہر سال ایک مقررہ رقم ادا کرنا لازمی تھا اس سے کچھ غرض نہ تھی کہ اُسے اسقدر آمدنی ہو یا نہ ہو لہذا ان کاروبار والوں کے حق میں احکام نافذ کرنے میں اُسے خبردار رہنا ضروری تھا"۔ چنانچہ وہ انگریز تاجروں کو داخلے کی اجازت دینے پر آمادہ تھا بشرطیکہ وہ اس بات کی ضمانت دیں کہ اُن کی تجارت پرتگالیوں کی تجارت سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ لیکن انگریز تاجر چونکہ اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتے تھے لہذا بغیر کوئی کاروبار کئے ہوئے وہ جنوب کی طرف روانہ ہوگئے۔ اُسی سال کمپنی کے تاجروں میں سے ایک شخص مسمی فلورس ساحل کارومنڈل سے اپنی ایک تحریر میں اُن خطرات پر زور دیتا ہے۔ جو عہدہ داران مجاز کی شخصیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عامل اگر چاہے تو کھلی تجارت کی اجازت دیدے یا خود اپنے لئے اس کا مطالبہ کر بیٹھے اور جملہ مال و اسباب حاصل کر کے اپنے ذاتی منافع کیلئے اس کو فروخت کرادے۔ اور اگر کہیں وہ اس آخری طریقے کو پسند کرے تو پھر عدم ادائی کا بھی خطرہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ "جب تک یہ عامل اپنی خدمتوں پر قائم رہتے ہیں اُن کے قرضے بھی ٹھیک رہتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں وہ مشتبہ ہوجاتے ہیں"۔ اس کے علاوہ ۱۶۱۶ء میں سورت کے تاجروں نے مقامی حکام کے طرز عمل کے خلاف ایک شکایت نامہ مرتب کیا تھا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ "عامل اور عہدہ دار چنگی عمدہ اور خاص خاص چیزیں جو محصول خانے میں لائی جاتی ہیں علیحدہ کر دیتے اور تاجروں کو قیمت ادا کئے بغیر انھیں اپنے گھروں کو روانہ کر دیتے ہیں اور مدت دراز کے بعد اگر کبھی قیمت ادا بھی کرتے ہیں تو اس کی شرح نہایت ادنی اور لاگت سے بھی بہت کم ہوتی ہے"۔ سر تھامس رو نے بھی یہ شکایت کی کہ عامل سورت نے تجارت شروع کرنے کی اجازت دینے سے قبل اس بات کا مطالبہ کیا کہ جو تحائف اُسے ابتداءً پیش کئے گئے تھے اُن سے بہتر تحائف دیئے جائیں۔ پس بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ محاصل چنگی کا مستند پیمانہ معمولی تاجروں کے تخمینوں میں بہت کم اہمیت رکھتا تھا جب کہ اس کا مقابلہ اُن مطالبات سے کیا جائے جن کی تکمیل کسی نہ کسی شکل میں مقامی عہدہ داروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی تھی

اس نتیجے کا اطلاق ان خاص خاص بندرگاہوں پر ہوتا ہے جو ہندوستانی حکمرانی کے ماتحت تھیں۔ جن مقامات پر پرتگالیوں کی حکومت تھی وہاں تاجروں کو اپنے مال کی لاگت غالباً اس سے بھی زیادہ پڑتی تھی۔ کیونکہ نظم و نسق بےحد بگڑا ہوا تھا اور اہم بندرگاہوں

باب ۲

کی نگرانی جن لوگوں کے سپرد ہوتی تھی انھیں اپنی ملازمت کی بدولت گویا بہترین مال غنیمت ہاتھ لگتا تھا۔ اس کے برعکس ملیبار کے بعض بندرگاہوں پر اس قسم کی خرابیاں بہت شاذ تھیں۔ یہ کیفیت خاص کر کالیکٹ کی تھی جو بحیرۂ احمر اور آبنائے ملاکا کے مابین بحری تجارت کی ترقی کی بدولت بہت خوشحال ہو گیا تھا۔ اور جہاں محصول خانے کی تنظیم کی بعض سیاحان یورپ یعنے پیرارڈ وغیرہ نے بیحد تعریف کی تھی۔

جہاں تک کہ اندرونی محاصل راہداری کا تعلق ہے تاجروں کیلئے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا اجنبی حالت اس سے بہت زیادہ ناموافق تھی۔ ملک کے روایات بھی حصول آمدنی کے اس طریقے کے موافق تھے اور اگرچہ محاصل راہداری وقتاً فوقتاً معاف کر دیئے جاتے تھے تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ وہی محاصل مختلف حکمرانوں کے زمانے میں متواتر معاف ہوتے جاتے تھے جس کی وجہ سے اس طرح کی رعایتوں کو زیادہ اہمیت دینا مشکل ہے۔ اکبر نے اپنے دور حکومت میں کم از کم دو مواقع پر محاصل راہداری معاف کیئے۔ اور جو شہادت موجود ہے اُس سے مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا یہ نتیجہ (۱) حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ "اس خود مختار بادشاہ کے مشفقانہ ارادے دور دراز مقامات کے عاملوں کی وجہ سے جنھیں اپنے زمانہ اقتدار میں عملاً کامل آزادی حاصل ہوتی تھی عام طور پر ناکامیاب رہتے تھے"۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان رعایتوں کے متعلق منشاہی یہ ہو کہ وہ محض عارضی رہیں۔ اور یقیناً کوئی تاجر حق بجانب نہ ہوتا اگر وہ ان رعایتوں کی پائداری پر بھروسہ کرتا۔ بہرصورت اسقدر تو ضرور واضح ہے کہ اکبر کے جانشین کے دور حکومت پر محاصل راہداری وصول کیئے جاتے تھے۔ گو یہ ممکن ہے کہ شاہی حسن ارادے تک نہ پہنچے ہوں۔ کیونکہ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جو احکام نافذ کیئے ان میں سے ایک کا منشا یہ تھا کہ سڑکوں اور دریاؤں کے محاصل اور اس کے ساتھ وہ عام محصول جو ہر صوبے اور ضلع کے جاگیرداروں نے اپنے ذاتی منافع کے لیئے عائد کر رکھے تھے موقوف کر دیئے جائیں" دریاؤں کے محاصل اور گھاٹوں کے استعمال کی فیس کے متعلق آئین میں صراحت کیساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اکبر نے انھیں برقرار رکھا تھا۔

جب ہم سرکاری یادداشتوں کو چھوڑ کر سیاحوں کی شہادت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس واقعے سے دوچار ہوتے ہیں کہ محاصل راہداری اس زمانے میں ایک ایسی عام بات تھی کہ

(۱) اکبر مغل اعظم صفحہ ۳۷۷۔

باب ۲

سڑکوں کے چوکیدار ناقابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے اور بعض بعض مقامات پر غالباً یہ عملدرآمد تھا کہ تاجروں کو بھاری رشوتیں ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، تاکہ جو سڑکیں خطرناک سمجھی جاتی تھیں ان پر ان کی نگہبانی کی جائے۔ ملک کے زیادہ ویران حصوں میں مقامی سرغنوں کو چوتھ ادا کیا جاتا تھا اور اس عادت کے زیادہ عام طور پر موجود ہونے کا پتا ہم شاید جہانگیر کے اس فرمان سے لگا سکتے ہیں جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ تاجروں کی گٹھڑیاں بغیر ان کی اطلاع اور اجازت کے سڑکوں پر نہ کھولی جائیں۔ بہر حال ایک نہ ایک صورت میں جو بار اندرونی تجارت پر حقیقی مصارف نقل و حمل سے بالکل قطع نظر عائد ہوتے تھے۔ وہ کافی اہم تھے لیکن جو کچھ مواد ہمیں میسر ہے اس سے اُن کی تعداد کا ہمیں ایک موہوم اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

باب ۲

ہندوستانی زندگی کی خصوصیات کے تذکروں میں اس کا حوالہ غیر متعلق تذکرہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اتفاقیہ اشاروں سے ہم اون کے وجود کا پتہ لگا سکتے ہیں مثلاً ایک پرتگالی پادری نے یہ شکایت کی تھی کہ اندرونی جہازوں پر ٹکس وصول کرنے کا عملوں میں جو عملدرآمد تھا ان میں بہت کچھ خیانت اور زبردستی کیجاتی تھی اسی طرح مانسریٹ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اکبر کے کیمپ میں ادنی قیمتوں کا رواج ایک حد تک اس بات کا نتیجہ تھا کہ جو اشیاء فروخت کے لئے لائی جاتی تھیں وہ ٹکس سے مستثنے ہوتی تھیں۔ اس سے تھوڑے زمانے کے بعد منڈی تھیوناٹ اور ٹیورنیر جیسے سیاح جو اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے حصوں میں محاصل راہداری کا ایک نہایت باقاعدہ انتظام قائم تھا۔ اور پادری سباسٹین جانریک ذکر کرتا ہے کہ لاہور سے وہانہ انڈس تک بہ حیثیت ایک کلیسائی کے سفر کرنے کے لئے اُسے جو پروانۂ راہداری عطا کیا گیا تھا اس کو کس طرح ایک ساتھی تاجر نے اثنائے سفر میں متعدد مطالبات سے بچنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

راہداری اور شہر کے محاصل وجیانگر میں سولھویں صدی کے دوران میں یقیناً بہت بھاری تھے جب کبھی کسی نئے شہر کی بنیاد ڈالی جاتی تو کوئی چیز محصول ادا کئے بغیر دروازے سے نہیں گذر سکتی تھی حتیٰ کہ مرد اور عورتیں بھی مال تجارت کی طرح محصول ادا کرتے تھے"۔ اور جہاں تک کہ دارالسلطنت کا تعلق ہے کوئی شخص اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ ٹکس کے ٹھیکہ داروں کو جو کچھ کہ وہ طلب کریں ادا نہ کردے اس صدی کے اختتام پر بھی پادری ہندوستان کے اس حصے میں پروانجات راہداری کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں تاکہ محاصل اور ٹکس کی بے انتہا تکلیف سے بچ سکیں۔ دکن کے بارے میں سولھویں صدی کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی ہے لیکن تھیونوٹ کے زمانے میں انتظام بے حد تکلیف دہ تھا چنانچہ اورنگ آباد سے گولکنڈہ جانے والی سڑک تیئیس لیگ کے فاصلے میں اس نے سولہ چوکیاں شمار کیں۔ پس ہندوستان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہوئے اس زمانے کا ہر تاجر یقیناً یہ تخمینہ کرتا ہوگا کہ اُسے دوران سفر میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا متعدد مرتبہ محصول ادا کرنا پڑے گا۔ البتہ اگر اتفاق سے اُس وقت کے مقامی عہدہ دار آزادانہ امدورفت کے حامی ہوں تو وہ کبھی کبھی محصول سے بچنے کی توقع کرسکتا تھا۔ پھر سرکاری محاصل سے قطع نظر دوسرے بار بھی موجود تھے۔ جن کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ ہم ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ

چھٹی فصل

تجارت وصنعت پر اثر

پچھلے عنوانات کے تحت جن حالات کی توضیح کی گئی ہے اور جو موجودہ زمانے میں تقریباً ناقابل برداشت معلوم ہوتے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ سولھویں صدی کے اواخر کی داخلی یا خارجی تجارت میں بہت زیادہ حائل نہیں ہوتے تھے۔ رشوتیں۔ تمغے تحائف بخشش جتنے کہ سر تھے ان سب کا لحاظ آمد ورفت کے حسابات میں کیا جا سکتا ہے۔ اور آخر میں خریداروں کو ان سب مصارف کا بار برداشت کرنا پڑتا تھا چنانچہ سورت کے انگریز کارکنوں نے کمپنی کو رپورٹ دی تھی کہ ہندوستانی تاجر "سفر کے خطرات وغیرہ کے باعث جب تک کہ بہت زیادہ نفع نظر نہ آئے کسی چیز کا لین دین نہیں کرتے" یہ رائے درحقیقت تمام صورت حالات کا خلاصہ ہے۔ چیزیں ایک مقام سے دوسرے مقام کو اس وقت تک نہیں لیجائی جا سکتی تھیں جب تک کہ تمام مصارف نکالنے کے بعد اس کاروبار سے کچھ منافع بچ نہ رہے۔ اور اگر مصارف زیادہ ہوتے تھے تو قیمت بھی اتنی گراں ہوتی تھی جو ان کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو۔ آج کل کی طرح اس وقت بھی ہر تاجر کی کامیابی کا دارومدار لاگت اور قیمت کا تخمینہ کرنے کی قابلیت پر ہوتا تھا اور مصارف کی ان مدوں کا تقریباً ٹھیک تخمینہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دولت مند تاجروں کو اس کے علاوہ ایک اور خطرہ کا بھی لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ سر تھامس رو بیان کرتا ہے کہ مغل بادشاہ اپنی تمام رعایا کا وارث تھا۔ اور اگرچہ یہ بیان بہت وسیع ہے تاہم یہ یقین ہے کہ بادشاہ امرا اور عہدہ داروں کے مال کیطرح زیادہ دولت مند تاجروں کا متروکہ مال بھی طلب کر سکتا تھا۔ لہذا اگر کوئی کامیاب تاجر اپنی دولت اپنے خاندان کو منتقل کرنا چاہتا تو اُسے اپنی حقیقی دولت پوشیدہ رکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ اور ہندوستان کے کم ازکم بعض حصوں میں تو یہ خطرہ محض موت تک محدود نہ تھا۔ چنانچہ ایک مشاہدہ کرنے والا یوں اظہار رائے کرتا ہے کہ جو تاجر دولتمند مشہور ہوتے تھے ان کو ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ وہ کہیں بھرے ہوئے اسپنج کیطرح استعمال نہ کئے جائیں یا موجودہ اصطلاح کے مطابق "نچوڑ نہ لئے جائیں" اور ہمیں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہے جو اس رائے کے خلاف کوئی قیاس ثابت کرے۔ دولتمند ہونا تو ٹھیک تھا لیکن اپنی دولت

باب ۲

سے دوسروں کو واقف کرانا پڑا تھا۔ "خواہ منافعہ کتنا ہی کثیر ہو جس شخص نے اسے کمایا ہے اس کو چاہئے کہ اب بھی افلاس ہی کا لباس پہنے رہے"۔

ظاہر ہے کہ یہ حالات سرمایہ داری کی بنیاد پر صنعت و حرفت قائم کرنے کے لئے بہت ہی ناموافق ہیں۔ جب کہ نظم و نسق کا چٹکی بجاتے خاتمہ ہو سکتا تھا یا مقامی عہدہ داروں کی تبدیلی اُسے کسی وقت بھی تباہ کن استحصال بالجبر کا شکار بنا سکتی تھی تو پھر کسی دولت مند شخص کا اصل قائم میں کثیر سرمایہ لگا دینا انتہا درجہ خلاف عقل ہو گا۔ لیکن اس مسئلہ کی اس وقت کوئی عملی اہمیت نہ تھی کیونکہ سرمایہ داری کے کاروبار کا آفتاب ابھی طلوع ہی نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی صنعتی پیداوار گو کثیر اور قیمتی تھی تاہم جہاں تک ہم معلوم کر سکے ہیں وہ کلیتاً دستکاروں کے ہاتھوں میں تھی جن کی مالی امداد غالباً تجار یا درمیانی اشخاص کرتے تھے اور جو انفرادی طور پر اتنی اہمیت نہ رکھتے تھے کہ اعلیٰ عہدہ داروں کی مخالفت یا حرص و طمع کا مورد بن سکیں۔ بلاشبہ شہری دستکار کو اس بات کی ضرورت رہتی تھی کہ کوتوال کی طرف سے جو ماتحت ملازمین اور جاسوس مقامی نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے تھے انھیں اپنے موافق بنا رکھے اور شہروں سے باہر بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کو راضی رکھنا پڑتا تھا۔ تاہم یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ یہ معاملات رسم و رواج کی بنا پر طے کر لئے جاتے تھے اور یہ کہ حالت خاص طور پر ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دیہاتی کاشتکار جو آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی آبادی کا اہم ترین طبقہ خیال کئے جاتے تھے نظم و نسق کی خوبی یا برائی سے بہت زیادہ براہ راست متاثر ہوتے تھے۔ لیکن زیادہ سہولت اس میں ہے کہ ان کی حالت کا مطالعہ اس وقت کے لئے ملتوی کیا جائے جب کہ ہم ہندوستان کی زراعت اور طریق مالگزاری کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔ (۵۲)

پیچیدگیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اکبر کی جاری کردہ تبدیلی سے قبل شمالی ہند کے سب سے زیادہ عام من کا وزن تقریباً ۲۸ یا ۲۹ پونڈ معلوم ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک پونڈ ۱۶ اونس کے مساوی ہوتا ہے۔ اکبر نے سیر کا وزن ۳۰ دام مقرر کیا اور دام ایک اہم تانبے کا سکہ تھا۔ اس طرح ۴۰ سیر کا ایک من وزن میں ۳۸۸۲۷۵ گرین یا عملاً ۵۵½ پونڈ (فی پونڈ ۱۶ اونس) کے برابر ہوتا تھا۔ اور معمولی سرسری موازنوں کے لئے اس کو ۵۶ پونڈ یا ٹھیک نصف ہنڈرڈ ویٹ کے مساوی خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اکبری ۴۰ من کا وزن ایک ٹن کے برابر ہوتا حالانکہ آج کل جو من عام طور پر مستعمل ہے ویسے صرف ۲۷ من ایک ٹن کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ فرض کر لینا ٹھیک ہے کہ آئین اکبری میں یا جو ایک سرکاری یادداشت ہے جو من استعمال کیا گیا ہے وہ یہی من ہے۔ اس کے علاوہ ایسی شہادت موجود ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دارالسلطنت کے پڑوس میں تجارتی کاروبار کے اندر وہی استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن سلطنت کے دور دراز حصوں میں اس کا رواج نہیں ہوا۔ سورت اور کھمبے کی دوسری بندرگاہوں میں عام طور پر دو طرح کے من استعمال ہوتے تھے۔ چھوٹا من ۲۷ پونڈ کا تھا اور بڑا تقریباً ۳۳ پونڈ کا آخر الذکر کا ہر سیر وزن میں ۱۴ دام کے برابر تھا اور اس تعلق کا علم بعض قدیم ترین انگریز تاجروں کو تھا۔ لہٰذا مغربی ساحل کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت چھوٹا مقامی من ایک چوتھائی ہنڈرڈ ویٹ کے اور بڑا من ۲/۷ ہنڈرڈ ویٹ کے مساوی تصور کیا جائے۔

جنوب میں کم از کم گوا تک لوگ من سے واقف معلوم ہوتے تھے۔ اور یہاں وہ ۲۵ اور ۳۰ پونڈ کے مابین کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ لیکن جنوبی ہند میں وزن کی جو اکائی بہت زیادہ عام طور پر بیان کی جاتی ہے وہ کھنڈی ہے اور اگرچہ یہ بھی بہت کچھ کم و بیش ہوتی رہتی تھی تاہم اس کا وزن ۵۰۰ پونڈ کے لگ بھگ مانا جا سکتا ہے۔ بہار کا بھی بار بار حوالہ دیا جاتا ہے یہ ایک اجنبی اکائی تھی جس کو عربوں نے بحیرۂ ہند کے طول و عرض میں جاری کر دیا تھا۔ اس کا وزن تجارتی رسم و رواج کے مطابق جو مختلف اشیاء کی فروخت سے متعلق ہوتے تھے کم و بیش ہوتا رہتا تھا لیکن بالعموم وہ کھنڈی سے کم رہتا تھا۔ ہم عصر مصنفین یورپ قنطال کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو ۱۳۰ پونڈ کے قائم مقام تھا اور ایک ہنڈرڈ ویٹ سے کسی قدر بڑا مانا جا سکتا ہے آخر میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اسناد میں خود پونڈ کے ہمیشہ ایک معنے نہیں لئے گئے ہیں (۵۴)

ساتویں فصل

اوزان پیمانے اور زر

حالات نظم و نسق کا مضمون ختم کرنے سے پیشتر یہ مناسب ہوگا کہ اوزان، پیمانے اور زر کے انتظامات کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔ مختلف ہندوستانی حکومتیں ان چیزوں کو باقاعدہ حالت میں رکھنے کا کم از کم جزئی طور پر تو پہلے ہی سے انتظام کرتی تھیں۔ لہٰذا ہم عصر اسناد کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے اس سے کچھ واقفیت ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک تفصیلی معاملہ ہے لہٰذا جو ناظرین خود ان اسناد کے مطالعہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے وہ اس عنوان کو بہ آسانی چھوڑ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کی طرح سولھویں صدی میں بھی اوزان و پیمانہ جات کے ہندوستانی طریقوں کی نمایاں خصوصیت ان کے اختلافات ہیں۔ آج کل کی طرح اس وقت بھی قدیم مقامی معیار سرکار کے مقرر کردہ معیاروں کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ پیمانوں میں بمقابل اکائیوں کے عام طور پر زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک من کے عام طور پر چالیس ہی سیر ہوتے ہیں لیکن من کا وزن اور اسی وجہ سے سیر کا وزن ہر جگہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات بندرگاہوں پر اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جہاں اجنبی تاجروں کی جاری کردہ اکائیاں مقامی طریقوں کے پہلو بہ پہلو قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن تمام ہم عصر اسناد میں جہاں کہیں مقداریں بیان کیجاتی ہیں وہاں اس اکائی کی تحقیق ضروری ہے جس کا حوالہ دیا جاتا ہے بظاہر ہندوستان کے اکثر و بیشتر نظم و نسق اسی حالت پر قانع تھے چنانچہ ہمیں کہیں کوئی ایسی یادداشت نہ ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ وجیانگر یا دکن کی سلطنتوں میں اوزان و پیمانہ جات کی یکسانیت حاصل کرنے کے لئے کوشش کی گئی ہو۔ اکبر نے البتہ اس بارے میں زیادہ جدید طرز عمل اختیار کیا اور وزن، طول اور سطح کی پیمائش کی خاص خاص اکائیاں مقرر کیں۔ اس میں شک نہیں کہ دار السلطنت کے پڑوس میں تو اس کی اکائیاں استعمال ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا اس کی وفات کے وقت تک وہ بندرگاہوں میں قائم نہیں ہوئی تھیں اور گمان غالب یہ ہے کہ زمانۂ مابعد کے اکثر واقعات کی طرح اسکی اصلاح کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ مسابقت کرنے والی اکائیوں کا ایک اور سلسلہ جاری ہو جانے سے سابقہ (۵۳)

باب ۲

اُس زمانے کے انگریز مصنفین پونڈ سے ۱۶ اونس کا پونڈ مراد لیتے ہیں جو کہ اب بھی استعمال میں ہے۔ لیکن فرانسیسی سے جو ترجمے کئے گئے ہیں ان میں یہ لفظ لیورے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ ایک اکائی تھی جو وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں تقریباً نصف جدید کیلو گرام یا یوں کہئے ۱٫۱ پونڈ کے مساوی تھی۔ اس قسم کے اختلافات ممکن ہے کہ خاص خاص بیانات کی توجیہ میں اہمیت رکھتے ہوں لیکن اُس زمانہ کے معاشی حالات کے ایک عام مطالعے کے لئے غالباً یہ ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ پونڈ کے جو معنے آج کل لئے جاتے ہیں وہی اس زمانہ میں بھی لئے جاتے تھے اور یہ کہ من سے مراد مغلیہ دارالسلطنت اور اس کے قرب و جوار میں ۵۶ پونڈ اور دوسرے مقامات پر تقریباً ۳۰ پونڈ ہوتی تھی اور کھنڈی اور بہار سے مراد اس سے بہت بڑی بڑی مقداریں تھیں جو تقریباً $\frac{1}{5}$ یا $\frac{1}{4}$ ٹن کے برابر ہوتی تھیں۔

طول کی اکائی شمالی ہند میں گز تھی۔ اور اس لفظ کا ترجمہ انگریزی میں اکثر (yard) کیا گیا ہے لہٰذا اس اکائی کا یہی مفہوم لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک اہم اختلاف ہے۔ گز کی تاریخ آئین اکبری میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں اسقدر کہنا کافی ہے کہ اکبر نے آخر میں ایک درمیانی اکائی جاری کی تھی جس کا نام اس نے الٰہی گز رکھا تھا اور جو ۳۰ $\frac{3}{4}$ انچ کے برابر تھی۔ شمالی ہند میں اس اکائی کے درحقیقت مستعمل ہونے کا پتا پرنسپ کے ۱۸۳۴ء والے اس بیان سے لگتا ہے کہ "شمالی صوبوں کے معیار کی حیثیت سے وہ بہت بڑی حد تک اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے"۔ لیکن مغربی ساحل کے تجارتی مرکزوں میں وہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہاں جملہ کاروبار کواد کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ مال تجارت کی نوعیت کے ساتھ کواد کا طول بھی بدلتا جاتا تھا۔ سوتی کپڑے کے لئے اس کا طول تقریباً ۲۶ انچ تھا اور اونی کپڑوں کے لئے اس سے زیادہ یعنے تقریباً ۳۵ انچ یا "ایک انچ کم ایک گز" تھا۔ بہرحال یکسانیت کی توقع نہیں کیجا سکتی تھی اور جس تاجر نے سورت میں کواد کی اس طرح توضیح کی ہے وہ شبہ ظاہر کرتا ہے کہ آیا بروچ میں بھی کواد کا تخمینہ یہی ہوگا۔ لہٰذا اوزان کی طرح پیمانوں کے متعلق بھی ہر تاجر کا یہ کام تھا کہ جس جس بازار میں وہ لین دین کرنا چاہے وہاں کی مروجہ اکائی کا تخمینہ معلوم کرے۔ اب جہاں تک سطح کی پیمائش کی اکائی کا تعلق ہے اسکی اہمیت صرف اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کہ ہمیں اُن اعداد و شمار کی توضیح کرنا ہو جو رقبے کے متعلق اُس زمانے میں بیان کیے گئے تھے لہٰذا اوس پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ہمیں مزید توقف کرنے کی ضرورت ہے۔

باب ۲

اوزان و پیمانہ جات کی طرح زر کے معاملات میں بھی اکبر ہی کے نظم ونسق نے رہنمائی کی ہے۔ اور شاہی ٹکسالوں کی جو مفصل کیفیت آئین اکبری میں بیان کی گئی ہے اس کی بدولت ہم سلطنت مغلیہ کے طریق زر کا ٹھیک ٹھیک تصور کر سکتے ہیں۔ جو سکے باقاعدہ استعمال میں تھے وہ چاندی اور تانبے کے تھے۔ طلائی سکے بھی ڈھالے جاتے تھے لیکن ان کی چھپیں قسموں میں سے اکثر و بیشتر محض شوق پر مبنی تھیں۔ اور جو تین قسمیں پابندی کے ساتھ ڈھالی جاتی تھیں وہ بھی شاذ و نادر ہی استعمال کیجاتی تھیں کیونکہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کے لئے وہ بہت بڑے تھے اور ان کی جو کچھ طلب بھی وہ زیادہ تر جمع کرنے کی غرض سے ہوتی تھی۔ خاص نقرئی سکہ ۱۷۸ گرین کا روپیہ تھا جو وزن میں (نہ کہ قوت خریدمیں) بالکل اس سکے کے مماثل تھا جو آج کل اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تانبے کا خاص سکہ دام تھا۔ اور پھر ہر ایک کے کچھ معاون سکے بھی تھے چنانچہ قلیل ترین نقرئی سکہ روپیہ کے بیسویں حصے کے برابر تھا اور تانبے کا قلیل ترین سکہ دام کے آٹھویں حصے کے مساوی تھا۔ تانبے کے سکے آج کل کیطرح زر وضعی نہیں تھے بلکہ نقرئی سکوں کیطرح وہ بھی اپنی قدر فلزاتی کے مطابق رائج رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو (بلکہ طلائی سکوں سمیت تین) جداجدا معیار موجود تھے جن کے باہمی مبادلے کی شرحیں ایک وقت سے دوسرے وقت میں یا ایک مقام سے دوسرے مقام پر بدلتی رہتی تھیں۔ سرکاری حسابات میں چالیس تانبے کے دام ایک روپیہ کے برابر سمجھے جاتے تھے اور شرح کی کمی بیشیاں کم از کم شمالی ہند کے اندر اس زمانے میں اہم نہیں تھیں۔ البتہ مستقر سلطنت اور مغربی ساحل کی مروجہ شرحوں میں بدیہی طور پر ایک دائمی اختلاف کی سی حالت موجود رہتی تھی اور یہ اختلاف دونوں دھاتوں کی رسد کے حالات کا نتیجہ تھا۔ سکہ سازی میں جو چاندی استعمال ہوتی تھی اس کی درآمد سمندر کے راستے سے ہوتی تھی اور اندرون ملک لیجانے کے مصارف اس پر عائد ہوتے تھے۔ اس کے برعکس تانبا راجپوتانے کی کانوں سے حاصل کیا جاتا تھا اور جتنا جتنا وہ جنوب کی طرف لیجایا جاتا تھا اسکی قدر میں اضافہ ہوتا جاتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ ایک ہی وقت میں ایک روپیہ کا مبادلہ دہلی یا آگرے میں بہ مقابل سورت یا کھمبے کے زیادہ داموں سے ہوتا تھا لیکن یہ اختلاف بہت بڑا نہیں تھا۔ اور عام ناظرین بغیر کسی اندیشے کے چالیس دام کو ایک روپیہ کے مساوی خیال کر سکتے ہیں۔ خاص کر اسلئے کہ گجرات میں جو اس وقت بحری تجارت کا خاص مرکز تھا اس زمانے میں روپیہ کا استعمال اختیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ جملہ کاروبار محمودی کے ذریعے سے انجام پاتے تھے جو نصف روپیہ سے بھی کم قدر کا ایک نقرئی سکہ تھا۔ ہمعصر انگریزی زر کے لحاظ سے روپیہ ۲ شلنگ ۳ پنس کے اور محمودی تقریباً

انیس کے مساوی ہوتے تھے لیکن ان میں سے ہر ایک میں کافی بڑی بڑی کمی بیشیاں ہوتی تھیں۔

شاہی حسابات کی تفصیلی مدوں کے لئے یا روزانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے کاروبار کیلئے تانبے کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ (دمڑی یا دام کا آٹھواں حصہ یا روپیہ کا $\frac{1}{320}$) بھی ناکافی تھا پہلی غرض کے لئے دام کاغذ پر پچیس جیتال میں منقسم کر دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ایک روپیہ کے ہزار دیں حصے تک بھی حسابات رکھے جاسکتے تھے۔ آخری غرض کے لئے کوڑیاں استعمال ہوتی تھیں جیسا کہ اب بھی رواج ہے۔ اور انکی قدر چاندی یا تانبے کے مقابلے میں اس فاصلے پر منحصر ہوتی تھی جو ساحل سے ہوتا تھا۔ اسکے برخلاف زمانۂ حال کے کرنسی نوٹوں کے مماثل بڑی بڑی مقداروں کے اجتماع کا کہیں کوئی نشان نہیں ملتا۔ جن تاجروں کو بڑی بڑی رقمیں بھیجنی ہوتیں وہ بالعموم ہنڈیوں کے ذریعے سے بھیج سکتے تھے ورنہ موتی یا سونا چاندی لے جاسکتے تھے تاکہ انھیں منزل مقصود پر پہنچکر فروخت کر دیں۔ مزید براں روپیہ کی اعلیٰ قوت خرید کیوجہ سے رقوم کے اجتماع کی ضرورت بھی بہت کچھ گھٹ گئی تھی۔ اس بارے میں کامل صحت کیساتھ کچھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے لیکن آئین اکبری میں قیمتوں کے جو اعداد و شمار درج ہیں ان کی تنقیح کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے اختتام پر دارالسلطنت کے قرب و جوار میں ایک روپیہ میں جسقدر اناج ملتا تھا وہ اس مقدار سے کم از کم سات گنا زیادہ تھا جو شمالی ہند میں سنہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان خریدی جاسکتی تھی اسی طرح روغن ارتخم گیارہ گنا اور کپڑا غالباً پانچ گنا زیادہ ملتا تھا۔ اس کے برخلاف دھاتیں اب سے کچھ زیادہ سستی نہ تھیں اور اشیائے درآمد تو درحقیقت زیادہ گراں فروخت ہوتی تھیں۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفلس ترین طبقوں کے حق میں سنہ ۱۶۰۰ء کا ایک روپیہ ۱۹۱۲ء کے سات روپیوں کے برابر قدر رکھتا تھا۔ جو طبقے انتہائی افلاس کی حد سے ذرا اوپر تھے ان کے حق میں وہ تقریباً چھ روپے کے برابر تھا اور متوسط طبقوں کے لئے وہ تقریباً پانچ روپیہ یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ کے برابر تھا۔ لہٰذا عام اغراض کے لئے یہ خیال کرنا (کم از کم اس وقت تک جب تک کہ جدید مواد کے انکشاف سے یہ نتائج غلط نہ ثابت ہو جائیں) قرین عقل ہے کہ اکبر کا ایک روپیہ قوت خرید میں زمانۂ قبل از جنگ کے چھ روپیوں کے برابر تھا۔ یا بالفاظ دیگر یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ پانچ روپیہ کی ماہانہ آمدنی سے ضروریات کی اسیقدر مقدار میسر آسکتی تھی جسقدر کہ ۱۹۱۲ء میں تیس روپے کی آمدنی سے خریدی جاسکتی تھی۔

باب ۲

(۵۷)

اس زمانے میں جنوبی ہند کا زر سلطنت مغلیہ کے بالکل برعکس خاصکر سونے پر مبنی تھا اور سونا ہی وہاں کا خاص زر مروجہ تھا۔ معیاری سکہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا کبھی وہ وَراہو کہلاتا تھا اور کبھی ہن۔ لیکن اہل یورپ کی تحریروں میں اسے عام طور پر پیگوڈا کہا گیا ہے اور اس کی اوسط قدر اکبر کے تقریباً ساڑھے تین روپیوں کے برابر سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چھوٹا طلائی سکہ تھا جو فانم کہلاتا تھا اور چاندی اور تانبے کے معاون سکے بھی رائج تھے مگر ان کے نام اور ان میں سے ہر ایک کی قدر ہمارے موجودہ اغراض کے لئے غیر ضروری ہے۔ ان ملکی سکوں کے علاوہ ساحلی تجارت کا بہت بڑا تعلق غیر ملکی سکوں سے بھی تھا۔ تاریخ کے ہر دور کی طرح سولھویں صدی میں بھی ہندوستان کی تجارت زیادہ تر نقد کے عوض ہوتی تھی۔ یعنے سونا چاندی خواہ مسکوک یا غیر مسکوک یہاں کی ایک خاص اور اہم درآمد تھی۔ اور جو شخص بیرونی تجارت میں حصہ لینا چاہتا تھا اُسے مختلف ممالک کے زروں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اور کم از کم لارن۔ سکوین۔ ڈوکاٹ اور اسپین کے ریال ہشت سے مانوس ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ پرتگالیوں نے گوا میں جو کسیقدر پیچیدہ انتظام قائم کر رکھا تھا اس سے بھی آشنا ہونا لازمی تھا۔

لارن ایرانی زر تھا جو اس ملک کے ساتھ تجارت قائم ہونے کی وجہ سے بڑی بڑی مقداروں میں ہندوستان پہنچا تھا اس لفظ کے معمولی مفہوم کے مطابق تو وہ کوئی سکہ نہیں تھا بلکہ وہ چاندی کا ایک خمیدہ ٹکڑا یا سلاخ تھی جس کے کنارے پر مہر لگی ہوتی تھی اور جس کی قدر اکبر کے نصف روپیہ سے بھی کم تھی)۔ سکوین (یا چکین) ونیس کا ایک طلائی سکہ اکبر کے تقریباً چار روپیوں کے برابر تھا اور یورپ کے ساتھ خشکی کی تجارت کے سلسلے میں بحیرۂ احمر یا خلیج فارس کے راستے سے ہندوستان تک پہنچا تھا۔ اٹلی کے ڈوکاٹ بھی اسی راستے سے آئے تھے۔ طلائی ڈوکاٹ کی قدر تقریباً اتنی ہی تھی جتنی کہ سکوین کی۔ اور نقرئی ڈوکاٹ کی قدر تقریباً اکبر کے نصف یا اکبر کے دو روپیوں کے مساوی تھی اس کے برعکس اسپین کے ریال ہشت[1] ہندوستان کو

(۱) ہمعصر مصنفین نے ریال ہشت جو نام استعمال کیا ہے اُس سے دھوکہ ہونے کا اندیشہ ہے ان سکوں کی تشریح کا زیادہ مناسب طریقہ یہ ہوتا کہ انھیں آٹھ آٹھ ریال کے سکے کہہ دیا جاتا۔ اسپین کے ریال کی قدر انگریزی زر میں چھ پنس سے کسیقدر زیادہ ہوتی تھی اسطرح آٹھ ریال کا ایک سکہ تقریباً چار شلنگ اور چھ پنس یا عملاً دو روپیوں کے مساوی ہوتا تھا۔

باب ۲ خاصکر سمندر کے راستے سے پہنچے تھے۔ ان کی قدر بھی تقریباً اتنی ہی تھی جتنی کہ نقرئی ڈوکاٹ کی تھی۔

گووا کا طریق زر ایک نہایت ہی پیچیدہ مضمون ہے خاصکر اس وجہ سے کہ یکے بعد دیگرے متواتر حاکموں نے مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سکہ سازی میں بہت کچھ رد و بدل کئے جنکی وجہ سے گو قدر میں بار بار کمی بیشیاں ہوتی تھیں تاہم عام رجحان متواتر تخفیف ہی کی طرف تھا۔

(۵۰) یہ انتظام ایک اکائی پر جو ریال کہلاتی تھی مبنی تھا لیکن یہ ریال اسپین کے ریال سے بہت چھوٹا تھا کیونکہ وہ ایک پنی کے چھوٹے سے جزکے برابر ہوتا تھا۔ لیکن معیاری سکہ دراصل پرڈاؤ تھا جو کہ ابتداءً پگوڈا کے مماثل تھا۔ ۱۶۰۰ء کے قریب قریب ریال اور اس کے ساتھ ساتھ طلائی پرڈاؤ دونوں کی قدر میں تخفیف ہو چکی تھی یہاں تک کہ پگوڈا بجائے ۳۶۰ کے ۵۷۰ ریس[1] کے مساوی ہو گیا تھا۔ اور اسطرح طلائی پرڈاؤ کی قدر اسوقت اکبر کے تقریباً سواد و روپیوں کے برابر تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک اور پرڈاؤ جو طلائی نہیں تھا اور جو قدر میں کسیقدر ادنیٰ تھا وجود میں آگیا تھا۔ پس عملاً اس زمانہ کا ایک پرڈاؤ دو روپیوں کے برابر خیال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب طلائی پرڈاؤ کی خصوصیت کردی جائے تو وہ سواد و روپیوں کے مساوی سمجھا جاسکتا ہے۔

ہمیں ایسا کوئی مواد نہیں مل سکا جو جنوبی ہند میں ان سکوں کی قوت خرید کے ایک سرسری تخمینے کے لئے بھی کافی ہو سکے۔ مختلف سیاح اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ سورت اور اسکے پڑوس میں قیمتیں ادنیٰ تھیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یورپ اس زمانے میں امریکہ سے چاندی کی متواتر درآمد کے اثرات محسوس کر رہا تھا۔ لہذا منفرد سیاحوں کے ذہنوں میں جو خاص خاص معیار تھے ان کا پتا لگانا انتہا درجہ مشکل ہے بعض اعداد جو ابتدائی انگریز تاجروں کے بیان کردہ ہیں یہ پتہ دیتے ہیں کہ قیمتیں سورت میں بمقابل شمالی ہندوستان کے بہت اعلیٰ تھیں لیکن اس قسم کے جدا جدا کاروبار کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنا خلاف احتیاط ہے خاصکر

(۱) ریس پرتگالی لفظ ریال کی جمع ہے۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں پرتگالی ریال کی قدر تقریباً ۰۲۷ء یا ۰۲۸ء پنی کے برابر تھی لیکن سنہ ۱۶۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس کی قدر میں ۰۱۶ء پنی تک تخفیف ہو چکی تھی۔

باب ۲

اس وجہ سے کہ یہ تجار اجنبی تھے۔ اور یہ کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ انھیں دھوکہ دیا گیا ہو۔ مزید برآں جیسا کہ آئندہ کسی باب میں ظاہر ہوگا بندرگاہوں کی تجارت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بہت ہی ناگہانی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ لہذا ایسے اعداد استعمال کرنا جو غیر معمولی حالات کی خریداریوں کو ظاہر کرتے ہوں خطرناک ہوگا۔ یہ ضرور قرین قیاس ہے کہ ساحل پر بہ مقابل اندرون ملک کے قیمتیں زیادہ اعلیٰ تھیں لیکن جب تک کہ مزید مواد حاصل نہ ہو اس فرق کی تعداد بیان نہیں کیجا سکتی۔

یہ محسوس ہوا ہوگا کہ ہم نے ہندوستان کے مختلف مروجہ سکوں کے معادل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ فروگذاشت سوچ سمجھکر کی گئی ہے کیونکہ کاروبار چلانے کے جو طریقے رائج تھے ان کے تحت سکے بلا روک ٹوک نہیں چلتے تھے۔ بلکہ تونا اور پرکھنا معمولی کاروبار کے ضروری اجزا تھے۔ اب کسی خاص سکہ یا سکوں کے مجموعے کی قدر یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو اکثر و بیشتر باہمی گفت و شنید سے طے ہوتا تھا۔ بیرونی ممالک کے سکے اس دھات کی قدر کے لحاظ سے جو ان میں موجود ہوتی تھی حاصل کئے جاتے تھے اور اسی وجہ سے نئے سکوں کی قدر بمقابل اُن سکوں کے جو استعمال سے گھس جاتے تھے زیادہ ہوتی تھی۔ سابقہ حکمرانوں کے ہندوستانی سکے بھی انہی شرائط پر قبول کئے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود اس زمانہ کے مروجہ سکوں پر بھی اگر کسی وجہ سے اُن کی دھات کی مقدار مسلمہ معیار سے کم ہو جائے تو بٹہ لگ جاتا تھا۔ اکبر نے اس خرابی کی اصلاح کی جو کوششیں کیں ان کی طویل کیفیت آئین اکبری میں درج ہے جس کا مطالعہ کرنے سے صورت حال کا ایک سرسری تصور ہو سکتا ہے۔ مروجہ سکوں کی قدر معلوم کرنے کے قواعد میں متعدد معقول پر تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ لہذا دوسری اکثر و بیشتر صورتوں کی طرح اس صورت میں بھی ابوالفضل کے اس درباری اظہار طمانیت کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے کہ جدید قواعد و ضوابط عام طور پر پسند کئے گئے تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم ان قواعد کو بدعنوانیوں کی موجودگی کا ثبوت تصور کریں لیکن ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ ان کے عملدرآمد سے تمام سلطنت کے طول و عرض میں دیانتداری قائم ہو گئی تھی۔ برخلاف اس کے اُن سے جو باتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ٹکسال کے عہدہ داروں پر ہلکے سکے جاری کرنے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ سرکاری خازنوں کو جو سکے وصول ہوتے تھے وہ اس کا وزن گھٹا دیتے تھے۔ اور یہ کہ لین دین کرنے والے اشخاص بھی اسی طرز عمل کی پیروی کرتے تھے اور غلط اوزان بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن سے

(۵۹)

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خازن کبھی کبھی اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ سرکاری مطالبات خاص خاص قسم کے سکوں سے ادا کئے جائیں۔ اور یہ غالباً وہ سکے ہوتے تھے جن کا انھیں یا انکے احباب کو عارضی طور پر مقامی اجارہ حاصل ہوتا تھا۔ مزید براں قابل اجازت تخفیف وزن کے بارے میں جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی کوئی پروا نہیں کیجاتی تھی۔ لہذا یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے کہ روپیہ کے لین دین کا کاروبار سارے ہندوستان میں بہت ہی ترقی یافتہ حالت میں تھا اور سیاحوں نے تجارت کے تمام مرکزوں پہ اس طرح کے ماہر بیوپاریوں کو موجود پایا۔

لہذا جن حالات میں کاروبار کئے جاتے تھے اُن کو معلوم کرنے کے لئے یہ ذہن نشین کرلینا مناسب ہے کہ اس زمانہ میں سکے قدر کے معینہ معیار نہیں تصور کئے جاتے تھے۔ بلکہ وہ بھی ایک قسم کا مال تجارت سمجھے جاتے تھے اور ان کے معاوضہ میں دوسری اشیاء کی جو مقدار دیجاتی تھی اس کا دارومدار پیش کردہ سکوں کے وزن اور ان کی مقدار پر ہوتا تھا۔ جو تاجر بشکل زر مطالبات ادا کرنا چاہتا وہ گویا درحقیقت ایک خاص قسم کا بارٹر (مبادلہ شے بہ شے) کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ فریق ثانی عام طور پر زر قبول کرلیگا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زر بہ حیثیت دھات کی ایک معینہ مقدار کے قبول کیا جائے گا۔ اور یہ کہ معاملہ مکمل ہونے سے پیشتر دھات کی مقدار متعین کرلینا پڑیگی۔ جدید حالات سے مانوس ہونے کی وجہ سے ناظرین کو کاروبار کا یہ طریق حد درجے کا تکلیف دہ اور مشکل معلوم ہوگا لیکن غالباً یہ فرض کرلینا غلطی ہے کہ سترھویں صدی کے تاجر بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ میں یاد نہیں پڑتا کہ ارباب یورپ کے تذکروں میں اس بارے میں کہیں کوئی شکایت درج ہو۔ اور جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے وہ اس انتظام سے مانوس ہوں گے اور ہمارے خیال میں غالباً وہ اس کو اپنے کاروبار کا ایک ضروری جسز و تصور کرتے ہوں گے۔ جو مختلف سکے ان کے ہاتھوں سے گذرتے تھے ان کا ایک کم وبیش صحیح تناسب ان کی نظر میں موجود رہتا تھا اور یہ سونے یا چاندی کی اس مقدار پر مبنی ہوتا تھا جس کی ان سکوں میں توقع کی جاتی تھی۔ لیکن کسی خاص معاملے میں جو سکے دیئے جاتے تھے اُن کی تو ٹھیک ٹھیک قدر معلوم ہی کرنی پڑتی تھی۔

(۶-۱)

ہم نے اسی کم وبیش صحیح تناسب کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو طالب علم ہندوستانی

اس زمانے کی معاشی حالت کا ایک عام خاکہ نظر میں لینا چاہیے۔ اس کے لئے غالباً سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ اکبر کے روپیہ کو معیار بنائے اب جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے اُسے صرف اس قدر یاد رکھنا کافی ہے کہ ایک روپیہ تقریباً چالیس تانبے کے داموں کے برابر تھا اور ایک معمولی طلائی مہر تقریباً دس روپیوں کے برابر تھی۔ لیکن ان سکوں کی قوت خرید موجودہ صدی کی حالت کے مقابلہ میں تقریباً چھ گنی زیادہ تھی۔ جنوب کی طرف بڑھنے پر نقرئی محمودی (روپیہ سے تقریباً ڈھائی گنی زیادہ) اور طلائی وراہو یا پگوڈا (تقریباً ساڑھے تین روپیوں کے برابر) نظر آنے لگتے تھے۔ بیرونی نقرئی سکوں کے متعلق یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ لارن اور محمودی تقریباً برابر برابر تھے اور اطالوی ڈوکاٹ اور اسپینی ریال ہشت ہر ایک تقریباً دو روپیوں کے مساوی تھا۔ طلائی سکوں میں سیکوین اور ڈوکاٹ ہر ایک تقریباً چار روپیوں کے برابر تھا اور جہاں تک گوا کے سکے پرڈاؤ کا تعلق ہے وہ طلائی ہونے کی صورت میں سوا دو روپیوں کے برابر ورنہ قریب قریب دو روپیوں کے مساوی ہوتا تھا۔ جنوبی ہند میں ان سکوں کی قوت خرید کے متعلق اس وقت جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انکی قدر متعارف میں اس حد تک اضافہ نہ ہونا چاہیئے جس حد تک کہ شمالی ہند کے روپیہ میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کس تناسب سے اضافہ ہونا چاہیئے وہ اس وقت تک مشتبہ رہیگا جب تک کہ کچھ مزید مواد دستیاب نہ ہو۔

اسناد برائے باب دوم

(۶۱) **فصل ۱:-** وجیانگر کے نظم و نسق کیلئے ملاحظہ ہو سیویل صفحہ ۳۷۳۔ دکن کے لئے ملاحظہ ہو باربون صفحہ ۲۰۹ اور تھیونوٹ صفحہ ۲۷۹ و ۳۰۱ تا ۳۰۷۔ اکبر کے طریق کے لئے آئین کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ البتہ اس کتاب کی چند مشکلات پر مسٹر یوسف علی اور مولف نے ایک مضمون میں بحث کی ہے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل بابتہ جنوری ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا ہے اور جو نتائج وہاں پیش کئے گئے انھیں کو مولف نے اختیار کیا ہے۔ مغلیہ فوج کی تنظیم کے لئے آئندہ باب میں حوالے دیے جائیں گے۔

فصل ۲:- رشوت ستانی کے لئے ملاحظہ ہو خاص کر سیویل صفحہ ۲۸۰ و خطوط موصولہ ۴-۹ و ڈی لیٹ صفحہ ۲۶۳۔ مانریق (۱-۷) ذکر کرتا ہے کہ جب کوتوال ملتان نے اُسے گرفتار کر لیا تھا تو کس طرح اُسے دے دلا کر خوش کیا گیا تھا اور رہائی کی صورت نکال لی گئی تھی۔ اثر کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو رو صفحہ ۱۶۴ و ۳۶۴ اور خطوط موصولہ ۴-۱۱۷ بادشاہ کے پاس مرافعہ کرنے میں جو خطرات تھے ان کے بارے میں ملاحظہ ہو پنچ در پرچاس ۱-۴-۴۳۹۔ فرقہ واری دباو کی مثال کی کیفیت خطوط موصولہ (۴-۳۲۰) سے ماخوذ ہے اور تعمیل کے متعلق تفصیلی امور خطوط موصولہ (۱-۲۵ و ۴-۱۱۷) میں وینیز ڈی لیٹ صفحہ ۱۲۴ میں مذکور ہیں۔

فصل ۳:- کوتوال کے لئے اکبر کے قواعد و ضوابط آئین (ترجمہ ۲-۴) میں موجود ہیں کوتوال گولکنڈہ کا حوالہ تھیونوٹ صفحہ ۲۹۰ میں موجود ہے۔ وجیانگر میں پولس کے نظم و نسق کے متعلق میجر صفحہ ۳۰ اور سیویل صفحہ ۳۸۱ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ اس نظام کے واقعی عملدر آمد کی کیفیت تھیونوٹ صفحہ ۵۹ و ۶۰ میں مذکور ہے۔ سزاؤں کے متعلق جو اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ توزک (ترجمہ ۱-۲۳۴) میں ملے گا۔ بے آئینی کے خطرے کے بارے میں خاصکر ملاحظہ ہو رو صفحہ ۲۹۵۔ سالبینک نے آگرہ کی جو کیفیت بیان کی ہے

باب ۲

وہ خطوط موصولہ (۴-۱۹۰) سے ماخوذ ہے۔

فصل ۴ :- ملک میں پولیس کے نظم و نسق کے متعلق صرف ایک راست تذکرہ جو ہمیں مل سکا وہ آئین اکبری (ترجمہ ۲-۴۰۷) کا یہ جملہ ہے کہ جہاں کہیں کوتوال نہ ہو وہاں عہدہ دار مال (امالگزار) اُس کے فرائض انجام دے۔

فینچ کی سیاحتوں کا وہ حصہ جو اندرون ملک سے متعلق ہے پرچاس کے ۱-۴ صفحہ ۴۲۴ پر شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسناد جن کا حوالہ دیا گیا ہے یہ ہیں :- ورتھما صفحہ ۱۳ سیویل صفحہ ۳۱ (برائے نونز) پرچاس ۲-۱۰، ۳۵-۱۷۳۶-۱ (برائے فینچ) اور ۱-۴-۴۸۴ (برائے وتھنگٹن) اور ۱-۴-۵۲۰- (برائے اسٹیل وکروتھر) خطوط موصولہ ۲-۲۵۴- (سورت سے نکلنے والے راستوں کے لئے) اور ۵-۳۲۳ (گولکنڈہ کے لئے) ٹری صفحہ ۱۶۰ و ۱۷۱- اکنس صفحہ ۴۳۴-

فصل ۵ :- دریاؤں کے محاصل اور کروڑگیری کے متعلق اکبر کے احکام آئین میں موجود ہیں (ترجمہ ۱-۲۸۱) دریائے انڈس پر انگریز تاجروں کا تجربہ پرچاس ۱-۴-۴۹۷ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ظورسس کی نصیحت خطوط موصولہ ۴-۰ میں ہے اور رُو کی شکایت اس کے جرنل کے صفحہ ۶۰ پر ہے۔ پرتگالیوں کی جانب سے سرکاری طور پر جو محاصل عائد کئے جاتے تھے اُن کی کوئی واضح کیفیت ہمیں نہیں مل سکی لیکن عملاً یہ معاملات باہمی گفت وشنید سے طے ہوتے تھے۔ مثلاً پیرارڈ کہتا ہے (ترجمہ ۲-۲۴۰) کہ عامل روپیہ لیکر ہر چیز چھوڑ دیتے تھے۔ کالی کٹ کے محصول خانہ کروڑگیری کی کیفیت جو پیرارڈ نے بیان کی ہے وہ ۱-۲۳۰ میں درج ہے۔

محاصل راہداری کے بارے میں جہانگیر کے احکام توزک (ترجمہ ۱-۷) میں دیئے ہوئے ہیں اندرون ملک کے جہازوں پر جو محاصل لگائے جاتے تھے اور اون سے جبراً جو روپیہ وصول کیا جاتا تھا اس کا حال معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو ہے صفحہ ۳۰۷۔ مستثنیات کے لئے ملاحظہ ہو مانسریٹ صفحہ ۵۸۱۔ بعد کے دور میں محاصل راہداری کی کیفیت کے لئے ملاحظہ ہو منڈی ۲-۳۹۔ تھیونو ۱۵- ٹیورنیر صفحہ ۸۱ و ۳۰۵ اور مانریق ۷۱- وجیانگر کے محاصل کے لئے ملاحظہ ہو سیویل صفحہ ۳۶۴ و ۳۶۶- اور ہے صفحہ ۳۸۷- دکن کے لئے ملاحظہ ہو تھیونوٹ صفحہ ۲۷۹ خطرناک سڑکوں پر حفاظت کے معاوضہ میں جو رقمیں وصول کی جاتی تھیں ان کا ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے

باب ۳

مثلاً خطوط موصولہ (۴ - ۸۰۷) میں۔

فصل ۶ ۔۔ کثیر منافعوں کی ضرورت کے بارے میں جو اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ خطوط موصولہ ۵ - ۱۱۶ سے ماخوذ ہے۔ (۶۲) مغلوں میں وراثت کے قاعدہ پر برنیر نے (صفحہ ۱۱۶) کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ٹیورنیر (۲ - ۱۵۸) نے یہ بتایا ہے کہ کیونکر اس قاعدہ کی وجہ سے لوگوں کو دفینے جمع کرنے کی ترغیب ہوتی تھی اور مانریق (۷۱) اس کے واقعی عملدرآمد کی ایک واضح تصویر کھینچتا ہے۔ اس کے متعلق کتاب میں جو جملے نقل کئے گئے ہیں وہ ٹری صفحہ ۳۹۱ اور برنیر صفحہ ۲۲۹ سے ماخوذ ہیں۔

فصل ۷ ۔۔ اکبر کے من کے لئے ملاحظہ ہو ٹامس صفحہ ۴۳۰۔ پرچاس ۱ - ۳ - ۲۱۸ خطوط موصولہ ۳ - ۱ - ۴۸۔ ڈی لیٹ صفحہ ۱۳۰۔ سورت کے منوں کا ذکر کثرت کے ساتھ خطوط موصولہ میں کیا گیا ہے مثلاً ۱ - ۳۰۔ گوا کے من اس تختہ میں بتائے گئے ہیں جو گرشیا ڈی اورٹا کی کتاب کے ساتھ لگایا گیا ہے کھنڈی اور بہار کے متعلق ملاحظہ ہو۔ ہابسن - جابسن۔ انہی الفاظ کے تحت۔ قنطال کے بارے میں ملاحظہ ہو بطور مثال خطوط موصولہ ۱ - ۳۰۴۔ یورپ کے متعلق جو حوالے دئے گئے ہیں ان کے لئے ملاحظہ ہو ٹیورنیر صفحہ ۲۹۔ ہم نے اس کی جو قدر بیان کی ہے وہ گرینڈ انسائکلو پیڈیا سے ماخوذ ہے۔

گز کے لئے ملاحظہ ہو آئین۔ ترجمہ ۲ - ۵۸ و مابعد۔ اور مفید تختے ۸۷ - و مابعد کو اوپر کے لئے ملاحظہ ہو خطوط موصولہ ۱ - ۴۴ اور ۲ - ۲۳۰۔

اکبر کی سکہ سازی کی کیفیت آئین (ترجمہ ۱ - ۱۶ و مابعد) میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ طلائی سکوں کی کمیابی کا حوالہ مختلف مصنفین نے دیا ہے مثلاً ٹری صفحہ ۱۱۲ و ۱۳۱، اور ٹیورنیر ۲ - ۴۱ و مابعد۔ ٹیورنیر نے چاندی اور تانبے کے تناسب کے فرق کی مثال دی ہے۔ محمودی کے لیے ملاحظہ ہو خطوط موصولہ ۱ - ۴۳۔ ہنڈی کے طریق کی کیفیت ٹیورنیر (۲ - ۴۳) میں مکمل طور پر موجود ہے اور اکثر انگریزی تحریروں میں اتفاقیہ طور پر اس کا حوالہ دیا گیا ہے مثلاً خطوط موصولہ ۲ - ۲۲۸ و ۲۶۶ اور ۳ - ۲۸۱۔ روپیہ کی قیمت خرید پر مولف کے ایک مضمون میں بحث کی گئی ہے جو کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل بابتہ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا ہے صفحہ ۳۷۵ و مابعد۔

جنوبی ہند کے زرمبادلہ کے لئے ملاحظہ ہو ہابسن - جابسن - زیر عنوان

باب ۲

پیگو ڈا۔ فانم۔ پرڈاؤ۔ چک لارن۔ و نیز دوسری اسناد جن کا وہاں حوالہ دیا گیا ہے گوا کے زر کے بارے میں ملاحظہ ہو وھایٹ وے باب ۴ اور مسٹر لانگورتھ ڈیمس کی تحریر بنام باربوسا (ترجمہ ۱-۱۹۱)۔ ساحل پر اور اس کے قرب و جوار میں ادنیٰ قیمتوں کے حوالے تری (صفحہ ۱۷۵) اور ڈیلاویل (صفحہ ۲۴۴) میں ملیں گے۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں انگریزوں نے سورت میں جو قیمتیں ادا کیں ان کے لئے ملاحظہ ہو خطوط موصولہ ۱-۱۴۱۔ سکہ سازی کے سلسلہ میں جو بدعنوانیاں ہوتی تھیں ان کے لئے خاصکر ملاحظہ ہو آئین اکبری ترجمہ ۱-۳۲ و مابعد۔

(۶۳)

تیسرا باب

دولت صرف کرنے والے طبقے

پہلی فصل

اہل دربار اور شاہی عہدہ دار

نظم ونسق کے عملدرآمد کے بعد اب ہم اُس کے چلانے والوں کی معاشی حیثیت پر نظر ڈالتے ہیں جن طبقوں میں ہندوستان کی آبادی اس کتاب کے اندر تقسیم کی گئی ہے ان میں سب سے پہلا طبقہ انھیں اشخاص کا ہے۔ اہل دربار اور عہدہ داروں کو ایک ہی طبقے کے اندر شامل دیکھکر ممکن ہے کہ اکثر اشخاص متعجب ہوں لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے اندر ان دونوں طبقوں میں کوئی صحیح امتیاز قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ لوگ اپنے مستقبل کی تلاش میں یا کم از کم کوئی ذریعۂ معاش حاصل کرنے کے لئے دربار میں آتے تھے۔ تلاش کے ناکام ہونے کی صورت میں تو وہ واپس ہو جاتے تھے لیکن جب کامیابی ہوتی تھی تو اس کے معنیٰ ہی یہ تھے کہ کوئی فوجی عہدہ ملے یا نظم ونسق سے متعلق کچھ فرائض سپرد ہوں اور ان خدمات کا کوئی معاوضہ مقرر ہو۔ اب یہ معاوضہ کبھی تو نقد تنخواہ کی شکل میں مقرر ہوتا تھا اور کبھی کسی خاص رقبے کی کل مالگزاری یا اُس کا کوئی جزو بہ شکل عطیہ حوالہ کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں آزاد اُمراء کا کوئی طبقہ ہی نہ تھا کیونکہ آزادی بغاوت کے مرادف تھی اور ہر امیر یا تو حاکم وقت کا خدمتگار ہوتا تھا یا اُس کا دشمن۔ موجودہ فصل میں اُن اعلیٰ عہدہ داروں کی حالت سے بحث کی جائے گی جو دربار میں ایک مستقل اور مسلمہ حیثیت رکھتے تھے اور جہاں تک چھوٹے کارپردازوں کا تعلق ہے خواہ وہ فوجی خدمات سے متعلق ہوں یا سیول یہ محض سیدھے سادے عہدہ دار کہلائے جا سکتے ہیں اور انکی حالت پر بعد کو غور کیا جائیگا۔

باب ۳

جہاں تک ان اعلیٰ عہدہ داروں کا تعلق ہے ہندوستان کے تمام علاقوں میں ان کی حالت میں بہت کچھ یکسانیت نظر آتی ہے۔ سولھویں صدی کے نصف اول میں وجیانگر کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امرا کی ایک جماعت شاہنشاہ کو گھیرے رہتی تھی یہ اُمرا نظم و نسق میں خاص خاص عہدوں پر مامور ہوتے تھے۔ سلطنت کے مختلف حصوں پر حکومت کرتے تھے۔ اپنی اپنی مالگذاری کا ایک بڑا حصہ خود روک لیتے تھے اور ایک خاص قسم اور معینہ وسعت کی فوجی قوت برقرار رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں دکن کی سلطنتوں کے حالات سے بھی بالکل (۶۴) اسی طرح کے انتظامات کا پتا چلتا ہے۔ اور اس قسم کی جو تنظیم اکبر نے قائم کر رکھی تھی اس کی تو مفصل کیفیت ہمارے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اگر اس کو اس زمانے میں ہندوستان کا خاص طریقہ تصور کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اور اس بنا پر اگر ہم صرف سلطنت مغلیہ کی حد تک جس کے متعلق ہمارے معلومات تقریباً مکمل ہیں۔ اس کے تفصیلی مطالعے پر اکتفا کریں تو ہمارے موجودہ مقصد کے لیے کافی ہوگا تاہم وجیانگر میں مختلف امرا کی جو جو حیثیت تھی اس کی جو کیفیت ۱۵۳۵ء کے قریب نونز نے بیان کی ہے اس سے چند مثالیں یہاں پیش کیجاتی ہیں۔ شاہنشاہ کا وزیر خاص اس زمانے میں ساحل کارومنڈل۔ نیگاپٹم۔ ٹانجور اور دوسرے اضلاع پر حکومت کرتا تھا۔ جہاں سے خزانۂ شاہی کا مطلوبہ حصہ ادا کرنے کے بعد اس کو ہر سال ۳۳۰۰۰۰ طلائی پرڈاو یا بالفاظ دیگر ۲۰ لاکھ روپیہ وصول ہوتے تھے[1]۔ اسی رقم سے اس کو ۳۰۰۰۰ پیادے اور ۳۰۰۰ سوار تیار رکھنا پڑتے تھے۔ لیکن وقائع نگار ذکر کرتا ہے کہ وہ اس مد میں کفایت کرتا تھا۔ اسی طرح محافظ جواہرات جس کے ذمے دکن کا ایک وسیع رقبہ کر دیا گیا تھا ۰۰۰۰۰ ۲ طلائی پرڈاؤ حاصل کرتا ۰۰ ۶ ۲۵ سپاہیوں کی فوج کا ذمہ دار تھا۔ اور ایک سابقہ وزیر آووے گیری کے نواح پر متصرف تھا ۰۰۰۰۰ ۵ طلائی پرڈاؤ وصول کرتا اور ۲۶۵۰۰ سپاہیوں کی فوج رکھتا تھا۔ ان اعداد کی اہمیت کا دارومدار سپاہیوں کو نوکر رکھنے کے مصارف پر ہے اور اس بارے میں ٹھیک ٹھیک مواد میسر نہیں ہے لیکن سرسری تخمینے سے پتا چلتا ہے کہ حساب کی رو سے امرا کو جو بچت ہوتی تھی وہ بہت

(۱) اس زمانے میں پرڈاؤ کی قدر میں اس حد تک تخفیف نہیں ہوئی تھی جس حد پر کہ وہ اختتام صدی تک پہنچ گیا تھا۔ ۱۵۱۰ء میں وہ تقریباً ساڑھے تین روپیوں کے مساوی تھا۔ ۱۵۳۵ء میں اس کی ٹھیک ٹھیک قدر تو ہمیں معلوم نہیں لیکن بہرصورت وہ تین روپیوں سے بہت زیادہ کم نہیں ہو سکتی۔

زیادہ نہ تھی۔ شاید وزیر کے لئے دو یا تین لاکھ روپیہ سالانہ بچ رہتے ہوں گے اور دوسرے امرا کو اس سے بھی کم رقمیں ملتی ہوں گی۔ بہر حال گمان غالب یہ ہے کہ ان کی حقیقی آمدنی زیادہ تر دو ذرائع پر منحصر تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ سپاہیوں کی مد سے کسی قدر بچا سکتے تھے۔ دوسرے اپنے مفوضہ اضلاع کی مقررہ مالگزاری میں وہ کسی حد تک اضافہ کر سکتے تھے۔ اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ یہ دونوں ذرائع اہم تھے۔ اور یہ نتیجہ بالکل معقول ہے کہ قابل اور غیر محتاط اشخاص جنوبی ہند میں بھی تقریباً ویسے ہی خوشحال تھے جیسے کہ شمال میں اکبر کے امراء تھے۔ یہ سچ ہے کہ یہ حالات اس دور سے متعلق ہیں جو جنگ تالیکوٹ سے قبل تھا۔ لیکن امراء کی آمدنی پر اس تباہی کا دوامی اثر غالباً بہت زیادہ نہ تھا۔[1] چنانچہ جیسوئیٹ پادریوں نے اواخر صدی کی زندگی کے متعلق اتفاقی طور پر جو کیفیتیں بہم پہنچائی ہیں اُن سے اسی طرح کی دولتمندی اور افراط کا پتا چلتا ہے۔ جس طرح کی دولتمندی ہندوستان کے اُن حصوں میں پائی جاتی تھی جن کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی شہادت موجود ہے۔

جب ہم شمالی ہندوستان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم اکبر کی قائم کردہ تنظیم کی باریکی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے سلطنت کے جملہ بڑے بڑے آدمی مختلف مدارج میں تقسیم کر دیئے گئے تھے گویا وہ زمانہ موجودہ کی سی امپیریل سروس کے مختلف اجزا تھے جس کے شرائط نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنشاہ نے قلمبند کر دیئے تھے لیکن ہندوستان میں جس قسم کے خدمات سے ہم آجکل مانوس ہیں اُن سے اکبر کی امپیریل سروس ضروری امور میں مختلف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً اس کا ڈھانچہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ ہر شخص جو اس سروس میں داخل ہوتا تھا وہ ایک خاص تعداد کی سوار فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے ایک منصب پر مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا فرض تھا کہ اپنی کمانڈ کے مطابق پیادہ اور سوار فوج کی بہم رسانی کا انتظام کرے اور جب وہ اسقدر فوج بہم پہنچا لیتا تو پھر اپنے منصب کی تنخواہ پانے کا مستحق ہوتا تھا جسقدر فوج کی بہم رسانی کا وہ اس طور پر ذمہ دار کر دیا جاتا تھا وہ بالعموم اس تعداد سے کم ہوتی تھی جو اس کے خطاب سے

(۱) بہت ممکن ہے کہ شاہنشاہ کی شکست سے بعض امرا کو مالی فائدہ پہنچا ہو۔ ان کی خام آمدنی تو متاثر نہیں ہوئی تھی البتہ جو مالگزاری وہ سابق میں ادا کرتے تھے ممکن ہے کہ اسکا ایک جزو دبا لینے کی ان میں قابلیت پیدا ہو گئی ہو۔

ظاہر ہوتی تھی مثلاً ایک ہزار فوج کے کمانڈر کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی سرکاری تنخواہ سے پورے ایک ہزار سواروں کی جماعت تیار رکھے۔ بلکہ اس سے کچھ کم تعداد کافی ہو جاتی تھی اور جتنا جتنا زمانہ گزرتا گیا اس تعداد میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔ اکبر کے دور حکومت کے وسط میں سب سے بڑا معمولی منصب پنجہزاری تھا لیکن شہزادے اس سے بلند تر عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ اور جس زمانے میں آئین اکبری کی تالیف ہوئی ہے شہزادہ سلیم جو بعد میں شاہنشاہ جہانگیر کے نام سے موسوم ہوا بہ حیثیت دس ہزار فوج کے کمانڈر کے سر فہرست نظر آتا تھا۔ اکبر کے دور حکومت کے اواخر میں پانچہزار کی شرط میں کسی قدر نرمی کر دی گئی تھی چنانچہ اس کے جانشینوں کے دور میں رعایا اس سے بہت بلند تر مراتب تک پہنچ سکتی تھی۔ دس سپاہیوں کی کمانڈری کے ادنیٰ ترین منصب سے لیکر چار سو کے منصب تک ہر کمانڈر منصبدار کہلاتا تھا۔ پانسو سے لیکر دو ہزار تک امیر[1] اور تین ہزار سے اوپر امیر اعظم یا عمدہ کہا جاتا تھا۔ بعض عہدہ داروں کو اپنے ذاتی منصب سے متعلقہ فوج کے علاوہ کچھ مزید فوج بھی جو سوار کہلاتی تھی رکھنے کی اجازت دی جا سکتی تھی یہ ایک طرح کا اعزاز تھا۔ مزید فوج کی تنخواہ خزانے سے حاصل کیجاتی تھی۔ کمانڈر کو اجازت تھی کہ تنخواہ کی فرد حساب کا ۵ فیصدی خود روک رکھے۔ اور غالباً مختلف قسم کی اور بھی بالائی آمدنیاں تھیں مزید براں خود اس کی ذاتی تنخواہ ایک حد تک اُس کی مزید فوج کی تعداد کے مطابق مختلف ہوتی تھی۔ (۶۶)

مختلف منصبوں کی تنخواہوں کا ہم نے اس طور پر ذکر کیا ہے گویا وہ معینہ رقمیں تھیں چنانچہ ابوالفضل نے بھی در اصل اس طور پر ان کو بیان کیا ہے۔ لیکن کسی خاص منصب کے عہدہ داروں کی خالص آمدنی کی تحقیق تو کجا اس کا سرسری تخمینہ بھی بہت مشکل ہے۔ مندرجۂ ذیل نقشے سے چند مدارج کی منظور شدہ ماہانہ تنخواہیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ اعداد اکبر کے زمانہ کے روپیوں سے متعلق ہیں اور جیسا کہ گذشتہ فصل میں واضح کیا گیا ہے ان کو پانچ یا چھ سے ضرب دینا ضروری ہے تاکہ موجودہ معیار کے مطابق شمالی ہند میں حقیقی قوت خرید کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) بیرونی سیّاح اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے مجموعی طور پر امرا کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو کہ عربی لفظ امیر کی جمع ہے۔

باب ۳

منصب	ماہانہ تنخواہ (۱)			مصارف متعلقہ فوج
	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم	
۵۰۰۰	۳۰۰۰۰	۲۹۰۰۰	۲۸۰۰۰	۱۰۶۰۰
۳۰۰۰	۱۷۰۰۰	۱۶۸۰۰	۱۶۷۰۰	۶۷۰۰
۱۰۰۰	۸۲۰۰	۸۱۰۰	۸۰۰۰	۳۰۰۰
۵۰۰	۲۵۰۰	۲۳۰۰	۲۱۰۰	۱۱۶۰
۵۰	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰	۱۸۵
۱۰	۱۰۰	۸۲½	۷۵	۴۴

ان تنخواہوں سے درصل جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اُن کا اندازہ کرنے کے لئے پہلے تو وہ مصارف منہا ہونے چاہئیں جو ہر منصب کی متعلقہ فوج تیار رکھنے میں لاحق ہوتے تھے۔ تختۂ مندرجۂ بالا کے آخری کالم میں یہ مصارف دکھلائے گئے ہیں۔ اور ان کا اندازہ اُس حساب کی بنا پر کیا گیا ہے جو اس قسم کی شاہی فوجوں پر ہر مہینے لاحق ہوتا تھا۔ لیکن ہم کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انتہائی اعداد ہیں اور کارگذار عہدہ دار اس سے بہت کچھ کم صرف کے ساتھ اپنی فوجیں برقرار رکھ سکتے تھے۔ اکبر کے آغاز دور میں اس معاملہ میں بڑی بڑی بے قاعدگیاں رائج تھیں چنانچہ بدایونی نے نہایت چبھتے ہوئے الفاظ میں ان بدمعاشیوں کی کیفیت بیان کی ہے جس کی تائید ابوالفضل کے عاقلانہ اور نپے تلے ہوئے جملوں سے بھی ہوتی ہے اکبر نے مختلف قواعد وضوابط جاری کئے تاکہ فوجوں کی جو تعداد تجویز کردی جاتی تھی

(۶۷)

(۱) درجہ کا انحصار سوار فوج پر ہوتا تھا۔ مثلاً پانچہزار کا کمانڈر ۳۰۰۰۰ روپیہ حاصل کرنیکا مستحق ہوتا تھا مگر صرف اسی صورت میں جب کہ اس کی سوار فوج بھی پانچہزار ہو۔ اور اگر اسکی سوار فوج دو ہزار پانسو یا اس سے زائد ہو تو وہ (۲۹۰۰۰) روپیہ پاتا تھا اور اگر وہ (۲۵۰۰) سے کم ہو تو وہ (۲۸۰۰۰) روپیہ پاتا تھا تنخواہوں کے یہ اختلافات مقابلتہً ناقابل لحاظ ہیں اور ہمارے موجودہ اغراض کیلئے وہ نظرانداز کئے جاسکتے ہیں۔

باب ۳

وہ درحقیقت تیار بھی رکھی جائے لیکن یہ فرض کر لینا کہ اوس کو پوری کامیابی حاصل ہوئی تھی غالباً غلط ہوگا۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نحتہ بالا میں جو مصارف دکھائے گئے ہیں حقیقی مصارف اُن سے کم ہوتے تھے۔ دوسرے ہمیں اوس طریقے پر غور کرنا ہے جس کے مطابق یہ تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ ملک میں روایتاً جو عملدرآمد چلا آرہا تھا وہ جاگیر کا طریقہ تھا۔ یعنی ہر عہدہ دار کو ایک یا چند گاؤں یا پرگنے یا اس سے بھی بڑے رقبے کی مالگذاری عطا کیجاتی تھی جس سے اس کو مجوزہ تنخواہ وصول ہوجاتی تھی دیگر مصلحین مالیات کی طرح اکبر نے بھی اس طریقے کو ناپسند کیا اور اس کے بجائے نقد ادائے زر کا طریقہ جاری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا اسے کبھی بھی پوری کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ بلکہ جہانگیر کے دور میں تو جاگیر کا طریقہ پھر اپنی سابقہ عمومیت حاصل کر چکا تھا خزانۂ شاہی کی تعویق کے باعث نقد ادائے زر کا طریقہ عہدہ داروں کے نزدیک عام طور پر ناپسند کیا جاتا تھا۔ جب کوئی عہدہ دار کسی جاگیر پر قابض ہوتا تھا تو اس کو اپنی آمدنی کا زیادہ یقین ہوتا تھا۔ اور بسا اوقات وہ ایسی جاگیر حاصل کرنے کی توقع کر سکتا تھا جو سرکاری اندراجات کے مقابلے میں دراصل زیادہ مالیت رکھتی ہو یا زیادہ آمدنی بہم پہنچانے کے قابل بنائی جاسکتی ہو غرض ان عطیات کے سلسلے میں کچھ کم دغابازی نہیں ہوتی تھی۔ اور اس طریقے کی کلیۃً مخالفت کرنے میں اکبر مالی نقطۂ نظر سے بلاشبہ حق بجانب تھا۔[1] بہرحال جہاں تک کہ اس کے دور کے عہدہ داروں کا تعلق ہے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کم از کم ابوالفضل[2] کی بیان کردہ

---

(۱) ہاکنس جو ۱۶۱۱ء کے قریب دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نائب تھا اور جس کو جہانگیر نے ...۴ سپاہیوں کا کمانڈر بنا دیا تھا۔ اس بارے میں نہایت جلکر اپنا تجربہ بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وزیر اس کو ہمیشہ ایسے مقامات پر ٹالا کرتا تھا "جہاں بدمعاشوں کا غلبہ ہوتا تھا"۔ اور جب خاص بادشاہ کے حکم سے اس کو لاہور میں جاگیر دی گئی تو کسی بہانے سے وہ فوراً اُس سے محروم کر دیا گیا۔ ایک ہندوستانی کمانڈر غالباً زیادہ کامیابی کے ساتھ اس کاروبار کو سنبھال لیتا ("سفرنامہ ہاکنس صفحہ ۱۱۳ و نیز ملاحظہ ہو پرچاس ۱-۱۱۱-۲۲۱)۔

(۲) بعض حالیہ مصنفین کی رائے ہے کہ منظورہ اعداد میں سے بہت زیادہ رقم وضع کرنی چاہیے کیونکہ اکثر عہدہ داروں کو سال میں پورے بارہ مہینے کی تنخواہ نہیں ملتی تھی مثلاً مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے لکھا ہے کہ پورے سال کی تنخواہ شاذ و نادر ہی ملتی تھی اور بعض صورتوں میں تو صرف چار مہینے کی

تنخواہیں پانے کی ضرور توقع رکھ سکتے تھے۔ اور ان میں سے جن عہدہ داروں نے نفع بخش جاگیریں حاصل کرلی تھیں وہ تو اس سے بھی زیادہ امید رکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف اُن کے سپاہیوں کے مصارف غالباً ہمارے بیان کردہ تخمینوں سے کم ہوتے تھے لہذا نتیجہ یہ تھا کہ اُن کی خالص آمدنیاں اس مقدار سے زیادہ تھیں جس کا اعداد مذکورہ سے پتا چلتا ہے۔

ان شکوک وشبہات کو ذہن نشین کرتے ہوئے ہم مختلف طبقوں کے عہدہ داروں کی آمدنیوں کا سرسری تخمینہ کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ۵۰۰۰ کا ہر کمانڈر ماہانہ کم از کم ۱۸۰۰۰ روپیوں کی توقع کرسکتا تھا۔ مزید برآں اپنے فوجی مصارف میں مناسب کفایتیں نکالکر یا اپنی قسمت کی یاوری سے کسی نفع بخش جاگیر پر ہاتھ مار کر وہ اس رقم میں اور اضافہ کرسکتا تھا اس آمدنی سے وہ تقریباً اتنا ہی مال واسباب خرید سکتا تھا جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے زمانے میں ماہانہ ایک لاکھ آمدنی والا شخص خرید سکتا تھا۔ اس طرح گویا اوس کی تنخواہ ہندوستان کے موجودہ ہر عہدہ دار کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اسی طرح ایک ہزار کا کمانڈر ہر مہینہ ۵۰۰۰ روپئے پانے کی توقع رکھ سکتا تھا جو ۱۹۱۴ء کے ۲۵۰۰۰ روپیوں سے لیکر ۳۰۰۰۰ روپیوں تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) تنخواہ دی جاتی تھی۔ مسٹر ایرؔوین نے بھی اسی طرح کی کیفیت بیان کی ہے لیکن کسی خاص بادشاہ کے دور حکومت کا مخصوص طور پر حوالہ نہیں دیا ہے جس سند پر ان مصنفین نے اعتماد کیا ہے اسکا آغاز شاہجہاں کے دور سے ہوتا ہے اور کوئی ہم عصر سند ایسی نہیں ملتی جس سے ظاہر ہو کہ یہ کیفیت اکبرؔ کے عہدہ داروں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ابوالفضل نے اس طریق کی بہت مفصل کیفیت بیان کی ہے لیکن اس پہلو کے متعلق وہ بالکل ساکت ہے ابوالفضل کا یہ سکوت فیصلہ کن معلوم ہوتا ہے۔ اور جب تک کوئی ہم عصر شہادت پیش نہ کی جائے احتیاط اس کی مقتضی ہے کہ ان وضعات کو ایک شئے مابعد تصور کیا جائے جو ممکن ہے اس وجہ سے وجود میں آئی ہو کہ مفوضہ مالگزاریوں سے جو ناجائز فوائد حاصل کئے جاتے تھے ان کی تلافی ہو جائے۔ بہرحال اگر اکبرؔ کے دور میں ایسی وضعات ہوتی بھی ہوں گی تب بھی موجودہ زمانے کی تنخواہوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اُس زمانے کی تنخواہیں غیر معمولی طور پر فیاضانہ معلوم ہوں گی۔ اس نقطہ پر ملاحظہ ہو وی اسمتھ کی کتاب "اکبر دی گریٹ مغل" صفحہ ۳۶۳۔ ایروین کی کتاب موسومہ "ہندوستان کے مغلوں کی فوج" صفحات ۷ و ۱۱۔ منصبوں کے بارے میں بلاکمن کا نوٹ۔ ترجمہ آئین اکبری ا۔ ۲۳۸ ومابعد۔

باب ۳

کے مساوی ہوتے تھے یا یوں کہیئے کہ اس زمانے کے لفٹنٹ گورنر کی تنخواہ کا سہ گنا۔ اسی طرح ۵۰۰۰ کا کمانڈر آج کل کے ۶۰۰۰ روپیوں تک کے برابر آمدنی حاصل کرتا ہوگا۔ پس اگرچہ ٹھیک ٹھیک اعداد غیر یقینی ہیں تاہم یہ نتیجہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ امپیریل سروس کے اعلیٰ عہدہ داروں کو جس پیمانے پر معاوضہ دیا جاتا تھا وہ ہندوستان و نیز دنیا کے ہر حصے کے موجودہ مروجہ پیمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ فیاضانہ تھا۔ یقیناً اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر کسب معاش کا کوئی اور شعبہ ایسے بیش بہا انعامات پیش نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا ہمیں متعجب نہ ہونا چاہیئے کہ مغربی ایشیا کے ایک بہت بڑے حصہ سے قابل ترین اور ہمت آزما اشخاص شاہی خدمت کی ان توقعات کو دیکھکر دربار کی طرف کشاں کشاں چلے آتے تھے۔

(۶۹)

خود بادشاہ ان خدمتوں پر تقرر کیا کرتا تھا۔ اور ہر صورت کے خاص حالات کے مطابق درجہ معین ہوتا تھا۔ مثلاً راجہ بہاری مل براہ راست ۵۰۰۰ کے منصب پر مقرر کر دیا گیا تھا جو غیر شاہی خاندان والوں کے لئے بلند ترین درجہ تھا۔ لیکن معمولی حالات میں ہر امیدوار کو ایک مربی پیدا کرنا پڑتا تھا جو بادشاہ سے اس کا تعارف کرائے اور اگر اس نے خوشنودی حاصل کی تو چند طول طویل تکلفات کے بعد اس کا تقرر ہو جاتا تھا۔ موزونیت کا کوئی مسلمہ معیار غالباً نہیں تھا۔ اور جس طرح اس زمانے میں تعلیمی قابلیت یا اور اوصاف کی کچھ نہ کچھ شہادت مطلوب ہوتی ہے ایسا کوئی رواج اس زمانے میں موجود نہ تھا۔ اکبر کو اپنی اس قابلیت پر بڑا بھروسہ تھا کہ وہ ہر شخص کے چال چلن کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ برابر اپنی ہی قوت فیصلہ کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اسیطرح ترقی کے بھی کوئی قواعد و ضوابط موجود نہ تھے۔ ہر عہدہ دار کی ترقی تنزلی یا برطرفی کا انحصار بادشاہ کی خوشی پر ہوتا تھا۔

شاہی خدمات صرف ہندوستانیوں ہی کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ اکبر کے زمانے میں تو غالب تعداد بیرونی اشخاص ہی کی تھی۔ ہندوستان میں خود اکبر بھی ایک غیر ملکی ہی تھا اس کا باپ ایک فاتح کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوا تھا۔ اور اس کے رفقاء سرحد کی دوسری طرف سے آئے تھے۔ برنیر سترھویں صدی کے وسط میں تحریر کرتے ہوئے زور دیتا ہے کہ مغل بادشاہ ہندوستان میں اسوقت بھی ایک اجنبی ہی تھا اور امرا میں زیادہ تر

مختلف قوموں کے منچلے شامل تھے جو ایک دوسرے کو دربار میں آنے کی ترغیب دیتے تھے اکبر کے زمانے میں شاہی خدمات پر کون کون لوگ کس کس تعداد میں فائز تھے اکی ایک تخمینی کیفیت اُن تحریروں سے معلوم ہو سکتی ہے جو بلاکمین نے نہایت محنت سے ابوالفضل کی پیش کردہ فہرست ہائے امرا و منصبداران کے ساتھ منسلک کی ہیں۔ ان فہرستوں میں وہ تمام تقررات شامل ہیں جو ۵۰۰ سے زیادہ کے منصبوں پر اس دور حکومت میں کئے گئے تھے۔ نیز اس سے ادنیٰ درجے کے وہ منصبدار شامل ہیں جو ۱۵۹۵ء کے قریب آئین اکبری کی تالیف کے وقت زندہ تھے۔ عہدہ داروں کی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر جنکی اصلیت کی کوئی کیفیت درج نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ۷۰ فیصدی سے کچھ ہی کم تعداد کا تعلق ان خاندانوں سے ہے جو یا تو ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے یا اکبر کی تخت نشینی کے بعد دربار میں وارد ہوئے تھے۔ بقیہ ۳۰ فی صدی عہدوں پر ہندوستانی فائز تھے جن میں نصف سے زیادہ مسلمان اور نصف سے کم ہندو تھے۔ اکبر کی روشن خیالی کی اکثر بہت تعریفیں کیجاتی ہیں کیونکہ اس نے اپنی ہندو رعایا کے لئے ترقی کے اعلیٰ مواقع بہم پہنچائے تھے۔ بلا شبہہ وہ اس تعریف کا مستحق ہے بشرطیکہ مصلحت کے پہلو کو کافی اہمیت دی جائے۔ تقریباً چالیس سال کے دوران میں اس نے کل اکیس ہندوؤں کا تقرر ۵۰۰ سے زیادہ کے منصبوں پر کیا ہے لیکن ان میں سے سترہ صرف راجپوت تھے جس کے یہ معنے ہوئے کہ اکثر و بیشتر تقررات اس غرض سے کئے گئے تھے کہ جن سرداروں نے اطاعت قبول کر لی تھی اُن پر اپنی گرفت مضبوط کر لی جائے۔ بقیہ چار عہدوں میں سے ایک پر دربار کا لطیفہ سنج رکن راجہ بیربل فائز تھا۔ دوسرے پر مشہور عہدہ دار مال راجہ ٹوڈرمل۔ تیسرے پر اس کا بیٹا اور چوتھے پر ایک اور کھتری جس کی اصلیت درج نہیں ہے مامور تھا جس کے متعلق یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ ٹوڈرمل ہی کا آوردہ تھا۔ اس سے ادنیٰ درجے کے منصبوں میں کوئی سینتیس ہندو موجود تھے جن میں سے تیس راجپوت تھے۔ پس معلوم ہوا کہ گو شاہی خدمات میں ہندوؤں کو مواقع حاصل تھے تاہم صحیح یہ ہے کہ یہ مواقع صرف راجپوتوں کے لئے مخصوص تھے اور دوسری ذاتوں کے عہدہ داروں کے متعلق صرف چند مستثنیات تھے اور بس۔ اس پوری فہرست میں ساری سلطنت کی آبادی میں سے صرف دو برہمن شامل تھے: ایک بیربل دوسرا اس کا

(۷۰)

باب ۳

فضول خرچ پڑےگا۔ پس شاہی خدمات کے اعلےٰ مراتب پر درحقیقت غیر ملکی اشخاص مسلمان۔ راجپوت۔ بیربل اور ٹوڈرمل فائز تھے۔

جن لوگوں کے سپرد شاہی خدمات تھے ان کا خاص فریضہ صرف یہ تھا کہ بادشاہ کے احکام کی اطاعت کریں لیکن ادنیٰ درجے کے عہدہ دار عام طور پر کسی نہ کسی اعلیٰ عہدہ دار کے ماتحت رکھے جاتے تھے۔ عہدہ داروں کی دو فہرستیں رکھی جاتی تھیں۔ ایک فہرست ان اشخاص کی جو حضوری میں رہتے تھے۔ دوسری فہرست ان اشخاص کی جو عہدوں پر مامور ہوتے تھے پہلی فہرست کے عہدہ داروں کو بجز اس کے کوئی اور کام نہ تھا کہ پابندی کے ساتھ دربار میں حاضر ہوں۔ اپنی فوجی قوت برقرار رکھیں اور بادشاہ جو حکم دے اسے بجا لانے کے لئے تیار رہیں۔ دوسری فہرست والے لوگ جن عہدوں پر مامور ہوتے تھے وہ بہت ہی مختلف قسم کے ہوتے تھے کبھی تو خالص فوجی فرائض کی انجام دہی ان کے سپرد ہوتی تھی۔ کبھی وہ صوبوں کے عامل مقرر کردئے جاتے تھے۔ کبھی صوبوں ہی میں کوئی اور جگہ ان کو دیدی جاتی تھی اور کبھی وہ شاہی محلات کے کسی نہ کسی شعبے مثلاً اصطبل یا میوہ خانہ کے ساتھ ملحق کردئیے جاتے تھے۔ تقررات میں تخصیص تقریباً ناپید تھی۔ اور ہر عہدہ دار صرف ایک لمحے کی اطلاع پر اپنی موجودہ خدمت سے کسی اور کلیتہً نئی خدمت پر منتقل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ بیربل سالہا سال دربار میں گذارنے کے بعد سرحد پر فوج کی کمان کرتے ہوئے فوت ہوا۔ اسی طرح ابوالفضل اپنے وقت کا ایک زبردست صاحب علم وفضل تھا لیکن جب دکن کی فوجی مہم اس کے سپرد کی گئی تو اس نے یہ خدمت خوبی کے ساتھ انجام دی الغرض جملہ عہدہ دار راست اکبر کے احکام کے تابع تھے اور جس کسی کو وہ کسی وقتی کام کے لئے موزوں خیال کرتا منتخب کرلیتا تھا۔ اس ڈھنگ پر نظم ونسق کی بنیاد رکھکر اس میں کامیابی حاصل کرنا اس کی قیافہ شناسی کا بہترین ثبوت ہے۔ (۷۱)

اکبر کے شاہی خدمات اور اُن میں ترقی کے توقعات پر ایک عام نظر ڈالنے کے بعد یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ان کا مقابلہ موجودہ زمانے کی سرکاری ملازمتوں سے نہیں بلکہ وکلاء کی حالت سے کرنا چاہئے تدریجی اور باقاعدہ ترقی جس سے آجکل ہم مانوس ہیں اس زمانے میں قطعاً معدوم تھی۔ شاہی خدمات کی حالت بالکل لاٹری کی سی تھی۔ ایک طرف بازی جیتنے کے لئے بڑے بڑے انعامات موجود تھے تو دوسری طرف

نا امیدیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ ملازمت میں ابتدا اگر قدم رکھنا اور ایک ماتحت حیثیت میں رہکر بادشاہ کی عنان کرم کو اپنی طرف پھیرنا یقیناً بہت ہی مشکل تھا لیکن ایک مرتبہ سلسلہ جنبانی شروع کرنے کے بعد یہ بھی ممکن تھا کہ بہت ہی سرعت کے ساتھ ترقی ملنے لگے اور ناگزیر ذاتی اوصاف کے اظہار کی بدولت خوب کامیابی حاصل ہو۔ بلاکمین کے جمع کردہ سوانح میں جن کا حوالہ دیا جا چکا ہے بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کے خدمات میں ترقی کے کیا کیا امکانات تھے۔ مثال کے طور پر حاکم علی کو لیجئے جو نہایت افلاس کی حالت میں ایران سے ہندوستان پہنچا تھا۔ لیکن اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کی وجہ سے ایک معمولی نوکر کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے ۲۰۰۰ کے منصب تک پہنچ گیا۔ پیشرو خاں بھی ایک غلام تھا جو ہدیے کے طور پر ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے کتنی ہی مختلف حیثیتوں میں خدمت انجام دی اور جب وفات پائی تو ۲۰۰۰ سپاہیوں کا کمانڈر تھا اور وفات کے بعد پندرہ لاکھ کا اثاثہ چھوڑا (جو زمانۂ حال کے تقریباً ایک کرور کے مساوی ہوتا ہے) غرض شاہی خدمت ہندوستان میں ایک نہایت ہی ترغیب آفریں ملازمت تھی لیکن اسی کے دوش بدوش اس میں بہت سی خرابیاں بھی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ اپنے عہدہ داروں کا وارث تھا جس کی وجہ سے نہ تو منصب دوسروں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا اور نہ اثاثہ۔ زیادہ سے زیادہ اتنی توقع کی جا سکتی تھی کہ خاندان کی پرورش کے لائق کچھ چھوڑ دیا جائے اور باپ کے خدمات کے صلہ میں بیٹوں کو کہیں کام سے لگا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض عہدہ داروں نے خفیہ اندوختے جمع کر لئے ہوں تاکہ بیمہ اور اسی طرح کے دوسرے ضروریات پورے ہو سکیں لیکن کھلے بندوں خاندان کی آزادانہ حیثیت قائم رکھنا بہر صورت ناممکن تھا۔ اور ہر نسل کو بالکل نئے سرے سے ابتدا کرنا پڑتی ہے۔ ظاہری آن بان قائم رکھنے اور مروجہ معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مصارف بہت زیادہ تھے جیسا کہ ہمیں آگے چلکر معلوم ہوگا۔ تنخواہوں کی تقسیم بالکل بے قاعدہ تھی اور جاگیریں گویا ایک طرح کا جوا تھیں۔ اس بات کی ہر ممکنہ ترغیب موجود تھی کہ وقتی خوشحالی سے پورا پورا فائدہ اوٹھا کر کچھ نہ کچھ رقم جمع کر لی جائے جو آڑے وقت میں کام آ سکے یا جس کی بدولت بارسوخ اور صاحب اختیار اشخاص کی خوشنودی خریدی جا سکے۔ رشوتوں اور تحائف پر جو روپیہ صرف کیا جائے ممکن تھا کہ وہ شغل اصل کی ایک بہت ہی نفع بخش صورت ثابت ہو

روپیہ پس انداز کرنا گویا اس کو ضائع کرنا تھا جب تک کہ اس کو دنیا سے مخفی رکھنے کا انتظام نہ ہو سکے۔

اکبر کے اعلیٰ عہدہ داروں کی حیثیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی جو ہم نے کوشش کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہی عہدہ دار سلطنت کے نظم و نسق کو چلاتے تھے اور عوام کی قسمتیں زیادہ تر انھیں کے ہاتھوں میں ہوتی تھیں۔ لہذا جو اہم معاشی سوالات سلطنت بلکہ تمام ہندوستان کے بڑے آدمیوں سے متعلق نظر آتے ہیں درحقیقت ان کا تعلق صرف انھیں چند افراد سے نہیں بلکہ باشندوں کی اکثریت سے ہے مثلاً جس طریقے کی ہم تشریح کر چکے ہیں اس کے اثر سے کامیاب عہدہ داروں میں کس قسم کے اوصاف نمایاں ہوتے تھے۔ آیا اس کی بدولت ایسے حکام و کارکن پیدا ہو سکتے تھے جو عوام کی بہبودی کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ یا غربا کے ہی خواہوں کے بجائے ملک میں لوٹ مچانے والوں کا ایک گروہ تیار ہوتا تھا۔ ان سوالات کے متعلق جو فیصلہ کیا جا سکتا ہے وہ ہمارے خیال میں یقیناً ناموافق ہوگا۔ اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والا اگر ایک طرف یہ تسلیم کرتا ہے کہ بعض فرمانروا دیانت داری سے کام کرنے والوں کے جویا رہتے اور انھیں اس کا صلہ دیتے تھے تو دوسری طرف اُسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ترجیح و ترقی کا تنہا یا آسان ترین راستہ دیانتداری سے کام کرنا نہ تھا۔ بات چیت میں مستعدی۔ ظاہرداری و نمائش۔ خود سازش کرنے یا دوسرے سازشیوں کا مقابلہ کرنے کی قابلیت۔ یہ تھے وہ صفات جو ہر تشنۂ ترقی عہدہ دار کے لئے درکار تھے۔ اور دوسرے فرمانرواؤں کی طرح اکبر کو بھی اس قسم کے لوگوں کی صحبت رہتی تھی۔ یہ لوگ ہمیشہ دربار میں حاضر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور صوبے یا جاگیر سے زیادہ تر اپنی جیبیں گرم کرنے کا کام لیتے تھے اپنے مفوضہ علاقوں کی خوشحالی بڑھانے سے انھیں بہت کم سروکار تھا۔ وہ صرف اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ معاملات خاموشی کے ساتھ چلتے رہیں اور بادشاہ کے کانوں تک اُن کے خلاف کوئی شکایت نہ پہنچنے پائے۔ اسی اثناء میں جہاں تک حالات اجازت دیں وہ دولت جمع یا خرچ کرتے رہیں۔ اکبر کی خداداد قیافہ شناسی کا پورا پورا لحاظ کرنے پر بھی یہ کسی طرح ممکن تھا کہ وہ ایک ایسی طویل مدت تک جاری رہ سکے جو ایک طرح کے مداحی تغیر پیدا کرنے کے لئے کافی ہو۔ چنانچہ اس بات کی بکثرت شہادت ہو جو دہے کہ

(۷۳)

باب ۲

اس کے جانشین کے دور میں حالات بہت جلد بدتر ہو گئے تھے۔ جہانگیر بار بار تبادلہ کرنے کو مفید سمجھتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بہت جلد منتقل ہونے کا یقین ہوتا تھا تو اس کی وجہ سے لوٹ میں جد و جہد اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ لیکن خود اکبر کے زمانے کے متعلق بھی اس بات کا یقین کر لینا ناممکن ہے کہ جو عہدہ دار اس ماحول کے لئے بہترین ہوتے تھے اُن سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ باشندوں کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے عام ترقی و فلاح کی جو مناسب تدبیریں ہوں انھیں اختیار کریں گے۔ اکبر گو محض مالی وجوہ کی بنا پر سہی اس قسم کی تدبیروں کی ضرورت کو تسلیم کرتا تھا لیکن اس غرض سے اس نے جو ضوابط مرتب کئے وہ مبہم ہونیکے باعث مشہور ہیں۔ عملی تدبیر کی تنہا مثال کروڑیوں کے تقرر سے ملتی ہے لیکن وہی اسکی انتظامی ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی کی مثال بھی ہے۔ غالباً کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ توقع ہوتی تھی کہ ان کا عامل انھیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا اور اپنے پیشرو سے زیادہ ان کو نہیں لوٹے گا۔ لیکن جو مواد موجود ہے اس سے یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ آیا یہ امید اکثر و بیشتر پوری ہوتی تھی یا نہیں۔

باب ۳

دوسری فصل

دوسری سرکاری ملازمتیں

سرکاری ملازمت کی بقیہ شکلوں کے لئے غالباً اسقدر تفصیلی کیفیت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ گو بہ حیثیت مجموعی باشندوں کے ایک بہت بڑے طبقے کی معاش اُن سے حاصل ہوتی تھی تاہم ملک کی مجموعی معاشی خوشحالی کے لئے نسبتہً اُن کی بہت کم اہمیت تھی اس موقع پر یہ ممکن ہے کہ فوجی اور غیر فوجی (سیول) ملازمت میں گو بالکل واضح نہیں تاہم کچھ نہ کچھ امتیاز کیا جاسکے چنانچہ پہلے عنوان کے تحت سب سے پہلے جس طبقے کا ذکر ہونا چاہیئے وہ ان مسلح اشخاص کی جماعت ہے جو احدی کہلاتے تھے۔ اور یہ اکبر کی تنظیم کی ایک ممتاز خصوصیت تھی سلطنت مغلیہ میں ہر باحیثیت نوجوان جو کسی وجہ سے منصب حاصل کرنے سے قاصر رہے پھر بھی ایک احدی یعنے بادشاہ کے "فوری خدمتگاروں" میں سے ایک خدمتگار بننے کی توقع رکھ سکتا تھا اور بعد ازاں اس جگہ سے کسی منصب پر ترقی پانے کی امید کر سکتا تھا۔ احدی طرح طرح کے (۴۷) کاموں پر نوکر رکھے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض تو ایسے فرائض انجام دیتے تھے جو زمانہ موجودہ کے ایڈی کانگ یا شاہی قاصد کے فرائض سے مشابہ ہوتے تھے اور بقیہ محلات شاہی کے مختلف شعبوں میں اعتبار واعتماد کی جگہوں پر مثلاً محافظان حرم کے طور پر یا کیمپ میں یا میوہ خانہ میں یا کتب خانے میں یا اسی طرح کے اور خدمات پر مقرر کئے جاتے تھے۔ ان کی تنخواہیں معمولی سپاہیوں کی تنخواہوں سے بہت زیادہ ہوتی تھیں ابو الفضل کا بیان ہے کہ ان میں سے اکثر ماہانہ پانچسو روپیہ سے زائد تنخواہ پاتے تھے سال میں ساڑھے نو مہینے کے لئے انھیں تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور بقیہ گھوڑوں اور سازوسامان کے مصارف میں محسوب ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اور مختلف طریقوں سے انھیں خاص خاص معاوضے ملتے تھے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ کوئی بہتر خدمت نہیں پاسکتے تھے انھیں اسکی بدولت آغاز سعی کا ایک ذریعہ ملجاتا تھا تاہم اس جگہ کے لئے بھی کسی نہ کسی کی سرپرستی ضروری تھی۔ اور ہم بجا طور پر یہ فرض کر سکتے ہیں کہ احدی بھی زیادہ تر انھیں طبقوں سے منتخب کئے جاتے تھے جن طبقوں سے کہ منصبدار و

باب ۳

انتخاب عمل میں آتا تھا۔

مغل فوج کے کثیر ترین حصے کی معاشی اہمیت پر غور کرتے وقت ہمارے خیال میں مناسب یہ ہے کہ اس چار لین پیادہ فوج کو چھوڑ دیا جائے جو بومی یا مقامی فوجوں پر مشتمل تھی۔ ابوالفضل تو صرف اسی قدر کہتا ہے کہ یہ فوجیں ملک کے زمین داروں کی جانب سے بہم پہنچائی جاتی تھیں اور دوسرے اسناد سے اس بات کا کوئی پتا نہیں چلتا کہ ان لوگوں کو تنخواہ دی جاتی تھی یا وہ کسی باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لئے طلب کئے جاتے تھے اور اس طرح پیدائش دولت کے کاروبار سے ہٹا لئے جاتے تھے۔ اُس زمانے کی تحریروں میں پیادہ سپاہی کا لفظ بہت وسیع معنے میں استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ لڑنے والے اشخاص اور بھیر و بنگاہ جو کثیر تعداد میں نوکر رکھے جاتے تھے دونوں اس مفہوم میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ آئین اکبری میں ان پیادہ سپاہیوں کا جو شمار کیا گیا ہے اس سے مراد ہمارے خیال میں صرف اسقدر ہے کہ ضرورت کے وقت مقامی حکام سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ سپاہیوں کی ایک معینہ تعداد بہم پہنچائیں۔ بالفاظ دیگر جب کبھی سلطنت کے کسی حصے میں فوجی کارروائیاں برسر ترقی ہوتی تھیں، تو اس خاص رقبے کے کاشتکاروں سے عارضی طور پر جبری خدمت لی جاسکتی تھی۔ لیکن مقامی سوار فوج کی حیثیت غالباً زیادہ باقاعدہ تھی۔ صوبوں پر ان کی تقسیم کم و بیش زمینداروں کی اہمیت کے مطابق تھی اور یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس عنوان کے تحت جن فوجوں کا شمار کیا گیا ہے وہ فوجی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتی اور ان سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھیں جنھیں زمیندار خود اپنے مصارف سے قائم رکھتے تھے۔ لیکن جو ضرورت کے وقت بادشاہ کی طرف سے طلب کیجاسکتی تھیں[۱]۔ غالباً پوری تعداد دوامی طور پر نہیں رکھی جاتی تھی تاہم اس کے باعث باشندوں کی ایک بڑی تعداد پیدائش دولت کے کاروبار سے علیحدہ ہو جاتی تھی۔ (۷۵)

ان مقامی فوجوں کے علاوہ ہمیں ایک تو اس نسبتاً قلیل تعداد کا شمار کرنا ہے

(۱) مقامی سوار۔ فوج کی جو تعداد آئین اکبری میں درج ہے اس کا شمار ۰۰۰ر۳۴۴ ہے۔ اس میں سے ۰۰ ۸۶ ۵ کا تعلق صرف ایک صوبۂ اجمیر سے ہے۔ جہاں زمینداروں کی حالت خاص طور پر اچھی تھی۔ برخلاف اس کے اودھ سے جس تعداد کی توقع کیجاتی تھی وہ صرف ۰۰ ۷۶ سوار ہیں۔

باب ۳

جو خود بادشاہ کی طرف سے نوکر رکھی جاتی تھی اور دوسرے ان کثیر التعداد سپاہیوں کا جنھیں اس کے عہدہ دار نوکر رکھتے تھے اور جن کے مصارف کچھ تو وہ خود برداشت کرتے تھے اور کچھ خزانۂ شاہی سے ادا کئے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے سپاہیوں کے لئے جو تنخواہ منظور شدہ تھی اس کا تو ہمیں علم ہے۔ اور ہم فرض کر سکتے ہیں کہ عہدہ داروں کو اس سے کسی قدر ارزاں شرح پر سپاہی مل جاتے تھے۔ سوار سپاہ کی تنخواہ میں گھوڑوں کی پرورش اور ساز و سامان کی تیاری کے مصارف شامل ہوتے تھے۔ اس مد کو منہا کرنے کے بعد ایک گھوڑا رکھنے والے ہر سپاہی کی تنخواہ کاغذ پر ۷ یا ۸ روپیہ تھی اور اگر اس کا گھوڑا باہر کا ہو تو وہ ۱۳ روپیوں تک پہنچ جاتی تھی لیکن مختلف منہائیاں اور بار بار کے جرمانوں کی وجہ سے ان تنخواہوں میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہوگی۔ توپ خانہ کلیتہً بادشاہ سے متعلق تھا اور اس کا انتظام فوج کے طور پر نہیں بلکہ شاہی محل کے ایک شعبہ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ اس میں تنخواہوں کا پیمانہ ۷ روپئے سے لیکر ۴ روپئے تک تھا۔ پیادہ فوج کو ہم بجا طور پر ایک متفرق فوج کہہ سکتے ہیں۔ جن کی صفوں میں بندوقچی (ماہانہ ۳ سے ۶ روپئے تک پانے والے) حمال (۲½ سے ۴ روپئے تک) شمشیر زن اور پہلوان (۲ سے ۱۵ روپئے تک) اور غلام (ایک دام سے ایک روپیہ روزانہ تک پانے والے) یہ سب شامل تھے۔ جب ہم دوسری ملازمتوں کے معاوضے کے معیار کی تنقیح کرنے لگیں گے تو اسوقت ان شرحوں کی اہمیت پر بھی غور کریں گے۔ بالفعل صرف اسقدر جان لینا کافی ہے کہ سوار فوج کی تنخواہ کی شرح جو بلند رکھی گئی تھی وہ معاشرت میں ایک جداگانہ حیثیت کا کم از کم جزوی ثبوت ضرور ہے۔ سوار فوج کی ملازمت ایک باعزت چیز تھی اور ہر شریف آدمی اس میں داخل ہو سکتا تھا لیکن فوجی ملازمت کی دوسری شاخیں قریب قریب ادنیٰ حیثیت کے کاموں میں شمار کی جاتی تھیں۔ البتہ توپ خانے کو اس سے جزوی طور پر مستثنےٰ کر سکتے ہیں کیونکہ جتنا جتنا زمانہ گذرتا گیا اس میں بیرونی ممالک کے ماہر روز بروز ایک بڑی تعداد میں نوکر رکھے جانے لگے۔

جیسا کہ گذشتہ فصل میں کہا گیا ہے مغلیہ فوج کی تعداد کا بالکل ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ سوار فوج کی واقعی تعداد تقریباً ایک ربع ملین کے لگ بھگ ہوگی اور (۷۶) پیادہ فوج کی تعداد کا تو محض قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس کی بدولت باشندوں کی بہت بڑی تعداد کو ذریعۂ معاش ملجاتا تھا۔ پیدل فوج میں تو کاشتکاروں اور شہریوں کے

معمولی طبقوں سے بھرتی کیجاتی تھی لیکن سواروں میں پٹھان اور راجپوت غالب ہوتے تھے اور ان کے علاوہ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے بہت سے جانباز بھی ہوتے تھے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اکبر کے قواعد و ضوابط خاص خاص شعبوں میں غیر ملکیوں کو بہت کافی ترجیح دیتے تھے۔

جنوبی ہند کی فوجیں شمال کی فوجوں سے خاصکر اس بارے میں مختلف تھیں کہ ان میں سواروں کا تناسب نسبتۂ کم ہوتا تھا اس اختلاف کی خاص وجہ گھوڑوں کی قلت تھی جنوب کی سلطنتوں میں ان کی افزائش کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا اور عربستان و ایران سے ان کی درآمد ایک پر از مصارف اور خطرناک کاروبار تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں شروع سے آخر تک یہ تجارت کلیتہً پرتگالیوں کے قبضہ میں تھی اور یہ لوگ اپنے پڑوسیوں کے سیاسیات میں اپنی حیثیت قائم کرنے کے لئے اپنے بحری اقتدار کو اس طور پر استعمال کرتے تھے اور گھوڑوں کی بہم رسانی کا وعدہ کرکے اس کے معاوضے میں طرح طرح کے اہم مراعات حاصل کرتے تھے گھوڑے رکھنا جنوب میں واقعی ایک طرح کا تعیش تھا۔ گوا میں ان کی قیمت ۵۰۰ پرڈاؤ یا اکبر کے ایک ہزار روپیوں کے برابر تھی۔ اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پیرارڈ جس نے یہ قیمت بیان کی ہے اس بازار میں ایک کنیز کی قیمت ۲۰ سے ۴۰ پرڈاؤ تک درج کرتا ہے بجز اس کے کہ پیدل فوج کی تعداد زیادہ تھی جنوبی ہند میں سپاہیوں کی حیثیت مغلیہ سپاہیوں کے مشابہ تھی۔ ہمیں کوئی ایسی تحریر نہیں ملی جس سے ان کی تنخواہوں کا پیمانہ معلوم ہو سکے لیکن نصف صدی بعد تھیونوٹ نے لکھا ہے کہ گولکنڈہ میں سپاہیوں کو دو یا تین روپیہ ماہانہ ملتے تھے جس کے معنے یہ ہوئے کہ ان کی حالت اکبر کی فوج کے اسی درجہ کے سپاہیوں سے مقابلتًا بدتر تھی یہ نہیں فرض کرنا چاہیے کہ جو تعداد دائمی طور پر فوجی فرائض کی انجام دہی کے لئے ملازم رکھی جاتی تھی وہ جنوبی ہند کی زمانۂ جنگ والی تعداد کے مساوی ہوتی تھی جس کا اندازہ ہم تقریبًا ایک ملین کر چکے ہیں لیکن باوجود اس کے سولھویں صدی کے اختتام پر جو فوجیں رکھی جاتی تھیں وہ تعداد میں بہت کافی ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اس زمانے میں سلطنت مغلیہ کی جنوب میں برابر توسیع ہو رہی تھی اور دکن کی حکومتوں کو اس روز افزوں خطرے کا مقابلہ کرنا تھا اس کے علاوہ امرائے و جیانگر اپنی اپنی حالت کو مضبوط کرنے میں لگے ہوئے تھے اور کبھی کبھی خود باہم

جنگ آزمائی کر لیتے تھے۔ پس اگر ہم مغلوں کی باقاعدہ فوج پیدل چھوڑ کر ان کے مقامی سوار، دکن کی حکومتوں کے دائمی سپاہی اور امرائے وجیانگر کے فوجی۔ ان سب کو جمع کریں تو یہ نتیجہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ کل ہندوستان کی مجموعی تعداد ایک ملین اشخاص سے بہرصورت بڑھ جائے گی۔ گویا ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کی مختلف فوجوں کی دگنی تعداد سے بھی زائد ہو گی۔

اس درمیان میں ملک کی آبادی میں جو اضافہ قرین قیاس ہے اس کا مناسب لحاظ کرتے ہوئے یہ نتیجہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ فوجوں کی وجہ سے ملک کی پیدائشی قوت پر جو بار عائد ہوتا ہے وہ زمانۂ مابعد کے مقابل زمانۂ ماسبق میں نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ کام کرنے والوں کی قلیل تعداد کو لڑنے والوں کی کثیر تعداد کے ضروریات بہم پہنچانا پڑتے تھے۔ اور ہندوستان کی مجموعی سالانہ آمدنی کی تقسیم پر اس فرق کا بہت کافی اثر پڑنا یقینی ہے۔

فوج کو چھوڑ کر جب ہم غیر فوجی نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو زمانۂ موجودہ کے حالات سے جو پہلا فرق مشاہدہ کرتے ہیں وہ ممتاز و مخصوص سررشتوں کی عدم موجودگی ہے۔ زمانۂ حال کی تعلیمات[ل] یا طبابت کے خدمات کے بالمقابل یا سررشتۂ آبکاری یا (بڑے بڑے شہروں سے باہر) سررشتۂ پولیس کی جگہ اس زمانے میں ہمیں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اور نہ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ جنگلات کے انتظامات یا کاشتکاروں اور دستکاروں کو فنی امداد بہم پہنچانے

ل اکبر نے اپنے دستور العمل میں (ملاحظہ ہو ترجمۂ آئین اکبری ۱۔ ۲۷۸) مدارس کیلئے ایک نہایت ہی عالی حوصلہ نصاب کا خاکہ پیش کیا ہے اس کو دیکھکر بعض مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کے زمانے میں نہایت زبردست تعلیمی ترقی ہوئی ہوگی۔ لیکن تاریخ کے سنجیدہ طلبہ اس رائے کو تسلیم کرنے کی طرف مشکل سے مائل ہوں گے۔ اگر ایسی کوئی ترقی ہوی ہوتی تو یقیناً اس کی تفصیل آئین اکبری میں مندرج ہوتی لیکن اس کی عدم موجودگی میں اس مفصل کی جو بدیہی توجیہ ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اکبر نے اپنے مذہبی خیالات کے ارتقا کے دوران میں یہ رائے قائم کی کہ مدارس (جو اسوقت مذہبی ادارات تھے) وقت ضایع کر رہے ہیں چنانچہ انکی بہتر تنظیم کے لئے اس نے اپنے خیالات تحریر کرا دئے۔ اور یہی نتیجہ صحیح و مناسب ہے کہ اس سے آگے یہ معاملہ نہیں بڑھنے پایا۔

کیلئے اس زمانے میں کوئی خاص تنظیم موجود تھی اس قسم کے خدمات کی عدم موجودگی کے باوجود جو ذرائع
معاش غیر فوجی نظم ونسق کی بدولت میسر آتے تھے وہ یقیناً بہت زیادہ تھے۔ شمالی ہند میں محل
شاہی کے مختلف شعبوں میں جو لوگ نوکر رکھے جاتے تھے وہ تو زیادہ تر فوج ہی سے لیے جاتے تھے۔
اعلیٰ خدمتیں عام طور پر امرا۔ منصبداروں یا احدیوں کو ملتی تھیں اور ادنے جگہوں کے لیے پیدل
فوج سے بھرتی ہوتی تھی۔ لیکن نظم ونسق کے مختلف صدر مقامات پر محرروں کے بڑے بڑے عملے
بھی موجود تھے اور اس کے علاوہ تشخیص وتحصیل مالگزاری کے واسطے بھی ایک کثیر التعداد دیہی
عملہ درکار تھا۔ صدر مقامات کے دفاتر کے متعلق ابوالفضل قطعاً کچھ نہیں بیان کرتا ہے اور
چونکہ آئین اکبری کو اکبر کے انتظامی فرامین کا ایک مکمل مجموعہ تصور کیا جاتا ہے لہذا ہم یہ نتیجہ
اخذ کرسکتے ہیں کہ اس نے ان دفاتر کی تنظیم میں کوئی رد و بدل نہیں کیا تھا بلکہ جس طریقے
پر کام چلتا ہوا پایا اسی کو برقرار رکھا اب رہا یہ امر کہ آیا محرروں کا ایک بڑا عملہ نوکر رکھا جاتا تھا
یا نہیں اس کا پتا ابوالفضل کے اس بیان سے بآسانی چل سکتا ہے جو اس نے سرکاری طریق کارروائی
کے متعلق تحریر کیا ہے۔ یہ طریقہ انتہا درجے کا پیچیدہ تھا اور اس میں بہت کچھ نقل و کتابت
کرنا اور متعدد رجسٹر استعمال کرنا پڑتے تھے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو اب تک ہندوستان کے
سرکاری دفاتر کا نشان امتیاز بنے ہوئے ہیں۔ معاملات جس طور پر طے پاتے تھے ان کی ایک
مثال کے لیے ہم یکے بعد دیگرے ان تمام مدارج پر نظر ڈالیں گے جن کی تکمیل قبل اس کے کہ
کوئی جدید تقرر یافتہ منصبدار اپنی رقمیں حاصل کرسکے ضروری تھی۔ تقرر چونکہ خود بادشاہ
کرتا تھا اس لیے سب سے پہلے اس کا اندراج روزنامچے میں کیا جاتا تھا جس میں اسکے تمام احکام
کا داخلہ رہتا تھا۔ روزنامچے کی تنقیح اور منظوری کے بعد اس حکم کی ایک یادداشت تیار کیجاتی
تھی جس پر تین عہدہ داروں کے دستخط ہوتے تھے۔ پھر وہ دفتر کتابت کے حوالے کی جاتی
جہاں اس کا ایک خلاصہ (تعلیقہ) تیار کیا جاتا اور چار عہدہ داروں کے دستخط ثبت ہوتے
تھے اور بعد ازاں اس پر وزرائے حکومت کی مہر لگائی جاتی۔ اس کے بعد وہ تعلیقہ دفتر فوج
میں جاتا اور وہاں سے سپاہیوں کی تفصیلی فہرست اور تخمینے طلب کئے جاتے۔ جب یہ
تیار ہو جاتے تو تنخواہ کی ایک کیفیت (سرخط) مرتب کیجاتی اور دفتر کے جملہ شعبوں میں اسکا
داخلہ ہونے کے بعد وہ دفتر مالیات (فینانس) کو روانہ کردی جاتی وہاں اس کا حساب
تیار کیا جاتا اور بادشاہ کی خدمت میں کیفیت پیش کی جاتی اور جب کوئی رقم باقاعدہ طور پر منظور

باب ۳

ہو جاتی تو ایک صداقت نامہ ادائگی کا مسودہ کیا جاتا جو زیر فینانس سپہ سالار اور محاسب فوج کے ہاتھوں میں سے گزرتا تھا یہی آخرالذکر عہدہ دار ایک آخری تحریر یعنے فرمان تیار کرتا جس پر تین جداگانہ سررشتوں سے چھ دستخط درکار ہوتے اور جو بالآخر ادائی تنخواہ کی سند کے طور پر خزانے میں قبول کیا جاتا تھا۔

اس طویل طریقۂ کارروائی کے دیکھنے سے ہندوستان کے موجودہ سرکاری دفاتر کا بدترین پہلو غالباً ناظرین کے پیش نظر ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ حالت صرف خرچ کرنیوالے سررشتوں کے ساتھ کچھ مخصوص نہ تھی۔ چنانچہ نظم و نسق مالگزاری کی جو کیفیت ابوالفضل نے بیان کی ہے اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے منجملہ اور تفصیلی باتوں کے ابوالفضل اس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ سال میں دو مرتبہ ہر گاؤں کے واسطے تشخیص مالگزاری کے تختے تیار کئے جاتے تھے اور جیسے ہی وہ تیار ہو جاتے شاہی مستقر پر ان کا روانہ کر دیا جانا ضروری تھا۔ کاغذات کے اس قدر عظیم الشان انبار کی تنقیح اور رجسٹری بجائے خود محرروں کی ایک چھوٹی سی فوج کی محتاج تھی اور وہ لوگ بالکل جداگانہ تھے جو سلطنت کی مالگزاری کی دوسری شاخوں کا کاروبار چلانے کے واسطے درکار تھے[۱]۔ پھر یہ تمام بڑے بڑے دفاتر کچھ شمالی ہند ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھے چنانچہ بیرارڈ نہایت جوش کے ساتھ اُس دفتر معتمدی کا ذکر کرتا ہے جو زامورن نے کالیکٹ میں قائم کر رکھا تھا۔ وہ کہتا ہے "مجھے اکثر ان کثیر التعداد اشخاص کو دیکھکر تعجب ہوتا تھا جنھیں دن بھر بجز اس کے کوئی اور کام نہ تھا کہ لکھتے رہیں اور رجسٹروں میں اندراجات

(۹۰)

---

[۱] مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ یہ تختے صرف صوبوں کے صدر مقامات پر بھیجے جاتے تھے لیکن آئین اکبری کا طرز بیان اس بارے میں بالکل صریح معلوم ہوتا ہے اور یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ جن مستند اشخاص نے اُس کتاب کی ان فصلوں کا مسودہ کیا وہ ایک مروجہ عملدرآمد کے بارے میں غلطی کے مرتکب ہوں۔ لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ جن جن محرروں کے ہاتھوں میں یہ تختے جاتے تھے وہ دارالسلطنت میں ایک جگہ پر مجتمع نہیں بلکہ صوبوں میں منقسم تھے۔ تب بھی کام کی مقدار پر اس سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ مسٹر اسمتھ تسلیم کرتے ہیں کہ شاہی صدر مقام پر "اعداد و شمار کا ایک زبردست دفتر" موجود ہوگا۔ آئین اکبری کے مضامین سے اس بیان کی بہت کافی تصدیق ہوتی ہے۔

کرتے جائیں۔ وہ بہت باعزت حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض تو وہ چیزیں لکھ لیتے ہیں جو بادشاہ کے لئے آتی ہیں۔ بعض وہ محاصل اور خراج قلمبند کرتے ہیں جو روز بروز ادا ہوتے رہتے ہیں بعض وہ رقوم درج کرتے ہیں جو شاہی محل کے مصارف کے واسطے نکلتی رہتی ہیں۔ بعض وہ اہم ترین واقعات تحریر کرتے ہیں جو دربار یا سلطنت کے کسی اور حصے میں روزانہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں مختصر یہ کہ ہر قسم کی خبریں لکھی جاتی ہیں کیونکہ ہر چیز کا رجسٹر میں داخلہ ضروری ہے اور ہر چیز کی اپنی ایک علیحدہ جگہ ہوتی ہے جبقدر اجنبی وارد ہوتے ہیں وہ بھی رجسٹروں میں درج کرلئے جاتے ہیں۔ اُن کے نام۔ اُن کے وطن۔ اُن کے آنے کے اوقات اور جن اغراض کے لئے وہ آتے ہیں یہ سب باتیں قلمبند کرلی جاتی ہیں (جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا) اُن کی تعداد اُنکا عمدہ انتظام اور ان کا اسقدر تیز لکھنا درحقیقت تعجب میں ڈالنے والی چیزیں ہیں سلطنت کے جملہ شہروں۔ بندرگاہوں اور راستوں میں بادشاہ نے اسی طرح کے محرر رکھ چھوڑے ہیں وہ کُل کے محرروں سے خط و کتابت کرتے ہیں اور ہر چیز ایک منظم حالت میں رہتی ہے۔ پہلے محرر ان دوسرے محرروں کے تابع رہتے ہیں اور خود ان کے آپس میں بھی افسر و ماتحت ہوتے ہیں۔ تمام ساحل ملیبار پر ان کے لکھنے کا طریقہ بھی ایک ہے اور ان کی تنظیم بھی ایک ہی ہے۔" (۸۰) ایک اور مقام پر کالی کٹ کے محصول خانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے پیرارڈ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ محرروں اور عہدہ داروں کی کثرت تعداد کی وجہ سے دھوکہ دینا یا غلطی کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا اور یہ کہ چھوٹے سے چھوٹے بندرگاہوں پر محرر متعین ہوتے تھے جو اپنا سارا وقت اشیائے درآمد کی فہرستیں بنانے میں صرف کرتے تھے۔ دوسرے سیاحوں کے بیانات سے بھی اسی طرح کے طویل قواعد و ضوابط کا پتا چلتا ہے۔ جو گویا ایک مکمل تنظیم یافتہ نظم و نسق کی موجودگی کا ثبوت ہے لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آج کل کیطرح اکبر کے زمانے میں بھی محرری کے کاموں کی بدولت ملک کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو کسب معاش کا ذریعہ میسر ہو جاتا تھا گو ان کے معاوضے کی مروجہ شرحوں اور دوسرے شرائط ملازمت کے بارے میں ہمیں کوئی واقفیت نہیں ہے۔

محرری کی خدمتوں کے علاوہ تشخیص و تحصیل مالگزاری کے طریقوں سے بھی بہت سے لوگوں کو معاش کا ذریعہ مل جاتا تھا۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ میں ماتحت انتظامی عملہ کی موجودگی کا کہیں کہیں پتا ملتا ہے۔ جنوبی ہند کے متعلق ہمیں اسی طرح کی کوئی واقفیت نہیں ہے لیکن

وہاں بھی مالگزاری کے کاروبار میں متعدد عہدہ دار درکار ہوتے ہوں گے ۔ اگرچہ طریق
نظم ونسق کے لحاظ سے وہ غالباً مرکزی حکومت کے نہیں بلکہ اُمرا کے ملازم ہوتے تھے[1]
ایک جزئی خبر جو محفوظ رکھی گئی ہے وہ قانون گو اشخاص کے بارے میں ہے جو ہمارے
خیال کے مطابق مالگزاری کے نظم ونسق کا ایک دوامی جزو تھے اور ہر مقام کے ساتھ
مخصوص ہوتے تھے ۔ کسی زمانے میں وہ ابواب کی آمدنی سے معاوضہ پاتے تھے لیکن
اکبر نے کچھ کچھ اراضی (جاگیر) ان کے تفویض کر دی جن سے ماہانہ ۲۰ تا ۵۰ روپیوں
کی آمدنی ہو سکے ۔ اس طرح اگر روپیہ کی قوت خرید کی تبدیلیوں کا لحاظ کیا جاوے تو
اس زمانے کے قانون گو اپنے آجکل کے جانشینوں سے بہت زیادہ بہتر تھے ۔ قانون گو
طبقے کو چھوڑ کر اکبر نے شیر شاہ کی قائم کردہ ماتحت تنظیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی ۔ چنانچہ
شق دار ۔ امین ۔ کارکن ۔ منصف[2] جیسے کثیر التعداد عہدہ داروں کے نام بلا ان کی تفصیلی کیفیت
کے ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ موسمی فصلوں کے اعداد وشمار تیار کرنے کے واسطے

جو عملہ نوکر رکھا جاتا تھا اُس کے بارے میں ہمیں زیادہ تفصیلی معلومات حاصل ہیں ۔ اس
قسم کے عملے کی موجودگی تشخیص مالگزاری کے دستور العمل کی نمایاں خصوصیت تھی ۔
گاؤں کے محاسب جو اُس زمانے میں سرکاری ملازم نہیں بلکہ گاؤں کے نوکر ہوتے تھے
ان اعداد وشمار کو جمع نہیں کرتے تھے بلکہ ہر موسم میں پیمائش کرنے والے اور لکھنے والے
موقع پر پہنچ جاتے تھے اور اگر وہ اپنے معاوضہ کا کوئی جزو کاشتکاروں سے وصول کر سکتے
ہوں گے تو یقیناً یہ طریقہ کاشتکاروں کے حق میں بہت گراں ثابت ہوتا ہوگا ۔ اکبر نے
پیمائش کرنے والی جماعتوں کے واسطے خوراک کا ایک پیمانہ مقرر کر دیا تھا اور نقد میں

[1] سلطنت گولکنڈہ میں ٹکس وصول کرنے والوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر تھیونوٹ نے جو اظہار رائے کیا ہے اس کا کسی سابقہ باب میں حوالہ دیا جا چکا ہے ۔

[2] منصف آجکل کی طرح فیصلہ کرنیوالا نہیں بلکہ ایک انتظامی عہدہ دار تھا ۔ یہ بات پورے طور پر واضح نہیں ہوئی ہے کہ شیر شاہ نے جو خدمتیں قائم کی تھیں آیا اکبر نے ان سب کو جاری رکھا ۔ اگر ایسا ہوتا تو اکثر خدمتیں دُہری ہوجاتیں اور یہ ممکن ہے کہ ایک ہی عہدہ دار مختلف ناموں سے نظر آئے ۔ کبھی تو وہ اپنے پرانے عہدہ کے نام سے پکارا جاتا اور کبھی دور جدید کے جاری کردہ لقب سے مخاطب کیا جاوے ۔

باب۳ بھی معین کر دی تھی لیکن چونکہ ہر موسم کی مالگزاری کی مقدار اس طرح تیار کیے ہوئے کاغذات پر منحصر ہوتی تھی لہذا یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ واقعی عملہ رآمد میں اس قسم کے اوا کرنے کا طرز کسی حکم و فرمان وغیرہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا بلکہ ماتحت عہدہ داروں کی حرص و طمع کے مطابق ان کی مقدار معین ہوتی تھی۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں پیمایش اراضی کو لوٹ کے مرادف خیال کرنے کی جو روایت متواتر چلی آرہی ہے اس کی بنیاد تشخیص مالگزاری کے اسی طرز میں موجود تھی جس کو شیر شاہ نے جاری کیا تھا اور جسے اکبر کے دور میں راجہ ٹوڈرمل نے مکمل کیا تھا۔

مقامی انتظامی عملے کے متعلق ہمارے معلومات کی کوئی کیفیت اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ کڑوڑیوں کو مقرر کرنے کے تباہ کن تجربے کا کچھ ذکر نہ کیا جائے جس کا سرسری طور پر ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں۔ جو خیال اس تجربے کے پردے میں پوشیدہ تھا وہ بلاشک وشبہہ صحیح تھا۔ سلطنت کے وسیع رقبے کافی طور پر کاشت نہیں کیے جاتے تھے حالانکہ ہر کھیت جو زیر کاشت لایا جاتا تھا تقریباً فوری اضافۂ آمدنی کا باعث ہوتا تھا۔ لہذا یہ ایک مالیات کی قرین عقل تجویز تھی کہ ایسے اشخاص کا تقرر کیا جائے جو آجکل کی اصطلاح میں عہدہ داران نوآبادیات کہلائے جاتے ہیں جن کا خاص فریضہ یہ ہو کہ رعایا کو توسیع کاشت کی ترغیب دیں اور اس میں ہر طرح سے ان کی مدد کریں۔ لیکن اس غرض کے واسطے تین سال کی جو میعاد مقرر کر دی گئی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس کام کی دقتوں اور پیچیدگیوں کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ مورخوں نے ان تقررات کو ۱۵۷۴ء کے تحت قلمبند کیا ہے لیکن اُن کے نتیجے کے متعلق وہ بالکل ساکت ہیں اور آئین اکبری میں بھی کروڑیوں کا کہیں حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف سے قبل ہی وہ ناپید ہو چکے تھے۔ بدایونی نے البتہ اصلی واقعات کا ذکر کیا ہے جو عہدہ داران جنگلوں پر مقرر کئے گئے تھے وہ اس توقع کو غنیمت جانکر اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنے میں پڑ گئے اور سلطنت کے مفاد کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تجربہ سراسر ناکام اور تباہ کن ثابت ہوا۔ کروڑیوں کی حرص وطمع اور تشدد کی بدولت ملک کا ایک (۹۲) بہت بڑا حصہ ویران ہو گیا۔ رعایا کے بیوی بچے فروخت ہوا ادھر اودھر منتشر کر دیئے گئے اور ہر چیز ابتری میں پڑ گئی۔ لیکن راجہ ٹوڈرمل نے کروڑیوں کی خوب ہی خبر لی۔ اور بہت سے نیک آدمی سخت مارپیٹ اور شکنجہ اور چھپٹے کی اذیتوں سے مر گئے۔ عہدہ داران مال

کے قید خانوں میں مدت تک بند رہ کر اتنے اشخاص نے جان دی کہ کسی جلاد یا قاتل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور کسی نے اتنی بھی ان کی پروا نہ کی کہ اُن کے لئے تجہیز و تکفین کا انتظام کر دے“ بدایونی کے اکثر و بیشتر تصنیفات کی طرح اس بیان میں بھی بلاشبہ بہت کچھ رنگ آمیزی ہے لیکن جو خاص خاص واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ نفس مطابق قیاس ہیں اور اکبر کے اس تجربے کی ناکامی کی حقیقت ہمارے خیال میں اس وجہ سے اور بھی مسلّم ہے کہ ابوالفضل نے طریق مالگزاری کی جو تاریخی کیفیت بیان کی ہے اس میں ان تقررات کا قطعاً کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اگر یہ تجویز کامیاب ثابت ہوتی تو وہ یقیناً اس موقع کو ہاتھ سے نہ چھوڑتا اور اپنے آقا و بادشاہ کے جو ہر تدبر و بصیرت کو اس کامیابی کا باعث قرار دیتا۔ لیکن حالات اس طرح وقوع پذیر ہوئے کہ اس بحث کا نظر انداز کر دینا ہی مناسب تھا۔

یہاں ہم ان طبقوں کی کیفیت ختم کرتے ہیں جن کی معاش کا دار و مدار سرکاری ملازمت پر تھا۔ ان کے بارے میں ہمارے معلومات کئی لحاظ سے غیر مکمل ہیں۔ تاہم معاشی نقطۂ نظر سے اُن کی جو کچھ اہمیت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں کافی واقفیت ہو چکی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ تعداد میں تو نسبتاً کم تھے لیکن ملک کی آمدنی کے ایک بہت بڑے حصے کا خرچ انھیں کے زیر اقتدار تھا۔ اور انھیں کے طرز عمل پر آمدنی پیدا کرنیوالے طبقوں کی خوشحالی کا انحصار تھا۔ درجہ ادنیٰ کے ملازمین کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ بحیثیت مجموعی وہ آبادی کا ایک کافی بڑا جز و تھے۔ معاشی نقطۂ نظر سے انھیں مفت خور کہنا چاہیے کیونکہ دوسرے کام کرنیوالوں کی محنت کے نتائج پر ان کی پرورش کا دار و مدار تھا۔ اور بجز ایک ناکمل اور غیر یقینی حفاظت جان و مال کے وہ ملک کی مشترکہ دولت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے تھے۔ اس باب کی بقیہ فصلوں میں ہمیں دوسرے طبقوں کے حالات پر غور کرنا ہے اور ان پر بھی عام طور پر اس کیفیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

باب ۲

تیسری فصل

دماغی پیشے اور مذہبی فرائض انجام دینے والے طبقے

ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ زمانۂ موجودہ کے بعض اہم ترین دماغی پیشے خاص کر وکالت۔ تعلیم اور اخبار نویسی اکبرؔ کے زمانے میں موجود نہ تھے۔ بلاشبہہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مقدس کتابوں کے بڑے بڑے عالم وفاضل لوگ موجود تھے لیکن آجکل کی طرح عدالتوں میں کام کرنیوالے وکلا نہیں تھے۔ اسی طرح بہت سے مدرس بھی نظر آتے ہیں لیکن ابھی تک خالص مذہبی فرائض سے یہ پیشہ علیحدہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک اخبار نویسوں کا تعلق ہے اگر ان کی موجودگی کے لئے دوسرے موافق اسباب موجود بھی تھے تو فن طباعت سے ناواقفیت ان کی عدم موجودگی کا بہت کافی سبب تھا[1]۔ آئین اکبری کے مطابق اس زمانے کے مستقل دماغی پیشے طبابت۔ درس تدریس۔ ادبیات۔ مصوری و خوشنویسی اور موسیقی پر مشتمل تھے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ لازمی طور پر ایک دوسرے سے کلیتاً علیحدہ نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک ذہین اور ہوشیار انسان اعلیٰ درجے کا طبیب بھی ہو سکتا تھا اور مشہور ومعروف شاعر بھی۔ جب ایک ماہر معاشیات کے نقطۂ نظر سے اِن پیشوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جو بات سب سے زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس احول کی کمی ہے جو ان پیشوں کو پیدا کرتا ہے یا جس سے اس قسم کے خدمات کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ بہت چھوٹا تھا اور کوئی طبیب یا مصور یا ماہر ادبیات صرف اسی حالت میں کافی آمدنی پیدا کرنے کی توقع کر سکتا تھا جبکہ وہ اپنے آپ کو شاہی دربار کے ساتھ وابستہ کر دے یا صوبوں کے حاکموں میں سے جو اپنے ماحول کو دربار شاہی کے نمونے پر ترتیب دیتے تھے

[1] جیسوئٹ فرقہ کے لوگوں نے حال ہی میں فن طباعت کو جنوبی ہند میں جاری کیا تھا۔ لیکن مطبع صرف مذہبی اغراض کے لئے استعمال ہوتا تھا اور ابھی تک وہ شمال میں نہیں پہنچایا گیا تھا۔

باب ۲

کسی ایک کے ساتھ وابستگی پیدا کرے۔ غرض سرپرستی ہی دنیاوی کامیابی کا واحد ذریعہ تھی[۱]۔ اور سرپرستی کا معاوضہ عام طور پر تحایف خوشامد یا کسی اور اسی قسم کے طریقے سے ادا کیا جاتا تھا۔

اکبر کا زمانہ ان پیشوں کے حق میں ایک بہت ہی موافق دور تھا۔ بادشاہ ہر بات میں دلچسپی لیتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک فیاض سرپرست بھی تھا۔ اہل دربار بھی لازمی طور پر اُسی کی تقلید کرتے اور اسی کے مذاق اور دلچسپیوں کو خود بھی اختیار کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں فضا بہت زیادہ اجنبی تھی۔ اور اگرچہ ہندوستان کے صاحب استعداد لوگ بھی نظر انداز نہیں کئے جاتے تھے لیکن حقیقت میں سرپرستی کا بہت بڑا حصہ ایران اور ایشیا کے دوسرے ممالک سے آنے والوں کو حاصل ہوتا تھا[۲]۔ عملی طور پر یہ سرپرستی تین شکلوں میں ظاہر ہوتی تھی منصب سے سرفراز کرنا۔ نقد یا بہ شکل زمین وظیفہ مقرر کرنا۔ ۸۱ خاص خاص خدمات پر انعامات عطا کرنا۔ آئین اکبری میں مشہور آدمیوں کی جو فہرستیں درج ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری منصب فوج والوں اور انتظامی عہدہ داروں کی طرح طبیبوں۔ مصوروں شاعروں اور عالموں کو بھی عطا کیا جاسکتا تھا۔

---

[۱] راماین کا وجود اس امر کی کافی شہادت ہے کہ اس زمانے میں اعلیٰ ترین قسم کی خالص ادبی تصانیف پیدا ہو سکتی تھیں۔ لیکن اکبر کے عین حیات دربار کے ذریعہ تلسی داس کا پتہ نہیں لگایا گیا تھا۔ گو جہانگیر نے اُسے باریابی عطا کی تھی۔

[۲] ابو الفضل نے اُن مصوروں اور اہل فن اشخاص کی ایک فہرست دی ہے جو اکبر کے دربار میں آئے تھے شعراء میں سے تین چوتھائی اجنبی تھے۔ طبیبوں میں ایک ثلث سے زیادہ تھے۔ اور ماہران موسیقی کا بھی تقریباً یہی تناسب تھا ملاحظہ ہوں بلاکمین کے نوٹ۔ ترجمۂ آئین اکبری۔

ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صاحب استعداد ملکی اشخاص پر بھی اکبر کی نگاہ لگی رہتی تھی چنانچہ ابو الفضل ذکر کرتا ہے کہ "جو نکہ بادشاہ نے ایک ادنیٰ خدمتگار کے کم سن لڑکے کو دیواروں پر تصویریں کھینچتا ہوا دیکھا اور اس کے لئے تصویر کشی کی تعلیم پانے کا انتظام کردیا۔ یہ کمسن لڑکا دسونت تھا جو کہ اپنے زمانے کا بہترین استاد نکلا"

باب۳

اس کے علاوہ ہم وقتاً فوقتاً اُن انعامات کی کیفیت کا بھی مطالعہ کرتے ہیں جو کسی نظم کے لکھنے یا کسی اور فنون لطیفہ سے متعلق کارگذاری پر قدیم روایاتی طرز کے مطابق عطا کئے جاتے تھے۔ مربیانہ سرپرستی کی باقی ایک شکل یعنی وظایف کا مقرر ہونا اس پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے وظایف بعض اوقات نقد الاونس کی شکل میں دئے جاتے تھے لیکن زیادہ مروجہ طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص رقبۂ زمین کی مالگزاری معاف کردی جاتی تھی۔ یہ عطیات ترکی لفظ "سورغل" یا۔ فارسی اصطلاح "مدد معاش" اور مختلف دوسرے ناموں سے موسوم ہوتے تھے۔ عہدہ داروں کے عطیات یعنی (جاگیرات) سے وہ اس بارے میں مختلف ہوتے تھے کہ وہ ایک غیر محدود زمانے کے لئے دئے جاتے تھے۔ اور نظری طور پر موروثی تھے۔ لیکن زمانۂ موجودہ کے مفہوم کے مطابق ان کو دائمی تصور کرنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ مسلمانوں کی حکمرانی کے سارے دور میں ان عطیات کے متعلق جو طرز عمل شروع سے آخر تک برابر جاری رہا وہ ایک کم و بیش معینہ گردش کا پابند نظر آتا ہے۔ ایک زمانے تک تو اندھا دھند زمینیں عطا کی جاتیں اور ان کی تقسیم میں ہر طرح کی دغابازیاں اختیار کی جاتیں تھیں۔ اس کے بعد یکایک سختی کا دور نمودار ہوتا تھا اور تھوڑی مدت تک نہایت زبردست مالی اصلاحات جاری رہتی تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بہت سے عطیات یا تو بالکل منسوخ کردیے جاتے یا ان کی مالیت میں بہت بڑی تخفیف کردی جاتی تھی۔ عطیات کے لئے مقامات تجویز کرنے کا اختیار سلطنت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے سپرد کیا جاتا تھا جسے صدر کہا جاتا تھا۔ اور اس عہدے کی تاریخی کیفیت جو ابو الفضل نے بیان کی ہے وہ رشوت ستانی کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے۔

غرض اکبر کی سلطنت میں دماغی پیشوں کی امتیازی خصوصیت ان کی ہمت شکن حالت تھی۔ کامیابی کا دارومدار شفقت و عنایت پر تھا اور شفقت و عنایت جسقدر آسانی سے حاصل ہوسکتی تھی اسقدر عجلت کے ساتھ اس کا خاتمہ بھی ہوجاتا تھا۔ حتیٰ کہ مستقل آمدنیوں کا انحصار بھی عملاً محض خوشنودی پر ہوتا تھا اور نظم و نسق کی ذرا ذرا سی شخصی تبدیلیوں سے اُن کے یکایک بند ہوجانے کا ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا تھا اس صورت حال کا کام کی خوبی پر کیا اثر پڑتا تھا اس سے ایک معاشی کو کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے

۸۵

باب ۳

لہٰذا ہماری موجودہ غرض کے لئے صرف اسقدر کافی ہے کہ اِن پیشوں کی غیر محفوظ حالت کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ جنوبی ہند میں بھی حالات زیادہ تر اسی قسم کے تھے۔ لیکن اس بارے میں ہمیں کوئی شہادت براہ راست نہیں ملی[1]۔ البتہ نصف صدی بعد ٹیورنیر نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ قابل لحاظ ہے۔ کرناٹک۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے اثنائے سفر میں جن جن مقامات میں اس کا گزر ہوا وہاں بجز اُن طبیبوں کے جو بادشاہوں اور شہزادوں کے لئے مخصوص ہوتے تھے مشکل سے کوئی اور طبیب ملتا تھا عوام جڑی بوٹیاں جمع کر لیتے اور ان سے اپنا آپ علاج کر لیتے تھے۔ البتہ بڑے بڑے شہروں میں ایک یا دو طبیب علاج معالجے کے لئے دکھائی دیتے تھے۔ پس ہم یہ رائے ظاہر کر سکتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں اہل فن اور علمی پیشہ وروں کے لئے ترقی کے مواقع شمال میں بمقابل جنوب کے زیادہ تھے۔ دکن کے بادشاہ اس زمانے میں سرپرستوں کی حیثیت سے نمایاں نظر نہیں آتے۔ مزید براں وجیانگر کی مرکزی حکومت کے زوال کے باعث امرا کے خیالات علم و ادب اور فنون لطیفہ کی طرف مائل نہیں رہ سکتے تھے۔

جب ہم مذہبی طبقوں کی حالت کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دربار کا اثر جو دماغی پیشوں پر اسقدر زبردست طور پر حاوی تھا یہاں نسبتاً غیر اہم معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس طبقے کے اشخاص دو خاص گروہوں میں منقسم پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ جو زہد و عبادت میں مشغول رہتے اور تارک الدنیا کہے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو گداگری اختیار کر لیتے ہیں۔ اُس زمانے کے جو حالات ہمیں میسر ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی کے تناسب سے اِن لوگوں کی تعداد اُس زمانے میں بھی ویسی ہی کثیر تھی جیسی کہ آجکل پائی جاتی ہے چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں سیاحوں نے

[1] دکن میں طب کے پیشہ کی حالت کا اندازہ اس قصہ سے ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم نے بیجاپور میں اپنی علالت کے دوران میں متعدد طبیبوں کو جو اُسے تندرست نہیں کر سکتے تھے مروا ڈالا۔ بعضوں کو تو اُس نے قتل کرا دیا اور بقیہ کو ہاتھیوں کے پیروں میں اسقدر روندوا ڈالا کہ وہ مر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باقی جتنے طبیب بچ رہے تھے وہ سب اس کی سلطنت سے بھاگ نکلے (سیویل صفحہ ۱۹۲)۔

باب ۳

ان کی کثرت پر اظہار رائے کیا ہے۔ ایک معاشی کو اُن سے صرف اسقدر سروکار ہے کہ ملک کے وسائل پیدائش میں ان لوگوں کی وجہ سے اُن کی تعداد کے مطابق کمی ہوجاتی ہے۔ جہاں تک مُرشِدوں کا تعلق ہے اسناد میں مخصوص طور پر ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مسٹر سیویل لکھتے ہیں کہ سولھویں صدی کے نصف اول میں وجیانگر کے امرانے سارے جنوبی ہند کے مندروں کے لئے کثیر تعداد میں عطیات مقرر کر دیئے تھے اور ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ شمال اور وسط کے کم از کم اُن علاقوں میں جہاں مقامی نظم ونسق زمینداروں کے ہاتھوں میں تھا مذہبی لنگر خانے اپنے قدیم عطیات سے برابر متفید ہورہے تھے۔ اکبر نے بھی غالباً اس قسم کے عطیات مقرر کرنے کا طریقہ جاری رکھا۔ آئین اکبری میں صرف اس کی عام سخاوت و فیاضی کا ذکر ہے اور مخصوص طور پر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندؤں کے لئے مذہبی عطیات مقرر کئے تھے یا نہیں البتہ شیخ عبدالنبی نے صدر ہونے کے بعد عطیات کی جو نظر ثانی کی تھی بدایونی اس کی کیفیت تحریر کرتے ہوے بیان کرتا ہے کہ عالم و فاضل مسلمانوں کو تو اپنے سابقہ عطیات کے چھوٹے چھوٹے حصوں پر قانع رہنا پڑا لیکن "معمولی سے معمولی جاہل و ناکارہ اشخاص حتیٰ کہ ہندوں کو بھی جتنی زمین انھوں نے طلب کی بغیر کسی وقت کے مل گئی" اس مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بادشاہ کے تول کی رسموں میں جو چیزیں استعمال ہوتی تھیں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ برہمنوں کو بھی تقسیم کی جاتی تھیں۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بادشاہ کی فیاضی کا کچھ حصہ ہندؤں کے مذہبی اوقاف کو بھی مل جاتا تھا۔

۸۶

مسلمانوں کے ادارات کو اکبر کے پیشرؤں کے مقرر کردہ عطیات سے بہت زیادہ فائدہ پہنچ چکا تھا۔ اور اس کی حکومت کے ابتدائی دور میں مملکت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہوگا۔ لیکن اکبر کا آخری طرز عمل مخالفانہ تھا۔ اور اگر بدایونی پر اعتماد کیا جائے تو نظر ثانی کی کارروائیاں جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں مسلمانوں کے حق میں بہت ہی مضر تھیں اور یقیناً اُن کی وجہ سے مسلمانوں کے ادارات کی آمدنیوں میں زبردست تخفیف ہوگئی ہوگی۔ آئین اکبری میں اُن عطیات کے اعداد و شمار درج ہیں جو اکبری دور کے اختتام پر موجود تھے۔ لیکن ان اعداد سے مقداروں کے متعلق نتائج اخذ کرنا ممکن نہیں ہے کچھ تو اس وجہ سے کہ عبارت اب تک غیر یقینی ہے

باب۳

اور کچھ اِس وجہ سے کہ اس میں مختلف عطیات کے اغراض کے مابین امتیاز نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف اُن عطیات کی میزانیں دیدی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف اغراض کے لئے مقرر تھے۔ پس جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مالیات میں اصلاح کرنیوالوں کی جد وجہد کے باوجود مملکت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس غرض سے صرف ہو جاتا تھا کہ مذہبی ادارات کے ساتھ ساتھ اہل علم و ارباب فن اور دوسرے ایسے اشخاص کی امداد کی جائے جو اپنے آپ کو صرف افلاس کے باعث خیرات کا مستحق سمجھتے تھے۔ اِن عطیات سے نفع اٹھانے والوں کی معاشی حیثیت کا ہم عصر اسناد سے ہمیں کوئی پتا نہیں چلتا۔ اسقدر یقینی ہے کہ ہندوستان کے بہت سے مندروں نے بڑی بڑی دولت جمع کر لی تھی۔ کیونکہ ان کی لوٹ حصول دولت کا ایک مسلّمہ ذریعہ تھی تاہم ہمیں اس بات کا بھی اتنا ہی یقین ہے کہ ہر طرح کے خیالات رکھنے والے بہت سے نیک لوگ بھی موجود تھے جو اپنے اعتقاد کے مطابق پوری پوری کوشش کرتے اور افلاس کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے خواہ یہ افلاس جبری ہو یا اختیاری۔ کم از کم اس بارے میں تو یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں ہندوستان بہت زیادہ متغیر ہو گیا ہے۔

باب ۳

چوتھی فصل

نوکر چاکر اور غلام

شخصی خدمات بجا لانے میں جس قدر محنت صرف ہوتی تھی وہ غالباً دور اکبری کے نمایاں معاشی واقعات میں سے ایک ممتاز واقعہ ہے۔ جن لوگوں سے یہ کام لئے جاتے تھے اُن میں سے بعض آزاد تھے اور بقیہ غلام۔ لیکن جو فرائض ان دونوں طبقوں کے سپرد کئے جاتے تھے وہ زیادہ تر یکساں ہوتے تھے۔ لہذا ہمارے موجودہ مقصد کے لئے ان کو ایک ہی شعبہ میں رکھنا کافی ہے۔ تنعم و تعیش کی تکمیل اور ظاہری شان و شوکت برقرار رکھنے میں ملک کے وسائل پیدائش کس حد تک صرف کئے جاتے تھے اس کا پورے طور پر اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس وقت کے ہندوستانی حالات زندگی سے پوری پوری واقفیت حاصل کی جائے۔ اور یہ ایک ایسا مضمون ہے جس کی توضیح میں تقریباً ہر مصنف کی تصنیف سے جس نے ملک یا اہل ملک کے متعلق کچھ بھی لکھا ہو اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں جملہ ہمعصر مصنفین کے بیانات جمع کرنا بہت زیادہ اور تکلیف دہ تکرار کا باعث ہوگا۔ لہذا ہم صرف ایک ایسا انتخاب پیش کرنے کی کوشش کریں گے جس کی بدولت ناظرین جو کچھ شہادت موجود ہے اس کی نوعیت کو بخوبی سمجھ سکیں جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے ابوالفضل نے دربار اکبری کی جو تفصیلی کیفیت قلمبند کی ہے اس میں سے چند امور کا حوالہ دینا کافی ہے۔ البتہ یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ایسے معاملات میں جیسا کہ اس زمانے کی تاریخوں سے بکثرت ثابت ہوتا ہے بادشاہ معیار قائم کرتا تھا اور ہر شخص جو دربار میں کوئی حیثیت رکھتا یا اُس کا خواہشمند ہوتا تھا جہاں تک اُس کے وسائل اجازت دیتے تھے اُسی معیار کی تقلید کرتا تھا شاہی محل کا پہلا شعبہ جو آئین اکبری میں بیان کیا گیا ہے وہ زنانے سے متعلق ہے۔ جس میں ۵۰۰۰ سے زیادہ بیگمات شامل تھیں جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک جدا گانہ

باب ۳ ۸۸

محل سرا تھی۔ نوکروں کا کافی عملہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اور اُن کی نگرانی کے لئے متعدد نگہبان عورتیں۔ خوجے۔ راجپوت اور دروازوں پر دربان مقرر رہتے تھے۔ اِن کے علاوہ عمارتوں کے چاروں طرف سپاہی متعین کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد ہم شاہی کیمپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں سوار پہرہ داروں کے علاوہ دو تین ہزار کے درمیان ملازم مقرر کئے جاتے تھے۔ خاصکر ایک خیمہ تو ایسا موجود تھا جس کو نصب کرنے کے لئے ایک ہفتے تک ۱۰۰۰ آدمی درکار ہوتے تھے[1]

محل کے ضروریات (خواہ ان کے پورا کرنے میں کتنی ہی محنت کیوں نہ صرف ہو) دور و دراز مقامات سے بہم پہنچائے جاتے تھے۔ بادشاہ جہاں کہیں رہے اس کے استعمال کے لئے پانی گنگا سے آتا تھا۔ اور برف روزانہ ڈاک کی گاڑیوں اور ہرکاروں کے ذریعے سے برف پوش پہاڑوں کی راہ سے لاہور پہنچایا جاتا تھا۔ اور میوہ نہایت پابندی کے ساتھ کشمیر اور کابل بلکہ اِن سے بھی زیادہ دور دراز مقامات مثلاً بدخشاں اور سمرقند سے لایا جاتا تھا۔ اصطبل میں علاوہ جانوروں کے بہت سے ملازم بھی موجود رہتے تھے۔ مثلاً ہر معمولی ہاتھی کے لئے چار ملازم رکھے جاتے تھے اور جو ہاتھی بادشاہ کے استعمال کے لئے ہوتے تھے ان پر سات سات آدمی مقرر کئے جاتے تھے کھیل کود اور تفریح کے سلسلے میں جو لوگ نوکر رکھے جاتے تھے! ان کا ٹھیک ٹھیک حساب نہیں لگایا جا سکتا لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی تعداد بھی بہت بڑی تھی۔ ایک ہزار شمشیر زن اور متعدد پہلوان ہر وقت دربار میں حاضر رہتے تھے۔ ایک کثیر التعداد عملہ خاصکر شکار اور بندوق بازی کے واسطے نوکر رکھا جاتا تھا۔ ایک دوسرا عملہ باز سے شکار کھیلنے کے واسطے مخصوص ہوتا تھا اور ایک تیر اندازی کے لئے اس کے علاوہ طرح طرح کے جانوروں حتیٰ کہ مینڈکوں اور مکھیوں کو لڑائی سکھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں اُن شعبوں سے لی گئیں ہیں جن کی تنظیم کی طرف بادشاہ کی ذاتی توجہ منعطف تھی؛ اور یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس کے

---

[1] ٹیری (صفحہ ۱۴۱) ذکر کرتا ہے کہ انگلستان سے جہانگیر کے لئے جو کتے بطور تحفہ لائے گئے تھے اُن میں سے ایک ایک کے لئے اس نے چار چار نوکر متعین کئے تھے۔

باب۳ خاص خاص عہدہ دار اپنے انتظامات بھی اسی طرز اور نمونے پر برقرار رکھتے تھے مثلاً ایک عہدہ دار ... ۵ مشعل برداروں کو نوکر رکھے ہوئے ہے تو وہ سراہر روز ایک ہزار طرح کی مرغن غذائیں تیار کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میدان کارزار میں مغلیہ فوج کے ہر سپاہی کے لئے اوسطاً دو یا تین نوکر موجود ہوتے تھے۔

اور یہ طریقہ کچھ محض بادشاہ کے لئے مخصوص نہیں تھا چنانچہ ڈیلاویل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورت میں نوکر اور غلام اس قدر کثیر اور اس درجہ ارزاں تھے کہ ہر شخص خواہ وہ ادنیٰ حیثیت رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو ایک بڑے خاندان کی پرورش کرتا ہے اور نوکروں چاکروں کی کثرت سے کامل آسائش حاصل کرتا ہے"۔ ۸۹

اس زمانے میں دکن کے حالات زندگی کے متعلق جو سرسری معلومات ہمیں یسر ہیں اُن سے بھی تریب قریب ایک ایسی ہی تصویر پیش نظر ہوتی ہے۔ مثلاً گووا میں سفیر بیجاپور اپنی جو عزت و منزلت برقرار رکھتا تھا اس کی کیفیت پیرآرڈ نے اسطرح بیان کی ہے کہ جب کبھی وہ شہر میں نکلتا تھا تو خدمتگاروں۔ غلاموں۔ باربرداروں سائیسوں اور کوتوں کا ایک انبوہ کثیر اس کے ہمراہ ہوتا تھا اور دکن کا تقریباً ہر بڑا آدمی اسی طرح اظہار شان و شوکت میں لگا رہتا تھا، تھیو نوٹ اس کے ایک بعد کے دور کی حالت تحریر کرتے ہوئے گولکنڈے کی زندگی کے بالکل ایسے ہی حالات بیان کرتا ہے۔ اُمرا کے اہالی موالی کثیر تعداد میں موجود رہتے تھے۔ اور ہر شخص خواہ ہند و یا مسلمان جس کی ذرا بھی کچھ حیثیت ہوتی تھی اُمرا کی تقلید کرتا تھا۔ کچھ نہیں تو کم از کم ایک چھاتہ بردار۔ ایک صراحی بردار اور مگس رانی کے لئے دو خدمتگار لازمی تھے۔ وجیانگر کی زندگی کا بھی جیسا کہ اُن سیاحوں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے جو اس کی تباہی سے قبل وہاں ہو آئے تھے بالکل یہی طرز تھا اور سولھویں صدی کے اختتام پر جنوبی ہند کے اُمرا کے درباروں میں بھی پادریوں کی روایتوں سے اس قسم کی حد سے گذری ہوئی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ ساحل ملیبار پر بھی خدمتگاروں کی تعداد سیاحان یورپ کے نزدیک ایک نہایت عجیب بات تھی۔ مثلاً پیرارڈ لکھتا ہے کہ زموریٖن حاکم کالی کٹ نے تقریباً ۳۰۰۰ آدمیوں کو اپنے ساتھ لیکر سفر کیا۔ اور یہ کہ ساحل پہ بالعموم ممر بآوردہ اشخاص کے ساتھ ہمیشہ اہالی موالی کی

کثیر تعداد رہا کرتی تھی۔ گوا میں بھی اسی قسم کے طریقے رائج تھے اور یہاں کے پرتگالی لوگ اپنے پڑوسیوں کی معاشرت کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ صاحب مرتبہ لوگوں کی جلو میں خدمتگار۔ ہرکارے اور غلام کثرت سے موجود رہتے تھے۔ ان کے علاوہ پیچھے پیچھے ایک کوتل گھوڑا اور ایک پالکی بھی رہتی تھی خواہ مالک پاپیادہ ہی چلنا پسند کرے۔ پس زمانۂ موجودہ میں ہندوستان کے اندر نوکروں کی ہر طرف جو افراط نظر آتی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اکبر کے دور میں جو طریقے رائج تھے اور جو بلاشبہ اس سے بھی بہت زیادہ قدیم زمانے سے چلے آرہے تھے یہ صورت انھیں کی تخفیف شدہ یادگار ہے۔

یہ خدمتگار جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں بعض صورتوں میں آزاد ہوتے تھے اور بعض صورتوں میں غلام۔ آزاد نوکروں کو صرف اتنی تنخواہ ملتی تھی کہ ان کی گذر اوقات کے واسطے کافی ہو سکے اسی لئے جب وہ موجودہ زر نقد کی شکل میں ظاہر کی جاتی ہے تو بالکل ہی خرافات معلوم ہوتی ہے۔ اکبر کے دربار میں ایک ایسا ملازم جس میں کوئی خاص خوبی ہو ماہانہ تقریباً ڈیڑھ روپیہ پر ملجاتا تھا اور مغربی ساحل پر شاید اس کو دو روپیہ دینا پڑتے تھے۔ غلاموں کی قیمتوں کے بارے میں جو مواد موجود ہے وہ اسقدر قلیل ہے کہ اُس سے اس قسم کا کوئی عام نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ پیرارڈ کے بیان کے مطابق گوا میں ایک کنیز کی قیمت جہاں ان اشیاء کی بہت گرم بازاری رہتی تھی (۵۰) روپیوں کے مساوی تھی۔ لیکن یہ شرح لازمی طور پر بہت وسیع حدود کے اندر متغیر ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اُس کا مدار کچھ تو ہر فرد کی خاصیتوں پر ہوتا تھا اور کچھ مقدار رسد کی کمی بیشی پر لیکن انسانوں کا اس طور پر ذکر کرنا گویا وہ ایک طرح کا مال و اسباب ہیں ممکن ہے کہ ہمارے ناظرین کے دلوں میں ایک قسم کی فطری برگشتگی کا احساس پیدا کردئے اور سچ بھی یہ ہے کہ موجودہ برطانوی ہندوستان میں غلامی کا خیال کچھ ایسا غیر مانوس ہوگیا ہے کہ یہاں اس کی سابقہ حالت اور حیثیت کا کچھ ذکر کردینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ غلامی کا سدباب ایک حال کی بات کہی جاسکتی ہے۔ ایکٹ (۵) بابتہ ۱۸۴۳ء منظور ہونے تک ہندوستان کی ہر برطانوی عدالتیں اُن امور کا جو افراد اشخاص کی غلامانہ حیثیت سے پیدا ہوتے تھے

(۹۰)

باب ۲

فیصلہ کیا کرتی تھیں اور شرع شریف اور دھرم شاستر کی کتابوں میں ان امور پر بالکل اسی
طرح بحث کی جاتی تھی جس طرح کہ تبنیت یا تقسیم جائداد یا وراثت کے مسائل پر
مزید براں اس وقت غلامی کے طریقے کی حیثیت کچھ زمانۂ قدیم کی ایک
شاذ و نادر یادگار کی طرح نہیں تھی کیونکہ جس رپورٹ پر ایکٹ نمبر (۵) مبنی تھا اس سے
اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ علاوہ بمبی اور مدراس کے کم و بیش ان تمام علاقوں
میں غلامی کا رواج تھا جو بنگال پریزیڈنسی میں شامل تھے چنانچہ اس میں ایسے لوگوں
کی مثالیں موجود ہیں جو دو دو ہزار غلاموں کی جماعتوں کے تنہا مالک تھے۔ باوجود
اس کے غلامی کا طریقہ کچھ اسقدر مکمل طور پر موقوف ہو گیا ہے کہ تاریخ ہند کی موجودہ
نصابی کتابوں میں اس مضمون کا بہ مشکل کہیں ذکر کیا جاتا ہے۔

اکبر کے زمانے میں جس طور پر یہ طریقہ موجود تھا اس پر بحث کرتے وقت
سہولت اس بات میں ہے کہ قصباتی اور دیہاتی غلامی میں اچھی طرح امتیاز کر لیا جائے۔
جہاں تک ہم معلوم کر سکے ہندوستان میں ایکدوسرے کے پہلو بہ پہلو دو جداگانہ
طریقے نمودار ہو گئے تھے۔ دیہات میں ہر مزدور کم از کم حقیقی عملدرآمد میں ایک
غلام کی حیثیت رکھتا تھا اور ہمارے خیال میں اکبر کے عہدہ داروں کو اس کی قانونی
حیثیت کے متعلق کسی امر کا فیصلہ کرنے کی تکلیف ہی نہیں اٹھانا پڑتی ہوگی۔ قصبوں
اور شہروں میں غلاموں سے بہت سے خانگی کام لئے جاتے تھے اور ان کی حیثیت
کم از کم ایک حد تک اصولِ قانون کے مطابق طے ہوتی تھی۔ دیہاتی غلامی سے
ہمیں اس لئے سروکار ہے کہ زرعی پیدائش دولت میں اس کی بڑی اہمیت ہے لہذا
تنظیم زراعت کے سلسلے میں ہم بہ آسانی اس پر بحث کر سکتے ہیں۔ بالفعل ہمیں صرف
۹۱
قصباتی یا خانگی غلامی سے سروکار ہے جو قریب قریب پورے طور پر عیش و عشرت
اور ظاہری شان و شوکت سے متعلق تھی۔

اگرچہ اکبر کے زمانے میں سب ہندو غلامی کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم یہ تسلیم
کرنا پڑتا ہے کہ غلامی ہندوؤں کی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کاتبان کتب مقدس اپنی
عادت کے مطابق اس کی ابتدا اور اس کے متعلقات کے بارے میں باریکیاں
نکالتے اور امتیازات پیدا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا قانون بھی گو ایک محدود

طریقے پر بھی غلامی کی اجازت دیتا ہے۔ لہذا اکبر اور اس کے ہمعصروں کے پاس غلامی کو تسلیم کرنے کی قانونی وجہ موجود تھی۔ لیکن سلطنت مغلیہ میں اس کی بنیاد اتنی وسیع تھی کہ اسلامی قانون کے باہر اس کی اجازت دینے پر مائل نہیں ہو سکتے تھے۔ پس ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ چیز چونکہ پہلے ہی سے قرین عقل اور مطابق فطرت تسلیم کی جاتی تھی لہذا بغیر کسی خاص جانچ پڑتال کے غلامی کے متعلق جو مقامی رسوم مروج تھے وہ اختیار کر لئے گئے وجیانگر میں عبدالرزاق۔ کونٹی۔ اور باربوسا جیسے سیاحوں نے غلامی کے وجود کی تصدیق کی ہے۔ احتیاط اس بات کی مقتضی ہے کہ دکن میں غلامی کا رواج فرض کر لیا جائے کیونکہ شمال کے اُن دوردراز مقامات میں جہاں سے دکن کے شاہی خاندان نکلے تھے غلامی مروج تھی۔ اسی بنا پر ہم نیکیٹن کے اس بیان کو قابل اعتماد سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کے وقت میں کالے آدمیوں کی بیدریں تجارت ہوتی تھی۔ پرتگالیوں نے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی ملک کے رسم ورواج کی تقلید کی چنانچہ لنچوٹن لکھتا ہے کہ انھوں نے کبھی خود کام نہیں کیا بلکہ غلاموں سے کام لیتے تھے جو جانوروں کی طرح بازار میں روزانہ فروخت کئے جاتے تھے۔ اور ڈیلاویل تحریر کرتا ہے کہ گوا کے باشندوں کا کثیر ترین حصہ " غلاموں پر مشتمل تھا۔ سلطنت مغلیہ میں غلامی کا رواج ثابت کرنے کے لئے مختلف بیانات پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن آئین اکبری میں اس کا اقبال کہ اس دور میں غلامی موجود تھی اس امر کی کافی شہادت ہے۔ ڈیلاویل کے بیانات سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سورت کے خاص خاص ہندو جن سے زیادہ دردمند لوگ شاید ہی کبھی پیدا ہوے ہوں غلامی کو کلیتاً ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ رائے عام طور پر ہندوؤں کے متعلق ظاہر نہیں کی جاسکتی کیونکہ۔ اکثر ہندوؤں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اُن کے پاس اس وقت تک بھی غلام موجود تھے جبکہ غلامی کے قانونی جواز کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ غلام مختلف ذرائع سے حاصل کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ کسی سابقہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ افریقہ اور مغربی ایشیا سے جو تجارت درآمد جاری تھی اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ مگر اسی کے ساتھ جانب مغرب غلاموں کی برآمد بھی ہوتی تھی۔ بیرونی ملکوں کے غلام قیمتی ہوتے تھے اور وہ خاصکر ایشیائی تعیش میں

شامل تھے۔ جہاں تک ہندوستانی غلاموں کا تعلق ہے دونوں قوانین کے مطابق ان کی یہ حیثیت موروثی تھی۔ اُن کی تعداد میں کئی طرح سے اضافہ کیا جا سکتا تھا مثلاً زبردستی کسی کو پکڑ لینا یا خود ان کا اختیاری یا غیر اختیاری طور پر اطاعت قبول کر لینا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے قانون زبردستی پکڑ لینے کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ہندوستان میں اسی جواز کی بدولت سخت خرابیاں پیدا ہو گئیں تھیں کیونکہ اکثر لوگوں نے اپنا یہ دستور بنا لیا تھا کہ بلا کسی ظاہری سبب کے کسی ایک گاؤں یا چند دیہات کے مجموعہ پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں کو غلاموں کی طرح سے پکڑے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر کو اپنے دور کے آغاز ہی میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے سپاہیوں کو اس طرح کے دھاووں میں حصہ لینے سے باز رکھنے کے لئے احکام نافذ کرے[1] غیر اختیاری اطاعت پذیری کے تحت ایک تو وہ لوگ شامل کئے جا سکتے ہیں جنھیں ارتکاب جرائم کی وجہ سے سزا دی جاتی تھی۔ دوسرے وہ قرضدار جو دیوالیہ ہو جاتے یا وہ لوگ جو مالگزاری ادا نہ کرنے کی وجہ سے مع ان کے خاندانوں کے فروخت کر دئے جاتے تھے۔ چنانچہ ہمعصر تواریخ میں اس طرح کے عملدرآمد کی مثالیں وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں۔ اختیاری اطاعت پذیری کی کیفیت اس سے بھی زیادہ دردانگیز ہے۔ عام طور پر یہ اُس وقت نمودار ہوتی تھی جبکہ قحط زدہ والدین اپنے بچوں کو فروخت کرنے لگتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں اور اُس کے بعد کامل دو سو سال تک یہ خرید و فروخت ایک بالکل معمولی سی بات تھی[2] چنانچہ

---

[1] ترجمہ اکبر نامہ ۲۔ ۲۴۶۔ ابوالفضل ان احکام کو "تنسیخ غلامی" کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں ان الفاظ کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان کو لفظاً لفظاً صحیح مانا جائے۔ احکام کے الفاظ ہی سے ان کی محدود وسعت کافی طور پر بدیہی ہے۔

[2] ۱۷۸۵ء میں سر ولیم جونس نے ایک جوری کو ہدایت کرتے ہوئے "بڑی بڑی کشتیوں کا ذکر کیا ہے جو بچوں سے بھری ہوئی تھیں جو یا تو چرائے ہوتے تھے یا جنھیں ان کے ماں باپ نے قحط کے زمانے میں تھوڑے سے چاولوں کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ یہ بچے کھلے بازار میں فروخت کے لئے دریا کے راستہ سے کلکتہ لائے جا رہے تھے" غلامی کی رپورٹ میں جس سے یہ اقتباس لیا گیا ہے یہ بھی ذکر ہے کہ اُسی شہر میں ۱۸۳۳ء کی طغیانی کے زمانے میں بچے عام طور پر گلی کوچوں میں پکار پکار کر فروخت کئے جاتے تھے۔

ایک ایرانی سفیر کا ذکر ہے کہ وہ ہندوستانی بچوں کی ایک کثیر تعداد اپنے وطن کو لے گیا کیونکہ اس کے اثنائے قیام میں قحط کے باعث بچے بہت ارزاں ہو گئے تھے۔ اور بار بوسا کا بیان ہے کہ جب لوگ ساحل کارومنڈل پر بھوکوں مرنے لگتے تھے تو ملیبار کے جہاز وہاں اشیائے خوراک لے جاتے تھے اور غلاموں سے لدے ہوئے پلٹتے تھے کیونکہ لوگ اشیائے خوراک کے عوض خود اپنے بچے فروخت کر ڈالتے تھے۔ لیکن معمولی اوقات میں بچے نہ صرف خریدے جاتے تھے بلکہ چرا بھی لئے جاتے تھے چنانچہ بنگال اس معاملۂ خاص میں سب سے زیادہ بدنام تھا۔ کیونکہ وہاں نہایت نفرت انگیز صورتوں میں یہ عملدرآمد جاری تھا[1] ان کے علاوہ غلاموں کے حاصل کرنے کے اور ذرائع بھی موجود تھے لیکن جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں وہ شاید یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ فروخت کے لئے بازاروں میں غلام بکثرت پائے جاتے تھے اور طبقۂ اعلیٰ کا ہر وہ شخص جو اظہار شان کا خواہشمند ہوتا تھا بلا کسی دقت کے جتنے غلام چاہتا خرید سکتا تھا۔ غلام کی حیثیت کے تفصیلی امور سے ایک ماہر معاشیات کو براہ راست کوئی سروکار نہیں ہے لیکن ہمیں کوئی شہادت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ بہ حیثیت مجموعی اس طبقہ کے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ غلاموں اور آزاد اشخاص کا کثرت کے ساتھ باہمی مبادلہ ہوتا تھا اور یہ نتیجہ قرین عقل ہے کہ ان دونوں طبقوں کے نوکروں کے ساتھ بہ حیثیت مجموعی ایک ہی قسم کا سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جس وقت غلامی کے وجود کا قطعی طور پر خاتمہ کیا گیا تھا تو صورت حال یہی تھی[2]

ہندوستان کی آبادی جن دو خاص شعبوں میں تقسیم کی گئی تھی ان میں سے پہلے شعبے کے طبقوں کی حالت ہم معلوم کر چکے یہ وہ شعبہ ہے جس کی اہمیت خاصکر صرف

---

[1] مارکوپولو (یول ii - ۱۱۵) - باربوسا (صفحہ ۳۶۳) اور پیرارڈ (ترجمہ i - ۳۳۲) جیسے مختلف مصنفین نے بنگال کو نوجوں کا ماخذ بتاتا ہے۔ آئین اکبری میں (ترجمہ ii - ۱۲۲) حالات بنگال کے عنوان کے تحت یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

[2] غلامی کی رپورٹ میں جو حالات درج ہیں انکا یہی عام نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ آقا مختلف ہوتے تھے اور بعض غصیلے لوگ جیسے کہ رہیلوں کے متعلق کہا جاتا ہے اپنے نوکروں کی ہڈیاں تک توڑ دیتے تھے لیکن ہم نہیں خیال کرتے کہ کسی منفرد قصوروار کی حیثیت کا کوئی اثر اس کی سزا کی سختی پر پڑتا تھا۔

باب ۲

دولت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ اور جو کچھ معاشرتی اور سیاسی حالات موجود تھے اِن سب کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں کی قوتوں اور ان کے وسائل کا ایک بہت بڑا حصہ مفید کاروبار میں کام نہیں آتا تھا بلکہ غیر نفع بخش کاموں میں صرف ہوجاتا تھا۔ جہاں تک محنت کا تعلق ہے ہمیں اُس کل تعداد کا لحاظ کرنا ہے جو سرکاری اور خانگی خدمت یا مذہبی اشغال میں مصروف رہتی تھی۔ بلاشبہ یہ پیشے "ضروری" خیال کئے جاسکتے ہیں لیکن جملہ ضروریات نسبتاً ایک بہت تھوڑی تعداد سے پورے ہو سکتے تھے۔ فوجوں کی تعداد بہ حیثیت مجموعی اِس زمانے کے مقابلے میں یقیناً کہیں زیادہ تھی لیکن مناسب تنظیم و تربیت کی کمی سے لوگ ضائع ہوتے تھے۔ بہت سے خانگی خدمات بھی محض فضول تھے اور مذہبی فقراء کے گروہ بھی ایک ماہر معیشت کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔

(۹۴)

جب ہم اعلیٰ طبقوں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قابل اور عالی ہمت اشخاص کے لئے ترقی کا راستہ صرف سرکاری ملازمت یا سرکاری امداد تھی اور اس راہ پر چلنے والوں کی نمایاں خصوصیت دولت کی پیدائش نہیں بلکہ اسکے صرف کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ایک اعلیٰ دولتمند طبقہ ملک کی بہت سی معاشی خدمتیں انجام دے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنی دولت عاقلانہ طور پر استعمال کرے۔ اور اپنی جمع کی ہوئی دولت کو براہ راست پیدائش دولت کے کاموں میں لگائے۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے اندر دولتمند اس طرح سے ملک کی خدمت کرتے تھے۔ اور جہاں کہیں دولت جمع بھی ہوتی تھی وہ سونے چاندی اور جواہرات کے ذخیروں کی شکل میں بے کار پڑی رہتی تھی۔ بہ حیثیت مجموعی ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ لغویات و فضولیات میں خرچ ہوتا تھا جس کا بار بالآخر دولت پیدا کرنیوالے طبقوں یعنی کاشتکاروں، دستکاروں اور تاجروں پر پڑتا تھا۔ لہٰذا اس کتاب کی آئندہ فصلوں میں ہم اُن حالات کی تحقیق کریں گے جن کے تحت یہ طبقے ملک کی آبادی کے لئے غذا اور لباس بہم پہنچاتے تھے اور دولتمندوں کی فضول خرچیوں کے لئے آمدنی مہیا کرتے تھے۔

باب ۳

اسناد برائے باب سوم

فصل ۱ ۔ وجیانگر میں امرا کی حیثیت کا حال بار بوسا صفحات (۲۹۶ و ۲۹۷) میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سیول میں خاص کر صفحات (۲۸۰ و ۳۷۳ و ۳۹۴) میں مذکور ہے۔ سولھویں صدی کے اختتام پر جو حالت تھی اس کا اندازہ اُن اتفاقی حوالوں سے ہوتا ہے جو ٹیری کی تصنیف میں صفحات (۳۴۳ تا ۴۰۰) میں ملتے ہیں۔ دکن کے لئے ملاحظہ ہو تھیونوٹ صفحہ (۲۹۰) وما بعد اکبری تنظیم کی مفصل کیفیت آئین اکبری (ترجمہ۔ باب ۱ صفحات (۲۲۳ تا ۲۶۵) میں درج ہوئی ہے اس مضمون پر بلاکمین کی یادداشتیں بہت ہی قابل قدر لیکن بجائے خود ناکافی ہیں لہٰذا ارون کی تصنیف سے ان کی تکمیل کر لینی چاہیئے بدایونی نے بے قاعدگیوں کی جو کیفیت تحریر کی ہے وہ بلاکمین کے ترجمہ آئین اکبری باب ۱ (صفحہ ۲۴۸) میں نقل کی گئی ہے جاگیروں کے متعلق آئین اکبری کے محولہ بالا بابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمینیں عام طور پر عطا کی جاتی تھیں لیکن اس صورت میں لفظ جاگیر سے ایسی خدمت ادا کی جا سکتی ہے جس کا معاوضہ روایتاً عطیۂ زمین لیکن درحقیقت تنخواہ کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر اپنے باپ کی عطا کردہ جاگیروں کے استقلال کے لئے چند احکام نافذ کئے تھے جن کی کیفیت اس نے تحریر کی ہے (ترجمۂ توزک۔ باب ۱ (صفحہ ۷) یہ کیفیت غالباً زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

شاہی خدمات کے اجزائے ترکیبی کے لئے ملاحظہ ہوں برنیر صفحہ ۲۱۲۔ اور ترجمۂ آئین اکبری باب (۱) صفحہ (۳۰۹ تا ۴۲۵)۔ بادشاہ کے حق وراثت کے متعلق اوپر باب (۲) فصل (۶) کے تحت حوالے دئے جا چکے ہیں۔ یہ قاعدہ خود ہندوستان کا نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کی ابتدا غالباً مغلوں سے ہوئی ہے۔ کیونکہ سکندر لودھی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ ہر متوفی امیر کی جائداد (لیکن خدمات یا جاگیریں نہیں) اس کے ورثا کو پہنچنی چاہیئے۔ (ایلیٹ۔ باب ۴ صفحہ ۴۲۷) جاگیروں کے متعلق جہانگیر کے عملدرآمد کا حال خود اسی کے بیانات سے جو توزک میں منتشر ہیں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہاکنس (پرچاس۔ ۱۔ ۱۲۱۔ ۲۲۱) بار بار کے تبادلوں کے متعلق ایک واضح لیکن متعصبانہ کیفیت بیان کرتا ہے اور یورپ کے دوسرے مستند مصنفین بھی اسی طرح تحریر کرتے ہیں۔ کروڑیوں کے بارے میں ملاحظہ ہو بدایونی کی بیان کردہ کیفیت کا ترجمہ ایلیٹ کی تاریخ میں بھی کیا گیا ہے۔ ایلیٹ

(۹۵)

باب ۳ صفحہ (۱۳؍۵)۔ اور طبقات اکبری کا مندرجہ حوالہ بھی اسی جلد میں شامل ہے (صفحہ ۳۸۳)۔
جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بابتہ جنوری ۱۹۱۶ء صفحہ (۲۰) میں اسی مضمون کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل ۲۔ احدیوں کی حیثیت آئین اکبری میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ (ترجمہ باب (۱) صفحہ ۲۴۹) نیز بعض سیاحان یورپ کے تذکروں میں بھی "حدی" وغیرہ کی شکلوں میں ان کا نام ملتا ہے (پرچاس ۱۔iii: - ۲۱۶) مقامی فوجوں (بومی) کا حوالہ آئین اکبری۔ جلد دوم کے ابتدائی باب میں دیا گیا ہے۔ (ترجمہ باب ۱ صفحہ ۲۳۲) اور ان کی تعداد "بارہ صوبوں کی کیفیت" میں بتائی گئی ہے (ایضاً باب ۲ صفحہ ۱۱۵ و مابعد)۔ بقیہ سپاہیوں کی متعلقہ خبریں آئین اکبری جلد ۱ اور ۲ میں منتشر ہیں۔ اس کا بہترین خلاصہ اروین کی کتاب میں موجود ہے۔ جنبیوں کو جو ترجیح دی جاتی تھی اس کے لئے ملاحظہ ہو ترجمۂ آئین اکبری باب ایک صفحہ ۲۳۱۔ "تورانی اور ایرانی ۲۵ روپے اور ہندوستانی ۲۰ روپے پاتے ہیں"

جنوبی ہند میں گھوڑوں کی رسد کا ذکر ڈکاڈا اس میں کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور ٹہائیٹوے کی کتاب کے باب ۷ اور ۸ میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے۔ پرتگالیوں کے عہد ناموں میں بھی اس تجارت کا حوالہ دیا گیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو سیویل صفحہ ۱۸۶۔ پیرارڈ نے جو قیمتیں بیان کی ہیں وہ ترجمہ کے باب ۲ صفحات ۶۶ اور ۶۷ میں موجود ہیں۔ چند سال قبل لنچوٹن نے گوا میں گھوڑوں کی قیمت ۴۰۰ سے ۵۰۰ پرڈاو تک بیان کی تھی۔ گولکنڈہ میں سپاہیوں کی تنخواہ کے لئے ملاحظہ ہو تھیونوٹ صفحہ ۳۰۱۔ امرائے وجیانگر کی باہمی لڑائیوں کے لئے ملاحظہ ہو "ہے" صفحہ ۵۹، و ۸۱، ۷۔

اکبر کے مستقر پر طریق کارروائی کی تفصیل آئین اکبری میں دی ہوئی ہے۔ (ترجمہ۔ باب ۱ صفحہ ۲۵۸ و مابعد)۔ مالگزاری کا نظم ونسق باب ۲ صفحات ۴۴ تا ۴۹ میں درج ہے۔ پیرارڈ سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں وہ باب ۱ صفحہ ۲۵۸ و ۲۹۷ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ماتحت انتظامی خدمات کے جو حوالے دیئے گئے ہیں وہ آئین اکبری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خاصکر ملاحظہ ہو ترجمہ باب ۲ صفحہ ۴۵ و ۶۲۔

باب ۳

کرڈوڑیوں کے متعلق اقتباسات گذشتہ فصل کے تحت درج کئے جا چکے ہیں۔

فصل ۳۔ اکبر کے دربار میں اہل فن اور دماغی پیشوں والے اشخاص کی حیثیت پر آئین اکبری میں بحث کی گئی ہے (ترجمہ۔ باب ایک صفحہ ۹۲ و مابعد۔ صفحہ ۲۰۷ و مابعد) اور بلاکمین نے ان فصلوں پر و نیز منصبداروں کی فہرست پر جو یادداشتیں لکھی ہیں ان سے اس مبحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ (ایضاً باب ا صفحہ ۳۰۸ و مابعد)۔ سورغل کے لئے ملاحظہ ہو باب ا صفحہ ۲۶۸ و مابعد و نیز وہ حوالے جو بلاکمین کی یادداشتوں میں دیئے گئے ہیں۔

جنوب میں طبیبوں کے متعلق تھیونیر کے خیالات باب ۲ صفحہ ۲۱۳ میں ملیں گے مذہبی اداروں کے عطیات کے لئے ملاحظہ ہو سیول صفحہ ۱۶۸۔ ترجمۂ آئین اکبری باب ا صفحہ ۲۶۶ و مابعد۔ ایلیٹ کی تاریخ باب ۵ صفحہ ۵۲۲۔

فصل ۴۔ آئین اکبری کے پہلے دو حصوں میں اکبر کے نوکروں چاکروں کے متعلق تفصیلی امور درج ہیں۔ متعدد خدمتگاروں کے رواج کی دوسری مثالیں پرچاس (۱۔۴۔۳۲۲ہ) ڈیلاویل (۲ہ ۸۲) پیرارڈ (ترجمہ۔ باب ا صفحہ ۳۲۶۔ باب ۲ صفحہ ۷۵ و ۱۳۵) تھیونوٹ (صفحہ ۳۰۷) سے ماخوذ ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں اس بحث پر تقریباً ہر معصر مصنف کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔

برطانوی ہند میں غلامی کے قانونی پہلو کے لئے ناظرین میکناٹن سے مدد لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ غلامی کی رپورٹ میں واقعات کا ایک بہت بڑا لیکن غیر مکمل مجموعہ موجود ہے جنوب میں غلامی کے لئے ملاحظہ ہو میجر صفحہ ۲۹۔ ۳۰۔ ۴۱۔ باربوسا صفحہ ۳۰۹ و ۳۵۵۔ لنچوٹن۔ سی۔ ۲۹۔ ڈیلاویل صفحہ ۱۵۷۔ پیرارڈ۔ ترجمہ باب ۲ صفحہ ۳۹۔ اکبر کے دور میں غلاموں کی حالت کے لئے ملاحظہ ہو ترجمۂ آئین اکبری باب ا صفحہ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ بچوں کو فروخت کرنا ایک عام بات ہے۔ کتاب میں جو مثالیں دیگئی ہیں وہ برنیر صفحہ ۱۵۱ اور باربوسا صفحہ ۳۵۸ سے لی گئی ہیں۔

(۹۹)

چوتھا باب

زرعی پیدائش

فصل ا حقیت اراضی

اکبر کے دور حکومت میں ہندوستان کے اندر جو طریقۂ زراعت مروج تھا اس کی تحقیق کرنے سے قبل حقیت اراضی کے مضمون پر چند الفاظ ضروری ہیں۔ ہر جگہ کا قاعدہ ہے کہ جن شرائط پر زمین حاصل کی جاتی ہے ان شرائط کا زمین کو کامیابی کے ساتھ کام میں لانے پر نہایت اہم اثر پڑتا ہے۔ اور ہندوستان کے معاملے میں اس مضمون پر غور و توجہ کرنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ کیونکہ زراعت کے متعلق ہماری بہت کچھ واقفیت تشخیص و تحصیل مالگزاری کے متعلقہ کاغذات سے ماخوذ ہے اور جو معلومات ان کاغذات سے دستیاب ہوتے ہیں ان کی ہم پورے طور پر قدر نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمیں اُن حالات کا کچھ تصور نہ ہو جن کے تحت مالگزاری حاصل کی جاتی تھی۔ دور اکبری کے خاتمہ پر ہندوستانی حقیتیں اپنے قدیم طریقے سے کچھ آگے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن کوئی انقلاب انگیز رد و بدل واقع نہیں ہوا تھا بلکہ قدیم خیالات ہی کا اثر ابھی غالب تھا۔ قدیم سے صرف دو قابل لحاظ طبقے رہے ہیں۔ ایک تو حکمران۔ اور دوسرا طبقہ رعایا۔ اور اگر رعایا میں سے کوئی شخص زمین پر قابض ہو تو اس کے لئے واجب تھا کہ اپنی خام پیداوار کا ایک حصہ ملکی امن و حفاظت کے معاوضے میں بادشاہ کو

باب ۲

ادا کرے ظاہر ہے کہ اس طریقے کے تحت زمین کی ملکیت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ طریقہ اس عملدرآمد سے قبل کا ہے جو خانگی حق کے خیال کو سیاسی فرمانبرداری سے الگ کرنے کے لئے جاری ہے اور جس کو اثنائے گذشتہ صدی میں اسقدر زیادہ ترقی ہوی ہے لیکن ابھی تک پورے طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے[1] اور نہ قبضۂ (۹۷) زمین اپنے قانونی مفہوم کے مطابق لازمی طور پر کوئی حق تھا بلکہ صورت حال درحقیقت اس کے برعکس تھی کیونکہ بادشاہ کو آمدنی کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کے ضروریات کی بہم رسانی کے لایق کافی زمین کی کاشت کرنا ایک طرح کا فرض تھا نہ کہ حق۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس فرض کو پورا کرنے کے لئے مناسب سزائیں بھی دی جاسکتی تھیں۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں اب زمین کی طلب اسقدر بڑھ گئی ہے کہ اس بالیے میں فرض کا ذکر کرنا ناظرین کو مضحکہ انگیز معلوم ہوگا۔ لیکن موجودہ صدی میں بھی بعض کم آباد ریاستوں میں ایسے موقعے پیش آتے ہیں جبکہ حکمران اور رعایا کے تعلقات کا یہ پہلو عملی اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ اور جبکہ کاشتکاروں کو یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اگر وہ کافی رقبہ کاشت نہ کریں گے تو مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ سابقہ زمانوں میں زمین کاشت کرانے کا فرض کسقدر سختی کے ساتھ پورا کرایا جاسکتا تھا اس کا اندازہ ایک اتفاقی رپورٹ سے ہوتا ہے جو مشرقی ساحل کے ایک انگریز تاجر نے ۱۶۳۲ء میں کی تھی۔ رپورٹ یہ تھی کہ مقامی حاکم نے زمین کاشت نہ کرنے کی بنا پر ایک گاؤں کے مکھیا کے خود اپنے ہاتھ سے دو ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ یہ ہم مانے لیتے ہیں کہ اسدرجہ کی سختی مستثنیات میں سے تھی لیکن اس قصے سے ہندوستانی حقیت اراضی کا ایک ایسا پہلو واضح ہوتا ہے جو اب تقریباً مکمل طور پر بھلا دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے تاریخی دور میں وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے اجتماع سے

[1] شمالی ہند میں اس عملدرآمد کی رفتار کا اندازہ لفظ رعیت کے مفہوم کی تبدیلی پر غور کرنے سے ہوتا ہے اکبر کے زمانے کی تحریروں میں اس لفظ کے معنی محض مطیع و فرمانبردار کے تھے۔ لیکن آجکل عام طور پر اس سے مراد آسامی یا کرایہ دار ہے۔ باوجود اس کے موجودہ زمیندار اب بھی کبھی کبھی اس پرانے مفہوم سے متاثر ہوکر اپنے آسامیوں کو اپنی رعایا تصور کرتے اور ان کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔

بڑی بڑی سلطنتیں نمودار ہوئی ہیں۔ اس قسم کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ حقیت اراضی کی ابتدائی اور سیدھی سادی شکل میں بھی نشو نما ہونے لگا۔ ہر فاتح کے سامنے دو صورتیں موجود ہوتی تھیں۔ یا تو مغلوب بادشاہ کو نکالکر خود اس کی جگہ لے لے۔ یا اُس بادشاہ کا قبضہ برقرار رکھکر اُس سے خراج وصول کرلے۔ ان میں سے کسی صورت میں بھی کاشتکار کی حیثیت پر اثر پڑنا لازمی نہ تھا۔ لیکن اس قسم کے سیاسی انتظامات کا عام طور پر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یا تو مطلوبہ پیداوار کے حصے میں یا اُس کی تشخیص و تحصیل کے طریقوں میں کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوجاتی تھی اور یہی وہ معاملات تھے جن سے کاشتکار کو نہایت گہرا تعلق تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ پیداوار کا جو حصہ علیحدہ کردینا پڑتا تھا اس کا اثر کاشتکار کی معاشی حالت پر پڑتا تھا کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دسواں حصہ ہو جیسا کہ فیروز شاہ کے زمانے میں یا نصف ہو جیسے کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لیکن یہ ذہن نشین کرلینا مناسب ہے کہ تشخیص کے طریقوں کی تبدیلیاں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی تھیں بلکہ درحقیقت یہی وہ تبدیلیاں تھیں جنھیں بہت بڑی حد تک زمانۂ حال کے ہندوستانی زمینداروں کے نمودار ہونے کا باعث کہنا چاہئے شاہی تنظیم کے مذکورۂ بالا دو طریقوں میں سے ایک کی مثال وجیانگر کے مروجہ طریق مالگزاری سے مل سکتی ہے۔ مالگزاری کی تحصیل اُمرا کے سپرد تھی جو اُن بادشاہوں کے قایم مقام تصور کئے جاسکتے ہیں جو سلطنت میں ضم ہوچکے تھے۔ یہ اُمرا ایک معینہ مقدار خزانۂ شاہی میں داخل کرتے اور بقیہ خود رکھ لیتے تھے پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جو طریقہ پہلے سے موجود تھا وہ حسب سابق برقرار رکھا گیا تھا اور سلطنت اسی پر قائم ہوگئی تھی۔ اور جب اکبر کی وفات کے چند سال بعد جنوبی سلطنت کا بالآخر خاتمہ ہوگیا تو اُمرا کا قبضہ حسب سابق برقرار رہا اور انھوں نے دوبارہ بادشاہوں کی حیثیت اختیار کرلی۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا سلطنت کے اس طرح بالا بالا قائم ہوجانے سے کاشتکاروں کی حقیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع ہوئی یا نہیں اس کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں ہم نہیں جانتے کہ قیام سلطنت سے پہلے پیداوار کا کسقدر حصہ انھیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ البتہ صرف اس ایک بات کا یقین کرسکتے ہیں کہ سلطنت کی ماتحتی کے زمانے میں

باب ۷

اس حصہ کی مقدار بہت ہی زیادہ تھی نُونِز تیقین کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کاشتکار پیداوار کا ۹/۱ حصہ اُمرا کو ادا کرتے تھے اور امرا اپنی وصول شدہ پیداوار کا نصف شاہنشاہ کو ادا کرتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ اِس مصنف کو واقفیت حاصل کرنے کے اچھے ذرائع میسر تھے تاہم ہم کسی ایسے طریق زراعت کا تصور نہیں کر سکتے جس میں کاشتکار اپنے کھیتوں کی خام پیداوار کے صرف دسویں حصہ پر زندگی بسر کر سکیں لہٰذا ہمارے خیال میں اِن اعداد کو بالکل ٹھیک تصور کرنا مناسب نہیں ۔ البتہ ان سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں مطالبہ غیر معمولی طور پر گراں تھا ۔ اسی طرح ہمیں ڈی لیٹ کے اِس بیان کو بھی لفظ بلفظ صحیح ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ مغل حکام خام پیداوار کا تقریباً تین چوتھائی حصہ وصول کر لیتے تھے اور وہ صرف ایک چوتھائی حصہ بدبخت کاشتکاروں کے لئے چھوڑ دیتے تھے جنھیں بعض اوقات اپنی محنت اور اپنے مصارف کا کچھ بھی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں ڈی لیٹ کی اطلاعیں زیادہ تر اُن اضلاع سے متعلق معلوم ہوتی ہیں جو سمندر کے کنارے واقع تھے ۔ اور ہمارے خیال میں نُونِز کے بیان کی طرح اس کے بیان کی بھی صرف یہ اہمیت ہے کہ اُس سے ایک نہایت سخت اور پامال کن طریق مالگزاری کے وجود کا بہت اچھا ثبوت ملتا ہے ۔ اور جہاں تک ٹھیک ٹھیک تناسب کا تعلق ہے ممکن ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں غیر معمولی مطالبات کو شامل کرنے کے بعد وہ درحقیقت تین چوتھائی تک پہنچ جاتا ہو ۔ (۹۹)

شمالی ہند میں اکبر کے نظم و نسق کا رجحان جیسا کہ ہم کسی سابقہ فصل میں بیان کر چکے ہیں یہ نہیں تھا کہ سابقہ انتظامات کو برقرار رکھکر بالا بالا سلطنت قائم کر دی جائے بالفاظ دیگر اکبر کا نصب العین یہ تھا کہ جسقدر کاشتکار اس کے زیر حکومت آئیں اُن کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کرے لیکن اس کا طرز عمل اور بھی بہت سی مصلحتوں سے متاثر ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کے طریق مالگزاری میں یکسانیت نہیں پائی جاتی چنانچہ سندھ میں اُس نے وہی پرانا ہندوستانی عملدرآمد برقرار رکھا اور کاشتکاروں سے پیداوار کا ایک حصہ وصول کرتا رہا ۔ بنگال ۔ برار اور خاندیس میں مالگزاری کے جو طریقے پہلے سے مروج تھے وہی جاری رکھے گئے اور ان طریقوں کی ٹھیک ٹھیک نوعیت

باب ۲

مشتبہ ہے برخلاف اس کے ٹھیک سلطنت کے قلب میں اس نے اپنے خاص طریقے جاری کئے جو اس کے پیشرو شیر شاہ کے طریقوں پر مبنی تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا اور جس حد تک احتیاط اجازت دیتی وہ انھی طریقوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا تھا لیکن جہاں مقامی حالات مجبور کرتے وہ زمینداروں کے ساتھ شرائط طے کر لیتا تھا۔ یہ تحقیق کرنا کہ کسی خاص رقبے میں کون سا طریقہ مروج تھا ممکن نہیں ہے لیکن غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شمالی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاداب حصوں میں یعنی بہار سے لیکر لاہور اور ملتان تک ادائی مالگزاری کا معیار ضابطہ یعنی تشخیص مالگزاری کے دستور العمل کے مطابق قرار پاتا تھا۔ اس دستور العمل میں اکبر نے اپنا مطالبہ پیداوار خام کا یک ثلث قرار دیا تھا اور اس بنیاد کے مطابق مالگزاری وصول کرنے کی غرض سے اس کے عہدہ دار ہر فصل کی جو ملک میں پیدا کی جاتی تھی اوسط پیداوار معین کرتے تھے اور پچھلے دس سال کے تجربے کی بنا پر اس کے ایک تہائی حصے کے برابر زر نقد کی شرح مقرر کر دیتے تھے۔ ہر موسم میں جسقدر رقبے پر جو فصل تیار کی جاتی تھی اس کو قلمبند کر لیا جاتا تھا اور ہر کاشتکار جسقدر رقبہ کاشت کرتا تھا اُس پر منظور شدہ شرح لگا کر اس سے وصول طلب رقم کا حساب کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ آگرے کے قرب وجوار کی زمین کاشت کرنیوالا ہر کاشتکار یہ جانتا تھا کہ اس کو گیہوں کی کاشت پر فی بیگہ ۶۷ دام کے حساب سے مالگزاری ادا کرنی پڑے گی [۱] جو کی کاشت پر فی بیگہ ۴۹ دام۔ نیل پر ۱۰۶ ½ دام۔ لاکھ پر ۲۳۹ دام اور اسی طرح ہر قسم کی پیداوار کے لئے علیحدہ علیحدہ شرح مقرر تھی۔ جن جن زرعی

(۱۰۰)

[۱] اصل کتاب میں جو اعداد دئے گئے ہیں وہ مکمل ہیں حقیقی فہرستوں کی مندرجہ شرحیں دام اور جیتال میں ظاہر کی گئی ہیں جو کہ ایک روپیہ کا قریب قریب ہزارواں حصہ ہے۔ اس بارے میں کسی قدر شبہ ہے کہ آیا ان شرحوں کا منشا یہ تھا کہ ہر جز انفرادی حالت میں پوری وصول کی جائیں یا صرف تحصیل کنندوں کی رہنمائی کے لئے ایک معیار قائم کر دینا مقصود تھا لیکن عملی طور پر یہ کچھ زیادہ اہم سوال نہیں ہے کیونکہ یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے کہ درحقیقت جو رقمیں طلب کیجاتی ہوں گی وہ یقیناً معیاری شرحوں کے بالکل مطابق نہیں تو کم از کم ان کے قریب قریب ضرور ہوتی ہوں گی۔ بیگہ جو نصف ایکڑ سے کچھ زیادہ ہوتا تھا زمین کی پیمائش کی اکائی تھی۔

باب ۴

علاقوں پر اس طریقے کا اطلاق ہوتا تھا وہاں شرح مالگزاری کی ایسی ہی نہر یں مقرر تھیں۔ اصلی ہندوستانی طریق کے مطابق پیداوار فصل کاٹنے کے وقت تقسیم کی جاتی تھی اور کاشتکار و حکومت دونوں کاروبار کے خطرے میں شریک رہتے تھے۔ اکبر کے جاری کردہ طریق کے مطابق خطرے کا اکثر و بیشتر بار کاشتکار پر عائد ہوتا تھا اور (نظری طور پر) جملہ زائد منافع کا بھی وہی مالک ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے ادا کرنے کا دارومدار بجز اس حالت کے جبکہ فصل خراب ہو جائے کاٹی ہوئی فصلوں پر نہیں بلکہ بوئی ہوئی فصلوں پر ہوتا تھا۔ پس اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو کاروبار کی کامیابی میں کاشتکاری کی دلچسپی بڑھ گئی اور دوسری طرف شاہی آمدنی پر موسمی تغیرات کا اثر بہت کم ہو گیا۔ اور اگرچہ اس کی وجہ سے کوئی باقاعدہ طریق لگان قائم نہ ہو سکا تاہم کاشتکار کو ایک زرنقد ادا کرنیوالا آسامی بنانے میں یقیناً کافی مدد ملی۔ گو اپنی ٹھیک ٹھیک ذمہ داری سے کاشتکار قبل از قبل واقف نہ ہو تاہم وہ فصل بونے کے متعلق جیسے ہی اپنی تجویزیں مکمل کر لے وہ کم از کم اس موسم میں اپنی ذمہ داریوں کا حساب لگا سکتا ہے اس طریقے کے واقعی عملدرآمد کا ذکر ہم آگے چلکر کریں گے۔ سردست صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کے جاری ہونے سے زمین کے متعلق ایک کثیر مواد جمع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور آئین اکبری میں ان معلومات کے محفوظ ہونے کیوجہ سے ہم زرعی کاروبار کی حالت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور یہ بات منفرد اشخاص کے اتفاقی مشاہدات پر سراسر بھروسہ کر کے کسی طرح ممکن نہ تھی۔

باب ۲

دوسری فصل

جہاں تک ہمیں علم ہے اُس زمانے کی تحریروں میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جس میں ہندوستانی طریق زراعت کی مکمل کیفیت بیان کی گئی ہو[1] اور اگر ایسی کوئی کیفیت موجود ہوتی تو درحقیقت ایک تعجب کی بات ہوتی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف اس زمانے کے ہندوستانی اہل قلم بہت کم توجہ کرتے تھے اور جہاں تک بیرونی سیاحوں کا تعلق ہے ان کی ساری دلچسپیاں محض تجارت تک محدود ہوتی تھیں لہذا وہ صرف ملک کی پیداوار وں کا شمار اور ان کی حالت بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے اور جن حالات کے تحت یہ چیزیں پیدا کیجاتی تھیں ان کے تفصیلی امور میں دخل نہیں دیتے تھے۔ لیکن دونوں جماعتوں کے اہل قلم اس مضمون کے متعلق بہت سی ناکمل باتیں اشارتاً کہہ گذرتے ہیں اور یہ بہ حیثیت مجموعی عام حالت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ ہمارے پاس کوئی ایسا خاکہ موجود ہو جس کے مطابق ہم ان باتوں کو ترتیب دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ خاکہ نظریۂ تسلسل کی شکل میں ہمیں مل سکتا ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ اور سنہ ۱۹۰۰ کے مابین ہندوستان میں کوئی زرعی انقلاب ایسا نہیں ہوا جیسا کہ بعض اور ممالک میں احاطہ بندی کا مسلک اختیار کرنے پر یا جدید بحری تجارت کے نشوونما کے ساتھ ظہور پذیر ہوا۔ مثلاً احاطہ بندی کی تو صرف اب کچھ عملی اہمیت ہو رہی ہے اور نقل وحمل کے جدید حالات کے خاص نتائج کا ہمیں ٹھیک علم ہے کیونکہ وہ نہر سویز کھلنے کے بعد کے زمانے سے متعلق ہیں۔ اکبر کے بعد جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ درحقیقت زیادہ ہیں اور بعض ان میں سے اہم بھی ہیں

۱۰۱

[1] ٹری نے اس قسم کی ایک کیفیت بیان کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نتیجہ کسی قدر مایوس کن ہے۔ اس نے ملک کا بہت تھوڑا حصہ دیکھا تھا۔ صرف وہ حصہ جو سورت اور سندھ کے مابین واقع ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کا بہت سا حصہ دلچسپ ہے لیکن اس کا اطلاق محدود ہے۔ اور یا تو وہ مشاہدہ کرنے سے قاصر رہا یا بہت سی ایسی باتیں قلمبند نہیں کیں جو اس چھوٹے سے رقبہ کے مروجہ حالات کو بھی ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے ناگزیر تھیں۔

باب ۲

لیکن طریق زراعت کو مجموعی طور پر منقلب کر دینے کے لئے وہ ناکافی ہیں۔ ہل اور بیل باجرا جوار دغیرہ اور چانول۔ دالیں اور روغندار تخم اور دیہات کی ساری روایات تمام چیزیں ہم کو سولھویں صدی کے زمانے جبکہ تاریخ ہند کے اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم دور سے ملحق کر دیتی ہیں۔ اور ہر شخص موجودہ زمانے کے کاشتکاروں کی زندگی سے ذرا بھی واقف ہے قریب قریب ہر ایک تفصیلی بات کو جو اکبری دور کے مستند حالات میں مذکور رہے فوراً محسوس کرلے گا۔ مثال کے طور پر شاہنشاہ بابر نے آگرے کے اطراف واکناف میں طریق آب پاشی کی جو کیفیت بیان کی ہے اس پر نظر ڈالئے "دہ کوئیں کے کنارے وہ لکڑی کا ایک دوشاخہ لگاتے ہیں جس کے بیچ میں ایک چرخی ڈالتے ہیں۔ ایک بڑے ڈول سے رسّی باندھکر اس کو چرخی پر ڈالدیتے ہیں اور اس کا دوسرا کنارہ بیل سے باندھ دیتے ہیں۔ ایک شخص بیل کو ہانکتا ہے اور دوسرا ڈول خالی کرتا جاتا ہے" یہ کیفیت بیسویں صدی پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح کہ بابر کے زمانے پر۔ یا دکن میں گوداکی عقبی زمینوں پر کھیتی باڑی کی جو حالت گرانٹ ڈف اور ٹانے بیان کی ہے اس کو دیکھئے "وہ ہماری طرح زمین کو کھاد دیکر یا محنت کر کے نہیں کاشت کرتے بلکہ بہت ہی تھوڑا کھود کر سطح زمین پر تخم بو دیتے ہیں" امپیریل گزیٹیر میں ہم اس ملک کے متعلق پڑھتے ہیں کہ "کالی مٹی کے کھیت میں سال میں صرف ایک مرتبہ ہل چلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور شاذ ونادر کھاد ڈالی جاتی ہے" اس طرح ناظرین محسوس کریں گے کہ ہر ایک جداگانہ مشاہدہ اسی حالت میں ٹھیک معلوم ہوتا ہے جبکہ ہم یہ فرض کرلیں کہ عام نظام برقرار رکھا گیا تھا۔ اور اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اگر ہمیں ان کے متعلق کوئی واقفیت حاصل ہو سکے تو ہم دوبارہ اس کار وبار کا جس طور پر کہ وہ تین سو سال پیشتر چلایا جاتا تھا ایک خاکہ تیار کرسکیں گے۔

(۱۰۲)

سب سے پہلے ہم اُن فصلوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ملک میں پیدا کی جاتی تھیں۔ ابوالفضل نے ہمارے لئے اِن کی فہرستیں محفوظ رکھی ہیں جن میں ہر ایسی فصل کا نام دیا گیا ہے جس پر شمالی ہند میں مالگزاری تشخیص کی جاتی تھی۔ اور ہمیں اسی بات پر بھروسہ کرلینا چاہئے کہ کوئی فصل جو وسیع پیمانے پر تیار کی جاتی تھی تشخیص مالگزاری سے

باب ۲

بچ نہیں سکتی تھی۔ یہ فہرستیں قریب قریب پورے طور پر اُن فہرستوں کے مطابق ہیں جو آجکل کے زرعی اعداد و شمار میں پائی جاتی ہیں[1] اناج میں چانول۔ گیہوں اور جوان کے علاوہ لانبا اور چھوٹا متعدد قسم کا موٹا اناج۔ (مشہور دالیں)۔ اور مختلف قسم کی معمولی ترکاریاں یہ سب ان فہرستوں میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ گنّا (موٹا اور پتلا دونوں قسم کا)۔ ریشہ دار فصلوں میں روئی اور پٹ سن۔ معمولی قسم کے روغن دار تخم۔ اور نیل خشخاش۔ پان اور سنگھاڑے جیسی متفرق فصلیں بھی نظر آتی ہیں۔ جنوب کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ہمعصر سرکاری تحریریں نہیں ہیں لیکن مختلف سیاحوں کے تذکروں سے ایک ایسی ہی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے اور یہ فہرست بھی اگر پورے طور پر نہیں تو کم از کم قریب قریب زمانۂ حال کی فہرست کے مطابق ہوگی۔ دونوں فہرستوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف ایک فصل ایسی ہے جو اکبر کے بعد سے غائب ہوگئی ہے اور وہ آل ایک قسم کا پودہ ہے جس سے رنگ نکلتا ہے اور جس کی متوسط ہند کے بعض حصوں میں پہلے بہت اہمیت تھی لیکن گزشتہ صدی میں مصنوعی رنگوں کی سابقت کے باعث اس کی کاشت موقوف ہوگئی۔ (۱۰۳) اس نقصان کی تلافی کے لئے بعض دوسری نہایت نفع بخش چیزیں موجود ہیں مثلاً چائے اور کافی۔ آلو۔ تمباکو۔ چھالیہ اور میٹھے آلو جیسے وسیع پیمانے پر کاشت ہونے والی خصائص پیداواریں اور جئی اور مکا جیسی خوراک کی فصلیں پس ہندوستانی زراعت سترھویں صدی کے بعد سے زیادہ سرسبز ہوگئی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کے دایمی خصوصیات کو منقلب کردے۔

ابوالفضل کے محفوظ کردہ اعداد و شمار کی بدولت اُن فصلوں کی اضافی قدر کا ایک سرسری اندازہ کرنا ممکن ہے جو شمالی ہند کے اُن علاقوں میں پیدا کی جاتی تھیں جہاں مالگزاری کی تشخیص اکبر کے دستور العمل کے مطابق کی جاتی تھی، جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں اس دستور العمل کا منشا یہ تھا کہ حکومت کے لئے یک ثلث

---

[1] ضمیمۂ الف میں صرف ایک ہی فہرست دی گئی ہے جو آئین اکبری کی مندرجہ فہرستوں پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کی فصلوں کی بھی ایک فہرست ہے جو ہمعصر بیانات سے مرتب کی گئی ہے۔

باب ۴

خام پیداوار کے مقدار زرِ نقد اوسطاً لے لیا جائے۔ اس طرح مختلف فصلوں کے مساوی رقبوں پر جو رقمیں طلب کی جاتی تھیں ان سے سرکاری نقطۂ نظر کے مطابق ہر فصل کی قدر کا تناسب ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً گیہوں کے ایک بیگہ پر ۶۰ دام مالگزاری تشخیص کرنے کے یہ معنی تھے کہ تشخیص کرنے والوں کی نظر میں گیہوں کے ایک بیگہ کی اوسط قدر ۱۰۰ دام تھی اور اگر ہم گیہوں پر تشخیص مالگزاری کی مقدار ایک سو کے مساوی قرار دیں تو پھر دوسری فصلوں کی مشخصہ مقداریں بھی ایک نہایت سہل طریقے پر ظاہر کر سکتے ہیں جس سے تمام فصلوں کا باہمی تعلق نمایاں ہو سکے۔ بعض خاص خاص فصلوں کے اعداد حسب ذیل ہیں، واضح رہے کہ مغلیہ صوبجات الہ آباد۔ آگرہ اور دہلی کے اندر اکبر کے دور میں تشخیص مالگزاری کی جو مختلف شرحیں مروج تھیں اُن کے اوسط پر یہ اعداد مبنی ہیں۔

فصل	قدر اضافی
گیہوں	۱۰۰
جَو	۶۷
چنہ (معمولی)	۶۰
جوار	۵۹
باجرا	۴۲
منڈو	۴۴
ساون	۲۲
السی	۵۱
سرسوں	۵۳
خشخاش	۲۱۰
گنا (معمولی)	۲۱۳
روئی	۱۵۰
نیل	۲۵۴

جہاں تک اناج کی چیزوں کا تعلق ہے ان کی باہمی قدروں میں بہت ہی کم

باب ۲ تغیر ہوا ہے۔ جو جوار یا چنے کے ایک ایکڑ کی مالیت آجکل اگر سرسری طور پر دیکھی جائے تو گیہوں کے ایک ایکڑ کی مالیت کے ۶۰ تا ۷۰ فیصدی کے مساوی ہوتی ہے یہی حالت اکبر کے زمانے میں بھی تھی۔ اور موٹے اناج کی مالیتیں تو مقابلۃً اس سے بھی بہت کم ہوتی ہیں[1] روغندار تخموں کی قدر اُس زمانے میں نسبتاً کم تھی کیونکہ ۱۰۴ یہ چیزیں نہ تو اسقدر وسیع پیمانے پر باہر بھیجی جاتی تھیں اور نہ ان کی تجارت اسقدر نفع بخش ہی تھی۔ برخلاف اس کے گنّے کی اضافی حیثیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے کیونکہ اب بھی اس کی مالیت گیہوں کی دوگنی قدر سے بھی زیادہ ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اکبر کے زمانے میں خشخاش گنّے کے ہمقدر تھی۔ لیکن اُسکی موجودہ قدر کھُلے بازار کے اندر نامعلوم ہے کیونکہ کاشتکار کو جو قیمت ادا کیجاتی ہے اُس کو مدت ہوئی کہ حکومت نے بالکل جداگانہ مصلحتوں کی بنا پر معین کر دیا ہے، لیکن اس پودے کی فروخت سے حال حال تک جو آمدنی حاصل ہوتی رہی ہے اگر اس کا لحاظ کیا جائے تو اس فصل کی موجودہ حیثیت کو دیکھکر کوئی تعجب نہ ہوگا۔ روئی کی قدر اضافی کی شرح جو اسقدر بلند نظر آتی ہے اس پر ملک کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں غور کیا جائے گا۔ یہ واضح ہے کہ اناج کی قیمتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے معمولی پوشاک کی خام پیداوار گراں تھی۔ نیل کی قیمت بھی بہت اعلیٰ تھی لیکن اس کی وجہ صنعت میں نہیں بلکہ تجارت میں مضمر تھی۔ کیونکہ سولھویں صدی میں بھی یہ فصل خاصکر بیرونی ممالک کے لئے کاشت کی جاتی تھی۔ اِن اشیا کی باہمی قدروں کو دیکھکر یہ ترغیب ہوتی ہے کہ اُن کی حقیقی قدر معلوم کی جائے اور اکبر کے زمانے میں ہر فصل کی اوسط پیداوار کے اعداد اِس مواد سے اخذ کئے جائیں۔ اس طرح کا حساب کاغذ پر تو بے شک ممکن ہے لیکن اس میں مشتبہ امور نسبتاً بہت زیادہ ہیں لہٰذا جو کچھ نتیجہ نکلے گا اس کا انحصار زیادہ تر اُن قدروں پر ہوگا جو ہر منفرد حساب لگانیوالا اِن مشتبہ چیزوں کے لئے معین کرے گا۔ لہٰذا ہماری واقفیت کی موجودہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ اِن اعداد کی وجہ سے جو ترغیب ہوتی ہے

[1] اکبر کے تشخیص کنندوں نے باجرے کو جس طرح سطح پر رکھا ہے، وہ ہماری توقع سے کم ہے۔ شاید اس کا باعث قیمت کا کچھ فرق ہو

باب ۵

اس کو رد کا جائے اور صرف اس نتیجہ پر اکتفا کیا جائے کہ مختلف فصلوں کی باہمی قدروں میں بہت کم تغیر و تبدل ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ جن جن صورتوں میں کوئی تبدیلی نمایاں معلوم ہوتی ہے اس کی توضیح زمانۂ مابعد کے تاریخی حالات سے عام طور پر ہو جاتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ بجز اُن مستثنیات کے جو ظاہر کر دی گئیں ہندوستان میں بہ حیثیت مجموعی وہی زرعی پیداواریں حاصل ہوتی تھیں جو اب حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین اور آب و ہوا کے حالات کے مطابق مختلف فصلیں مختلف مقامات کے ساتھ مخصوص ہو گئی تھیں۔ بنگال کا انحصار زیادہ تر چانول پر تھا۔ شمالی ہند کا چانول گیہوں موٹے اناج اور دالوں پر۔ دکن کا جوار اور روئی پر۔ جنوب کا چانول اور موٹے اناج پر۔ اور مختلف ذرائع سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ اس نتیجہ کو حق بجانب ثابت کرتی ہیں کہ اُس زمانے میں فصلوں کی ایسی تخصیص نہیں تھی جیسی کہ آجکل پائی جاتی ہے تاہم تخصیص بالکل مفقود نہ تھی کیونکہ ہندوستان کے اکثر حصوں کے لئے شکر کی بہمرسانی بنگال سے ہوتی تھی اور نیل کی پیداوار بڑی حد تک صرف دو مقامات میں مخصوص ہو گئی تھی: ایک بیانے میں جو آگرے کے قریب واقع ہے دوسرے سرکھیج واقع گجرات میں ان دونوں مثالوں سے اُن حالات پر روشنی پڑتی ہے جو طریق تخصیص پر اثر ڈالتے ہیں۔ شکر زیادہ تر تری کے راستہ سے منتقل کی جاتی تھی خواہ وہ جانب مغرب آگرے بھیجی جائے یا جانب جنوب ملیبار کے بندرگاہوں کو۔ گویا اس کی تجارت بہت بڑی حد تک خشکی کے راستہ کے کثیر مصارف سے محفوظ تھی اس کے برعکس نیل کی روانگی آگرے سے کھمبے کی بندرگاہوں کو یا سرحد کے اُس پار ایران کو خشکی کے راستہ سے ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کی قدر برآمد اس کی جسامت کے تناسب سے غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ بس ان مثالوں میں ہم کو طریق تخصیص کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں جو گذشتہ ایک صدی کے اثناء میں ذرائع آمد و رفت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اسقدر ترقی کر چکا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم زمانۂ موجودہ کے سے گیہوں یا روئی کے قطعات کی تلاش کریں گے تو محض بے سود ہوگا۔ کیونکہ یہ چیز خاصکر ریلوں کے کاروبار کا نتیجہ ہیں۔

۱۰۵

تاہم روئی کی کاشت اس زمانے کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر ہوتی تھی اگرچہ اُس کی مجموعی پیداوار کی مقدار غالباً کم تھی بہرحال یہ نتیجہ قرین عقل ہے کہ ملک کے اکثر حصے

پوشاک خوراک اور دوسرے ضروریات کے معاملے میں تقریباً کسی اور کے محتاج نہ تھے پس اگر وہ اجناس جو بعد میں جاری کی گئیں خارج کر دی جائیں اور طریق تخصیص کی ترقی اور آبپاشی سے متعلقہ تبدیلیوں کا جنپر ہم ابھی بحث کریں گے مناسب لحاظ کیا جائے تو ہم ہندوستان کے کسی خاص حصے میں فصل پیدا کرنے کے طریقوں کا ایک عام تصور قائم کر سکتے ہیں۔

جب ہم اس سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اکبرؔ کے زمانے کے کاشتکار کس طرح کے آلات و اوزار استعمال کرتے تھے تو ہمیں فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس بارے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں بھی کاشتکار کا ساز و سامان اسقدر ادنی ترین ہے کہ یہ خیال کرنا کبھی وہ اس سے بھی ابتر حالت میں تھا نا ممکن ہے۔ مزید براں یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس دوران میں کچھ مفید آلات و اوزار غائب ہو گئے ہوں گے۔ ہل اور کدال پانی کھینچنے کے ڈول اور دوسرے چھوٹے چھوٹے آلات و اوزار ان سب کی قدامت ان کی صورتوں سے ظاہر ہے۔ اب رہے ان کے ذرا ذرا سے فرق یہ غالباً نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر مقام کے مخصوص حالات کے مطابق بنانے کے لئے ان میں بتدریج ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ مزید براں اُن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت لوہے کی کفایت ہے اور اس کی توجیہہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان کو صرف اپنے ہی لوہے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ پانی کھینچنے کے ڈولوں کے بارے میں ہمارے اس نتیجہ کی بدیہی طور پر تصدیق ہوتی ہے۔ پانی کھینچنے کے معمولی ڈول کی جو تشریح بابرؔ نے کی ہے اُس کا ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں۔ اسی طرح ایرانی وضع کے موٹ کی کیفیت بھی جو پنجاب میں استعمال کیا جاتا ہے ویسی ہی منقول ہے۔ پس اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ موجودہ آلات و اوزار کم از کم اکبرؔ کے پیدا ہونے سے قبل مستعمل تھے۔ اور اگرچہ ہل کے بارے میں اسی قسم کی کوئی براہ راست شہادت ہمارے علم میں نہیں آئی[1]

[1] ٹری کہتا ہے (پرچاس ۲ ـ ۹ ـ ۱۴۶۹) وہ اپنی زمین بیلوں اور پاڈں کے ہلوں سے جوتے ہیں" اس زمانے میں انگلستان کا پاڈں کا ہل موجودہ ہندوستانی ہل کے بہت مشابہ ہوگا کیونکہ وہ بھی زیادہ تر لکڑی ہی کا بنا ہوا ہوتا تھا اور اس میں نہ کوئی پہیا ہوتا تھا اور نہ کوئی تختہ۔ لیکن ہمیں ایسی کوئی واضح کیفیت نہیں مل سکی جو یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہو کہ آیا ان میں کوئی اہم فرق موجود تھا۔

باب

تاہم اس کی قدامت پر کوئی اہم اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ آلات واوزار کے مصارف فی الجملہ کاشتکار کے حق میں زیادہ تھے یا کم اس کا جواب اعداد کے ذریعے سے نہیں دیا جا سکتا لیکن فرق غالباً دونوں طرح سے بہت کم تھا۔ ایک طرف تو لکڑی بمقابلہ آجکل کے زیادہ سہولت سے ملجاتی تھی لیکن دوسری طرف لوہا بمعاوضہ اناج یقیناً بہت زیادہ گراں تھا اور جہاں تک بنوائی کے مصارف کا تعلق ہے ان میں بھی اسی زر کے حساب سے غالباً بہت تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی ضروری آلات واوزار کی رسد برقرار رکھنے کے لئے پیداوار کی جو مقدار مطلوب تھی اس میں گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں کوئی بہت زیادہ تغیر وتبدل نہیں ہوا ہے۔

جہاں تک قوت محرکہ کی رسد کا تعلق ہے اکبرؒ کے زمانے میں کاشتکار بمقابل آجکل کے غالباً زیادہ بہتر حالت میں تھے ہر جگہ تو نہیں لیکن ملک کے اکثر حصوں میں چرنے کے لئے بیکار زمین زیادہ مقداریں میسر تھی اور یہ نتیجہ قرین عقل ہے کہ مویشی ارزاں قیمت پر اور سہولت سے دستیاب ہوسکتے تھے جواب ممکن نہیں ہے جہاں تک مویشیوں کی خوبی کا تعلق ہے اس بارے میں کوئی ٹھیک اطلاع ہمیں نہیں ملی ہے مختلف سیاح گاڑی کے بیلوں کی مشہور نسلوں میں سے ایک نہ ایک کی کیفیت بیان کرتے ہیں لیکن یہ تو صرف دولتمندوں کے تعیشات میں شامل تھے۔ اور جہاں تک ہمیں علم ہے ہل کھینچنے والے جانوروں کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ خوبی کو چھوڑ کے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالت کے مقابلہ میں ہل کھینچنے والے مویشی زیادہ آسانی سے دستیاب ہوجاتے تھے اور ان کی پرورش بھی مقابلۃً آسان تھی۔ ہمارے خیال میں یہ نتیجہ حق بجانب نہ ہوگا کہ کھاد کی رسد مقابلۃً زیادہ تھی۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ایک مساوی رقبۂ زیر کاشت کے لئے اُس زمانے میں زیادہ مویشی موجود ہوتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کی کھاد بھی دستیاب ہوجاتی تھی کیونکہ اس زمانے میں مویشیوں کی پرورش زیادہ تر چراگاہوں میں اور کمتر طویلوں میں ہوتی ہوگی اور مویشی جہاں کہیں کھاد ڈالتے وہیں وہ پڑی رہتی ہوگی۔ ہمیں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہو کہ سولھویں صدی میں گوبر کم جلایا جاتا تھا۔ ایندھن کے طور پر تو وہ یقیناً استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اس زمانے میں خود یورپ کے اکثر

۱۰۷

باب ۲ حصوں کی حالت تھی ۔ لیکن یہ بتانا کہ آجکل کے مقابلے میں کس حد تک اس کا رواج تھا محض ایک قیاسی بات ہوگی ۔

جب ہم آبپاشی کے لئے پانی کی رسد کی طرف متوجہ ہوں تو ہمیں چاہئے کہ آجکل بڑی نہروں کا جو خطہ کہلاتا ہے اس میں اور بقیہ ملک میں گہرا امتیاز کریں ۔ الہ آباد کے شمال اور مغرب کی طرف جن سیاحوں نے سفر کیا ان کے تذکروں کو پڑھتے وقت ہمیں فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اُن لوگوں نے اس مضمون کا کسقدر کم حوالہ دیا ہے۔ اکثر و بیشتر سیاح آبپاشی کے رواج سے غالباً ناآشنا تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اُس کو ایک عجیب وغریب چیز سمجھکر قلمبند کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بارے میں بہت ہی کم قلم اٹھاتے ہیں ۔ بعض صورتوں میں ان کے سکوت کی توضیح موسم کی حالت سے کی جاسکتی ہے ۔ مثلاً اسٹیل اور کروتھر سنہ ۱۶۱۵ء میں آگرہ سے ایران تک سفر کرنے کے بعد اس آخری ملک کے طریق آبپاشی کا حال نہایت جوش کے ساتھ قلمبند کرتے ہیں لیکن لاہور تک ان کا سفر اپریل اور مئی کے مہینوں میں طے ہوا جبکہ آبپاشی کا کوئی کاروبار دکھائی نہیں دیتا ۔ لیکن اس توضیح کا اطلاق فینچ کے سے سیاحوں کی حالت پر نہیں ہوسکتا جس نے آگرے سے لاہور تک جنوری کے مہینے میں سفر کیا اور صرف اسقدر دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پانی کا نالہ شاہی باغوں میں سے ایک باغ کی آبپاشی کے لئے کاٹ لیا گیا ہے اور تمام بیانات کا مجموعی طور پر لحاظ کرتے ہوئے اس نتیجے سے گریز کرنا مشکل ہے کہ ملک کے اس حصے میں موسم سرما کی آبپاشی آجکل کی طرح نمایاں اور اہم نہیں تھی ۔ آئین اکبری میں زراعت کے جو تھوڑے سے حالات درج ہیں اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے ۔ اُس میں عام طور پر بارش کی فصلوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے ۔ اور بارہ صوبوں کے حالات میں خاصکر آبپاشی کے متعلق صرف ایک جگہ ذکر ہے اور وہ بھی اسقدر کہ لاہور میں آبپاشی زیادہ تر کنوؤں سے ہوتی تھی ۔ بابر سولھویں صدی کے اوائل میں تحریر کرتے ۱۰۸ ہوئے ہندوستان کے اندر مصنوعی نہروں کی عدم موجودگی پر اظہار رائے کرتا اور اس کی یوں توجیہ کرتا ہے کہ پانی بالکل ناگزیر نہیں ہے کیونکہ خزاں کی فصلیں تو بارش سے سیراب ہوتی ہیں اور بہار کی فصلیں بارش نہ بھی ہو تو بھی پیدا ہو جاتی ہیں ۔

باب ۴

ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں پنجاب کا کوئی سیاح یہ رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن پانی حاصل کرنے کے ذرائع کا جو حال ہمیں معلوم ہے وہ اس کے بالکل مطابق ہے۔ نہروں کا تقریباً پورا انتظام ایک زمانۂ مابعد کی چیز ہے اکبر کے زمانے میں دریائے انڈس پر چند سیلابی نالے موجود تھے اور فیروز شاہ نے اپنے بنائے ہوئے باغات اور شہروں کو سیراب کرنے کے لئے جو نہریاں بنائی تھیں ان میں سے کچھ باقی رہ گئی تھیں لیکن ان چیزوں کی اہمیت زیادہ تر مقامی تھی۔ اور ملک کا انحصار بہ حیثیت مجموعی یا تو کوؤں پر تھا یا چھوٹی چھوٹی ندیوں پر جن کو عارضی پشتوں کے ذریعے سے کام میں لایا جاتا تھا۔ لہذا ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُس زمانے میں شمالی ہند کے حالات قریب قریب ایسے ہی تھے جیسے کہ آجکل وسط ہند میں موجود ہیں یعنی بڑے بڑے وسیع رقبوں پر خشکی کاشت کیجاتی تھی جس پر کہیں کہیں زیادہ پیداوار زمین کے قطعات نظر آتے تھے۔ یہ وہ مقامات ہوتے تھے جہاں یا تو کوئی ندی کام میں لائی جاتی تھی یا زیادہ کارآمد کوئیں بنائے جاتے تھے۔

ہندوستان کے دوسرے مقامات میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ اس سے بھی بہت کم ہیں۔ دیہات کی ظاہری صورت سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ کوؤں یا پانی کے ذخیروں کی تعمیر کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور یہ امر مطابق قیاس ہے کہ آبادی کے تناسب سے جس رقبہ کی اکبر کے زمانے میں آبپاشی ہوتی تھی وہ قریب قریب اتنا ہی تھا جتنا کہ موجودہ صدی کے آغاز میں۔ ممکن ہے کہ وہ اس سے بہت کم ہو یا کسیقدر زیادہ ہو لیکن ہمارے خیال میں فرق بہت زیادہ نمایاں نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے جزیرہ نما علاقے میں پانی کے صدیوں سے پشتے تعمیر ہوتے اور ٹوٹتے ہیں۔ کوئیں کھودے جاتے اور خراب ہوتے رہتے ہیں۔ پس جہاں تک مادی حالات کا تعلق ہے جو کچھ معلومات ہمیں میسر ہیں اُن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے کا طریق زراعت بالعموم آجکل کے مروجہ طریق زراعت کے مشابہ تھا آیندہ فصل میں ہم اس کاروبار کے اُس پہلو پر جو کام کرنے والوں کی حالت سے متعلق ہے غور کریں گے۔

باب ۳

تیسری فصل

کاشتکار اور مزدور

سولھویں صدی کے مروجہ طریق زراعت کا حال معلوم کرنے کے بعد زرعی آبادی کی تعداد کے بارے میں ہم چند نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دور کے واقعات پر غور کرنے سے قبل ہمیں اس عام تعلق پر ایک نظر ڈالنی چاہئے جو کسی قوم کی تعداد اور اس کے زیر کاشت رقبے کے مابین قایم رہتا ہے۔ اگر ہم زمین کے تجارتی استعمال کی مثالوں کو علحدہ کر دیں اور اپنی توجہ صرف اُس زراعت تک محدود کر دیں جو براہ راست ذریعۂ معاش کے طور پر جاری رہتی ہے تو ہم دیکھیں گے کہ کسی علاقے میں جو کوئی خاص طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا انحصار کچھ تو زمین۔ آب وہوا۔ اور قدرتی نواح کے دوسرے دیرپا عناصر پر ہوتا ہے اور کچھ زراعت کا کاروبار چلانے والوں کی قابلیتوں پر۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جو رقبہ اس طریق کے تحت کاشت کیا جاتا ہے اس کی وسعت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ محنت کی کسقدر مقدار دستیاب ہوتی ہے۔ اور مقدار محنت کی وجہ سے جو حد بندی عائد ہوتی ہے اس کا ظہور انتہائی مصروفیت کے موسموں میں ہوتا ہے۔ اکثر دوسرے کاروبار کے برعکس جس نمونے کی زراعت ہمارے زیر غور ہے اُس میں سال بھر یکساں مصروفیت کے مواقع موجود نہیں ہوتے بلکہ بیکاری اور مصروفیت کے دور یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تخم ریزی کے وقت سب سے زیادہ مصروفیت رہتی ہے بعض صورتوں میں فصل کاٹنے کے وقت۔ اور بعض صورتوں میں کسی نہ کسی درمیانی زمانے میں۔ لیکن نتیجہ ہر حالت میں ایک ہی ہوتا ہے۔ زیر کاشت رقبہ کبھی اتنا وسیع نہیں ہوگا کہ سنبھل نہ سکے ممکن ہے کہ ناموافق موسموں میں وہ اس معیار سے بہت ہی کم ہو جائے لیکن جب تک کہ کاشت کرنے کی نیت وزر بھی موجود ہوتی ہے میلان یہی ہوگا کہ جتنا بڑا رقبہ تیار کیا جا سکتا ہے بویا جائے لیکن اس سے زیادہ نہیں اب اگر دوسرے تمام حالات تو زیادہ تر غیر متغیر رہیں اور زرعی آبادی کی تعداد گھٹ جائے تو رقبہ زیر کاشت بھی

باب ۴

کم ہو جائے گا۔ اور اگر آبادی بڑھے تو یہ رقبہ بھی وسیع ہوتا جائے گا حتی کہ مزید زمین دستیاب نہ ہو سکے۔ اور اس طرح جو گنجائش پیدا ہو گی اس سے دوبارہ توازن قائم ہو جائے گا۔ خواہ ترک وطن کے ذریعے سے یا ہلاکت میں اضافہ ہو جانے کے باعث۔ لیکن گنجائش کی حالت کو چھوڑ کر تعداد آبادی اور رقبۂ کاشت کا باہمی تعلق قریب قریب یکساں رہے گا۔

موجودہ زمانے میں بھی بہت بڑی حد تک ہندوستانی زراعت کا "عہد ذریعۂ معاش" ہی جاری ہے۔ یعنی ہر منفرد کاشتکار کو ابھی تک سب سے پہلے یہی فکر ہوتی ہے کہ اپنے اہل و عیال کیلئے غذا پیدا کرے۔ لہذا ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ گذشتہ تین صدیوں کے اثناء میں تعداد آبادی اور رقبۂ کاشت کا باہمی تعلق بہت زیادہ متغیر نہیں ہوا ہے بشرطیکہ ہمارے پاس یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ موجود ہو کہ دوسرے حالات میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوی ہے اب جہاں تک زمین اور آب ہوا کے دائمی حالات کا تعلق ہے یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اور گذشتہ فصل میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ فصلوں اور کاشت کے طریقوں کے تغیرات بھی ایسے نمایاں نہیں ہیں۔ اب یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ آیا خود کاشت کرنے والوں میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے یا نہیں۔ کوئی شہادت ایسی موجود نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوستانی کاشتکار اور مزدور بمقابل آجکل کے اکبر کے زمانے میں زیادہ یا کم کارگزار تھے۔ جیسا کہ کسی آیندہ باب میں معلوم ہو گا وہ اس وقت بھی وہی غذا کھاتے تھے جو آجکل کھاتے ہیں اور قیاس یہ ہے کہ بہ لحاظ مقدار کے اُنھیں کھانے کے لئے زیادہ نہیں بلکہ کچھ کم ہی ملتا ہو گا۔ مزید براں اُس زمانے میں ایسے اسباب موجود نہیں تھے جن سے اُن کی سمجھ اور واقفیت میں اضافہ ہو سکے۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہو گا اُنھیں اس بات کی بہت کم توقع ہوتی تھی کہ مزید سعی و محنت کے ثمرات سے خود متمتع ہو سکیں گے۔ اور براہ راست شہادت کی عدم موجودگی میں یہ نتیجہ بالکل قرین عقل ہے کہ معمولی لوگوں کے کام کی مقدار اور خوبی موجودہ معیار سے کم از کم بہتر تو نہیں تھی۔ عملی مثالیں لیکر دیکھئے تو ہمارے خیال میں ایسی کوئی وجہ نہیں بتائی جا سکتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ایک ایکڑ زمین جوتنے یا چانول کے ایک ایکڑ پر بو دینے۔ یا روئی کا ایک ایکڑ صاف کرنے میں

۱۱۰

باب ۳ یا گنے کا ایک ایکر کاٹنے ایک ایکر گیہوں کی فصل اکٹھا کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں کوئی بڑی تبدیلی ہوی ہے۔ اور اگر اسقدر تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گذشتہ تین صدی کے اندر ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں زراعت کے حالات زیادہ متغیر نہیں ہوئے ہیں زیر کاشت رقبے کی ایک معینہ وسعت زرعی آبادی کی کم وبیش ایک ہی تعداد پر ہمیشہ دلالت کرتی رہی ہے۔ اس نتیجے میں جس یکسانیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُس سے مراد وسعت کاشت کی یکسانیت نہیں بلکہ صرف وقت کی یکسانیت ہے چنانچہ آجکل بھی مختلف مقامات میں لوگوں کی جو تعداد درکار ہوتی ہے اس میں بڑے بڑے فرق نظر آتے ہیں۔ اور خیال یہ ہے کہ یہ فرق بلا کسی اہم تبدیلی کے اب تک برابر موجود ہیں۔ موجودہ صدی کے ۱۱۱ آغاز میں صوبہ جات متحدہ کے بعض مغربی اضلاع میں "معمولی کاشت" کے ہر ایک سو ایکر کے لئے باشندوں کی تعداد ۱۰۰ سے ۱۲۰ تک تھی اور دوسرے اضلاع میں جو جنوب کی طرف واقع ہیں ہر سو ایکر کے لئے یہ تعداد ۶۰ سے ۷۰ تک تھی[1] ان اعداد کا فرق قدرتی نواح کی دوامی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے کافی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ بلا کسی خاص تبدیلی کے غالباً برابر باقی ہے اور یہ کہ اکبر کے زمانے میں و نیز سارے درمیانی دور میں ۱۰۰ ایکر زمین کاشت کرنے کے لئے مغربی اضلاع میں ۱۰۰ اور ۱۲۰ کے درمیان اور جنوبی اضلاع میں ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان آدمی درکار ہوتے تھے۔

جس نقطے پر ہم اب پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر بہ حیثیت مجموعی ہندوستان پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو طریق زراعت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی خاص خطے میں زرعی آبادی کی تعداد قریب قریب رقبۂ زیر کاشت کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ نظری طور پر یہ نتیجہ اس بات کے متناقض نہیں ہے کہ کھیتوں کی اوسط وسعت میں بڑے بڑے فرق موجود ہوں۔ خواہ جملہ زرعی آبادی کے پاس زمین موجود ہو یا صرف بڑے بڑے کاشتکاروں کی ایک

[1] یہاں "معمولی کاشت" سے مراد وہ اوسط رقبہ ہے جو متواتر کئی معافق سال تک فی الواقع زیر کاشت لایا گیا ہو۔

باب ۴

چھوٹی سی تعداد زمین پر قابض ہو اور کثیر التعداد بے زمین مزدوروں کو نوکر رکھکر کام لے دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمارے خیال میں ان دونوں انتہائی باتوں میں سے ایک بھی اکبری دور کے واقعات کے مطابق نہیں ہے بلکہ متعدد امور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف تو بے زمین مزدور کثرت سے موجود تھے اور دوسری طرف کاشتکاروں کی بڑی تعداد آجکل کی طرح کم حیثیت اور محدود ذرائع والے اشخاص پر مشتمل تھی۔ اب جہاں تک اس آخری طبقے کا تعلق ہے اکبرؒ کی انتظامی ہدایات میں گاؤں کے مکھیا کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر گاؤں میں کثیر التعداد کاشتکار موجود ہوتے تھے اور یہی نتیجہ ہم جنوبی ہند کی زندگی کے جستہ جستہ حالات سے بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں کو چھوٹا خیال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس زمانے کی تحریروں میں بڑے بڑے اصلدار کسانوں کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا اگر کوئی غالب طبقہ ہوتا تو یقیناً ان کا وجود محسوس ہوتا۔ برخلاف اس کے جہاں کہیں ہم کاشتکار کا حال پڑھتے ہیں وہ اُس زمانے میں بھی اتنا ہی حقیر نظر آتا ہے جتنا کہ آجکل۔ اس کے علاوہ عام طور پر وہ زر نقد کا بھی محتاج نظر آتا ہے چنانچہ اکبرؒ نے اپنے مال کے عہدہ داروں کو ہدایت کی تھی کہ حاجتمند کاشتکاروں کو زر نقد قرض دیں۔ اِن ہدایات کو ہم اصل کی کمی کا ثبوت تصور کر سکتے ہیں گو ہم اُن سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ سرکاری قرضوں سے یہ ضرورت پورے طور پر رفع ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جوہر کا بیان کیا ہوا قصہ بھی موجود ہے کہ کسطرح لاہور کے ۱۱۲ قریب رہنے والے کاشتکار ادائے مالگزاری کے لئے روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے ضمانت میں اپنی بیوی بچے ساہوکاروں کے حوالہ کرنے کے عادی تھے اس قصے سے جو مالی حالت ظاہر ہوتی ہو وہ وہی ہے جس سے ہم آجکل آشنا ہیں۔ اگرچہ اس خاص قسم کی ضمانت پیش کرنا اب متروک ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ایک انگریز تاجر ۱۶۱۴ئہ میں نیل خریدنے کے لئے آگرے کے قرب وجوار کے دیہات میں گیا تو ملک کے دستور کے مطابق اُس نے پیشگی رقمیں تقسیم کیں جن کا حساب اُسوقت ٹھیک ہو گا جب کہ حوالگی کے لئے نیل تیار ہو جائے گا

باب۲ تقریباً اُسی زمانے میں ایک اور تاجر نے احمد آباد سے تحریر کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ دیہات کے لوگوں سے روز کے روز نیل خریدنے کے لئے سرمایہ مہیا کرنا ضروری ہے کیونکہ "یہ لوگ تکمیل ضروریات کے لئے روپیہ کی قلت سے مجبور ہو کر تھوک خریداروں کے ہاتھ نہایت ادنی قیمتوں پر فروخت کر دیتے ہیں" اسی طرح ہم پڑھتے ہیں کہ پرتگالی مشنریوں نے تھانے میں اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے نئے عیسائیوں کے لئے لباس اور غذا۔ تخم۔ مویشی اور ہل غرض وہ تمام اصل فراہم کریں جو اُن کو اپنا پیشہ چلانے کے قابل بنانے کے لئے درکار ہو۔ یہ مثالیں گو بہت ہی تھوڑی ہیں تاہم وہ ایک کافی وسیع رقبے پر حاوی ہیں اور ہمیں تو کوئی ایسی عبارت یاد نہیں پڑتی جس سے اس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہو۔ شہادت بلاشبہہ بہت ہی قلیل ہے لیکن جو کچھ شہادت موجود ہے وہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں اور حاجتمند کاشتکاروں کی موجودگی کے موافق ہے بڑے بڑے کسانوں کا جو اپنے اپنے کاروبار کی وسعت کے لحاظ سے حسب ضرورت سرمایہ فراہم کر سکتے ہوں کہیں پتا نہیں چلتا۔

دوسری طرف ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ آجکل کی طرح سولھویں صدی میں بھی زرعی آبادی کی ایک کثیر تعداد بے زمین مزدوروں پر مشتمل تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کے طبقہ کا معاصر تحریروں میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم اس صورت میں سکوت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ زرعی مزدور کا وجود ہی نہ تھا حق بجانب نہیں ہے۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن اہل قلم کی تصنیفات ہمارے پاس موجود ہیں اُن کو اس مضمون سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بے زمین مزدوروں کی موجودگی کی تائید میں جو استدلال موجود ہے وہ مختصراً حسب ذیل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان اس قسم کے مزدوروں سے جو غلاموں کی حیثیت رکھتے تھے یا اُس حیثیت سے نکل آئے تھے بھرا ہوا تھا۔ یہ کمینہ طبقہ یا تو اکبر کے دور میں موجود ہو گا یا بعد کے درمیانی زمانے میں وجود پذیر ہوا ہو گا۔ آخری مفروضہ بہت زیادہ (۱۱۳) خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کا تمدنی انقلاب اُس زمانے کی تاریخ پر لازمی اپنا کچھ نہ کچھ اثر چھوڑتا اور جب تک کہ اس کی صحت کی کوئی شہادت پیش نہ ہو ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ دیہاتی غلامی ایک بہت ہی قدیم چیز ہے اور دور اکبری سے

باب
کہیں قدیم تر زمانے سے اس کا وجود ہے۔ دنیا کی تاریخ تمدن کا عام طور پر اور ہندوستان کا خاص طور پر ہمیں جو کچھ علم ہے وہ بھی اسی یقین کے مطابق ہے۔ ایک تو وہ بجائے خود قرین قیاس ہے دوسرے اس کا کوئی قرین عقل بدل نہیں ہے۔

جس واقعاتی شہادت پر یہ استدلال مبنی ہے وہ زیادہ تر "غلامی کی رپورٹ" میں ملے گی جس کا کسی گذشتہ فصل میں حوالہ دیا جا چکا ہے۔ رپورٹ سے دراصل صورتِ حال مکمل طور پر پیش نظر نہیں ہوتی۔ اراکین کمیشن نے زیادہ تر عدالتی عہدہ داروں سے حاصل کی ہوئی اطلاع پر اعتماد کیا اور صرف چند مقامات ایسے ہیں جہاں انھوں نے ایسے اشخاص کے مشاہدات قلمبند کئے جنھوں نے بذات خود اس مسئلے کا مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی تحقیقات اُس کل رقبہ پر جواب برطانوی ہند کہلاتا ہے حاوی نہیں تھی اور جسقدر رقبہ پر وہ حاوی تھی خود اس میں بھی بہت سے مقامات چھوٹ گئے ہیں۔ اراکین کمیشن نے باضابطہ غلامی اور اس کی مشابہ صورتوں میں امتیاز کیا اور ان صورتوں کو انھوں نے مختلف مواقع پر مختلف نام دئیے ہیں۔ کبھی تو اُسے متعلق اراضی غلامی کہا ہے۔ کبھی اُسے زرعی قید سے موسوم کیا ہے اور کبھی اُس کیلئے قانون کی لاطینی اصطلاح جس کا مفہوم غلامی متعلق بہ اراضی کے مرادف ہے استعمال کی ہے۔ اور ان کی تحقیقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں تلاش کی گئی زرعی غلامی یا اس کے نشان پائے گئے۔ چنانچہ بنگال کے بعض اضلاع کے متعلق بیان کیا گیا تھا کہ زرعی غلام عام طور پر زمین کے ساتھ فروخت ہوتے تھے اور سر ولیم میکناٹن کا یہ بیان کہ موروثی غلاموں پر بھی انھیں قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جو آبائی جائداد غیر منقولہ سے متعلق ہیں قابل لحاظ ہے۔ سر ایڈورڈ کولبروک نے ذکر کیا ہے کہ بہار میں زمینداروں کو اپنے موروثی غلاموں پر جو حقوق حاصل تھے وہ اس وقت تقریباً نابید ہو چکے تھے۔ "مغربی صوبوں (یعنی صوبجات متحدہ کے بعض حصوں) میں اس ادارہ کے حالیہ وجود کی کوئی شہادت" اراکین کمیشن کو نہیں ملی۔ لیکن ان کے خیال میں یہ بات قرین قیاس ہے کہ "اِس قسم کی حالت کم وبیش اُس زمانے تک جاری تھی جب کہ وہ برطانوی حکمرانی کے ماتحت آگئے تھے" نواب کے دور حکومت میں جو لوگ ہر جائداد کے ساتھ ملحق ہوتے تھے وہ زیادہ تر متعلق بہ اراضی

باب ۴ ۔ ۱۴

سمجھے جاتے تھے " اعظم گڑھ میں ادنیٰ ذات کے دیہاتیوں کو اب تک بھی اپنے زمیندار کے " بہت سے ذاتی خدمات بجالانا پڑتے تھے پچھلی حکومتوں کے ماتحت وہ غلامان اراضی تھے اب ہر چمار اپنے زمیندار پر فوجداری عدالت میں نالش کرسکتا ہے چنانچہ ہمارے سارے انتظامات میں زمینداروں کے لئے کوئی بات اسقدر پریشان کن اور تکلیف دہ نہیں ہے جسقدر یہ بات کہ ۔ کماؤں میں کوئی آزاد مزدور دستیاب نہیں ہوتا تھا ۔ لیکن " ہل چلانے والے غلاموں " اور گھریلو غلاموں میں امتیاز کیا جاتا تھا ۔ آسام میں بہت سے غلام مزدور موجود تھے لیکن زراعت میں کسی آزاد مزدور سے کام نہیں لیا جاتا تھا ۔ یہاں تک تو شمالی ہند کے بارے میں کہا گیا ۔ اب مدراس میں بورڈ آف ریونیو نے اطلاع دی ہے کہ " سارے ٹامل علاقے و نیز ملیبار[ل] اور کنارا میں مزدوری پیشہ طبقوں کا بہت بڑا حصہ زمانۂ قدیم سے مسلسل غلامی کی حالت میں رہتا چلا آیا ہے اور اس زمانے تک بھی اُن کی یہی حالت جاری ہے " پریزیڈنسی کے شمال میں غلامی کی موجودگی کا بورڈ کو کوئی علم نہیں تھا لیکن اراکین کمیشن کے پاس وہاں اس کی موجودگی کا یقین کرنے کی وجہ موجود تھی ۔ کورگ میں بھی قدیم زمانے سے غلامی موجود تھی ۔ بمبئی کے بارے میں جو شہادت قلمبند کی گئی وہ بہت ہی قلیل اور ناقابل اطمینان تھی تاہم اُس سے یہ انکشاف تو ہوا کہ سورت اور جنوبی مرہٹہ علاقے میں غلامی کا وجود تھا ۔

ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برطانوی حکمرانی قائم ہونے تک اور اس وجہ سے اکبر کے زمانے میں بھی غلاموں کا طبقہ ملک کی زرعی آبادی کا ایک معمولی جزو تھا ۔ اِس خیال کی مزید تصدیق بہ شکل غلّہ اجرت ادا کرنے کے طریقوں سے ہوتی ہے جو کہ گذشتہ صدی میں اسقدر کثرت کے ساتھ مروج تھے اور جو اب تک بھی پورے طور پر ناپید نہیں ہوے ہیں ۔ اِن طریقوں کی یہ توجیہ بالکل قرین عقل ہے کہ وہ اُس زمانے کے حالات سے قدرتی طور پر نمودار ہوے ہیں جبکہ ہر کاشتکار کو

[ل] باربوسا (صفحہ ۳۴۵) اور سولھویں و سترھویں صدی کے دوسرے مصنفین بھی ملیبار کے کاشتکاروں و نیز مزدوروں کو غلام کہتے ہیں ۔

باب ۳ محض اپنے غلاموں کو کھانا اور کپڑا دینا پڑتا تھا۔ کسی اور مفروضے کی بنا پر مشکل ہی سے ان طریقوں کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ موجودہ معاشرتی تعلقات بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں اور ہماری رائے میں یہ خیال حق بجانب ہے کہ اکبرؔ کے زمانے کی زرعی آبادی بھی آجکل کی طرح دیہاتی کاشتکاروں ۔ دستکاروں مزدوروں اور ادنیٰ ملازمین پر مشتمل تھی۔ البتہ خاص فرق یہ تھا کہ مزدوروں اور ملازمین کو اس زمانہ میں یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ اپنی مرضی سے جس آقا کو چاہیں پسند کریں۔ بلکہ وہ اسی کاشتکار یا انھیں کاشتکاروں کیلئے کام کرنے پر مجبور تھے جن کیساتھ وہ گاؤں کے رسم ورواج یا روایات کی بنا پر وابست کردیئے جاتے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ مجموعی آبادی کے لحاظ سے ان میں سے ہر طبقے کا ٹھیک تناسب کیا تھا اس کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے ۔ ممکن ہے کہ کاشتکار کم ہوں اور مزدور زیادہ۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خود کاشتکاروں کی تعداد بمقابل آجکل کے زیادہ ہو۔ اور بہرصورت ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں حق بجانب ہیں کہ کاشتکاروں اور مزدوروں کو ملاکر کام اور کام کرنیوالوں کے تناسب میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے ۔ ۱۱۵

اب ہمیں چاہیئے کہ زرعی آبادی کو بہ شکل اشیا جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو کاشتکاروں اور مزدوروں کے مابین پیداوار کی ٹھیک تقسیم سے بہت کچھ غیر متعلق ہے جہاں تک انسان کی سعی و محنت کا تعلق ہے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے کہ اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے ۔ چنانچہ وہ بہ حیثیت مجموعی وہی فصلیں انھیں طریقوں سے پیدا کرتا ہے اور غالباً کاروبار میں طاقت و قوت بھی اسی مقدار میں صرف کرتا ہے۔ پس اگر زرعی آبادی کی فی کس اوسط آمدنی[1] میں کوئی خاص تغیر واقع ہوا ہے تو اس کا سبب زمین کے حالات میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ آیا گذشتہ تین سو سال کی مدت میں زمین سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس میں بہت بڑا تغیر ہوگیا ہے یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فوری جواب دینے کے لئے رائے عامہ تیار ہے ۔ لیکن بعض اور معاملات کی طرح اس معاملے میں

[1] شاید یہ واضح کردینا مناسب ہے کہ اس عبارت اور اس قسم کی دوسری عبارتوں میں لفظ "آمدنی" سے مراد زرِ نقد نہیں بلکہ اشیا ہیں ۔

باب ۲

بھی رائے عامہ صحیح غور و خوض پر مبنی نہیں ہے۔ لہذا قبل اس کے ہم اس عام خیال کو کہ زرخیزی گھٹ گئی ہے تسلیم کریں چند ضروری فرق ذہن نشین کر لینا چاہئیں۔ اگر ایک طویل مدت پر نظر ڈالی جائے تو زمین کی اوسط پیداوار تین قسم کی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ (ا) اس کل مدت کے اندر زیر کاشت زمین کی زرخیزی کی تبدیلی (ب) مختلف اوقات میں زیر کاشت زمین کی خوبی کی تبدیلی یا (ج) فصلوں اور کاشت کے طریقوں کی تبدیلیاں۔ رائے عامہ نے ان عاملین میں سے صرف پہلے عامل کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہے اور اس بات کی مدعی ہے کہ اگر فی ایکڑ حساب کیا جائے تو زمین کی پیداوار پہلے سے گھٹ گئی ہے لیکن یہ دعویٰ کسی واقعی خارجی شہادت پر مبنی نہیں ہے اور رفتار "زرخیزی" کے متعلق جو کچھ علم حاصل ہے اس کے لحاظ سے وہ خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور مقامات کی طرح ہندوستان میں بھی کاشتکار ہمدرد سامعین سے ہمیشہ یہی کہینگے کہ ان کی زمین کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ اس قسم کے بیانات واقعی صورت حال کی شہادت نہیں ہو سکتے بلکہ وہ صرف بیان کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور جب تک کہ عہد زریں کی تلاش سنین ماضیہ میں کی جائے گی اس قسم کے بیانات برابر جاری رہیں گے۔ البتہ اگر زرعی پیدایش کی رفتار پر نظر ڈالی جائے تو ایسے بیانات کے لئے ایک طرح کا عذر دستیاب ہو سکتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی زمین زیر کاشت لائی جاتی ہے تو ابتدائی سالوں میں[1] اس کی پیداوار غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ ایک ادنیٰ سطح پر آ رہتی ہے اور جب تک کہ زراعت کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو وہ قریب قریب اُسی سطح پر قائم رہتی ہے۔ اب جس کاشتکار کی نظر جب اسی قدیم زمانے پر لگی رہیں جبکہ اس کی زمین غیر مستعمل حالت میں تھی وہ سچائی کے ساتھ

۱۱۶

---

[1] "ابتدائی سالوں" سے مراد پہلا یا دوسرا سال نہیں ہے جبکہ کھیتی باڑی کی ابتدائی دقتوں کی وجہ سے عام طور پر پیداوار کم حاصل ہوتی ہے بلکہ اُن سے مراد وہ چند سال ہیں جو ان دقتوں کے رفع ہونے کے بعد آتے ہیں۔ اکبر نے اپنے طریق تشخیص میں ان ابتدائی دقتوں کا لحاظ رکھا تھا۔ چنانچہ جس سال کوئی نئی زمین کھودی جاتی تھی تو اس سے برائے نام بہت ہی تھوڑی مالگزاری لی جاتی تھی۔ اور پانچویں سال میں کہیں پوری مالگزاری وصول کی جاتی تھی۔

باب ۴

یہ کہہ سکتا ہے کہ پیداوار پہلے سے کم ہے۔ کیونکہ یہ یقینی ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں ہندوستان کی تمام زمین اسی حالت میں تھی لہذا ہم یہ مانتے ہیں کہ اکبر کے آخری زمانے میں جو کچھ نئی زمین زیر کاشت لائی گئی تھی اس کی پیداوار اُسوقت بمقابل اُس زمانے کے بہت زیادہ تھی بشرطیکہ اس درمیانی زمانے میں کاشت متواتر جاری رہی ہو۔ دوسری طرف یہ بات بھی بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اُس زمانے میں جو زمین پہلے ہی سے باقاعدہ طور پر زیر کاشت تھی اس کی پیداوار انھیں حالات کے اندر قریب قریب یکساں رہی ہو لہذا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قدیم کاشت کے بیشتر حصے کی پیداوار میں تخفیف واقع ہوئی ہے بہت ہی صاف اور قطعی شہادت کی ضرورت ہے۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں لہذا ہمارا یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ زرخیزی میں کوئی نمایاں عام تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کلیئے سے وہ تخفیف مستثنیٰ ہے جو نتیجہ ہو اس بات کا کہ زمین اب تازہ یا غیر مستعملہ حالت میں نہیں ہے۔[1]

۱۱۷ جہاں تک دوسرے عامل کا تعلق ہے حالت بالکل مختلف ہے یا۔ اکبر کے بعد سے ہندوستان کے اکثر حصوں میں کاشت بہت پھیل گئی ہے۔ اور توسیع کاشت کا لازمی نتیجہ جبکہ قدیم وجدید کل رقبہ کو ملا لیا جائے اوسط پیداوار کی تخفیف ہے۔ کیونکہ بدیہی طور پر سب سے پہلے وہی زمین زیر کاشت لائی جاتی ہے جو بہترین ہوتی ہے اور ادنیٰ زمینوں کو لوگ صرف اسی وقت کاشت کرتے ہیں جبکہ بہترین زمین

---

[1] جو زمین اسقدر نشیبی ہو کہ اس کی مٹی بتدریج کم ہوتی جائے تو ایسی صورت میں زرخیزی کی تخفیف تیز رفتاری کے ساتھ ہوتی ہے۔ جہاں تک ایسی زمینوں کا تعلق ہے ہمارے مذکورۂ بالا نتیجہ میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس ترمیم سے ہمارے عام استدلال پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ ایک جگہ مٹی کم ہونے سے جو نقصان پہنچتا ہے دوسری جگہ کی زرخیزی بڑھنے سے اس کی تلافی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو ہر سال اچھی مٹی کثرت سے سمندر کو چلی جاتی ہے اور دوسری طرف بلند زمینوں کی مٹی بہ بہ کر نیچے آتی اور قابل رسائی مقامات پر جمتی جاتی ہے۔ جب زمین اسقدر خالی ہوجائے کہ قابل کاشت نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقیہ رقبہ کی اوسط پیداوار تو بڑھ جاتی لیکن مجموعی آمدنی میں تخفیف ہوجاتی ہے۔

باب ۱۴

ناکافی ثابت ہونے لگے ۔ پس ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ اوسط پیداوار کی تخفیف میں اس عامل کا بھی حصہ ہے ۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ حصہ کسقدر ہے اور اس عامل کی کیا اہمیت ہے اس کا سرسری اندازہ کرنے کی کوشش کریں گے اس غرض کے لئے ہم بھی اُس طریقے کی تقلید کریں گے جو اکبر نے تشخیص مالگزاری میں اختیار کیا تھا۔ اس طریقے کے مطابق زمین کے تین درجے قرار دیئے جاتے ہیں ۔ اعلیٰ ۔ اوسط ۔ ادنیٰ ۔ اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ہر شعبے کے اندر مساوی رقبہ شامل ہے ۔ اگر کسی خاص فصل کی پیداوار اعلیٰ زمین پر فی بیگہ ۱۲ من ۔ اوسط پر ۹ من اور ادنیٰ پر ۶ من مان لی جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ہر درجے کی زمین کا رقبہ مساوی ہے تو ایسی صورت میں اوسط پیداوار ۹ من ہوگی ۔ اگر کاشت ۲۰ فیصدی پھیل جائے اور یہ سب زمین ادنیٰ ہو تو اوسط گھٹکر ۸ء۵ من ہوجائے گا ۔ اگر توسیع ۳۳ فیصدی ہو تو اوسط ۸ء۲۵ ہوگا اگر ۵۰ فیصدی تو اوسط ۸ من ہوگا پس معلوم ہوا کہ کاشت کی معمولی توسیع سے (اور جیسا کہ ہم باب اول میں دیکھ آئے ہیں آگرے اور لاہور کے درمیان اس طرح کی توسیع قرین قیاس ہے) اوسط پیداوار میں کم وبیش ۱۰ فیصدی تخفیف ہوسکتی ہے اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ یہ فرض کرلیا جائے کہ جسقدر نئی زمین زیر کاشت لائی گئی ہے وہ سب کی سب ادنیٰ ترین درجہ کی ہے جن صورتوں میں توسیع بہت زیادہ ہوی ہے جیسی کہ بہار اور صوبہ جات متحدہ کے مشرق میں وہاں یہ مفروضہ ناقابل قبول ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ بے کار زمینوں کے بڑے بڑے رقبے صاف کرنے میں ہر درجے کی زمین نکل آئے گی اور اوسط کی تخفیف مقابلۃً بہت ہی کم ہوگی ۔ ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا اعداد محض بطور مثال کے پیش کئے گئے ہیں لیکن اگر ناظرین تکلیف اٹھاکر زراعت کے ممکنہ حالات کے مطابق ان میں کمی بیشی کریں اور اس طرح جو نتائج حاصل ہوں اُن سے عام رجحان کا پتا چلائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ اضافۂ کاشت کے مقابلے میں اوسط پیداوار کی تخفیف بہت ہی تھوڑی ہے ۔ بالفاظ دیگر ادنیٰ زمینوں پر توسیع کاشت کا اثر بیان کرنے میں مبالغہ آمیزی کا بہت زیادہ قرینہ ہے ۔ اوسط پیداوار میں اس کی وجہ سے تخفیف تو دراصل ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی کہ ایک سرسری

باب ۴

مشاہدہ کرنے والا فرض کرے گا۔

۱۱۸

اس کے برعکس تیسرے عامل یعنی فصلوں یا کاشت کے طریقوں کی تبدیلیوں کا اثر بہت زیادہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم صرف ایک مثال لے کر اس کو دیکھتے ہیں۔ فرض کرو کہ جب کاشت میں ۵۰ فیصد توسیع ہوجاتی ہے تو ایک نہر جاری کی جاتی ہے جس سے مجموعی رقبے کے ایک تہائی حصہ کی آبپاشی ہوتی ہے۔ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ حصہ پہلے خشک تھا۔ جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں توسیع کاشت بجائے خود پیداوار کو ۹ من سے گھٹا کر ۸ من کر دیگی لیکن مزید پانی کی بہم رسانی کی بدولت اس تخفیف کی ضرورت سے زائد تلافی ہوجائے گی اور ان اعداد کی بنا پر جدید اوسط تقریباً ۹½ من ہوجائیگا۔ اور اگر جیساکہ قرین قیاس ہے نہر کی بدولت طریق کاشت میں بھی اصلاح ہوجائے تو پھر اوسط پیداوار میں باوجود ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلنے کے بہت زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ ان مثالوں کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد اس واقعے کو نمایاں کرنا ہے کہ جو دور ہمارے زیر غور ہے اس میں دو متضاد قوتیں زمین کی اوسط پیداوار پر اپنا اپنا اثر ڈالتی رہی ہیں ایک طرف بڑے بڑے رقبوں پر کاشت پھیلنے سے تخفیف اوسط کی مقدار نسبتاً کم رہی ہے۔ دوسری طرف فصلوں اور بہم رسانی آب کی ترقی جن جن خطوں میں رونما ہوئی وہاں اوسط کی مقدار میں بہت کافی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ایسی حالت میں تمام ہندوستان کے بارے میں یوں ہی بلا تامل کوئی رائے قایم کرلینا اور یہ دعوی کرنا کہ اوسط پیداوار بڑھ گئی ہے یا گھٹ گئی ہے ایک خلاف عقل بات ہوگی البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان متضاد قوتوں کے نتائج ملک کے مختلف حصوں میں مختلف رہے ہیں۔ چنانچہ آیندہ فصل میں ہم ابھی مضمون پر مزید معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کریں گے تاکہ ملک کے جن جن حصوں کے بارے میں ضروری مواد میسر ہے وہاں زرعی کاروبار کی حالت کا زیادہ صحیح اندازہ ہوسکے۔

چوتھی فصل

خاص خاص مقامات میں زراعت کی حالت

ہندوستان کے خاص خاص حصوں میں زراعت کی حالت ظاہر کرنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ " بارہ صوبوں کی کیفیت " کا جو عنوان آئین اکبری میں شامل ہے اس کی ترتیب اختیار کی جائے۔ یہی ایک ایسی کیفیت ہے جو باوجود اپنے تمام نقائص اور خامیوں کے کسیقدر باقاعدہ کہی جا سکتی ہے اور جس سے زیادہ باقاعدہ ہمیں ابتک کوئی کیفیت نہیں مل سکی سب سے پہلا صوبہ جس کی حالت بیان کی گئی ہے وہ بنگال اور اوڑیسہ ہے اور اس کے بارے میں ابوالفضل نے صرف اسقدر کہا ہے کہ چاول کی پیدا وار سب پر غالب ہوتی تھی اور فصلیں ہمیشہ بہت افراط سے تیار ہوتی تھیں اور یہ ایک ایسی اطلاع ہے جو بڑی حد تک آجکل کے مروجہ حالات کے مطابق ہے۔ دوسرے ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گنّا ایک عام اور قیمتی فصل تھی جیسا کہ اب تک ہے۔ لیکن اِن واقعات سے آگے ہمیں کوئی ٹھیک اطلاع نہیں ملتی۔ اور جہاں تک آبادی کی تعداد کا ہمیں علم ہے وہ رقبۂ زیر کاشت کے اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں اسقدر مبہم ہے کہ اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ بہرحال اسقدر یقینی ہے کہ مکا اور تمباکو کو اُن کی موجودہ اہمیت اکبر کے زمانے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اور جہاں تک جوٹ کی فصل کا تعلق ہے اس کے رقبے کی توسیع اور اس کی قدر کا اضافہ اس قدر حال کی باتیں ہیں کہ ہم فوراً ان کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کسی ہمعصر مصنف نے اس ریشے کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ اکبر کے زمانے میں اس کی کاشت ہوتی ہوگی۔ کیونکہ ابوالفضل کہتا ہے کہ جو مقام اب ضلع رنگپور کہلاتا ہے وہاں ایک قسم کا " ٹاٹ " تیار ہوتا تھا۔ اور چونکہ انیسویں صدی کے آغاز تک بھی سن کے کپڑے غریب طبقوں کی معمولی پوشاک تھے لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ کپڑے بنانے میں مستعمل ہوتا تھا۔

۱۱۹

باب ۴

لیکن ایک ایک ادنیٰ درجے کے ریشے سے ترقی کرتے کرتے جو کہ مقامی صرف کے لئے پیدا کیا جاتا تھا دنیا کی خاص خاص اشیائے تجارت میں اُس کا شامل ہو جانا اِس صوبے کی زرعی تاریخ میں ایک بہت ہی نمایاں واقعہ ہے۔ اور اِس بات میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ اِس تبدیلی کی بدولت زرعی آبادی کی فی کس اوسط پیداوار میں بہت کافی اضافہ ہوا ہے۔

بہار کے حالات سے تو اِس سے بھی زیادہ گہری تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے۔ آئین اکبری کے مندرجہ اعداد و شمار کے مطابق زیر کاشت رقبہ آجکل کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھا۔ بہ حیثیت مجموعی وہ غالباً کل صوبے کے پانچویں حصے سے زائد نہیں تھا اور یہ خیال کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں۔ کہ جو فصلیں پیدا کی جاتی تھیں وہ نسبتاً اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں۔ نیل کی کاشت تو درحقیقت مفقود تھی[1] اور آلو۔ تمباکو۔ یا مکا نہیں پیدا کئے جا سکتے تھے۔ لیکن خشخاش کثرت سے بوئی جاتی تھی اور (چانول کو چھوڑ کر) گیہوں۔ گنا اور روئی خاص خاص پیداواریں معلوم ہوتی ہیں۔ فنیچ کہتا ہے کہ روئی اور اس سے زیادہ شکر اور اُس سے بھی زیادہ افیون کی پٹنے سے برآمد ہوتی تھی۔ آئین اکبری میں گنّے کی افراط اور اعلیٰ درجے کی خاصیت کا ذکر ہے اور اگرچہ اس میں گیہوں کا کوئی ذکر نہیں ہے تاہم ہمیں یقین ہے کہ مغلوں کے دارالسلطنت کو اسی حصۂ ملک سے بہت زیادہ رسد حاصل ہوتی تھی۔ اس آخری نقطے کے متعلق کسیقدر تشریح کی ضرورت ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے جسقدر سیاح بنگال میں آئے اُن میں سے کسی نے بھی گیہوں کی بہت زیادہ افراط کو محسوس نہیں کیا لیکن ہندوستان کے دوسرے مقامات میں اکثر اہل نظر بنگال سے گیہوں آنے کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ سر تھامس رو مغلیہ دربار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " اس ملک کو کھانے کے لئے گیہوں اور چانول " بنگال سے ملتے ہیں۔ اور سورت کے کارندوں نے تقریباً اس زمانے میں یہ لکھا کہ " ہم

۱۲۰

[1] بہار میں نیل کی کاشت کی ترقی بالکل حال کی بابت ہے ملاحظہ امپیریل گزٹیر ۱۱۱ - ۰۷

باب۲ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کو گیہوں ۔ چانول اور شکر بنگال سے آتے ہیں "۔ ظاہر ہے کہ اس جملہ میں لفظ ہندوستان اپنے محدود معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے مراد محض مغربی ساحل ہے ۔ اب یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں[1] گیہوں کی کچھ مقدار برآمد کی غرض سے بنگال میں پیدا ہوتی ہو لیکن زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ گیہوں دراصل بہار سے آتا تھا اور دریا کے راستے سے ایک طرف آگرے کو اور دوسری، طرف بنگال کے بندرگاہوں کو پہنچایا جاتا تھا اب سورت کے کارندوں کو اس مقام کا نام تو نہیں معلوم ہوتا تھا جہاں گیہوں پیدا ہوتا تھا بلکہ وہ صرف اس مقام کا نام سنا کرتے ہوں گے جہاں سے دریائی سفر شروع ہوتا تھا ۔ لہذا ہمیں صرف یہ فرض کر لینا چاہئے کہ تھاسس رو نے اجمالی طور پر یہ سن لیا تھا کہ اشیائے خوراک کی رسد بنگال کی جانب سے آتی ہے[2] غرض اس کی جو کچھ بھی حقیقت ہو ہمارے خیال میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جو فصلیں پیدا کی جاتی تھیں اُن کی اوسط قدر آجکل سے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم برابر ضرور تھی ۔ اور یہ کہ فی ایکڑ اوسط پیداوار آجکل سے بہت زیادہ تھی کیونکہ جب بہت تھوڑا رقبہ زیر کاشت ہو تو زمین کی خوبی اوسطاً لازمی طور پر بہتر ہوتی ہے ۔ لہذا گمان غالب یہ ہے کہ بہار میں فی کس پیداوار کا اوسط اب سے صریحاً بلند تھا ۔ گو مجموعی پیداوار مقابلۃً بہت ہی کم ہو ۔

مغلوں کے زمانے کا صوبہ الہ باد آجکل کے صوبجات متحدہ کے مشرقی اضلاع سے کم وبیش منطبق ہوتا ہے جو کہ اب ایک خاص طور پر گنجان رقبہ ہے ۔ اکبر کے زمانے میں جبکہ کاشت موجودہ معیار کے صرف تقریباً پانچویں حصے تک پہنچی تھی زمین یقیناً اسقدر گنجان طور پر آباد نہیں تھی ۔ اور اس لحاظ سے یہاں کے حالات بھی

---

[1] تقریباً نصف صدی بعد برنیر لکھتا ہے کہ بنگال میں مقامی صرف کے لئے اور جہازوں کو خوراک بہم پہنچانے کے لئے کافی گیہوں پیدا ہوتے تھے لیکن اس خیال کی تائید میں کہ وہاں برآمد کے لئے بھی کوئی بڑی مقدار رہتی تھی وہ کچھ نہیں کہتا ۔

[2] لفظ بنگال کے اس مبہم استعمال کی ایک مثال ہاکنس نے پٹنہ کی جو کیفیت بیان کی ہے اس میں ملتی ہے چنانچہ وہ اس شہر کو "بنگال کی سرحد پر" واقع سمجھتا ہے چند سال بعد اسی شہر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تمام بنگالہ میں سب سے بڑا بازاری شہر ہے"

باب ۴ (۱۲)

بہار کے مروجہ حالات کے قریب قریب تھے۔ گو مالگزاری کے اعداد و شمار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں کی فصلیں مقابلۃً کم نفع بخش تھیں۔ آئین اکبری سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کی حالت اچھی تھی لیکن بجز جوار اور باجرے کی فصلوں کی عدم موجودگی کے جو اس حصۂ ملک میں اب بھی بہت کمیاب ہیں کوئی اور خاص بات اُس سے معلوم نہیں ہوتی۔ خوشحالی کے متعلق اس قسم کے عام اقوال چنداں قابل لحاظ نہیں ہوتے اور ہمیں علم نہیں ہے کہ آیا دوسرے ہمعصر اسناد میں بھی اس مضمون کا کوئی حوالہ دیا گیا ہو۔ بہرحال اسقدر تو یقینی ہے کہ ادنیٰ درجہ کی مٹی کے بڑے بڑے وسیع خطّے جو کہ اس حصۂ ملک کی ایک خصوصیت ہیں اکبر کے زمانے میں زیادہ تر بے کاشت تھے۔ اِن زمینوں کی پیداوار بہت تھوڑی ہے۔ اور اُن کے خارج ہوجانے سے اوسط پیداوار کی مقدار بہت زیادہ ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بہار کی طرح یہاں بھی اوسط غالباً اب سے زیادہ تھا۔

صوبۂ اودھ کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ یہاں بھی ابوالفضل یہی کہتا ہے کہ زراعت سرسبز تھی۔ لیکن وہ صرف چانول کی اعلیٰ قسموں کا جو کہ شمالی اضلاع میں حاصل ہوتے تھے ذکر کرتا ہے۔ کنوؤں کی آبپاشی کے عجیب و غریب انتظام کی طرف جو آجکل جنوبی اودھ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ابوالفضل نے کہیں کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ وہاں مکا کا وجود نہ تھا۔ اور مالگزاری کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ بمقابل سرمائی فصلوں مثلاً گیہوں کے چانول اور باجرا۔ جوار وغیرہ کی کہیں زیادہ اہمیت تھی۔ اِن قلیل معلومات سے کوئی خاص نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا۔ لیکن ہم یہ خیال کرنے پر مائل ہیں کہ اس صوبے کے اُن حصوں میں جہاں کاشت مدت سے جاری تھی پیداوار کا اوسط غالباً اب سے بھی کم تھا۔

مغلوں کے زمانے کے صوبہ آگرہ میں یکسانیت نہیں تھی کیونکہ اس میں کچھ حصہ تو گنگا کے میدان کا شامل تھا اور کچھ حصہ اُس علاقے کا بھی جو اب راجپوتانہ کہلاتا ہے۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لئے سہولت اسی میں ہے کہ اِس آخری رقبے کو نظرانداز کردیا جائے اور صرف شمالی حصے پر مع ملحقہ صوبۂ دہلی کے غور کیا جائے۔

باب ۲

اس خطے میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ قریب قریب ایک زرعی انقلاب کے مساوی ہیں۔ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں جو رقبہ اکبر کے زمانے میں کاشت کیا جاتا تھا وہ موجودہ معیار کے تقریباً تین چوتھائی تھا لیکن فصلیں نسبتاً ادنیٰ درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔ کسی خاص قابل لحاظ پیدائش کا نہ ابوالفضل ذکر کرتا ہے اور نہ کوئی اور مستند شخص۔ اور جب ہم اس واقعے پر نظر ڈالتے ہیں کہ گیہوں اور شکر کی درآمد مشرقی صوبوں سے ہوتی تھی تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس حصۂ ملک کی آجکل جو دو خاص اشیائے برآمد ہیں اُس زمانے میں وہ خود مقامی ضروریات کے لئے بھی ناکافی تھیں۔ اس تبدیلی کا باعث زیادہ تر نہروں کو سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی بدولت وہ تمام ترقیاں ممکن ہوسکیں جن پر آجکل اس خطے کا دار و مدار ہے۔ چنانچہ آجکل جہاں ہمیں گیہوں اور ایکھ کپاس اور مکا کے وسیع میدان نظر آتے ہیں وہاں پچھلے زمانے میں غالباً جوار باجرا۔ دالیں اور روغندار تخم خاص اور اہم پیداوار شمار ہوتی ہوں گی۔ بہ حیثیت مجموعی اس خطے کی پیداآوری کا کچھ اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ وہاں سے اکبر جو مالگزاری طلب کرتا تھا وہ فی بیگہ ۲۰ سے ۳۰ دام تک ہوتی تھی[1] حالانکہ الہ باد میں اوسط شرح ۵۰ دام سے زائد اور بہار میں غالباً ۶۰ دام سے بھی بہت زیادہ تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ شرحیں پیداوار کی قیمت کا تخمینہ کرنے کے بعد اُسی کے تناسب سے معین کی جاتی تھیں پس معلوم ہوا کہ محصول لگانے والوں کی نظر میں بنارس اور جونپور کے قریب ایک بیگہ کی پیداوار اتنی ہوتی تھی جتنی کہ آگرے اور سہارنپور کے درمیان دو بیگہ زمین کی۔ پس اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس خطے کی اوسط پیداوار اکبر کے بعد سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اور یہی نتیجہ گو شاید اسی حد تک نہیں تاہم ملحقہ صوبۂ لاہور کے

۱۲۲

[1] بعض بدیہی غلطیوں کو دور کرنے کے لئے یہ شرحیں ایک خاص طریقہ پر ترتیب دی گئی ہیں جس کی تشریح مولف کے ایک مضمون میں کی گئی ہے۔ اس مضمون کا عنوان "اکبر کی سلطنت کے زرعی اعداد و شمار" ہے اور اس کا حوالہ باب ۱ کی فہرست اسناد میں دیا گیا ہے۔ اگر ان شرحوں کا تخمینہ راست اُن اعداد و شمار سے کیا جائے تو مشرقی صوبوں کی موافقت میں اس سے بھی زیادہ بڑا فرق نظر آتا ہے۔

باب ہجم

بارے میں بھی صحیح ہے [1]

اس حد تک تو یہ ممکن ہے کہ اکبر کے زمانے میں زراعت کی حالت کا ایک عام تصور حاصل ہو جائے ۔ لیکن جب ہم اُس حصۂ ملک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اِن بڑے بڑے میدانوں کے جنوب میں واقع ہے تو پھر ہمارے ذرائع معلومات ناکافی ثابت ہونے لگتے ہیں ۔ اجمیر کے بارے میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ زراعت بہت خراب حالت میں تھی اور موسم سرما کی فصلیں شاید ہی پیدا کی جاتی تھیں ۔ پس قیاس یہ ہے کہ اس صورت میں اوسط پیداوار کوئی قابل لحاظ حد تک متغیر نہیں ہوی ہے ۔ مالوے کی حالت سے بھی غالباً کوئی تغیر ظاہر نہیں ہوتا ۔ کیونکہ اس کے موجودہ نظام زراعت کی قدامت ہر مشاہدہ کرنے والے کو نظر آتی ہے اور جو چند بیانات اس کے بارے میں ابوالفضل نے قلمبند کئے ہیں وہ اب بھی درحقیقت صحیح ہیں ۔ مغلوں کے زمانے کا صوبۂ برار گذشتہ دو صدیوں کے اندر ترقی کرتے کرتے روئی کا ایک وسیع خطہ بن گیا ہے ۔ لیکن ہمیں کوئی مواد ایسا نہیں ملا جس کی بنا پر اکبر کے زمانے میں اس خطے کی اوسط پیداوار کا سرسری اندازہ بھی کیا جا سکے ۔ اس کے برعکس گجرات میں کاشت یقیناً اعلیٰ پیمانے پر کی جاتی تھی ۔ لیکن یہاں بھی مقابلہ کے لئے مواد کی بے حد قلت ہے ۔ دکن اور وجیانگر کے بارے میں تو مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ ان مقامات کے لئے آئین اکبری سی کوئی چیز موجود نہیں ہے ۔ لہذا ہم اجمالی طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ آجکل وہاں سے جو خاص خاص پیداواریں حاصل ہوتی ہیں وہی اس زمانے میں بھی پیدا ہوتی تھیں ۔ تھیونوٹ نے دکن میں چانول اور روئی ہر جگہ اور ایکھ بعض بعض مقامات میں دیکھی ۔ اور

۱۲۴

---

[1] پہلے پہل ذرا مشکل سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس رقبہ میں ایسا بڑا تغیر واقع ہوا ہے لیکن درمیانی دور کی تاریخ سے اس صورت حال کی توضیح ہو جاتی ہے ۔ اٹھارھویں صدی کی سیاسی بدامنی کے دوران میں دہلی کے اطراف واکناف سے ملک کا قدیم نظام زراعت کلیتاً مٹ گیا ۔ اور برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک نے از سر نو آغاز کیا ۔ سنہ ۱۷۹۲ء کے قریب جو حالات موجود تھے ان کی نہایت واضح کیفیت ونڈنگ کے سفرنامۂ ہند میں درج ہے ۔

باب ۴ پرتگالی روایتوں[1] سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وجیانگر کی اونچی زمین سے چانول۔ روئی۔ جوار اور دوسرے اناج اور ایسی جن کے ناموں سے راوی ناواقف تھے حاصل ہوتے تھے۔ اور اس کے علاوہ ساحل پر ناریل اور ملیبار میں کالی مرچ کا ہم اکثر ذکر سنتے ہیں اس وسیع خطۂ ملک کے بارے میں ہم صرف اسقدر جانتے ہیں کہ (بجز ان چند پیداواروں کے جو بعد میں جاری کی گئیں جیسے کہ چھالیہ) یہاں نہ زراعت کے طریقوں میں کوئی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے اور نہ زرعی پیداواروں میں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا اوسط پیداوار بڑھ گئی ہے یا گھٹ گئی ہے۔ البتہ شمالی علاقوں میں جس قسم کے تغیرات کا حال ہم معلوم کر چکے ہیں اس کو پیش نظر رکھتے ہوے ہمیں ہرگز یہ نہیں فرض کرنا چاہئے کہ کسی رخ پر بھی حرکت یکساں ہوی ہوگی۔ شمال کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ متضاد قوتوں کے عملدرآمد کا نتیجہ ملک کے مختلف مقامات میں مختلف رہا ہے۔ شمالی ہند سے تو یقیناً زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے اور غالباً بنگال کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن درمیانی ملک کے تمام نہیں تو کم از کم اکثر حصے میں اوسط پیداوار بمقابل اکبر کے زمانے کے آجکل ادنی ہے۔ اور ان حدود کے اندر اندر مختلف دیہات یا پرگنے انفرادی طور پر غالباً مختلف طریقوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ یہ نتیجہ قرین عقل ہے کہ کم و بیش اسی قسم کی باتیں جنوب میں بھی واقع ہوئی ہیں۔ چنانچہ جہاں اسکے بعض حصے اوسطاً زیادہ زرخیز ہوگئے ہیں اس کے دوسرے حصے اپنی سابقہ حالت کے مقابلہ میں کم زرخیز ہوگئے ہیں۔

اسی تشریح کا آخری نتیجہ ٹھیک یا حسابی شکل میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔ ہم نہیں جانتے کہ سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان سے بہ شکل اشیاء کسقدر (۱۳۴) آمدنی حاصل ہوتی تھی لہذا اس کی مقدار کے بارے میں کوئی مستقل رائے ظاہر کرنا درست نہ ہوگا۔ لیکن جو مواد موجود ہے وہ ہمارے خیال میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر ملک پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو فی کس اوسط آجکل کی مقدار سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوسکتا۔ زراعت کے خاص خاص طریقے نہیں بدلے ہیں

---

[1] ان تذکروں کے ترجمہ میں (سیول صفحہ ۲۴۳، ۲۳۳) "ہندوستانی غلہ" کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جس پرتگالی اصطلاح کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے اس سے بلاشبہ جوار مراد ہے جیسا کہ ہم نے ضمیمہ ب میں واضح کیا ہے

باب۲

اور مقدار پیداوار پر اثر ڈالنے والے رجحانات کا عملدرآمد متضاد سمتوں میں ہوا ہے۔ ایک طرف تو کثیر اضافہ آبادی کا غیر مشتبہ واقعہ ہے جس کی وجہ سے اونیٰ درجے کی زمینوں کو کاشت کرنے کی ضرورت لاحق ہوی اور اس کی بدولت فی کس پیداوار کا اوسط گھٹ گیا۔ دوسری طرف نئی نئی اور زیادہ نفع بخش فصلیں جاری ہوئیں۔ آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ ہوا اور دیگر تفصیلی تغیرات رونما ہوے جن کی بدولت ملک کے بڑے بڑے حصوں کی اوسط آمدنی میں اس حد تک اضافہ ہوا کہ وہ اول الذکر رجحان کے عملدرآمد پر پردہ ڈالنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ ہم اپنے نتایج کو مقداروں کی شکل میں بیان نہیں کرسکتے تاہم یہ بدیہی ہے کہ فی الجملہ تغیر بہت بڑا نہیں ہے۔ ہندوستان کی زرعی آبادی کی پیدا کردہ اشیا کی شکل میں یہاں کی اوسط آمدنی آیا سابق سے کچھ زیادہ ہے یا کچھ کم یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق ہر منفرد شخص بجا طور پر ایک جداگانہ رائے قائم کرسکتا ہے لیکن جو کچھ مواد میسر ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقدار پیداوار میں کوئی بہت بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوی ہے۔ کاشتکاروں اور مزدوروں کو ملاکر لوگوں کی ایک معینہ تعداد اب بھی کم و بیش اتنی ہی مقدار پیداوار تیار کرتی ہے جتنی تعداد اکبرؔ کے زمانے میں پیدا کی جاتی تھی اور اگر پیدا کرنے والے اس قابل تھے کہ اپنی پیدا کردہ تمام مقدار خود صرف کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی معاشی حالت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوی ہے۔ لیکن اس مقام پر پہنچکر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ماحول پر بھی نظر ڈالیں اور یہ تحقیق کریں کہ دوسرے فریقوں کے مطالبات پورے کرنے کے بعد خام آمدنی کا کسقدر حصہ زرعی آبادی کے لئے بچ رہتا تھا۔

باب ۷

پانچویں فصل

ماحول کا اثر زراعت پر

یہاں تک تو ہم نے اس دور کی زراعت پر اس طریقے سے نظر ڈالی کہ گویا وہ بجائے خود ایک مکمل چیز تھی ۔ لیکن اب ہم کسی قدر وسعتِ نظر سے کام لیکر اُن تعلقات کا حال معلوم کریں گے جو کاشتکاروں اور قوم کے دوسرے طبقوں کے مابین قائم تھے اور یہ تحقیق کریں گے کہ سولھویں صدی میں اربابِ شہر اور نظم و نسق ۱۲۵ کے ذمہ دار کس حد تک اس کاروبار کی کامیابی میں مدد دیتے یا اس میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے ۔ دیدہ و دانستہ براہ راست اصلاحات کرنے کا حال میں جو یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی تو ہمیں اس زمانے میں توقع نہ رکھنی چاہئے کیونکہ وہ ایک خاص دورِ جدید کی چیز ہے ۔ اکبر کے زمانے میں نہ ایسے سائنس داں موجود تھے جو کاشتکاری کے مسائل کی تحقیق میں لگے ہوئے ہوں ۔ نہ ایسے ماہر انجنیر تھے جو کاشتکاروں کی ضروریات کے لایق آلات و اوزار تجویز کرنے میں مشغول ہوں ۔ اور نہ مالیات کے ایسے قابل افراد تھے جو اُن کے بازاروں کی تنظیم میں یا اُن کے لئے باآسانی سرمایہ بہم پہنچانے کی ترکیبیں نکالنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہوں ۔ اس قسم کی جد و جہد کی گنجائش ہی غالباً صرف ذرائع آبپاشی کی بہم رسانی تک محدود تھی اور اس بارے میں بھی ہمارا میلان اس خیال کی جانب ہے کہ گو اصولاً اس طرح کی جد و جہد کے فوائد تسلیم کئے جاتے تھے تاہم عملاً بہت کم کام کیا جاتا تھا ۔ اکبر نے اپنے صوبوں کے عاملوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ”تالاب ۔ کوئیں ۔ نالے ۔ باغات ۔ سرائیں اور دوسرے نیک کاموں کے سرانجام میں“ خاص طور پر چستی دکھائیں اور بلاشبہ اس کا یہ حکم حکومت کے بارے میں اس کا نصب العین ظاہر کرتا ہے ۔ مزید براں ابوالفضل اجمالی طور پر ذکر کرتا ہے

کہ "بہت سے کوئیں اور تالاب کھودے جارہے ہیں"۔ لیکن اُس کے سکوت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے کوئی خاص انتظام موجود نہیں تھا اور نہ کوئی مفصل قواعد وضوابط نافذ کئے گئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلطنت کے نظم ونسق کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس کے تحت ایسے عہدہ دار پیدا نہیں ہو سکتے تھے جو اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیں یا کوئی خاص جد وجہد ظاہر کریں اور گمان غالب یہ ہے کہ ایسے جو کچھ کام کئے بھی جاتے تھے وہ محض اتفاقی ہوتے تھے۔ اور جہاں کہیں کوئیں اور تالاب سرکاری خرچ سے بنائے جاتے تھے وہ معمولی کاشتکاروں کے ضروریات کے خیال سے نہیں بلکہ باشندگان شہر اور مسافروں کے آرام اور سہولت کی غرض سے تعمیر کئے جاتے تھے۔ اب جہاں تک دکن کی حکومتوں کا تعلق ہے ہمیں ایسا کوئی مواد نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس بارے میں وہاں کے حالات شمالی ہند کے حالات سے مختلف تھے۔ جنوب کے بارے میں مسٹر سیویل کا بیان ہے کہ سولھویں صدی کے نصف اول میں شاہنشاہ کرشنارایا اپنے دارالسلطنت کے گرد و نواح میں آبپاشی کی ترقی و اصلاح میں مشغول رہا۔ اور ممکن ہے کہ مرکزی حکومت کے زوال کے بعد وجیانگر کے بعض سرداروں نے اپنی اپنی جاگیروں کے فائدے کے لئے اس قسم کا طرز عمل اختیار کیا ہو۔ ڈیلا ویل نے منگلور کے قریب اولالا کے مقام کو جانے کی جو دلکش کیفیت بیان کی ہے اس کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ ملکہ ایک تالاب کی تعمیر کی نگرانی میں مشغول تھی۔ انفرادی کوششوں کی ایسی ہی مثالیں بلاشبہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ملتی ہیں لیکن ملک کے ضروریات کی باقاعدہ تکمیل کے لئے کوئی مستقل طرز عمل اختیار کیا گیا ہو اس کا کہیں پتا نہیں چلتا اور نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ذرائع کو ٹھیک حالت میں رکھنے کے لئے کوئی انتظام کیا جاتا تھا۔ ۱۲۶

اس کے بعد ہم یہ معلوم کریں گے کہ زراعت پر اُس زمانے کے طریق تجارت کا کیا اثر پڑتا تھا۔ زراعت کی خوشحالی کے لئے اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ آیا کاشتکار کی کھلے بازار تک رسائی ہوتی ہے اور وہ اپنی پیداوار کی خوبی کے مطابق قیمت پاسکتا ہے یا یہ کہ وہ کسی اجارہ دار کے چکر میں پھنسا ہوا ہے جس کی

باب ۲

خاص کوشش یہ ہوتی ہے کہ حتی الوسع ارزاں ترین قیمتوں پر خریدے ۔ یہ بات پورے طور پر واضح نہیں ہے کہ اکبر کے زمانے میں کاشتکار کس حد تک بازار کا محتاج تھا ۔ بعض مقامات میں وہ اپنی مالگزاری بہ شکل جنس ادا کرتا تھا اور ان صورتوں میں بازار کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی کیونکہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوگا اس کے پاس خرچ کرنے کو بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا ۔ لیکن کم از کم مغلیہ سلطنت میں نقد لین دین عام تھا[1] گو اس کی ٹھیک ٹھیک وسعت مشتبہ ہے اور نقد لین دین کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس موسم کی مجموعی پیداوار کے کم از کم ایک ثلث حصے کے لئے بازار تلاش کیا جائے ملک کے اندرونی نظام تجارت کی حالت تو بہت کچھ آجکل ہی کے طرح معلوم ہوتی ہے البتہ دو خاص فرق قابل لحاظ ہیں ؛ ایک تو یہ کہ نقل وحمل کا معاملہ زیادہ گراں اور خطرناک تھا جس سے تاجر خرید و فروخت کی قیمتوں میں بہت زیادہ فرق رکھتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ برآمد کی غرض سے خریدنے والے جن کی وجہ سے آجکل کاشتکاروں کی حالت بدیہی طور پر سدھر گئی ہے اُس زمانے میں ابھی نمودار نہیں ہوئے تھے[2] پس جس حد تک کاشتکار کو

۱۲۷

[1] دربار و صوبوں کی کیفیت ، مشمولہ آئین اکبری میں درج ہے کہ بنگال میں مالگزاری سکہ میں ادا کی جاتی تھی ۔ اور بہار میں کاشتکار زر ادا کرتا تھا جس سے مراد ہمارے خیال میں سکہ ہی ہے ۔ اجمیر میں نقد ادائیاں شاذ نہیں تھیں ؛ اور جہاں تک بقیہ صوبوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مقامی عہدہ داروں کو اپنے محاصل کا حساب مقررہ شرحوں کے مطابق بہ شکل نقد دینا پڑتا تھا لہذا یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ وہ بہ شکل جنس ادائی مالگزاری کو پسند کرتے ہوں گے ۔ الا اُس صورت کے جبکہ فروخت کے نقصان کا خطرہ کاشتکار پر پڑتا ہو ۔

[2] براہ راست کاشتکاروں سے خریدنے کا طریقہ کلیتہً معدوم نہیں تھا ۔ کیونکہ ۱۶۱۴ء میں نکولاس وِٹھنگٹن ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے آگرہ کے قرب وجوار کے دیہات سے نیل خریدتا تھا لیکن جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے نیل ہی غالباً ایک ایسی پیداوار تھی جو یورپ کو برآمد کرنے کے لئے طلب کی جاتی تھی ۔ اور اس طریقہ سے کاشتکاروں کی صرف تھوڑی سی تعداد کو سروکار تھا ۔ اناج روغندار تخم ۔ اور ریشے ان چیزوں کی براہ راست خریداری برآمد کی غرض سے بہت ہی حال حال کی ایجاد ہے ۔

باب ۴

پیداوار فروخت کرنا پڑتی تھی اس کا مدار ایک ایسے طریقے پر تھا جو اُس کے حق میں موجودہ طریقے سے بھی جو کہ ترقی زراعت میں بجا طور پر ایک بہت بڑی رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے زیادہ ناموافق تھا۔ اُس طریقے کے تحت اضافۂ قیمت کا فائدہ تو سب سے آخر میں کاشتکار کو پہنچتا تھا لیکن تخفیف قیمت کا نقصان سب سے پہلے اسی کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ کمی بیشیاں جسقدر بڑی اور جسقدر کثرت کے ساتھ واقع ہوتی تھیں اسی قدر کاشتکار کی حالت ابتر ہوتی تھی۔ ہمیں ایسا کوئی مواد نہیں ملا جس سے براہ راست اکبرؔ کے زمانے میں مقامی بازاروں کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکے۔ تاہم ہمارے خیال میں یہ نتیجہ قرین عقل ہے کہ قیمتوں کی کمی بیشیاں سولھویں صدی میں بھی اسی قدر زیادہ تھیں جس قدر کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں جبکہ ملک کے بازار ذریعۂ آمدورفت کی ترقی کی بدولت ابھی ایک نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر تھیوڈور مارلین نے اپنی کتاب (ایک ہندوستانی صوبہ کی صنعتی تنظیم) کی بارھویں فصل میں نہایت واضح طور پر وہ حالات بیان کئے ہیں جو اُس زمانے میں عام تھے۔ لہٰذا اگر اُن کے بیان کردہ اعداد کا مطالعہ کیا جائے تو ان کاشتکاروں کی حالت کا بہترین اندازہ ہو سکتا ہے جنھیں اپنی پیداوار فروخت کرنا پڑتی تھی اور جن کے پاس مقامی تاجروں کی پیش کردہ قیمتیں قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

پس معمولی حالات میں تو کاشتکار کو اپنے ماحول سے کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی تھی۔ لیکن بارش کی کمی سے زراعت کی ابتری اور عام تنگی و تکلیف کے جو غیر معمولی دور آتے تھے ان کے متعلق بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سولھویں اور سترھویں صدیوں کے اثناء میں ہندوستان کے اکثر حصے کسی نہ کسی وقت ضرور قحط زدہ رہتے تھے[۱] اور اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس درمیانی دور میں ہندوستان کی آب و ہوا میں کوئی خاص تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ لیکن ان دو عہدوں میں قحطوں کی کثرت کا باہمی موازنہ کرنا

[۱] قلمبند شدہ قحطوں کی ایک فہرست مسٹر لفڈے کی تصنیف موسومہ "ہندوستانی قحطوں کی تاریخ و معاشیات (۱۹۱۴ء)" کے ضمیمۂ الف میں دی ہوئی ہے۔

ممکن نہیں ہے کیونکہ اس مدت میں لفظ قحط کے معنی ہی متغیر ہو گئے ہیں۔ آجکل قحط سے مراد ایسا زمانہ ہے جبکہ مصیبت اس حد تک پہنچ جائے کہ سرکاری مداخلت کی ضرورت لاحق ہو۔ لیکن اگر سولھویں صدی کے واقعہ نگاروں پر بھروسہ کیا جائے تو اُس دور میں قحط سے مراد ایسا زمانہ ہوتا تھا جبکہ مرد اور عورتیں بھوک کے مارے انسانوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ بدآیونی ۱۵۵۵ء کے قحط کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ: "مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے اس واقعے کو دیکھا کہ لوگ اپنے ہی ہم جنسوں کو کھاتے تھے۔ اور قحط کے ستائے ہوؤں کا نظارہ اسقدر مہیب تھا کہ بہ مشکل کوئی ان کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ ایک طرف بارش کی قلت۔ قحط اور بربادی۔ دوسری طرف متواتر دو سال تک جنگ و جدل کا سلسلہ، المختصر سارا ملک ایک ویرانہ بن گیا تھا اور کاشت کرنے کے لئے کوئی کسان باقی نہ رہا تھا"۔ اُس زمانے کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ "لوگ ایک دوسرے کو کھا جانے کی حد تک پہنچ گئے تھے"۔ اور بعد ازاں ۱۵۹۶ء کے قحط کے متعلق بھی یہی علم ہوا ہے کہ لوگ آپس ہی میں ایکدوسرے کو کھاتے تھے اور گلی کوچے مُردوں سے پٹے پڑے رہتے تھے۔ اکبر نے اس آخری موقع پر مصیبت زدوں کو مدد پہنچانے کی کوشش کی لیکن اُس زمانے کی تنظیم کے تحت غالباً اِس سے زیادہ کچھ ممکن نہ تھا کہ قصبوں اور شہروں میں قحط زدہ لوگوں کے لئے غذا بہم پہنچائی جائے۔ اور ان بار بار آنے والی آفتوں کے اثر سے زراعت میں لازمی ایسی ابتری پھیلتی ہو گی کہ اس زمانے میں مشکل ہی سے اس کا تصور کیا جاسکتا ہے مزید براں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وقائع نگار صرف انتہائی مصیبتوں ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ معمولی طور پر جو ناموافق موسم اکثر واقع ہوتے تھے ان کا ذکر کرنا وہ بے سود خیال کرتے تھے حالانکہ اگر یہی ناموافق موسم اس زمانے میں نمودار ہوں تو مدد بہم پہنچانے کی مختلف تدبیریں اختیار کی جائیں۔ لہٰذا ان کے سکوت کو اس بات کا ثبوت نہیں سمجھنا چاہئے کہ کوئی ناگوار صورت حال موجود ہی نہ تھی غرض زرعی کاروبار کی حالت کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے وقت نہ صرف انتہائی قسم کے اتفاقی حوادث کا جبکہ کثیر الوقوع مقامی یا

باب ۷

جزئی کمی پیداوار کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے اور یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ مصائب خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے کاشتکاروں کو ہمیشہ تن تنہا بلا امداد غیرے اُن کا بار اُٹھانا پڑتا تھا سوا اس کے کہ اس سے مالگزاری کے مطالبے میں تخفیف کر دی جائے۔

پس جہاں تک عملی تدبیروں کا تعلق ہے زراعت کی سرسبزی بڑھانے کے لئے قوم کے بقیہ طبقے تقریباً کچھ نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے برعکس کاشتکاروں کے پاس اس بات کی کافی وجہ موجود تھی کہ اہل شہر اور عہدہ داران حکومت[1] کے ساتھ میل جول قائم رکھنے سے احتراز کریں۔ خاصکر انھیں ملکیت زمین کے متعلق وہ جمعی حاصل نہیں تھی جو کاشتکاری کی کامیابی کے لئے شرط اولین ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس سوال پر کہ آیا کسی کاشتکار کو اپنے کھیت پر قابض رہنے کا قانونی حق حاصل ہے یا نہیں بہت طویل مباحثے ہوئے لیکن یہاں ہمیں قانونی حیثیت سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ معاملے کے عملی پہلو کو دیکھنا ہے۔ آیا کاشتکاروں کو یہ بھروسہ تھا کہ وہ آرام و اطمینان سے رہ سکیں گے۔ یا دست اندازیاں دراصل اس کثرت سے واقع ہوتی تھیں جس سے ایک عام بے اطمینانی کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس بارے میں جو شہادت موجود ہے گو وہ بہ لحاظ مقدار بہت تھوڑی ہے تاہم صرف ایک واقعہ ایسا ہے جو اس بارے میں بالکل قطعی معلوم ہوتا ہے جہانگیر لکھتا ہے کہ اپنے دور حکومت کے آغاز ہی میں اس نے یہ حکم نافذ کیا کہ "شاہی زمینوں کے عہدہ دار اور جاگیر دار رعایا کی زمینیں بہ جبر نہ لیں اور انھیں اپنے طور پر کاشت نہ کریں۔" یہ حکم منجملہ ان احکام کے ہے جن کا منشا عوام کی شکایتیں رفع کرنا تھا۔ جہانگیر کے نظم ونسق کی بابت جو کچھ واقفیت ہمیں حاصل ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرض کرنا حق بہ جانب ہوگا کہ اس حکم کا اثر بہت ہی خفیف اور محض عارضی رہا ہوگا

۱۲۹

---

[1] زرعی کاروبار کے معمولی خطرات کی ایک ادنیٰ مثال کے لئے ٹیورنیر کی رائے کا اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے صفحہ ۱۹۷ پر وہ رقم طراز ہے کہ دہلی میں سرکاری ہاتھیوں کی کثیر تعداد درختوں کی شاخیں، نیشکر، باجوار و باجرا وغیرہ چرنے کے لئے ہر روز باہر لائی جاتی تھی۔ جس سے کاشتکاروں کا بہت نقصان ہوتا تھا۔ چنانچہ نقل وحمل کے سرکاری جانوروں کے لئے مفت خوراک بہم پہنچانے کی روایت یہاں و نیز ملک کے دوسرے حصوں میں بدقسمتی سے اب تک موجود ہے۔

باب۶ لیکن اس سے ہمیں اس بات کا تو ضرور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شکایت اسقدر حقیقی اور عام تھی کہ ایک نئے شاہنشاہ کو جو رعایا کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اُس کی طرف توجہ کرنی پڑی ۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس حکم کا اطلاق تمام زمینوں پر تھا خواہ وہ براہ راست بادشاہ کے زیر انتظام ہوں یا جاگیر کے طور پر دوسروں کو عطا کی گئی ہوں ۔ پس ہم بے کھٹکے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کاشتکاروں کو اپنی زمین چھن جانے کا ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا اور ڈی لیٹ کے بیان سے بھی اس نتیجے کی بہت کافی تصدیق ہوتی ہے چند مشہور جاگیرداروں کا قبضہ چھن جانے کی کیفیت بیان کرتے ہوے وہ لکھتا ہے کہ عوام بے حد پریشان کئے جاتے تھے ۔ بسا اوقات انھیں ہر موسم میں اپنی زمینیں بدلنی پڑتی تھیں ۔ کبھی تو اس وجہ سے کہ حکومت اس کو چاہتی تھی اور کبھی اس وجہ سے کہ اس زمین کا کسی اور کو دیا جانا مقصود ہوتا تھا ۔ نتیجہ یہ کہ سارے ملک میں کاشتکاری کا کاروبار ناقص رہ جاتا تھا ۔ جو گاؤں انتظامی عہدہ داروں کے مستقر سے دور ہوتے تھے یا جن کھیتوں میں کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی تھی وہاں البتہ دست اندازی کا خطرہ کم رہتا تھا ۔ لیکن جو کوئی خاص محنت کر کے اپنی زمین کو اوسط پیداآوری کی سطح سے بلند کرنا چاہتا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کوئی حریص عہدہ دار یا جاگیردار اتفاقاً اس کے پڑوس میں آ جائے تو پھر اس کی ملکیت کا دارومدار اس کے رحم و کرم پر ہوگا ظاہر ہے کہ اس قسم کا احساس ہی بجائے خود زراعت کی نفع بخش ترقی کے لئے مہلک تھا ۔ منڈی اور برنیر جیسے دور ما بعد ۱۳۰ کے سیاحوں کے مشاہدات سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں زراعت درحقیقت غیر ترقی یافتہ حالت میں تھی ۔ چنانچہ اول الذکر کا بیان ہے کہ "آگرے کے قریب کاشتکاروں سے ویسا ہی سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ ترک عیسائیوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں ، " جو کچھ وہ اپنی محنت سے حاصل کر سکتے تھے وہ سب ان سے چھین لیا جاتا تھا حتی کہ بجز مٹی کی دیواروں اور پھوس کی چھتوں والے مکانات اور چند مویشیوں کے جن سے وہ ہل چلا سکیں ان کے پاس اور کچھ نہیں رہتا تھا ۔" برنیر بیان کرتا ہے کہ عہدہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم کے باعث یہ عالم تھا کہ جب تک زبردستی نہ کی جائے زمینوں پر شاذ و نادر ہی ہل چلایا جاتا تھا نہ تو نالوں کی

باب ۲

مرمت ہی کر سکتا تھا اور نہ اس کا خواہشمند ہی تھا۔ اور سارے ملک میں نہایت ناقص کاشت ہوتی تھی۔ یا بالفاظ دیگر ملکیت زمین کی بے اطمینانی کے قدرتی نتائج بالکل بدیہی تھے۔ اس شہادت کا اطلاق صرف سلطنت مغلیہ پر ہوتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دکن کی حکومتوں اور وجیانگر میں حالات زیادہ موافق رہے ہوں لیکن ان علاقوں کی حالت کے متعلق ہمیں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ لہذا یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ملکیت زمین کے معاملے میں جنوب کے کاشتکاروں کو عملاً کچھ زیادہ اطمینان حاصل تھا۔

مختصر یہ کہ گرد و نواح کے حالات کا اثر زراعت کی ترقی کے لئے بہ حیثیت مجموعی بدیہی طور پر ناموافق تھا۔ قوم کے دوسرے طبقوں سے کاشتکار کو بہت کم علی مدد حاصل ہوتی تھی۔ بازار کے ساتھ اُس کے تعلقات ہمیشہ اس کے حق میں نقصان دہ ہوتے تھے۔ اور اولوالعزمی کا جو کچھ میلان موجود بھی تھا وہ نظم و نسق کی نوعیت کے باعث بے نتیجہ تھا۔ اس کے بعد ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کاشتکار کی آمدنی کا کتنا حصہ ایسا ہوتا تھا جس کی قوم مدعی ہوتی تھی۔ اس باب کی پہلی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکبر مجموعی پیداوار کے ایک ثلث کے برابر حصہ طلب کرتا تھا۔ اور یہ کہ جنوب میں اس حصے کی نسبت یقیناً اس سے زیادہ تھی گو اس کی ٹھیک مقدار معلوم نہیں کی جا سکتی۔ اکبر کا مطلوبہ حصہ ہی بجائے خود بہت زیادہ تھا[1] خواہ اس اُس کو ہندوؤں کی تقدیس

[1] جو ناظرین شمالی ہند کے حالات سے ناواقف ہیں ان کے فائدے کے لئے شرح لگان اور شرح مالگزاری کا فرق واضح کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا۔ آجکل آسامی کاشتکار لگان ادا کرتا ہے جس میں سے اس کا زمیندار مالگزاری ادا کرتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں بالعموم کوئی زمیندار نہیں تھا۔ اور کاشتکار مالگزاری راست سرکار کو ادا کرتا تھا۔ مالگزاری کے بار کا موازنہ کرتے وقت اگر ہم لگان اور مالگزاری کا مقابلہ کریں گے تو یہ ایک بدیہی غلطی ہوگی۔ لیکن موجودہ فصل میں ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ سرکار کو کیا آمدنی وصول ہوتی تھی بلکہ ہمارا تعلق اس سوال سے ہے کہ کاشتکار کو کسقدر ادا کرنا پڑتا تھا۔ لہذا ہمیں اکبر کی مالگزاری کا موازنہ اُس لگان سے کرنا ہے جو آجکل کے زمیندار وصول کرتے ہیں۔

باب۴
۱۳۱

کتابوں سے جانچا جائے یا اُس کے پیشرو مسلمان حکمرانوں کے معیار سے دیکھا جائے۔ ہندوؤں کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱/۶ سے ۱/۱۲ تک معقول حصہ تصور کیا جاتا تھا اگرچہ ضرورت کے وقت ایک چوتھائی بھی لیا جاسکتا تھا۔ مسلمان حکمرانوں کے مطالبات ایکدوسرے سے بہت ہی مختلف ہوتے تھے لیکن بالعموم اُن کی شرح اونی رکھی جاتی تھی اور جہاں تک علاءالدین خلجی کے نصف مطالبے کا تعلق ہے وہ ایک مستثنیٰ صورت تھی کیونکہ اس کا منشا حصول آمدنی نہیں تھا۔ وہ تو دراصل ایک انتظامی تجویز تھی جو بدیہی طور پر اس جامع نظام کا ایک جز و تھی جو" ہندوؤں کو پیسنے اور انہیں دولت وجائداد سے جو بدولی اور بغاوت کا گہوارہ ہوتے ہیں محروم کرنے کے لئے" قائم کیا گیا تھا۔ اکبر کی تشخیص میں اس طرح کا کوئی منشا مخفی نہیں تھا۔ بلکہ ہر شخص جو آجکل شمالی ہند میں لگان کی اوسط مقداروں سے واقف ہے اس کی سختی کو محسوس کرے گا۔ اور جن ناظرین کو یہ واقفیت حاصل نہیں ہے اُن کی خاطر اس معاملے میں کسیقدر تفصیل سے کام لینا خالی از منفعت نہ ہوگا۔ خاصکر اس لئے کہ جو مسئلہ اسوقت زیر بحث ہے اس کا تعلق سلطنت کی آبادی کے کثیر ترین حصے کی روزی سے ہے۔ و نیز اس لئے کہ جب اکبر کی تشخیص ہی اسقدر بلند تھی تو پھر ہندوستان کے بقیہ علاقے غالباً اس سے بھی زیادہ ادا کرتے ہوں گے۔

مالگزاری کا بار سب سے زیادہ توضیح کے ساتھ زر کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ روپیہ کی قوت خرید کے متعلق جن تخمینوں کا حال کسی پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے اسی کے مطابق جو کاشتکار ایک روپیہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو مغلیہ دارالسلطنت کے قرب وجوار میں ۱۲-۱۹۱۰ء کی قیمتوں کے معیار سے مختلف چیزوں کی حسب ذیل مقداریں پیش کرنی پڑتی تھیں۔ اناج سات گنے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ جیساکہ ہمیں معلوم ہوگا اکبر کی مالگزاری کی تعداد آجکل کی لگان سے قریب قریب دگنی تھی لہذا آجکل کی مالگزاری کے مقابلہ میں جو کہ نصف لگان سے بھی کم ہوتی ہے وہ گویا چار گنی زیادہ تھی۔

سے بھی زیادہ ۔ روغندار تخم تقریباً گیارہ گئے ۔ خام شکر تقریباً سات گنی یا روئی کی غالباً کسیقدر کمتر مقدار جو موجودہ مواد سے ٹھیک ٹھیک نہیں بتائی جاسکتی ۔ لہذا بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ہر کاشتکار کو ایک روپیہ کے عوض پیداوار کی اتنی مقدار دینی پڑتی تھی جتنی کہ قبل از جنگ سات روپیوں سے خریدی جاسکتی تھی اور جو مقامات دارالسلطنت سے کسیقدر فاصلے پر ہوتے تھے وہاں قیمتوں کا فرق غالباً اس سے بھی زیادہ ہوتا ہوگا ۔ پس اگر موازنہ کی غرض سے قوت خرید کا معیار سات قرار دیا جائے تو پھر ہم کاشتکار پر جو اوسط بار پڑتا تھا اُس کو سمجھ سکتے ہیں ۔ چنانچہ اس ۱۳۲ معیار کو استعمال کرنے سے اور الہ باد ۔ آگرہ ۔ دہلی ۔ ان تین صوبوں میں اکبر کی شروح مالگزاری کا اوسط نکالنے سے پتا چلتا ہے کہ فی ایکر[1] جو مقدار طلب کی جاتی تھی وہ ۱۰-۱۹۱۰ء کے زر کی شکل میں حسب ذیل تھی :۔

اکبر کے فی ایکر مطالبۂ مالگزاری کا تخمینہ موجودہ زر کی شکل میں۔

فصل	روپیہ
گیہوں	۱۷٫۰ سے ۲۰٫۰ تک
جو	۱۱٫۵ " ۱۳٫۵ "
چنا	۱۰٫۲۵ " ۱۲٫۰ "
جوار	۹٫۰ " ۱۰٫۵ "
باجرا	۷٫۲۵ " ۸٫۵ "
مانڈوا	۷٫۵ " ۸٫۷۵ "
ساواں	۳٫۷۵ " ۴٫۵ "

[1] اکبر کے بیگہ کی ٹھیک وسعت غیر یقینی ہے لیکن وہ ۰٫۵۳۸ ایکر اور ۰٫۶۲۵ ایکر کے بین بین تھا ۔ متن میں جو اعلیٰ اور ادنیٰ حدود دئے گئے ہیں وہ انہی اکثر و اقل مالیتوں پر مبنی ہیں ۔ قیاس یہ ہے کہ حقیقی مطالبہ حدود مندرجۂ متن کے مابین رہتا تھا کیونکہ بیگہ کی وسعت پر مستعملہ معیار ہائے پیمائش کے مقامی اختلافات کا اثر پڑتا تھا لیکن وہ چھوٹے اعداد سے نہیں بلکہ بڑے اعداد سے قریب تر نہ ہوتا تھا ۔ "اکبر کی سلطنت میں زرعی اعداد و شمار" کے عنوان سے پہلے باب کی اسناد کے تحت جس مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے ۔

باب ۶

فصل	روپیہ
السی	۸٫۵ سے ۱۰٫۲۵ تک
سرسوں	۹٫۰ " ۱۰٫۷۵ "
خشخاش	۳٫۲۵ " ۴٫۲۰ "
ایکھ (معمولی)	۳۶٫۰۵ " ۴۲٫۲۵ "
روئی	۲۶٫۰ " ۳۰٫۰ "
نیل	۴۳٫۷۵ " ۵۰٫۷۵ "

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ شرحیں فصل سے متعلق ہیں نہ کہ سال سے مثلاً اگر کوئی کاشتکار ادنیٰ درجہ کی فصل یعنی ساواں کاشت کرے تو وہ فی ایکڑ تقریباً ۴ روپیہ ادا کرے گا لیکن اگر وہ اس کے بعد چنے کی فصل بوئے تو اس کو باقی نصف سال میں مزید ۱۰ یا ۱۲ روپیہ ادا کرنے پڑیں گے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ زمانے میں ان اعداد کے مطابق لگان طلب کرنے کا خیال تک نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی زمیندار قانون کو پس پشت ڈالکر کسی غیر معمولی زرخیز اور وسایل والے گاؤں سے ایک مختصر زمانے کے لئے ان اعداد کے مطابق جبریہ طور پر لگان وصول کرے۔ لیکن یہ شرحیں مستثنیات سے نہیں ہیں بلکہ شمالی ہند کے ایک بڑے حصے کا اوسط ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عہدہ دار بندوبست اس زمانے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کرے گا کہ اپنی تشخیص کسی ایسی بنیاد پر مرتب کرے۔

مطالبات مالگزاری کا مزید فرق معلوم کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن علاقوں میں اکبرؔ کی شرحیں مروج تھیں وہاں جو فصلیں آجکل پیدا کی جاتی ہیں اُن پر اکبرؔ کی شرحوں کے مطابق کسقدر مالگزاری عائد ہوتی اس کا تخمینہ کیا جائے۔ یہ تخمینے اس قدر طویل ہیں کہ ان کی تفصیل نہیں دی جاسکتی لیکن بہ طور مثال کے میرٹھ ڈویژن کے چار بڑے بڑے اضلاع میں ۱۹۱۵-۱۶ء میں جو فصلیں پیدا کی جاتی تھیں اِن کے نتائج پیش نظر رکھتے ہیں۔ اگر ان اضلاع کی مالگزاری اسی طرح تشخیص کی جائے جس طرح کہ اکبرؔ کے زمانے میں قاعدہ تھا لیکن

۱۳۳

باب ۴

جس قدر مشتبہ امور ہوں وہ سب کاشتکار کے موافق تصور کئے جائیں [1] اور اس طرح نظری طور پر مالگزاری کی مقدار بہت کچھ گھٹا کر بیان کی جائے تو بھی زمین مقبوضہ کے فی ایکڑ کے لئے جو رقم یہ مغل بادشاہ طلب کرتا وہ موجودہ شرح لگان کے اوسط سے فی صدی حسب ذیل بڑھ جاتی ہے۔

ضلع	اکبر کی مالگزاری کا فیصد اضافہ
سہارنپور	۱۱۲
مظفر نگر	۹۹
میرٹھ	۸۸
بلند شہر	۸۶
چاروں اضلاع	۹۶

واضح رہے کہ ان اعلیٰ فیصدی اضافوں کا باعث کوئی مقامی سبب نہیں ہے اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اودھ کے ضلع اناؤ میں اضافہ کی تعداد ۹۷ ہے اور اگر شرق کی جانب اور آگے بڑھیں تو غازی پور میں اضافہ ۱۲۰ ہوتا ہے اور جونپور میں تو ۱۹۳ تک پہنچ جاتا ہے۔ غرض ہمارے خیال میں ان تخمینوں کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن جن مقامات میں دستور العمل کے مطابق مالگزاری مشخص کرنے کا طریق مروج تھا وہاں اکبر کے مطالبۂ مالگزاری کی مقدار زمانۂ موجودہ کے زمینداروں کے مطالبۂ لگان سے کم از کم دوگنی ہوتی تھی۔ دستور العمل سے

[1] یہ حسابات محض تخمینی ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اکبر کے بعد سے جو فصلیں جاری ہوی ہیں اُن کے لئے کوئی منظورہ شرحیں نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں ہم نے کسیقدر کمتر مالیت والی فصل کی شرح اختیار کی ہے مثلاً مکا کی مالیت قریب قریب جوار کی شرح سے مقرر کی گئی ہے۔ روئی کے لئے ہم نے اکبر کی شرحیں ترک کردیں کیونکہ اس میں یہ امکان ہے کہ اس فصل کی خوبی گھٹ گئی ہو اور اس کی مالیت گیہوں سے بھی کسی قدر کم مقرر کی ہے۔ اور جن صورتوں میں شرحیں خوبی کے ساتھ ساتھ بدلتی تھیں (مثلاً چانول اور ایکھ) وہاں ہم نے صرف ادنی شرح استعمال کی ہے تاکہ کسی غلطی کا اندیشہ نہ رہے۔

باب۳ اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ماتحت عہدہ داروں سے ساز باز کر کے مطالبے کی مقدار میں تخفیف کرا لینا ممکن تھا لیکن اُس صورت میں یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا اس طرح سے کاشتکار کو کوئی بڑی بچت ہوتی تھی یا نہیں ۔ ماتحت تو اُس زمانے میں بھی ویسے ہی ہوتے ہوں گے جیسے کہ ان کے موجودہ قائم مقام نظر آتے ہیں ۔ لہٰذا اس دھوکے بازی سے جس قدر تخفیف ہوتی تھی وہ تقریباً کُل یہی لوگ لیتے ہوں گے اور کاشتکار کے لئے صرف اتنی مقدار چھوڑتے ہوں گے جس سے اس کاروبار میں رہکر اس کی پرورش ہو سکے ۔

۱۳۴ ان تخمینوں میں وہ قانونی اور غیر قانونی ابواب جو کاشتکار اس زمانے میں ادا کرتا ہے شامل نہیں ہیں ۔ اِن کی ٹھیک ٹھیک مقدار دریافت نہیں کی جاسکتی۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ پہلے دور میں اسی قسم کی جو ادائیاں ہوتی تھیں اُن کے مقابلہ میں انھیں مجرا کر دیا جائے ۔ اکبر کے عائد کئے ہوئے عام ابواب میں سے کم از کم ایک چیز یعنی دس سیری کا تو ہمیں علم ہے جس کی بابتہ ہر زیر کاشت ایکر سے تقریباً ۲۲ پونڈ اناج وصول کیا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ ہم دیگر مقامی ابواب کا بھی ذکر سنتے ہیں مثلاً آگرے میں قلعے کی تعمیر کے مصارف اس کے قرب وجوار میں رہنے والوں پر عائد کئے گئے تھے فصلوں کی کیفیت قلمبند کرنے کے متعلق جو قواعد نافذ تھے ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر موسم میں پیمائش کرنے والے عہدہ داروں کی سربراہی کے لئے کاشتکاروں سے ابواب وصول کئے جاتے تھے[1]۔

[1] آئین اکبری (جلد ۲) میں ہم ضابطانہ اور جریبانہ کا حال پڑھتے ہیں جو تشخیص (ضبط) اور پیمائش (جریب) کرنے والے عہدہ داروں کو بطور محنتانہ ادا کئے جاتے تھے ۔ ممکن ہے کہ یہ محنتانے خزانہ سے ادا کئے جاتے ہوں لیکن ہمارے خیال میں زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ باشندوں سے وصول کئے جاتے تھے جریانہ کا لفظ صوبجات متحدہ کے بعض حصوں میں اب تک باقی ہے لیکن اب اس میں نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں: کاشتکاروں کے نزدیک جریانہ سے مراد آجکل ہر ایسا جرمانہ ہے جو حکومت کی طرف سے عائد کیا جائے۔ اور خواہ یہ صنعت دیدہ و دانستہ ہو یا بے خبری میں پیدا ہو گئی ہو ہمارے خیال میں اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ کاشتکار کے نزدیک اب تک بھی جریانہ سے مراد سرکاری عہدہ داروں کی بے جا اور جبری

باب ۵

اور بہر صورت اس بارے میں تو کوئی معقول شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ ''گاؤں والوں کی محنت پر زندگی بسر کرتے تھے''۔ چنانچہ آجکل بھی اس قسم کے عہدہ دار یہی توقع رکھتے ہیں جو زمینیں بہ طور جاگیر کے عطا کی جاتی تھیں وہاں غیر قانونی مطالبے غالباً اور بھی زیادہ ہوتے تھے خاصکر ان تدبیروں کے بعد سے جو اکبر نے اس طریقے کے گھٹانے کے لئے کی تھیں۔ ہاکنس جس نے بہ حیثیت ایک جاگیر دار کے (گو ناکامیاب ہی سہی) واقفیت حاصل کی تھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ غریبوں کو خوب نچوڑتے تھے تاکہ جاگیر جانے سے قبل جس قدر بھی مل سکے حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ جہانگیر کے اُن فرامین میں جو اُس نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر صادر کئے تھے اور جن کا ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں قسم قسم کے بار بیان کئے گئے ہیں ''جو ہر صوبے اور ضلع کے جاگیر داروں نے اپنے ذاتی نفع کے لئے عائد کر رکھے تھے''۔ کاشتکاروں کو مجموعی طور پر جو رقمیں ادا کرنی پڑتی تھیں ان کی ٹھیک ٹھیک مقدار تو ہم نہیں بتا سکتے لیکن ہم بجا طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ مجوزہ شرحوں کے مطابق مالگزاری کا جو تخمینہ ہوتا تھا اُس سے وہ بہت زیادہ تھیں۔ اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس کا تناسب کبھی کبھی تین چوتھائی پیداوار کے قریب قریب پہنچ جاتا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈی لینٹ نے یہی نسبت بیان کی ہے۔

زمینداروں کے زیر انتظام جو زمینیں ہوتی تھیں اُن پر کاشتکاروں کو کس قدر مطالبات ادا کرنا پڑتے تھے اس بارے میں ہمیں براہ راست کوئی خبر نہیں ملی ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ وہ اپنے اُن ساتھیوں سے جو جاگیرداروں کے تابع ہوتے تھے کسی قدر بہتر حالت میں تھے۔ جاگیر دار عام طور پر ایک اجنبی ہوتا تھا جس کو صرف اپنی جیب بھرنے سے سروکار ہوتا تھا۔ اس کے برعکس زمیندار کی اُس مقام میں دوامی حیثیت ہوتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ موروثی سلسلے یا فرقہ واری تعلق کی بنا پر ان سے وابستہ ہوتا تھا۔ مزید برآں

۱۳۵

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ وصول کیا بیان ہیں۔ اور جو جرمانہ از روئے قانون عائد کیا جائے اس کے متعلق بھی اس کی یہی رائے ہے۔

باب۶ اگر وہ کبھی باغی ہو جائے یا بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے جو اُس زمانے میں بہت زیادہ بعید از قیاس نہ تھا تو ایسے نازک وقت میں اُس کا دار و مدار انہیں کی تائید پر ہوتا تھا۔ لہٰذا گمان غالب یہ ہے کہ معمولی زمیندار اپنے کاشتکاروں سے مقابلۃً اچھا سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ اس خیال کی تائید اُس واقعے سے ہوتی ہے جو برنیر نے نصف صدی بعد اِن الفاظ میں قلمبند کیا ہے کہ "اکثر کاشتکار اس قدر مکروہ ظلم و ستم سے مایوس ہو کر گاؤں چھوڑ دیتے ہیں" اور بعض اوقات "کسی راجہ کے علاقہ میں بھاگ جاتے ہیں کیونکہ وہاں ان پر مظالم کم ہوتے ہیں اور مقابلۃً زیادہ آرام پانے کا موقع ملتا ہے۔" برنیر یہ بھی لکھتا ہے کہ اس طریقے سے کاشتکاروں کو کھو بیٹھنے کا جو خوف لگا ہوا تھا تو اس سے سلطنت مغلیہ کے عاملوں کے ظلم و ستم میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی اور اگرچہ اکبر سے زیادہ شاہجہاں کے دور میں ظلم و ستم کے لحاظ سے زیادہ خراب حالت تھی تاہم اب بھی ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ پہلے دور میں کم از کم بعض زمینداروں کی عملداری میں مظالم سے پناہ ملتی تھی۔

پس معلوم ہوا کہ سلطنت مغلیہ میں جہاں جہاں طریق دستور العمل کے مطابق تشخیص کی جاتی تھی وہاں کاشتکار کو اپنی خام آمدنی کا جو حصہ بہ شکل مالگزاری چھوڑ دینا پڑتا تھا وہ اُس مقدار سے کہیں زیادہ تھا جو آجکل اس کا جانشین بہ شکل لگان ادا کرتا ہے۔ اب رہے وہ صوبے جہاں دوسرے طریقوں کے مطابق تشخیص کی جاتی تھی۔ اِن میں سے سندھ کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہاں کاشتکار ایک ثلث پیداوار بہ شکل جنس ادا کرتے تھے۔ لیکن اجمیر میں جہاں نظم و نسق کافی موثر نہیں تھا اس شرح کے نصف سے بھی کم مالگزاری لی جاتی تھی۔ بنگال، برار اور خاندیش کی حالت غیر یقینی ہے۔ اِن علاقوں کا حال میں الحاق کیا گیا تھا اور تشخیص مالگزاری کے وہی قدیم طریقے برقرار رکھے گئے تھے جس کے یہ معنی ہوئے کہ یا تو تبدیلی سے کوئی زیادہ آمدنی نہیں ہو سکتی تھی یا فوری اضافہ سیاسی وجوہ سے خطرناک تصور کیا جاتا تھا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ اِن علاقوں میں مالگزاری کا بار بمقابل دستور العمل والے صوبوں کے ہلکا تھا لیکن بہت زیادہ ہلکا نہیں۔

باب ۲

لیکن اس بارے میں ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی حالت کے متعلق ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ ہے کہ مالگزاری کا مطالبہ اگر اُس کو خام پیداوار کے ایک حصے کی شکل میں پیش کیا جائے تو جنوب میں بمقابل شمال کے بہت کافی اعلیٰ تھا۔ جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دکن اور وجیانگر میں کاشتکاروں کی حالت غالباً مغلیہ علاقے سے بھی (۳۴) زیادہ ابتر تھی۔ پس ہماری تحقیق کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہوئے دیہاتی آبادی کی فی کس زرعی پیداوار کا اوسط تو غالباً آجکل کے اوسط سے بہت مختلف نہیں تھا لیکن کاشتکار کے تصرف کے لئے جو حصہ چھوڑا جاتا تھا وہ اوسطاً آجکل سے بہت کم ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی اتنی ہی خام آمدنی ایک اوسط درجے کے کاشتکار کے ہاتھ لگتی ہوگی جتنی کہ اب۔ لیکن اگر یہ صحیح بھی ہو تو اُس کو خاص اپنے استعمال کے لئے مقابلۃً بہت کم حصہ ملتا تھا۔

باب ۲

چھٹی فصل

دیہات میں زندگی کی حالت

زراعت کی حالت کے متعلق ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کا آئندہ بابوں میں پھر حوالہ دیا جائے گا لیکن اس وقت اس مضمون کو چھوڑنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو مرد اور عورتیں اس کاروبار میں مشغول رہتے تھے ان کی زندگیوں کے بارے میں ہم اپنے معلومات اکٹھا کرلیں۔ معمولی دیہاتی مزدور تو غالباً معمولی موسموں میں تقریباً اسی قدر خوش یا خستہ حال تھا جس قدر کہ وہ اب ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس کے ذرائع معاش کے متعلق کوئی براہ راست ہم عصر اطلاع قطعاً موجود نہیں ہے تاہم یہ فرض کرلینا خلاف احتیاط نہیں ہے کہ بہ حیثیت ایک غلام کے گذر اوقات کرنے کے لئے جو اقل مقدار ناگزیر تھی اس سے صرف کچھ ہی زیادہ اس کو ملجاتا تھا۔ البتہ ناموافق موسموں میں اُس کی حالت مقابلۃً بہت زیادہ ابتر ہوتی تھی۔ اب تو اس کو یقین رہتا ہے کہ اگر گھر پر کوئی کام کرنے کو نہ رہے تو کارہائے امدادی میں ضرور کوئی نوکری ملجائے گی۔ لیکن سولھویں بلکہ انیسویں صدی میں بھی بہت زمانے تک حالت یہ تھی کہ یا تو وہ گھر پر پڑا پڑا فاقے کرتا رہے یا سڑک کے کنارے یا کسی جنگل میں بھوکوں مرتا رہے۔ آیا اس کو اپنی حالت سدھارنے اور دنیا میں ترقی کرنے کا کوئی معقول موقع حاصل تھا یا نہیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں براہ راست کوئی شہادت موجود نہیں۔ بہ حیثیت ایک غلام کے اس کو تلاش معاش میں اپنا گاؤں چھوڑنے کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اور ہمارے خیال میں اُس کے آقا صرف اُسی حالت میں گاؤں چھوڑنے کی اجازت دیتے ہوں گے جب کہ مزدوروں کی تعداد گاؤں کے ضروریات سے زیادہ ہوجائے۔ عام محنت کی طلب یقیناً موجودہ زمانے سے بہت کم تھی۔ اُس زمانے میں نہ بڑی بڑی

باب ۴

فیکٹریاں تھیں اور نہ ریلیں اور بجز شہروں اور بندرگاہوں کے بازارِ محنت کی موجودگی کی بھی علامتیں نہیں پائی جاتیں۔ ہمارے خیال میں ایک تو گاؤں چھوڑنے کی وقّت تک اور دوسرے کسی اور جگہ کام ملنے کا شک ان باتوں کی وجہ سے کسی کو ترک وطن کی ہمت ہی نہیں پڑتی ہوگی۔ چنانچہ آجکل بھی زرعی مزدوروں میں جو غیر نقل پذیری نظر آتی ہے اس کی جڑیں اُن صدیوں کے اندر مضمر ہیں جبکہ کسی شخص کو اپنا گاؤں چھوڑ کر باہر جانے کی کوئی ترغیب نہیں تھی سوائے اس صورت کے جبکہ اُسے اپنے گاؤں میں روٹی میسر نہ آسکے۔

۱۳۷

البتہ یہ بالکل ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ہر مزدور ترقی کر کے کاشتکار کی حیثیت پر پہنچنے کی توقع رکھ سکتا ہو۔ اور زمانۂ جدید کے مزدوروں کی امیدیں بھی اُن کے اندیشوں کی طرح صدیوں کے تجربے پر مبنی ہوں۔ غلامی کی رپورٹ میں جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے اس امر کی شہادت موجود ہے کہ بعض حالات میں غلام مزدوروں کو قطعاتِ زمین پر قبضہ رکھنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ اور جب کسی اور جگہ ان کی محنت درکار نہیں ہوتی تھی تو وہ ان قطعات کو کاشت کر سکتے تھے۔ مزید براں اگر گذشتہ تین صدیوں کے اثنا میں لوگوں کا طرز ہی بدل گیا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ ہمارے خیال میں تو کسی معمولی گاؤں کے اندر۔ کم از کم شمالی یا متوسط ہند میں۔ کسی شخص کو بتدریج اپنے کھیت وسیع کرنے سے نہیں روکا جاتا ہوگا بشرطیکہ وہاں فالتو زمین موجود ہو اور محنت کی رسد کافی ہو۔ اسی قسم کی ترقی کے لئے ہر جگہ تو نہیں لیکن ہندوستان کے اکثر حصوں میں خالی قابل کاشت زمین کی موجودگی سے بڑی سہولت ملتی ہوگی۔ بلکہ ہم شاید یہ بھی فرض کر سکیں کہ متواتر موافق موسموں کی مدد سے ایک کفایت شعار آدمی فراہمی سرمایہ کی دقتوں پر بھی غالب آسکتا تھا۔ پس یہ ممکن ہے کہ ایک غیر معمولی مزدور کے لئے ترقی کا راستہ کھلا ہوا ہو لیکن اس بارے میں براہ راست کوئی شہادت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ جہاں تک معمولی مزدور کا تعلق ہے وہ جس حیثیت میں کہ پیدا ہوتا تھا۔ غالباً اسی پر قانع رہتا تھا جیسا کہ اب بھی بسا اوقات اس کی عادت ہے۔

باب ۳

جہاں تک درحقیقت زمین کاشت کرنے والے کا تعلق ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ معمولی موسموں میں اُس کی حالت بہ مقابل آجکل کے بہت زیادہ ابتر تھی بہرصورت کپڑوں ۔ اشیائے راحت اور تعیشات پر خرچ کرنے کے لئے اسے زر کی کم مقدار میسر تھی بلکہ ملک کے بعض حصوں میں تو اُسے کبھی کبھی غذا کی بھی کمی محسوس ہوتی ہوگی نا موافق موسموں میں اس کی حالت معمولی مزدور سے کسی طرح بہتر نہیں ہوتی تھی مصیبت کے زمانے میں دیہاتیوں کو کام سے لگا رکھنے یا جب مصیبت گذر جائے تو انھیں دوبارہ سابقہ حالت پر لانے کی کسی باقاعدہ کوشش کا کہیں کوئی نشان نہیں ہے ۔ چنانچہ جب خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جاتا تھا تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ سڑکوں یا جنگلوں کا راستہ لیں اور اپنا آخری اثاثہ یعنی اولاد بھی فروخت کر ڈالیں ۔ بہر صرف قحط ہی کی تنہا مصیبت نہیں تھی جبکہ کہ اندیشہ تھا جنگ وجدال اور بغاوتیں ہر وقت دیہات کی زندگی کو درہم برہم کرسکتی تھیں ۔ اس کے علاوہ سرکاری عہدہ داروں کا ظلم وستم خود کاشتکاروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا تھا ۔ لیکن یہ واضح رہے کہ کاشتکاروں کی زندگی کے صرف تاریک پہلو پر نظر ڈالنا غلطی ہوگی ۔ قحطوں اور دوسری مصیبتوں کے درمیانی وقفوں میں ایک کفایت شعار آدمی جو عہدہ داران مال کے ساتھ برتاؤ کرنے کی ترکیب سمجھتا ہو بتدریج اپنی حالت سدھار سکتا اور اپنے کھیت میں توسیع کرسکتا تھا تاکہ اسے آرام کی زندگی بسر کرنے کے لایق آمدنی حاصل ہو سکے ۔ اس کے علاوہ شدت کے زمانے میں زیادہ ہمت والے کم ناموافق حالات میں منتقل ہو سکتے تھے یا برنیر کے قول کے مطابق[1] "شہروں یا کیمپوں میں کوئی زیادہ قابل برداشت طریق معاش تلاش کر سکتے تھے"۔ لیکن ہر ممکنہ لحاظ کر لینے کے بعد بھی جو نتیجہ سب سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معمولی کاشتکار بمقابل آجکل کے بہت زیادہ ابتر حالت میں تھا ۔ اُسے اپنی موجودہ آمدنی کا مقابلۃً بڑا حصہ اپنے کاروبار کے شرکائے خفیہ کے حوالہ کرنا پڑتا تھا ۔ اور مستقبل کی غیر یقینی حالت کے باعث وہ

۱۳۸

---

[1] برنیر صفحہ ۲۰۵ -

باب ۴

کسی قسم کی اولو العزمی دکھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔
زمینداروں کی حالت کے متعلق کچھ زیادہ کہنا ناممکن ہے۔ جو زمیندار دربار میں نظر آتے اور کوئی خاص منصب حاصل کر لیتے تھے وہ تو دوسرے درباریوں اور عہدہ داروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جو زمیندار اپنی ہی علمداریوں کے اندر رہتے تھے اُن کی زندگی کی ذراسی جھلک بھی مشکل سے نظر آتی ہے۔ لہذا ہم صرف یہ قیاس دوڑا سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنے اُن جانشینوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہوں گے جو جدید خیالات پر اعتماد نہیں کرتے اور اپنے دیہاتی قدیم روایات برقرار رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اس صدی سے زیادہ گذشتہ صدی میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ بعض ان میں سے غالباً اپنے کاشتکاروں کو مدد دیکر اور ان کی پرورش کر کے بہت ہی قابل قدر معاشی خدمات انجام دیتے تھے اور بقیہ محض مفت خورے تھے۔ لیکن یہ کہنا ناممکن ہے کہ کونسا طبقہ زیادہ غالب تھا۔ ان کے عام طرز کے متعلق ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ سرکاری حلقوں میں بہت ہی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا[1]۔

[1] ابوالفضل لکھتا ہے کہ "ہندوستانی زمینداروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اخلاص و یک جہتی کا راستہ چھوڑ کر ہر جانب پر نظر رکھتے ہیں اور جو کوئی فاتح ہو یا زیادہ ہل چل کرے اس سے مل جاتے ہیں" (ترجمۂ اکبر نامہ ۲: ۹۶)۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ سیاسی معاملات میں ان کے طرز عمل پر کس حد تک معاشی مقاصد کا اثر پڑتا تھا۔

اسناد برائے باب چہارم

فصل ۱۔ شمالی ہند کے طریق مالگزاری کے متعلق آئین اکبری (ترجمہ جلد ۲) سے بہت کچھ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اِن معلومات پر مسٹر یوسف علی اور مولف نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل بابتہ جنوری ۱۹۱۸ء میں بحث کی ہے۔ اس کتاب میں جو کیفیت درج ہے وہ اُس مضمون پر مبنی ہے۔ اور تاریخ ہند کی بعض عام کتابوں میں جو باتیں لکھی ہیں اُن سے وہ بعض اہم تفصیلی امور میں مختلف ہے۔ جنوبی ہند کے حالات کے متعلق بہت کم راست شہادت میسر ہے اور اسی وجہ سے ہمیں ایسی اتفاقی اطلاعوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جیسی کہ سیویل (صفحہ ۳۷۳ و ۳۷۹) اور باربوسا (صفحہ ۲۰۹ و ۲۵۶) میں ملتی ہیں۔ ڈی لیٹ کا اقتباس صفحہ ۲۵ اپر ہے۔ زمین کاشت نہ کرنے کی بنا پر جو سزا دی جاتی تھی اس کی کیفیت "انگلش فیکٹریز ۱۶۳۰ء تا ۱۶۳۳ء"۔ صفحہ ۳۳۲ سے ماخوذ ہے۔

فصل ۲۔ زراعت کی رفتار کے متعلق جو مشاہدات ہیں وہ بالعموم منتشر اور جزئی ہیں۔ شمالی ہند کے بارے میں تو اکثر و بیشتر واقفیت آئین سے ماخوذ ہے (جلد ۲ اور "بارہ صوبوں کی کیفیت") بابر کے مشاہدات صفحہ ۲۸۴ پر شروع ہوتے ہیں۔ فنچ نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ اس کے جرنل مندرجہ پرچاس میں منتشر ہیں۔ ٹری کے لئے ملاحظہ ہو پرچاس ۲-۹-۱۴۶۸ و مابعد دکن کی کاشتکاری کے لئے ملاحظہ ہو گریشیا ڈی اورٹا صفحہ ۳۰۸ اور امپیریل گزیٹیر ۹-۳۰۸ سے مقابلہ کیا جائے۔ شمالی ہند کی فصلیں اور شرح مالگزاری آئین میں موجود ہیں (ترجمہ ۲-۷۰ تا ۱۱۴)۔ اور جنوب کے بارے میں یہی معلومات خاصکر گریشیا ڈی اورٹا اور سیویل سے ماخوذ ہیں۔ مکا وغیرہ کے لئے موافقت

باب ۲

آب و ہوا کے بارے میں ملاحظہ ہو ڈی گینڈ ول مختلف فصلوں کے تحت ۔ گوبر کو بہ طور ایندھن استعمال کرنے کا ذکر ڈی لیٹ (صفحہ ۱۱۶) اور منڈی (۲ - ۱۷) نے کیا ہے ۔

شمالی ہند میں آبپاشی کے متعلق جن مشاہدات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ پرچاس (۱ - ۴ - ۴۳۱ و ۵۱۹) اور بابر (۴۸۶) میں ملیں گے ۔ نہروں کی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو امپیریل گزیٹیر ۳ - ۳۱۶ و مابعد ۔ و نیز میجر کاٹون کا ایک مضمون جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل بابتہ مارچ ۱۸۳۳ء میں طبع ہوا ہے ۔ کوؤں اور ذخیرہ ہائے آب کا ذکر سیویل تھیونوٹ اور دوسری اسنادوں میں موجود ہے ۔

فصل ۳ ۔ اس فصل کے ابتدائی فقرات میں جن واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یا تو آئین اکبری سے ماخوذ ہیں یا جنوب کے بارے میں سیویل یا ہے جیسی اسناد سے ۔ لیکن اس کتاب کا استدلال خاص خاص واقعات کے بیان پر اسقدر مبنی نہیں ہے جس قدر کہ ان تمام مصنفین کے عام طرز عمل پر ۔ وسائل کی کمی کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ مندرجۂ ذیل اسناد میں ملیں گی، آئین اکبری (ترجمہ ۲ - ۱۴) ۔ ایلیٹ ۔ تاریخ (۵ - ۱۳۸) ۔ خطوط موصولہ (۲ - ۱۰۳ و ۱۴۲) میتھیوس کی کتاب صفحہ ۳۶ ۔ غلامی کے متعلقہ واقعات رپورٹ غلامی سے ماخوذ ہیں ۔ جو کوئی اصلی حالت معلوم کرنا چاہے ضروری ہے کہ وہ اس رپورٹ کو شروع سے آخر تک پڑھ جائے ۔ کتاب میں جو اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ صفحات ۳۸ - ۳۹ - ۹۳ - ۹۷ - ۱۱۳ - ۱۴۹ - ۱۵۷ سے ماخوذ ہیں ۔ غلاموں کی قانونی حیثیت کے بارے میں جو مقولہ ہے وہ میکناٹن کی کتاب ”اصول شرع وشاستر“ میں موجود ہے ۔

فصل ۴ ۔ اس فصل میں جو نتائج ہم نے استعمال کئے ہیں وہ ابوالفضل کے اعداد وشمار کی تنقیح کا ماحصل ہیں جن کا حوالہ باب ۱ کے تحت دیا جا چکا ہے ۔ اکثر و بیشتر واقعات کا بیان ”بارہ صوبوں کی کیفیت“ سے ماخوذ ہے ۔ (آئین ۔ ترجمہ جلد ۲) ۔ بنگال کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۱۲۱ تا ۱۲۳

باب ۴ (نیز امپیریل گزیٹیر ۳-۲۰۴) بہار کے لئے صفحہ ۱۵۱ (نیز فیتچ ور پر چاس ۲-۱۰
۱۷۳۲- زوا - ۲۱۸ - خطوط موصولہ ۴-۳۲۰) الہ آباد کے لئے صفحہ ۱۵۸
او دھ صفحہ ۱۷۱- آگرہ صفحہ ۱۷۹- دہلی صفحہ ۲۷۸- لاہور صفحہ ۳۱۲- اجمیر
صفحہ ۲۶۷- مالوہ صفحہ ۱۹۵- برار صفحہ ۲۲۹- گجرات صفحہ ۲۳۹- جنوبی ہند
کے لئے ملاحظہ ہو (مثلاً) تھیو نوٹ صفحہ ۲۱۹ و ۲۴۰ اور سیویل صفحہ ۲۳۷-
صفحہ ۱۴۰-

فصل ۵۔ کارہائے آبپاشی کے بارے میں ابوالفضل نے جو حوالے ہیں وہ آئین میں لیں گے (ترجمہ ۱-۲۲۲ اور ۲-۳۸)۔ جنوب میں آبپاشی کا حال معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو سیویل صفحہ ۱۶۲ اور ڈیلا ویل ۲-۳۳۸۔ منجملہ اور مصنفین کے منڈی ذکر کرتا ہے (۲-۴۸) کہ پانی کے ذخیرے اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع شاذ و نادر ہی مرمت کئے جاتے تھے۔ قحطوں کے بارے میں جو اقتباسات ہیں وہ ایلیٹ کی تاریخ سے ہیں (۵-۴۹۰ اور ۶-۱۹۳ و ۱۹۳)۔ اس مضمون کے متعلق مزید حوالے باب ۷۔ فصل ۴ کے تحت ملیں گے۔ معافی مالگزاری کے بارے میں اکبر کے احکام آئین میں موجود ہیں (ترجمہ ۲-۴۵)۔

جبری بے دخلی کی جو ممانعت جہانگیر نے کی وہ توزک میں مذکور ہے (۱-۹) اس بارے میں ڈی لیٹ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ صفحہ ۲۵ پر ہیں جن اشخاص کو زمینیں عطا کی جاتی تھیں ان کے مظالم کا حال تھیو نوٹ صفحہ ۱۴۵ اور برنیر ۲۲۶ میں موجود ہے۔ منڈی سے جو اقتباس نقل کیا گیا ہے وہ ۲-۶۳ سے ماخوذ ہے۔ مالگزاری کے متعلق علاء الدین کے مسلک کی توضیح ایلیٹ کی تاریخ میں کی گئی ہے (۳-۱۸۲)۔

روپے کی قوت خرید کے بارے میں ملاحظہ ہو مولف کا ایک مضمون مطبوعہ جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بابتہ اکتوبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۳۷۵ و مابعد۔ مالگزاری کی جو شرحیں تخمینوں میں استعمال کی گئی ہیں وہ آئین سے ماخوذ ہیں (ترجمہ ۲-۹۴ و مابعد)۔ زمانۂ حال کا سواد رپورٹ موسمہ

باب ۴

وفصل اور رپورٹ نظم ونسق مالگزاری صوبہ جات متحدہ بابتہ ۱۶-۱۹۱۵ء سے ماخوذ ہے۔ ابواب کے بارے میں ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۱-۲۷۵)۔ بدایونی ۲-۴۷۔ ہاکنس ورپرچاس ۱-۳-۲۲۱ اور توزک ۱-۷۔ کاشتکاروں کے ترک وطن کے متعلق ملاحظہ ہو برنیر صفحہ ۲۰۵ و ۲۳۱۔ سندھ اور اجمیر میں جن شرحوں سے مالگزاری وصول کی جاتی تھی وہ آئین میں مذکور ہیں (ترجمہ ۲-۳۴۸ و ۲۶۷)۔

پانچواں باب

غیر زرعی پیدائش

پہلی فصل

عام حالت

اندرونی پیدائش کے مقابلے میں بیرونی تجارت کا مطالعہ کرنا زمانۂ موجودہ میں بھی عام طور پر زیادہ آسان ہے۔ اور اگر یہی کیفیت سولھویں صدی کے ہندوستان کے بارے میں بھی ٹھیک ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ جن مصنفین سے ہمیں اپنی معلومات کا بہت بڑا حصہ حاصل ہوتا ہے ان کو خاص طور پر تجارت سے سروکار تھا اور وہ پیدائش کی طرف صرف اُسی حدتک اشارہ کرسکتے ہیں جس حدتک کہ اُس کے حالات کا اشیائے برآمد کی رسد پر اثر پڑتا تھا۔ پس ہمارے پاس اُس زمانے کی صنعتی حالت کی کوئی ہم عصر کیفیت ایسی موجود نہیں ہے جو مکمل یا قابل اطمینان کہلائی جاسکے۔ آئین اکبری میں ۱۲ بارہ صوبوں کی حالت کا جو عنوان شامل ہے وہ معدنی اور صنعتی پیدائش سے متعلق ہے لیکن اس سے جو واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی طرح مکمل نہیں ہے۔ اور ابوالفضل نے بھی بعض حالیہ مصنفین کی طرح صرف عجیب وغریب اور نادر اشیاء کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور جو پیداواریں عوام کے صرف میں آتی تھیں ان کو نظر انداز کردیا ہے۔ اسی طرح سیاحان یورپ بھی ملک کی بڑی پیداواروں کی طرف توجہ نہیں کرتے کیونکہ اُن کو زیادہ تر صرف چند چیزوں سے تعلق ہوتا تھا جو یورپ تک لے جانے کے بھاری مصارف برداشت کرسکتی تھیں۔ لہٰذا مختلف شعبہ جات پیدائش کی

باب ۸

اضافی اہمیت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا کلیتاً آسان کام نہیں ہے۔ آیندہ فصلوں میں ہم نے زیادہ تر اُن اشیا کی طرف توجہ منعطف کرنے کی کوشش کی ہے جو مقدار کے لحاظ سے اہم تھیں۔ کیونکہ وہ یا تو عوام کے صرف میں آتی تھیں یا ان پر تجارت برآمد کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ اسی غرض سے ہم نے نہایت آزادی کے ساتھ ان معلومات سے کام لیا ہے جو اندرونی صرف اور خارجی تجارت کے بارے میں یلسعر ہیں۔

۱۴۲

اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر قریب قریب خود پروری کا دور موجود تھا۔ اور اُس کی درآمد میں صرف چند دھاتیں اور خام پیداواریں اور ان کے علاوہ کثیر التعداد اشیائے تعیش شامل تھیں جو ایک بہت ہی قلیل حصہ آبادی کے استعمال کے لیے درکار ہوتی تھیں۔ خود پرور قوم کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں انھیں بعض مقامات میں اسقدر اہمیت دی جاتی ہے کہ شاید ابتدا ہی میں یہ کہدینا مناسب ہے کہ ہم نے یہ لفظ محض ایک معاشی واقعہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ اشارہ کرنا نہیں چاہتے کہ یہ واقعہ اچھا ہے یا بُرا۔ عام لوگ ملک میں پیدا کی ہوئی غذائیں کھاتے اور ملک ہی میں تیار کئے ہوے کپڑے پہنتے تھے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انھیں کھانے کے لئے کافی مقدار ملجاتی تھی یا یہ کہ جو کپڑے وہ پہنتے تھے وہ انھیں موسمی اثرات سے کافی طور پر محفوظ رکھتے تھے۔ موجودہ زمانے میں وہ اپنے کپڑوں کے لیے دنیا کے دوسرے حصوں کے زیادہ محتاج ہیں ممکن ہے یہ تبدیلی اچھی ہو یا بُری۔ اور بعض اوقات یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لیے اس قسم کے مباحث بالکل غیر متعلق ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اصطلاح ”خود پرور“ کس حد تک قابل اطلاق ہے۔ اس غرض سے ہم خاص خاص اشیائے صرف کو بہت ہی سرسری طور پر چند شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی خوراک۔ لباس۔ دھات کا سامان۔ اور تعیش یا نمایش کی چیزیں۔ اور پیدائش دولت کے لئے جو اشیاء درکار تھیں وہ پیداوار خام اور آلات یا مشنری میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ خوراک اور اشیائے متعلقہ خوراک جو عام لوگوں کو

باب۸ مطلوب ہوتی تھیں وہ سب ملک میں پیدا کی جاتی تھیں اگرچہ انکی مقدار جملہ ضروریات کی تکمیل کیلئے ہمیشہ کافی نہیں ہوتی تھی۔ اس عنوان کے تحت درآمد صرف میووں۔ مسالوں اور محرکات تک محدود تھی[1]۔ اسی طرح جملہ معمولی کپڑے بھی ہندوستان ہی میں بنائے جاتے تھے لیکن ریشم۔ مخمل اور بانات دنیا کے مختلف حصوں سے آتے تھے۔ اس کے برعکس دھاتوں کی بلاشبہ قلت تھی۔ دھات (۱۴۳) کا سامان تو تقریباً سب کا سب ملک میں بنایا جاتا تھا لیکن پیداوار خام زیادہ تر درآمد کی جاتی تھی جہاں تک تعیش یا نمائش کی چیزوں کا تعلق ہے گو ان کی بدولت بہت سے ہندوستانی دستکار کام سے لگ جاتے تھے تاہم چونکہ نئی چیزوں کا مذاق موجود تھا تقریباً ہر چیز جو باہر سے پہلی مرتبہ آتی تھی اس کے لیے بازار موجود ہوتا تھا گو اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ نہ تو وہ زیادہ وسیع ہو سکتا تھا اور نہ دیرپا[2]۔ اب جو چیزیں پیدائش دولت کے لیئے مطلوب ہوتی تھیں ان میں مشنری کا تو اس وقت کوئی سوال ہی نہ تھا اور آلات جو ہندوستان میں استعمال ہوتے تھے وہ زیادہ تر مقامی طور پر بنالیے جاتے تھے۔ درآمد والی خام پیداواروں میں

[1] مغلوں کو میووں کا جو شوق تھا اس کا تقریباً ہر ایک ہمعصر مستند مصنف نے ذکر کیا ہے۔ بابر تو خود بہ حیثیت ایک واقفکار کے ذکر کرتا ہے۔ جن ذرائع سے اکبر کے دربار میں میوے مہیا کئے جاتے تھے ان کی تفصیل آئین اکبری میں موجود ہے۔ جہانگیر کے خیالات تو زک سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پرتگالی یورپ سے شراب اور دیگر مسکرات لاتے تھے۔ اس کے علاوہ بر ما سے بھی بہت کچھ درآمد ہوتی تھی۔ اور کافی عرب سے آتی تھی۔ درآمد شدہ مصالحے اور غالباً دوسری قسم کے مصالحے بھی مغلوں کے باورچی خانوں میں بکثرت استعمال ہوتے تھے۔ مونگ اور دارچینی تو آئین اکبری کے مندرجہ تمام نسخوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

[2] اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انگریز تاجروں کو ابتدا میں بہت کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ تھوڑا سا مال جو بہ طور امتحان کے روانہ کیا جاتا وہ تو خوب منافعہ سے فروخت ہوتا تھا۔ لیکن جب دوسری مرتبہ وہی مال زیادہ مقدار میں بھیجا جاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ طلب پوری ہو چکی ہے اور اس کا فروخت کرنا مشکل ہوتا تھا۔ لیکن نادر و کمیاب چیزیں ہمیشہ قابل فروخت ہوتی تھیں یا تحفوں کے لیئے استعمال کی جاتی تھیں چنانچہ "خطوط موصولہ" کی جلدوں میں اکثر عجیب و غریب حوالے موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ انگریزی گتے۔ کمیاب شربت۔ گانے بجانے کے آلات

باب ۳

خام ریشم۔ ہاتھی دانت ۔ مرجان ۔ کچھوے کی ہڈی ۔ عنبر ۔ اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں ۔ ان کے علاوہ دھاتوں میں سونا اور چاندی ۔ سیسہ ۔ ٹین ۔ جست ۔ پارہ شامل تھے اور بعض مقامات میں تانبہ بھی ۔ سہاگا اور گندھک جیسی بعض معدنی پیداواریں بھی صنعتوں کے استعمال کے لیے درآمد کی جاتی تھیں ۔ لیکن ان چیزوں کو مستثنیٰ کر کے ہندوستان میں جس قدر صنعتیں جاری تھیں ان کا انحصار ملک ہی کی خام پیداواروں کی رسد پر تھا ۔ آئندہ فصلوں میں ہم دو قسم کی معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کریں گے ایک تو وہ جو زرعی پیداواروں کے علاوہ دوسری خام پیداواروں کو کام میں لانے سے متعلق ہیں ۔ اور دوسرے وہ جو ہر قسم کی اشیائے صرف مہیا کرنے والی صنعتوں سے متعلق ہیں ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ زنانی ٹوپیاں اور موزے اور اسی نوعیت کی دوسری اشیا جن کی اس زمانے میں تجارت کی جاتی تھی یہاں طلب کی جاتی تھیں ۔ مزید براں نئی نئی چیزوں کا شوق صرف مغلیہ دار السلطنت تک محدود نہیں تھا چنانچہ کسی پادری کے بیان سے جو تبے کی کتاب میں طبع ہوا ہے (صفحہ ۲۷۶ تا ۲۷۷) ظاہر ہوتا ہے کہ شاہنشاہ جہانگیر اور اس کے بڑے بڑے اُمرا شیشے کے صندوقچے سیپی کی پیالیاں ۔ یا سونے اور چاندی کے کام کا دل اور اسی قسم کی دوسری نادر چیزوں کو اسی طرح پسند کرتے تھے جس طرح کہ اکبر نے اگنیشیس (Ignatius) کی ایک تصویر حاصل کرنے کی اس لیے خواہش کی کہ وہ نئی تھی ؎

دوسری فصل

جنگلات اور ماہی گیری

ہم دیکھ چکے ہیں کہ گو ہر جگہ نہیں تاہم ہندوستان کے اکثر حصوں میں غیر مقبوضہ قابل کاشت زمین کا تناسب بمقابل آجکل کے زیادہ تھا۔ اور یہ فرض کرنا خلاف احتیاط نہ ہوگا کہ ایسی زمین عام طور پر ایک نہ ایک قسم کے جنگل سے ڈھنکی ہوئی رہتی تھی۔ اُس دور کی تحریروں میں کہیں اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ حفاظت و استفادہ جنگلات کے آجکل کے سے باقاعدہ طریقے اُس زمانے میں بھی موجود ہوں۔ یہ طریقے تو صرف گذشتہ صدی کے اثناء میں جاری ہوے ہیں۔ اُس زمانے میں اگر کچھ رکاوٹیں تھیں بھی تو گمان غالب یہ ہے کہ وہ مرکزی یا مقامی حکام کی جانب سے محاصل وصول کرنے تک محدود تھیں۔ لہذا اکبر کے زمانے میں جنگلات کی حالت کا ایک عام خاکہ ذہن میں جمانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ غیر تنظیم یافتہ جنگلات کا حال معلوم کرلیا جائے اور ذرائع نقل و حمل کے فرق کا بھی لحاظ کرلیا جائے۔ ناقابل گزر جنگلات سے تو کوئی آمدنی حاصل نہیں ہوسکتی تھی اور یہ ناقابلیت بمقابل آجکل کے بہت زیادہ عام تھی۔ اور جن جنگلات تک شہروں یا دیہات سے پہنچنا ممکن تھا وہاں سے باشندوں کے لیے چوبینہ۔ ایندھن اور بعض چھوٹی چھوٹی پیداواریں حاصل ہوتی تھیں جن کی مقدار آبادی کی گنجانی کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی یعنی ان مقداروں اور آبادی کی گنجانی میں نسبت معکوس قایم تھی۔ چنانچہ بعض خاص خاص پیداواروں کو بازارات میں شہرت حاصل ہونے کی جو کچھ مثالیں ہمیں ملتی ہیں ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً بنگال کے بمبو جو جہازوں کی تیاری کے لیے مطلوب تھے تری کے رستوں سے

(۱۴۴)

باب۵

بار زائی منتقل کیئے جا سکتے تھے۔ اسی طرح مغربی گھاٹ کی ساگوانی لکڑی سمندر کے کنارے سے جہاں بڑے بڑے جہاز بنائے جاتے تھے قریب تھی۔ یا یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہو گا کہ جہاز سازی کا کام ایسے ساحلی مقامات پر کیا جاتا تھا جہاں موزوں لکڑی کافی مقداروں میں دستیاب ہوتی تھی۔

جب ہم یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ملک کو جنگلاتی پیداوار سے کس قدر آمدنی حاصل ہوتی تھی تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ چند در چند متضاد اسباب کے عملدرآمد کا نتیجہ ہوتی تھی۔ چونکہ جنگلات نسبتاً زیادہ اور کاشت نسبتاً کم تھی لہذا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ زرعی آبادی کی نسبتاً بڑی تعداد کو اس قسم کی پیداوار بلا روک ٹوک حاصل ہو جاتی تھی اور یہ فرق اس قدر بڑا تھا کہ اس کی وجہ سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی زرعی آبادی کی حالت اس لحاظ سے نسبتاً بہتر تھی۔ اس کے برعکس شہروں اور قصبات کو غالباً اب سے کچھ زیادہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ کیونکہ باوجود جنگلات زیادہ قریب ہونے کے ذرائع نقل و حمل نسبتاً بہت زیادہ خراب تھے۔ اور نہ وہ دور دراز مقامات کی پیداوار سے جو باقاعدہ طریقہ پر کارآمد بنائی گئی ہو استفادہ کر سکتے تھے۔ خود زرعی آبادی کو جو فوائد حاصل تھے اُن کے مقابل جنگلات کے وحشی جانوروں سے فصلوں کو جو نقصان پہنچتا تھا وہ پیش نظر رہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر کاشتکار بلا روک ٹوک جنگلاتی پیداوار حاصل کر سکتا تھا لیکن اُس کے ساتھ ہی کھیتوں کو جنگلات کی بدولت نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ لگا رہتا تھا اور جن ناظرین کو اس معاملے کا عملی تجربہ حاصل ہے وہ غالباً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ موازنہ کرنے پر کسی جانب بھی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ پس زرعی پیداوار کی طرح اس صورت میں بھی اگرچہ ہم قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اکبر کے زمانے میں فی کس اوسط آمدنی بمقابل آجکل کے زیادہ تھی یا کم پھر بھی ہم بجا طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی تمام ملک پر نظر ڈالتے ہوئے اُس کی مقدار قریب قریب اتنی ہی تھی۔

(۱۴۵)

ماہی گیری کی آمدنی کے متعلق بھی قریب قریب ایسا ہی نتیجہ اخذ

باب۵

کیا جا سکتا ہے۔ آئین اکبری میں مذکور ہے کہ مچھلی بنگال واڑیسہ و نیز سندھ میں باشندوں کی خوراک کا ایک اہم جزو تھی۔ اور مختلف سیاحوں نے لکھا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں عام طور پر استعمال کیجاتی تھی۔ اور بعض اوقات اس کو سکھا کر اور نمک لگا کر جہازوں کی اشیائے خوراک میں شریک کیا جاتا تھا۔ سندھ میں مچھلی کا تیل تیار کیا جاتا تھا اور ۱۶۶۶ء میں جب تھیونوٹ سورت گیا تھا تو گجرات میں مچھلی کی کھاد کا استعمال جاری ہو چکا تھا۔ پس اجمالی طور پر یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ ماہی گیری کا کاروبار زیادہ تر اسی ڈھنگ پر جاری تھا جو کہ آجکل معلوم ہے۔ یہ جو عام طور پر شکایت کی جاتی ہے کہ دریاؤں کی پیداوار طلب کی مناسبت سے گھٹ گئی ہے ممکن ہے کہ وہ کسی قدر صحت پر مبنی ہو کیونکہ طلب کا دارومدار ایسی آبادی کی تعداد پر ہے جو مچھلیوں کی رسد سے قریب ہوتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سمندر کے کنارے جو مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں ان کی مقدار میں کچھ کمی ہو گئی ہو اگرچہ ان کی امکانی پیداوار تو عملاً ناقابل اختتام ہے۔ لیکن اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ مچھلی کھانے والی آبادی (یعنی وہ لوگ جن کے لئے مچھلی محض ایک تعیش کی چیز نہیں بلکہ اہم ترین خوراک ہے) ملک کی مجموعی آبادی کا محض ایک جزو ہے تو پھر یہ بات بہت ہی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ماہی گیری کی پیداوار میں کچھ تخفیف ہو جانے سے کل تعداد کی اوسط آمدنی پر کوئی خاص اثر پڑ سکتا ہے۔

جنوبی ہند میں موتیوں کی غوطہ گاہ کے متعلق چند الفاظ ضروری ہیں۔ یہ منجملہ اُن واقعی حالات کے ہے جن کو اُس حصۂ ملک کے ہر سیاح نے محسوس کیا۔ غوطہ گاہ کا ٹھیک مقام وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ (۱۴۶) چند سال وہ ہندوستان کے سمندروں میں واقع ہوتا تھا اور دوسرے سالوں میں ساحل سیلون پر۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ واقع ہوتا ایک انبوہ کثیر اس کی طرف کھنچا ہوا چلا جاتا تھا جس کی تعداد کا اندازہ ایک پادری سیاح نے ساٹھ ہزار کیا ہے۔ مروجہ کیفیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاروبار انتہا درجہ تخمینی تھا۔ چنانچہ اب تک بھی اس کی یہی حالت ہے لیکن ہمیں کوئی تحریر ایسی نہیں ملی جس سے اس کی معاشی اہمیت پر روشنی

پڑ سکے ۔ بلا شبہ اعلیٰ طبقوں میں موتیوں کی طلب بہت زیادہ تھی ۔ لیکن ہندوستانی سمندروں کو اس کی پیداوار کا کوئی اجارہ حاصل نہیں تھا ۔ کیونکہ دوسرے مقامات اور خاصکر خلیج فارس سے بھی ان کی درآمد ہوتی تھی ۔ غرض جو لوگ اس کاروبار میں لگے رہتے تھے ان کے حق میں تو اس کی آمدنی اہم تھی لیکن وہ اس قدر نہیں تھی کہ ساری آبادی کی مالی حالت میں اس سے کوئی خاص فرق پیدا ہو سکے ۔

باب ۳

تیسری فصل

معدنیات اور دھاتیں

گذشتہ فصل کے مطالعے سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ہمارے پاس بہت کم تحریریں ایسی ہیں جن سے اُس زمانے میں ہندوستان کی خورو حیوانی اور نباتی پیداواروں پر براہ راست روشنی پڑتی ہو۔ لیکن دھاتوں سے کام لینے کے بارے میں کسی قدر زیادہ تفصیلی معلومات حاصل ہیں کیونکہ مؤلفِ آئین اکبری اسکو ایک دلچسپ مضمون خیال کرتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے قیمتی دھاتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو سونے کی پیدائش ناقابل التفات معلوم ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کی سیاحت کرنے والوں کا سکوت اس امر کی قطعی شہادت تصور کیا جاسکتا ہے کہ میسور کی طلائی کانوں پر ابھی تک کام نہیں شروع ہوا تھا۔ اور ابو الفضل صرف اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ کیونکر شمالی ہند کے بعض حصوں میں دریائی ریت کو دھوکر سونا نکالا جاتا تھا۔ چنانچہ اب بھی اس کا عملدرآمد جاری ہے۔ چاندی بھی بہت ہی قلیل مقداروں میں حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ ابو الفضل بیان کرتا ہے کہ صوبۂ آگرہ میں ایک کان موجود تھی لیکن اس پر کام کرنا نفع بخش ثابت نہیں ہوا۔ اس نظری ماخذ کے علاوہ صرف چند مبہم بیانات ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دریاؤں کی تہ میں ریت کو دھو کر بھی یہ دھات حاصل کی جاتی تھی ونیز کماؤن کے پہاڑوں میں وہ کان سے نکالی جاتی تھی لیکن یہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے متعلق مغلیہ عہدہ داروں کو بہت کم حقیقی واقفیت حاصل تھی۔

دوسری خاص دھاتیں جو ہندوستان میں صرف کی جاتی تھیں پارہ۔ ٹین۔ سیسہ۔ جست تانبا۔ لوہا تھیں۔ ان میں سے پہلی

باب ۵ (۱۴۷)

چار دھاتیں تو زیادہ تر باہر سے درآمد کی جاتی تھیں [1] البتہ سیسہ اور جست کی کچھ کچھ مقدار راجپوتانہ میں پیدا ہوتی تھی۔ تانبا جنوبی ہند کو تو سمندر پار علاقوں سے ملتا تھا لیکن شمال کا دارومدار مقامی کانوں کی رسد پر تھا۔ اور جہاں تک لوہے کا تعلق ہے سارے ملک کو خود اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اِن دونوں دھاتوں کی پیداوار کا ٹھیک حال معلوم کرنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں فلزی حالت میں نہیں ملتے اور کچی دھات کو صاف کرنے کے لیے دونوں صورتوں میں ایندھن کی کثیر مقدار درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ایندھن ہی کی رسد پر اس صنعت کا درحقیقت بہت زیادہ دار و مدار ہوتا ہے۔ اب جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس زمانے میں یہاں کوئلہ کی کانیں نہیں کھودی جاتی تھیں۔ اور لوہے اور تانبے کی پیدایش کا انحصار لکڑی کی اُس مقدار پر ہوتا تھا جو خام دھاتوں کے مقامات تک لائی جاسکے۔ گذشتہ صدی کے اثناء میں جب کبھی نسبتاً بڑے پیمانے پر لوہا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس رکاوٹ کا عملی اثر نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ ابتداً تو یہ صنعت بالعموم کسی قدر ترقی کرتی لیکن ایندھن کی رسد کے مقامی ذرائع بہت جلد ختم ہوجاتے اور دوسرے مقامات سے لکڑی لانے کے مصارف روز بروز بڑھتے چلے جاتے حتیٰ کہ کاروبار بتدریج غیر نفع بخش ثابت ہونے لگتا۔ اب رہا یہ سوال کہ کس نقطے پر پہنچکر منافع حاصل ہونا موقوف ہوجاتا تھا اس کا دارومدار درآمدشدہ دھاتوں کی مسابقت اور بازاری قیمت پر ہوتا تھا۔

[1] خطوط موصولہ (۳-۶۳) میں آگرہ کے قریب "پارہ کی کان" دریافت ہونیکا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بیان اس وقت کا ہے جبکہ انگریز تاجر اِس دھات کی درآمدشدہ مقداریں پیش کررہے تھے۔ لہذا ہمارے خیال میں یہ محض خریداروں کی ایجاد معلوم ہوتی ہے جن کا منشا بازار پر اثر ڈالنا تھا۔ ہمیں اس بات کی کہیں کوئی شہادت نہیں ملی کہ اِس زمانے میں ہندوستان میں پارہ پیدا کیا جاتا تھا۔

باب ۵

چنانچہ ابتدائی دور کے مقابل جبکہ مصارف ورآمد زیادہ ہوتے تھے بعد کے دنوں میں یہ حد زیادہ جلد نمودار ہونے لگی۔ تاہم اس طرح حد بندی کا وجود ایک بالکل بدیہی واقعہ ہے جس کا لحاظ لوہا بنانے والوں کو ہر زمانے میں لازمی طور پر کرنا پڑتا ہوگا[1] اگر وہ بڑے پیمانے پر کام کرتے تو ایندھن کی رسد بہت جلد ناکافی ہونے لگتی اور کاروبار ملتوی کرنے پڑتے یہاں تک کہ درختوں کو اگنے اور بڑے ہونے کا وقت مل جائے اور اگر مقدار پیداوار اتنی کم رکھی جاتی کہ قرب وجوار سے ایندھن کی سالانہ رسد اس کے لئے کافی ہو سکے تو پھر کاروبار بہت ہی چھوٹے پیمانے پر چل سکتا تھا۔ قدیم زمانے میں اس کاروبار کے جو کچھ حالات ہمیں مل سکے ہیں اُن سے نیز گذشتہ صدی کے دوران میں جس طور پر یہ صنعت برقرار رہی ہے اس سے ہمارے خیال میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ رکاوٹیں فی الواقع محسوس کی جاتی ہوں گی (۱۴۸) چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ اس صنعت کی تنظیم بڑے پیمانے پر نہیں تھی بلکہ لوگ فرداً فرداً چھوٹی چھوٹی بھٹیاں ایسے مقامات پر قائم کر لیتے تھے جہاں خام فلز اور ایندھن دستیاب ہوتے تھے۔ اور جب ان میں سے کسی ضروری جز و کی رسد بھی موقوف ہونے لگتی وہ اپنا کاروبار ترک کر دیتے تھے[2]۔ جن صورتوں میں خام فلز کی رسد کم ہو جاتی وہاں تو بدائمی طور پر کام ترک کر دیا جاتا تھا۔ لیکن جن مقامات میں خام فلز بکثرت موجود ہوتا وہ جنگل دوبارہ تیار ہونے تک کچھ مدت کے لئے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ پس یہ صنعت

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ معمولی بھٹی سے لوہے کی جو مقدار حاصل ہوتی تھی وہ سالانہ ۵ اور ۱۰ ٹن کے درمیان کم وبیش ہوتی تھی۔ جدید نمونے کی جو لوہار کی بھٹی آجکل ہندوستان میں استعمال ہوتی ہے اُس سے صرف ایک دن میں اس قدر دھات تیار ہو گی جس قدر کہ دیسی بھٹی سے کام کرنے والا اپنی ساری عمر کام کر کے پیدا کر سکے۔

[2] قدیم کاروبار کے لحاظ سے اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خام فلز کے دستیاب ہونے کا دارومدار زیادہ تر گہرائی پر ہوتا تھا۔ جب کانیں زیر زمین گہری ہو جاتی تھیں

باب ۴

کسی ایک مرکز پر قائم نہیں تھی بلکہ مختلف مقامات میں منتشر تھی اور اگر زمانۂ جدید کے معیار سے جانچا جائے تو وہ بالکل ناقص حالت میں تھی اور سرمایہ داری کی جد و جہد کے لئے تو وہ بالکل ہی غیر موزوں تھی - تاہم بہ حیثیت مجموعی وہ ملک کی پیدائش کا ایک اہم جزو تھی -

تانبے کے بارے میں جیساکہ ہم ابھی واضح کر چکے ہیں شمالی اور جنوبی ہند میں امتیاز کرنا پڑتا ہے - ہمیں کوئی تحریر ایسی نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُس زمانے میں یہ دھات بمبئی - مدراس یا حیدرآباد کے علاقوں میں ملتی ہو - اور نہ ہمیں یہ علم ہے کہ ملک کے اِن حصوں میں زمانۂ قدیم میں ایسے وسیع کاروبار جاری تھے - اس کے برعکس دونوں ساحلوں پر اس کی درآمد کے جو متعدد حوالے ملتے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دھات کی تجارت مضبوطی کے ساتھ قائم تھی - حتیٰ کہ تانبے کے سکوں کی رسد کا دار و مدار بھی اُس مقدار پر ہوتا تھا جو چین سے لائی جاتی تھی - برخلاف اس کے شمالی ہند میں دریا کے راستے سے اس دھات کے درآمد ہونے کا کہیں کوئی حوالہ نہیں ملتا خواہ وہ بنگال میں سے ہو یا خلیج کمبے کے راستہ سے - تانبے اور چاندی کے سکوں کے مابین شرح مبادلہ کے اختلافات کی جو کیفیت ٹیورنیر نے بیان کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تانبے کے خاص خاص ماخذ بمقابل ساحل کے آگرے اور دہلی سے قریب تر تھے - اور زمانۂ قدیم کے کاروبار کی شہادت سے قطع نظر ہمارے پاس ابو الفضل کے قطعی بیانات اس بارے میں موجود ہیں کہ ملک کے مختلف حصوں میں تانبے کی کانیں موجود تھیں - جو ماخذ اس نے بتائے ہیں اِن میں ایک تو ہمالیہ کے پہاڑ ہیں اور دوسرے چند اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ تو وہ بہت جلد پانی سے بھر جاتی ہیں - موجودہ زمانے میں پمپ کے ذریعہ پانی باہر نکالنے کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اُس زمانے میں ہندوستان کے لوگ بھی پمپ کو نہیں سمجھتے تھے اور جب وہ اس سطح پر پہنچ جاتے جہاں پانی جمع ہو جاتا تھا تو پھر وہ کاروبار ترک کر دیتے تھے -

باب ۴ (۱۴۹)

مقامات ہیں جو آجکل راجپوتانے میں شامل ہیں۔ قدیم کاروبار کے نشانات ملک کے ان حصوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹا ناگپور اور بندھیلکھنڈ کے بعض حصوں میں بھی وہ وسیع پیمانے پر نظر آتے ہیں اور قرین قیاس یہ ہے کہ اکبر کے زمانے میں ان آخری علاقوں کی رسد بھی شامل ہوتی تھی۔ کیونکہ ابوالفضل نے اُن کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ بدیہی طور پر نہایت ہی نامکمل واقفیت پر مبنی ہے اور اس معاملے میں اس کا سکوت قطعی نہیں ہے۔ البتہ راجپوتانہ اُس زمانے میں اس کا خاص ماخذ معلوم ہوتا ہے۔

تانبے کی پیداوار کی مقدار کے متعلق کوئی اطلاع موجود نہیں ہے لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دھات انتہا درجے گراں تھی۔ اکبر کے دارالضرب میں ایک من کے ۴۴ دام دیے جاتے تھے۔ اور اس شرح سے ایک کاشتکار کو ایک پونڈ تانبے کی قیمت ۴۴ پونڈ گیہوں پڑتی تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں اس کی قیمت صرف ۲۰ پونڈ گیہوں ہوتی تھی۔ پس جس شخص کی آمدنی زرعی پیداوار کی شکل میں حاصل کی جاتی تھی اُسے تانبے کی بنی ہوئی اشیا کے لیے موجودہ معیار سے کم از کم پانچ گنی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی لہذا ہمیں یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ قیمت عملاً مانع خرید تھی اور شمالی ہند کے ادنیٰ طبقوں کی طرف سے اس دھات کے لیے کوئی موثر طلب نمودار ہی نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس کی پیداوار بھی بہ مقابل آجکل کے جبکہ پیتل اور تانبے کے برتن عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں بہت ہی کم تھی۔ ہمیں یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ جنوب میں اس کی قیمت بہ مقابل شمال کے بہت زیادہ ادنیٰ نہیں تھی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو درآمد کرنے والے تاجر اپنی اپنی رسد مغربی ساحل کی بندرگاہوں سے کیمبے کی بندرگاہوں کو منتقل کر دیتے اور اس زمانے کے تجارتی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اُن کا یہ طرز عمل ہر لحاظ سے ممکن و مناسب تھا۔ پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سولھویں صدی میں ہندوستان کے اندر بہ حیثیت مجموعی تانبے اور پیتل کی بنی ہوئی چیزیں کثیر آبادی کی رسمی ضروریات میں شامل نہیں تھیں بلکہ وہ قطعی طور پر گراں تعیشات کے ہم مرتبہ تھیں۔

باب ۵

لوہے کی پیداوار بمقابل تانبے کے بہت زیادہ وسیع رقبے پر منتشر تھی اور ہمارے خیال میں اس کی مقدار بھی بہت زیادہ ہوتی ہوگی ۔ اِس بات کی شہادت نہیں ہے کہ ہندوستان کے کسی بڑے حصے کا انحصار درآمد پر تھا[۱] خام فلز کی مقداریں ملک بھر میں منتشر ہیں اور قدیم کاروبار کے نشانات بجز دریائی مٹی کے میدانوں کے ملک کے تقریباً ہر حصے میں پائے جاتے ہیں ۔ گو کثیر مقداروں (۱۵۰) میں نہیں تاہم جنوبی ہند سے لوہے کی برآمد پابندی کے ساتھ جاری تھی اور شمال کے بارے میں ابوالفضل کا یہ مستند بیان موجود ہے کہ مغلیہ صوبجات بنگال ۔ الہ آباد ۔ آگرہ ۔ برار ۔ گجرات ۔ دہلی ۔ کشمیر میں لوہا پیدا کیا جاتا تھا ۔ بہ لحاظ خوبی کے یہ پیداوار بسا اوقات اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی اور کم از کم جنوب کے دستکار تو فولاد بنانے کا طریقہ جانتے تھے ۔ چنانچہ مغربی ساحل سے خاصکر اس شکل میں برآمد ہوتی تھی ۔ جہاں تک مقدار پیداوار کا تعلق ہے اس کا ہم صرف ایک مبہم تصور کر سکتے ہیں ۔ موجودہ زمانے میں طرح طرح سے یہ دھات استعمال کی جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کی اکثر و بیشتر صورتیں اُس زمانے میں نامعلوم تھیں ۔ چنانچہ ہم اکبری دور کے ہندوستان میں لوہے کے پل ۔ نالی دار لوہے کی چھتیں ۔ تار کی باڑ ۔ لوہے کے سفری صندوق یا اسی قسم کی دوسری چیزیں دیکھنے کی توقع نہیں کر سکتے ۔ تعمیر کے ہندوستانی طریقوں[۲] کی نمایاں خصوصیت لوہے کی عدم موجودگی یا کفایت ہے لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ جس قدر

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی نے امتحاناً بیرونی لوہے کی کچھ مقدار سورت میں منافعہ کے ساتھ فروخت کی تھی ۔ لیکن اس کی وجہ ایک عارضی مقامی کمیابی تھی چنانچہ دو ہفتوں کے اندر ہی ملک کے اندرونی مقامات سے لوہے کی کثیر مقداریں شہر میں پہنچ گئیں (خطوط موصولہ ۱ ۔ ۲۳) اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر اس تجارت کو ترقی دینے کے لئے اُس زمانے میں نہیں کی گئی ۔

[۲] مثلاً پیرارڈ ذکر کرتا ہے (ترجمہ ۲ ۔ ۱۸۰) کہ ہندوستانی جہازوں کے بنانے میں نسبتاً بہت ہی تھوڑا لوہا استعمال کیا جاتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ پرتگالی کشتیوں کے مقابلہ میں وہ کمزور ہوتے تھے حالانکہ جس لکڑی سے وہ بنائے جاتے تھے وہ نسبتاً اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی ۔

باب ۳

پیداوار حاصل ہوتی تھی وہ زیادہ تر آلات و اوزار یا اسلحہ تیار کرنے یا کیل پیچ اور گھوڑے کے نعل جیسی معمولی چیزیں بنانے میں صرف ہوتی تھی۔ شمالی ہند میں ان میں سے بعض اشیا کی قیمت کے متعلق ابوالفضل نے کچھ مواد بہم پہنچایا ہے لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں کوئی قابل اطمینان موازنہ کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً نعلوں کے ایک سٹ کی قیمت دس دام ہوتی تھی۔ لیکن یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ اس میں لوہے کی کتنی مقدار لگتی تھی۔ اور جہاں تک کیل یا پیچ وغیرہ کا تعلق ہے ان کی قیمت میں کاریگری کے مصارف کا جزو نہایت اہم لیکن غیر معین ہے۔ البتہ لانبی میخوں کی تنہا مثال ہے جن کے بارے میں بلا کسی اندیشہ کے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی قیمت فی سیر تین دام ہوتی تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ دارالسلطنت میں ایک پونڈ لوہے کی مالیت جبکہ وہ اس شکل میں ہو دس پونڈ گیہوں کے مساوی ہوتی تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۱۴ء میں اس کی قدر تین پونڈ سے کچھ ہی زائد تھی۔ گویا اس لحاظ سے اکبر کے زمانے کے کسانوں کو اپنے آلات و اوزار کے لیے جو لوہا درکار ہوتا تھا اس کے لیے انھیں بہ مقابل ان کے موجودہ جانشینوں کے اناج کی سہ گنی مقدار ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ ابوالفضل نے جو اور اعداد دیے ہیں ان سے اس عام نتیجہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ لوہا گراں تھا لیکن اس قدر گراں نہیں جتنا کہ تانبا تھا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس دھات کو کوئی تعیش نہیں بلکہ ایک گراں ضرورت خیال کریں جس کے استعمال میں انتہا درجہ کی کفایت شعاری درکار تھی۔ (۱۵۱)

ان دھاتوں کے علاوہ جو دوسری معدنیات اس زمانے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں وہ نمک اور ہیرے کی کانیں تھیں چنانچہ ہم پہلے آخرالذکر کا حال معلوم کریں گے۔ لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ قیمتی پیداوار ہے بلکہ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ واقفیت اس کی پیدائش کے طریقوں سے متعلق حاصل ہے اس سے کاروبار معدنیات کے متعلق ہم اب تک جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس کی تکمیل ہو جاتی ہے اور نیز حالاتِ ملازمت کا بھی ایک سرسری اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی خام فلزدل کی طرح ہیرے بھی سطح زمین کے قریب پائے جاتے ہیں لیکن انھیں حاصل کرنے کے لیے، ایندھن استعمال کرنے کی حاجت

باب ۵

نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کاروبار پر وہ حد بندی عائد نہیں ہوتی جو کہ تانبے اور لوہے کی حالت میں نظر آتی ہے اور جس کا ہم حال معلوم کر چکے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہیرے کی کانوں پر مزدور کثیر تعداد میں جمع ہوتے تھے اور وہاں جو تنظیم اختیار کی جاتی تھی وہ گویا اس زمانے کی کاروباری تنظیم کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی[1]۔ ٹیورنیر نے جو بہ حیثیت ایک ماہر جوہری کے اس مضمون سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اس تنظیم کی نہایت مکمل کیفیت تحریر کی ہے۔ اور اگرچہ اُس کی تحریر کا آغاز سترھویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے تاہم یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اہم خصوصیات کم از کم اس دور سے جس سے کہ ہمیں سروکار ہے برابر قائم ہیں۔ اس زمانے میں دکن میں دو ہیرے کی کانیں تھیں۔ ان میں سے ایک جگہ تو ہیرے ریتیلی مٹی میں پائے جاتے تھے اور انھیں صرف چھاننے اور تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن دوسری جگہ چکنی مٹی بھی شامل رہتی تھی لہذا وہاں ان کاموں سے قبل اس کو دھونا بھی پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس آخری مقام پر مزدور زیادہ تعداد میں درکار ہوتے تھے۔ اور اس لیے وہیں ہمعصر صنعتی نظام کی زیادہ مفید مثال دستیاب ہوتی ہے۔ ٹیورنیر کی تحریر کے مطابق تنظیم بر پیمانۂ کبیر کی سی وہاں کوئی چیز موجود نہ تھی۔ بلکہ کوئی تاجر تقریباً نصف ایکڑ کی وسعت کا ایک قطعۂ زمین علیحدہ کر دیتا اور اس پر ایک خاص تعداد میں مزدور نوکر رکھ لیتا۔ کبھی کبھی یہ تعداد تین سو تک پہنچ جاتی تھی[1]۔ مرد سطح زمین کو کھودتے تھے اور عورتیں اور بچے اُس مٹی کو ایک محصورہ چہار دیواری میں لے جاتے تھے جہاں وہ اُس پانی میں جو مٹی کے گھڑوں میں لایا جاتا تھا

(۱۵۲)

[1] ٹیورنیر وہ تعداد نہیں بیان کرتا جو فرداً فرداً ہر تاجر نوکر رکھتا تھا بلکہ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ دونوں مقامات میں طریقہ ایک ہی تھا۔ رؤلکنڈہ میں جہاں دھونے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مزدوروں کی تعداد پچاس بیان کی گئی ہے جو بڑھتے بڑھتے سو تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ اب اگر ہر کھودنے والے کے لئے دو دو حمّال رکھے جائیں تاکہ دھونے کا مزید کام انجام پا سکے تو اس طرح جو انتہائی تعداد ہوگی وہ تین سو تک پہنچ جاتی ہے۔

باب۵ خوب بھگوئی جاتی تھی ۔ بعدازاں جو کچھ کیچڑ ہوتی تھی وہ تو دیواروں کے سوراخوں میں سے باہر نکل جاتی تھی اور جو کچھ ریت بچ رہتی وہ خشک ہونے کے بعد اسی قسم کی ٹوکریوں سے جیسی کہ کھیت کاٹنے کے وقت استعمال کیجاتی تھیں چھان لیجاتی تھی ۔ اس کا موٹا حصہ زمین پر پھینک دیا جاتا اور لکڑی کے ٹھپّوں سے کوٹا جاتا تھا اور آخر میں ہیرے ہاتھ سے چن لئے جاتے تھے ۔ جس شخص کو کام کرنے کے ہندوستانی طریقوں کا تجربہ ہو وہ اِس تمام کارروائی کو فوراً نظر کے سامنے لاسکتا ہے ۔ کام کرنے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہوتا تھا جس کا شمار ٹیورنیر نے غالباً کسی قدر مبالغے کے ساتھ ساٹھ ہزار کیا ہے لیکن اس تعداد میں متعدد مقامات کے کام کرنیوالے شامل تھے ۔ یہ مقامات فرداً فرداً بہت چھوٹے اور ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوتے تھے ۔ اجرتیں جو ادا کی جاتی تھیں وہ بہت ادنیٰ ہوتی تھیں چنانچہ ٹیورنیر نے بھی اس کو محسوس کیا ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ماہر مزدور بھی سال میں صرف تین پیگوڈا کماتا تھا اور مزدوروں کو چوری کی ترغیب اس قدر زیادہ تھی کہ ہر پچاس مزدوروں کے لیے بارہ یا پندرہ نگرانکار درکار ہوتے تھے ۔ پیگوڈا کی جو قدر کسی سابقہ باب میں بیان کی جاچکی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوے اُن کی کمائی کی شرح ماہانہ ایک روپیہ سے بھی کم ہوتی تھی جو ادنیٰ ضروریات زندگی کے لیے بھی بہ مشکل کافی ہوتی ہوگی ۔ البتہ قیمتی پتھروں کا پتا لگانے پر مزدوروں کو انعام دیا جاتا تھا ۔ اور جن ترغیبوں کے زیر اثر مزدوران مقامات پر کام کرنے کے لئے جاتے تھے اُن میں سب سے زیادہ نمایاں اِس قسمت آزمائی کا خیال تھا کہ شاید خوش قسمتی سے کوئی عمدہ پتھر ملجائے یا اسے چرالینے کا موقع ہی ہاتھ لگ جائے ۔ اجرتیں ادنیٰ ہونے کے باوجود یہ امر بدیہی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی بڑی بڑی رقمیں تقسیم کی جاتی تھیں اور چونکہ ٹیورنیر کے زمانے میں اِس مقام پر تقریباً ایک صدی سے کام ہورہا تھا لہذا ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ بہ حیثیت مجموعی اُس سے مصارف نکل آتے تھے گو منافعہ کی اوسط شرح جیسا کہ عام طور پر تخمینی کاروبار میں واقع ہوتا ہے غالباً بہت کم تھی ۔ پس اگر ہم اجرتوں کی مجموعی مقدار کو بنیاد قرار دیں اور دوسرے مصارف اور حقوق شاہی اور منافعہ کے لیے کافی طور پر

باب ۵

گنجایش رکھیں تو تمام ذرائع کی مجموعی آمدنی اُس زمانے کے زر کے حساب سے بمشکل بیس لاکھ روپے سالانہ ہوتی ہوگی بشرطیکہ کاروبار کی مقدار انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہو۔ یہ ایک انتہائی عدد ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بڑھاکر بیان کیا گیا ہو تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس کاروبار کی اہمیت محض مقامی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ تھی۔ اور جن حالات کے تحت وہ جاری تھا اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ آجکل پائی جاتی ہے۔ یعنی آبادی نہایت گنجان (۱۵۳) اور اس کا معیار زندگی ادنیٰ۔ کام کی نوعیت ہی ایسی کہ لوگ اس سے عام طور پر مانوس ہوں اور ادنیٰ اجرتوں پر قانع ہوکر کثیر تعداد میں اس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ اور اگر کبھی قسمت نے یاوری کی تو اتفاقیہ طور پر ان اجرتوں کے علاوہ کچھ نہ کچھ انعام بھی مل جائے۔

ہیروں کا تیسرا ماخذ جو ٹیورنیر نے بیان کیا ہے اس کی بہت کم اہمیت تھی۔ یہاں صورت یہ تھی کہ چھوٹے ناگپور کے ایک دریا کی ریتیلی تہہ میں ہیرے مل جایا کرتے تھے جس کی وجہ سے مقامی آبادی ہر سال جنوری یا فروری کے مہینے میں جبکہ دریا میں پانی تھوڑا ہوتا ہے اور خزاں کی فصلیں کٹ چکتی ہیں وہاں نکل آتی اور ہیروں کی تلاش میں لگجاتی تھی۔ گویا جس زمانے میں مقامی باشندوں کو اپنے معمولی کاروبار سے فرصت ملجاتی تھی وہ اس کاروبار میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اور پھر چند ہی ماہ بعد یہ سارے کام ملتوی کر دیئے جاتے تھے کیونکہ بارش ہونے کے بعد ان کا جاری رکھنا ناممکن تھا۔ غرض اس طریقے سے جو پیداوار حاصل ہوتی تھی وہ اُن باقاعدہ ذرائع کے مقابلے میں جو اور آگے جنوب میں واقع تھے بہت کم ہوتی تھی۔ باوجود اس کے یہ توقع کہ شاید خوش قسمتی سے کوئی قیمتی ہیرا ہاتھ لگجائے بلاشبہہ اس بات کے لیے کافی تھی کہ بقول ٹیورنیر کے آٹھ آٹھ ہزار تلاش کرنیوالوں کو اُس طرف نکل آنے کی ترغیب ہو۔

نمک کی پیداوار اس زمانے میں کافی اہمیت رکھتی تھی اور جہاں تک ہمیں علم ہے باہر سے کسی بڑے پیمانے پر اس کی درآمد بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ماخذ اُس زمانے میں بھی وہی تھے جن سے ہم اب تک واقف ہیں یعنی جھیل سانبھر

باب پنجاب کی کانیں۔ اور سمندر کا پانی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی تجارت کی مقدار بہت کافی تھی۔ دھات کی طرح اس صورت میں بھی مقدار پیداوار کے بارے میں کوئی خبر براہ راست ہمیں نہیں ملتی۔ لیکن قیمتوں کا موازنہ کر کے ہم اس کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر اناج کی شکل میں اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکبر کے دارالسلطنت کے قرب وجوار میں جس قیمت پر نمک فروخت ہوتا تھا وہ اس قیمت سے جو ۱۹۱۴ء کے قریب شمالی ہند میں رائج تھی ۲½ گنی زیادہ تھی۔ اور چونکہ دارالسلطنت بالعموم کسی نہ کسی ایسے مقام پر رہا جو نمک کی رسد کے خاص خاص ماخذ سے قریب تھا لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سارے ملک میں نمک کی اوسط قیمت اس سے کسی قدر زیادہ رہتی ہوگی۔ موجودہ صدی کے تجربہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ نمک کی قیمتوں میں تخفیف ہونے سے اُس کے صرف کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے لہذا اکبر کے زمانے میں جو نسبتاً اعلیٰ قیمت رائج تھی اُس کے غالباً یہ معنی ہیں کہ آجکل جس قدر نمک استعمال کرنے کے لوگ عادی ہیں اس سے بہت کم مقدار اُس زمانے میں صرف ہوتی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا موجودہ زمانے میں زیادہ نمک کا استعمال محض مقدار درآمد کا نتیجہ ہے یا کیا؟ اس بارے میں کوئی متفقہ رائے نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہر صورت یہ بات بدیہی ہے کہ اکبر کے زمانے میں فی کس پیداوار اب سے بہت زیادہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس کا نسبتاً کمتر ہونا ممکن ہے۔ (۵/۱۴)

نمک ہی کے ہم پلّہ دوسری معدنی پیداواروں کا جہاں تک تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ شورہ پیدا تو کیا جاتا تھا لیکن اُس کی اس قدر اہمیت نہیں تھی جس قدر کہ زمانۂ مابعد میں یورپ کی طرف اس کی برآمد شروع ہونے سے حاصل ہوگئی اور بھی مختلف دھاتیں مثلاً سہاگہ۔ پھٹکری۔ پیلی مٹی چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر پیدا ہوتی تھیں لیکن مقدار درآمد کو ملا کر ملک کی صنعتی ضرورتوں کے لئے کافی ہو جاتی تھیں۔ ادنیٰ درجہ کی دھاتوں میں عمارت کا پتھر مقامی استعمال کے لیے اکثر مقامات میں جہاں جہاں پایا جاتا تھا کھودا جاتا تھا۔ لیکن ذرائع نقل وحمل کی جیسی کچھ حالت تھی اس کی وجہ سے اس کا بازار زیادہ وسیع نہیں ہونے پاتا تھا

باب

صرف ایک مثال البتہ ایسی ملی ہے کہ ایک مقام کا پتھر دوسرے مقام کو لیجایا جاتا تھا اور یہ مثال بیین کے پتھر کی ہے جو گوا میں استعمال ہوتا تھا اور دریائی راستہ سے وہاں روانہ کیا جاتا تھا۔ سڑکوں کی تعمیر اور ریلوں کے لیے پتھر کے روڑوں کا استعمال یہ ایک بالکل حال کی بات ہے۔

اب ہم اکبر کے زمانے میں ہندوستان کی معدنی پیداوار کا موجودہ زمانے کی پیداوار سے سرسری طور پر موازنہ کریں گے۔ جن جن مدوں میں تخفیف نظر آتی ہے وہ ہیرے۔ لوہا۔ تانبا و نیز متعدد غیر اہم مدیں مثلاً سیسہ اور جست۔ سہاگہ۔ پیلی مٹی وغیرہ ہیں۔ جو نقصان ہیروں کی تخفیف کا نتیجہ ہے اس کی انتہائی مقدار ہم نے اُسی زمانے کے بیس لاکھ روپیوں تک بتائی ہے۔ یہ تو مشتبہ ہے کہ اس زمانے میں اور اُس مقام پر روپے کی قوت خرید کیا تھی لیکن یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ اکبر کے دارالسلطنت کے مقابل وہ کم تھی۔ پس اس مد کے تحت جو انتہائی نقصان ہو سکتا ہے وہ ایک کروڑ روپیں (زرحالیہ) سے بہت کم ہوگا۔ دوسری مدوں کے متعلق مقداروں کا کوئی تخمینہ پیش کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ تانبا نادر الوجود تھا۔ اس کی قدر بہت اعلیٰ تھی لیکن جو مقدار پیدا ہوتی تھی وہ زمانۂ حال کے صرف کا مقابلہ کرتے ہوئے یقیناً بہت ہی کم تھی۔ لوہے کی حالت کا موازنہ کرنے میں اس وجہ سے پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ گذشتہ چند سال کے دوران میں اس کی پیداوار میں بہت بڑی توسیع ہو گئی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ موجودہ پیداوار اگر پورے طور پر نہیں تو کم از کم اس مقدار کے قریب قریب ضرور پہنچ گئی ہے جو اکبر کے زمانے میں حاصل ہوتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۲ء یا اس کے قریب کے زمانے پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس میں بہت کافی تخفیف ہو گئی ہے۔ اِن نقصانات کے مقابل کوئلہ، سونا، مغنیسیہ اور چھوٹی چھوٹی دھاتوں کی کلیتاً جدید پیدائش کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن کی سالانہ مجموعی مقدار جنگ عظیم سے قبل قریب قریب ۷½ ملین پونڈ اسٹرلنگ[1] تک

(۱۵۵)

[1] سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی معدنیات کی فہرست میں تیسرا درجہ

بابٹ

پہنچ چکی تھی۔ اس کے علاوہ شورے کی مد میں جو اضافہ ہوا ہے اور پتھر کھودنے کے مقامات میں جو زبردست ترقی ہوئی ہے وہ بالکل جداگانہ ہیں۔ اب اگر اس عدد سے وہ نقصان منہا کر دیا جائے جو ہیروں کے تحت تخمینہ کیا گیا ہے اور جو چھوٹے چھوٹے نقصانات ہوئے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے فوائد کے ساتھ مجرا کر دئے جائیں تو پھر جو مجموعی مقدار ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ اس قدر بڑی ہے کہ اس کے مقابلہ میں تانبے کی قدیم پیداوار اور لوہے کی زائد پیداوار ناقابل لحاظ ہوجاتی ہیں۔ بس اس اضافۂ آبادی کا لحاظ کرنے کے بعد جو کہ گذشتہ تین صدیوں کے اثنا میں واقع ہوا ہے یہ نتیجہ بالکل ناقابل تردید معلوم ہوتا ہے کہ فی کس آمدنی کا اوسط جو معدنی پیداوار سے حاصل کی جاتی تھی بہ مقابل اکبر کے زمانے کے آجکل بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ جو آمدنی آجکل حاصل ہوتی ہے وہی بجائے خود نہایت ادنی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مٹی کے تیل کا ہے جو کہ کوئلہ اور سونے کے بعد واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تقریباً پوری مقدار برما میں پیدا ہوتی ہے اور اس کتاب میں ہمیں برما کو خارج کر کے بقیہ ہندوستان سے سروکار ہے۔ لہذا ہم برما کی پیداوار کو بحث سے خارج کر دیتے ہیں۔

باب ۵

چوتھی فصل

زرعی مصنوعات

ہمعصر اسناد کا سطحی طور پر مطالعہ کرنے سے ہمارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کے طول و عرض میں طرح طرح کی صنعتیں نہایت مستعدی کے ساتھ جاری تھیں۔ لیکن یہ خیال بعض لحاظ سے گمراہ کن ہے۔ سیاح جو راستے اختیار کرتے وہ نسبتاً بہت تھوڑے تھے اور ملک کے نہایت وسیع علاقے ایسے ہیں جن کا کوئی حال ہمیں معلوم نہیں ہے۔ پس ہم جو نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ صنعتوں نے صرف اُن مقامات میں ترقی کی تھی جو نقل و حمل کے چند خاص خاص راستوں مثلاً دریائے گنگا و انڈس پر واقع تھے یا ان سڑکوں پر جو آگرہ سے لاہور یا مغربی ساحل کو جاتی تھیں۔ مزید تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو ان راستوں پر جو صنعتیں قائم تھیں وہ بہت بڑی حد تک صرف چند خاص قصبوں اور شہروں میں محصور تھیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ احمد آباد یا لاہور جیسے مرکزوں میں کاروباری جد و جہد کی جو کیفیتیں بار بار بیان کی گئی ہیں صرف انہیں علاقوں پر ان کا اطلاق کریں جن پر کہ واقعات کے لحاظ سے ان کا اطلاق صحیح ہے۔ غلطی کے ان احتمالات کا پورا پورا لحاظ کرنے پر بھی ہماری رائے میں یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ صنعت و حرفت کے معاملے میں ہندوستان بمقابل مغربی ممالک کے اُس زمانے میں بہت زیادہ (۱۵۶) ترقی یافتہ حالت میں تھا۔ مختلف سیاحوں نے ہندوستان کی صنعتی فوقیت کے متعلق بار بار جو بڑے چڑھے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ کم از کم اس نتیجے کی حد تک تو ضرور قابل لحاظ ہیں پھر جن واقعات کا ان کے بیانات سے انکشاف ہوتا ہے وہ اس نتیجے کی مزید تائید کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لیے مختلف قوموں کے مقابلے میں ہندوستان کا مرتبہ معلوم کرنا ایک بالکل غیر اہم سی بات ہے اور یہاں جو ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا اُس سے ہمارا منشا صرف ایک خاص امتیاز

باب۳ کی طرف جو بسا اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے توجہ دلانا ہے۔ یہ تسلیم کرنا کہ ہندوستان اب مغربی ممالک سے نسبتاً بہت پیچھے رہ گیا ہے ایک اور بات ہے اور یہ کہنا کہ ہندوستان کو صنعتوں سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ گھٹ گئی ہے ایک بالکل جداگانہ بات ہے۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ملک کو مفید و کارآمد اشیا پہلے سے زیادہ حاصل ہو رہی ہوں لیکن دوسری قوموں نے اس سے بھی زیادہ ترقی کر لی ہو۔ آیا صنعت و حرفت سے بشکل اشیا ملک کو جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ آبادی کے تناسب سے گذشتہ تین صدی کے اثنا میں بڑھ گئی ہے یا گھٹ گئی ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فی الفور براہ راست کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن اُس دور کی صنعتوں کی نوعیت اور اُن کی وسعت کے بارے میں جو شہادت ہمارے پاس موجود ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو ہم اُس جواب کے قریب قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اس غرض کے لیے کسی نہ کسی خاص قسم کی تقسیم و ترتیب درکار ہے لہذا ہم ترتیب وار زرعی مصنوعات۔ عام دستکاریاں۔ جہاز سازی اور نقل و حمل کی دوسری شکلوں کی پیدایش سے بحث کریں گے اور آخر میں سب سے زیادہ اہم یعنی مختلف پارچہ بافی کی صنعتوں کا حال معلوم کریں گے۔

ان میں سے پہلے شعبہ میں وہ مختلف صنعتیں شامل ہیں جن کے ذریعہ سے زرعی پیداوار صرف کے لیے تیار کی جاتی ہے بہ حیثیت مجموعی ان کی بہت بڑی صنعتی اہمیت ہے۔ کیونکہ زمین سے جو خام پیداوار حاصل ہوتی ہے خواہ وہ اناج ہو یا روغندار تخم ہوں۔ شکر۔ ریشے۔ ادویات ہوں یا رنگسازی کی چیزیں اس کا ایک بہت بڑا حصہ انھیں کے ذریعے سے شکل بدلتا رہتا ہے۔ اور ہمارے موجودہ مقصد کے لئے یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ آجکل کی طرح اکبر کے دور میں بھی اس قسم کے کاروبار کی طرف بالعموم اُس قدر توجہ نہیں کی جاتی تھی جس قدر کہ ان دستکاروں کی زیادہ نمایاں پیداوار پر جو دوسری قسم کی خام پیداواروں کو لے کر کام کرتے ہیں۔

اب ہم سب سے پہلے مختلف قسم کے اناج کے استعمال کو لیتے ہیں۔

اس بارے میں بلا کسی اندیشے کے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سولھویں صدی میں (۱۷) آٹا پیسنے کی کوئی منظم یافتہ صنعت موجود نہیں تھی چنانچہ اس کے وجود کے متعلق

باب ۵

کہیں کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ لہذا ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ آٹا پیسنا اور کھانا تیار کرنا بالعموم ایک خالص گھریلو کاروبار تھا جیسا کہ اب بھی عام طور پر اس کی حالت ہے۔ سورت اور دوسری بندرگاہوں میں جہازوں کو خوراک بہم پہنچانے کے سلسلے میں اور بعض اندرونی قصبات میں مسافروں اور سیاحوں کے ضروریات پورے کرنے کے لیے ممکن ہے کہ اناج کی کچھ مقدار پیسی جاتی ہو لیکن اگر اس صنعت کا ایسا کوئی اجتماع موجود بھی تھا تو اُس کی تنظیم نہایت ہی ابتدائی ہوگی۔ غالباً عورتوں کی ایک خاص تعداد کسی غلّہ فروش کے زیر نگرانی معمولی گھریلو ہاتھ کی چکیوں کو لے کر کام کرتی ہوگی۔ یہی حال شکر کا بھی تھا۔ خام پیداوار کی اکثر و بیشتر مقدار سے خود کاشتکار گڑ یا راب[1] تیار کرتے تھے جو زیادہ تر اُسی شکل میں استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن جدید مفہوم کے مطابق شکر کی پیدائش ہندوستان کے چند حصوں میں جاری تھی۔ بنگال اس صنعت کا خاص مرکز تھا۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ہی معلوم کر چکے ہیں یہ پیداوار سمندر کے کنارے کنارے گھوم کر ملیبار تک اور دریائے گنگا کے راستے سے مغلیہ دارالسلطنت تک پہنچائی جاتی تھی۔ اب رہا اس کی تیاری کا طریقہ اس کی کوئی کیفیت ہمیں نہیں ملی البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ "باریک شکر" کہلاتی ہے جس سے غالباً مراد یہ ہے کہ وہ نہایت ہی باریک پسی ہوئی ہوتی تھی چنانچہ شمالی ہند میں لوگ اب تک اس نمونے کی شکر سے واقف ہیں۔ اس نمونے کی شکر کی کچھ مقدار احمد آباد میں بھی ملا کرتی تھی۔ لیکن زیادہ گراں قسم کی شکر جو مصری کہلاتی ہے وہ خاصکر لاہور کے قرب و جوار سے آتی تھی اور بعض دوسرے شہروں میں بھی تیار کی جاتی تھی۔ ان دونوں نمونوں کی قیمتوں کا فرق بہت زیادہ تھا چنانچہ ابو الفضل نے دارالسلطنت میں ایک من باریک شکر کی قیمت ۱۲۸ دام اور ایک من مصری کی قیمت ۲۲۰ دام بیان کی ہے۔ پس ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ

[1] بہتیرے مصنفین نے اس پیداوار کا ذکر کیا ہے لیکن طریقۂ کار کا صرف ایک حوالہ جو ہمیں مل سکا ہے وہ تھیونوٹ کے ایک جملہ میں (صفحہ ۲۱۹) جو اس نے دکن کے بارے میں لکھا ہے شامل ہے۔ وہ جملہ یہ ہے کہ ہر کاشتکار کے پاس جو شکر کی کاشت کرتا تھا خود اپنا ہی شکنجہ اور اپنی ہی بھٹّی ہوتی تھی۔

باب ۸ پہلی شکر ایک عام معیار کا نمونہ تھی اور دوسری شکر گویا ایک مخصوص پیداوار تھی۔ لیکن حالیہ قیمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ارزاں قسم کی شکر بھی گراں نظر آتی ہے کیوں کہ جس شرح کا حوالہ دیا گیا ہے وہ قوت خرید کی تبدیلی کا لحاظ کرنے پر بھی فی من (جدید) ۲۵ تا ۳۰ روپیوں کے مساوی ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی قیمت ہے جس کی وجہ سے یہ چیز غریب طبقوں کی استطاعت سے باہر ہو جاتی ہے۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں سفید شکر تعیشات میں شامل تھی۔ اور یہ کہ اس کی پیدائش بہ مقابل آجکل کے بہت کم تھی۔ رہے غریب طبقوں کے لوگ یا وہ حلوائی جو ایسے طبقوں کے لیے ضروریات بہم پہنچاتے تھے وہ صرف گڑ استعمال کرتے تھے۔[1] (۱۵۵)

تیل نکالنے کا کاروبار غالباً انھیں انتہائی درجہ قدیم طریقوں پر جاری تھا جیسا کہ اب تک دیکھنے میں آتا ہے لیکن ہمیں کوئی ایسی تحریر نہیں ملی جس میں کام کرنے کے مروجہ طریقوں کی تشریح کی گئی ہو۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ صنعت منجملہ ان صنعتوں کے ہے جو اکبر کے بعد سے زوال پذیر ہو گئیں۔ کیوں کہ اس وقت تک لوگ معدنی تیل سے ناواقف تھے۔ تاہم جو تبدیلی واقع ہوی ہے اس کی وسعت ظاہر کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مواد موجود نہیں ہے۔ اسی طرح تجارتی پیمانے پر روئی اوٹانے کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اوٹنا اور کاتنا یہ دونوں کاروبار عام طور پر خود کاشتکار اور اس کے خاندان والے چلاتے تھے۔ لیکن نصف صدی بعد تھیونوٹ نے ایک مشاہدہ قلمبند کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر پہلے ہی سے تخصیص شروع ہو چکی تھی۔

---

[1] روہیلکھنڈ میں اس زمانے میں شکر صاف کرنے کا کہیں کوئی حوالہ نہیں ملا۔ یہ یقین کرنا کہ یہ صنعت جو کہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی اہم ترین صنعت ہے حال میں شروع ہوی ہے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی خلاف قیاس ہے کہ ابوالفضل اس کی موجودگی کو نظرانداز کر دے۔ جمنا کے جنوب میں کالپی اور بیانہ جیسے مقامات میں شکر صاف کرنے کا ابوالفضل نے ذکر کیا ہے لیکن روہیلکھنڈ کے کسی شہر میں وہ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

باب ۳

احمد آباد کے قریب اس نے کام کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت دیکھی جن کا کوئی خاص وطن نہ تھا بلکہ جو گاؤں گاؤں سفر کرتے رہتے تھے اور روئی دھنکتے اور کاتتے تھے یا جو کوئی اور کام مل جائے اُسے انجام دیتے تھے ۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جو ضرورت اب روئی کے خاص خاص علاقوں میں روئی اوٹانے کی گرنیاں قائم ہو جانے سے اس طرح موثر طور پر پوری ہو رہی ہے وہ سترھویں صدی میں محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی ۔ اس صنعت کی وسعت کے متعلق یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آگے چلکر کپڑے کی پیداوار کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہی اس پر بھی حاوی ہے ۔

اکبر کے دور حکومت میں تمباکو سازی کا کام ہندوستان کے اندر مشکل ہی سے شروع ہو سکتا تھا ۔ اُس کے عہدہ داران مال اس پودے سے واقف ہی نہیں تھے ۔ لہٰذا سولھویں صدی کے دوران میں وہ پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ خیال یہ ہے کہ پرتگالیوں کے توسط سے یہ پودا ہندوستان تک پہنچا ہے اور سب سے پہلے وہ صوبۂ گجرات میں جاری ہوا جہاں ۱۶۱۳ء میں وہ مل سکتا تھا ۔ لیکن اس کے تیار کرنے کے طریقے سمجھ میں نہیں آئے تھے ۔ افیون تیار کرنے کا فن بہار اور مالوہ دونوں جگہ قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا ولیم فنچ نے نیل بنانے کے ان طریقوں کی تشریح کی ہے جو بیانہ میں رائج (۱۵۹) تھے ۔ شمالی ہند میں یہی مقام نیل کی پیداوار کا خاص مرکز تھا ۔ یہ طریقے زیادہ تر وہی ہیں جو اُس وقت بھی جاری تھے جبکہ اس کا جدید کاروبار اپنے انتہائی عروج پر تھا گو تنظیم میں بہت سی تفصیلی تبدیلیاں واقع ہو گئی ہوں گی[1] ۔

نشہ آور مشروبات کی پیدائش کے متعلق یہاں چند الفاظ ضروری ہیں ۔

---

[1] سب سے زیادہ اہم تبدیلی صنعتی نہیں بلکہ زرعی ہے ۔ فصل تین سال تک زمین میں پڑی رہتی تھی اور اس سے ہر سال کچھ مقدار تراش لی جاتی تھی ۔ دوسری تراش سے بہترین رنگ ملتا تھا آبپاشی کی توسیع کے ساتھ ساتھ زرعی طریقہ میں بتدریج تبدیلی واقع ہوتی گئی حتیٰ کہ یہ فصل موسمی بن گئی ۔ (خطوط ماسوصولہ ۳ ۔ صفحہ ۲۷ و ۵۶ ۳)

باب ۵ | مغل بادشاہ سرکاری طور پر اس کاروبار کو بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ کوتوالوں یا عاملان شہر کو اکبر کا یہ حکم تھا کہ خانگی زندگی کے پوشیدہ مشاغل میں مداخلت کیے بغیر جس حد تک ممکن ہو سکے اس کے استعمال کو روکیں۔ اور جہانگیر نے تو اس کو کلیتاً ممنوع قرار دیدیا تھا حالاں کہ وہ خود نہایت زبردست پینے والا تھا۔ لیکن یہ آخری فرمان غالباً چنداں قابل وقعت نہیں تھا اور بہر صورت اس پر عملدرآمد نہیں ہوا[1] شراب اور جوش دی ہوئی مشروبات ملک بھر میں بہ آسانی دستیاب ہوتی تھیں۔ چنانچہ سیاحان یورپ کے بیانات میں ہمیں بار بار اس کے حوالے ملتے ہیں۔ جنوب میں یہ چیزیں زیادہ تر تاڑ کے رس سے تیار کی جاتی تھیں اور شمال میں مہوہ اور گڑ کا شیرہ مستعمل ہوتے تھے۔ پس جو پیداواریں ان علاقوں میں استعمال کی جاتی تھیں وہ وہی تھیں جو اب بھی مستعمل ہیں۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس زمانے میں جو طریقے رائج تھے وہ اسی نمونہ کے تھے جو آجکل نظم ونسقِ آبکاری کے زیر ہدایت متغیر ہوتے جا رہے ہیں۔

اب اگر کاروبار کے اس شعبے پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو ہمارے خیال میں اس نتیجے کی تائید میں کافی وجوہ موجود نہیں ہیں کہ آبادی کے تناسب سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی وہ آجکل کی آمدنی سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ تمباکو تو قطعاً نہیں بنایا جاتا تھا اور سفید شکر کی مقدار کم ہوتی تھی لیکن جو تیل نکالا جاتا تھا غالباً وہ مقدار میں زیادہ ہوتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ ادویات اور نشہ آور مشروبات کا صرفہ بھی بمقابل اس زمانے کے جب کہ موانعات اس قدر سخت اور محاصل آبکاری اس قدر بھاری ہیں زیادہ رہا ہو۔ اس بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ انیسویں صدی کے اثناء میں بمقابل اکبر کے زمانے کے بہت زیادہ نیل بنایا جاتا تھا لیکن جنگ عظیم سے پیشتر اس کی (۱۶۰)

[1] شاہجہاں کے دور میں ممانعت زیادہ سختی کے ساتھ جاری کی گئی تھی جیسا کہ منڈی کی شکایتوں سے ظاہر ہوتا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو ۲ صفحہ ۷۵ و ۱۰۳)۔ مگر پھر بھی وہ کلیتاً عام نہیں تھی کیونکہ وہی مصنف یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ سورت میں تاڑی کے درختوں کو عامل نے ٹھیکہ پر اٹھا دیا تھا۔ (۲-۲۲)۔

باب ۳

پیداوار بہت ہی گر گئی تھی اور یہی وہ زمانہ ہے جس کو ہم نے مقابلہ کے لئے منتخب کیا ہے ۔ پس بہت ممکن ہے کہ اُس وقت یہ کاروبار سولھویں صدی کے اختتام کی حالت سے کچھ زیادہ بڑے پیمانے پر نہ ہو ۔ مختصر یہ کہ اگر فوائد نقصانات کے مقابل رکھے جائیں تو ممکن ہے ہم یہ رائے قائم کرسکیں کہ بمقابل آجکل کے اکبرؔ کے زمانے میں ہندوستان کسی قدر ابتر حالت میں تھا ۔ لیکن جو کچھ اطلاعات ہمیں میسر ہیں ان میں تو ہمیں کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آئی جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ اس وقفے میں کوئی خاص معاشی تغیر واقع ہوا ہے ۔

پانچویں فصل

عام دستکاریاں

اب ہم مصنوعات کے دوسرے شعبے یعنی متفرق دستکاریوں کی طرف دبہ استثنائے پارچہ بافی متوجہ ہوتے ہیں۔ اس بارے میں سیاحوں کے بیانات سے جو خیال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ اس شعبے کی معاشی اہمیت کے متعلق نہیں بلکہ اس کی زرنگارگی اور مہارت کے متعلق ہے اور وہ بھی خاصکر نقل اتارنے میں۔ اکثر و بیشتر کاریگر جن کے کام خاص طور پر لوگوں کی نظروں پر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً جوہری جو سنار۔ ہاتھی دانت۔ مرجان۔ کہربا یا سیپی کے کام کرنے والے۔ دوائیں اور عطریات تیار کرنے والے وغیرہ۔ یہ سب ایک نہایت ہی تنگ و محدود بازار کے لئے مال فراہم کرتے تھے جہاں طلب زیادہ تر فضول خرچ حکمران طبقوں تک محدود رہتی تھی البتہ غیر ملکی بھی تھوڑا بہت مال خرید لیتے تھے لیکن ان کی طلب ہمیشہ متغیر ہوتی رہتی تھی۔ جو چیزیں یہ لوگ تیار کرتے تھے وہ بہت کچھ قابل قدر اور بعض صورتوں میں صناعی و کاریگری[1] کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے کاروبار کی مقدار زیادہ نہیں تھی اور ان کی چیزوں کی قدر کا بہت بڑا جزو خام پیداوار کی قیمت کا نتیجہ ہوتا تھا نہ کہ ان طریقوں کا جو مال تیار کرنے میں اختیار کیئے جاتے تھے۔

جو چیزیں بڑے بڑے بازاروں کے لئے تیار کی جاتی تھیں ان کی طرف کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے ہم دھاتوں کی

[1] صناعی کے تنزل کی جو شکایت چند سال سے اس قدر عام طور پر سنی جا رہی ہے وہ کوئی بالکل نئی بات نہیں ہے۔ تھیونوٹ نے سترھویں صدی کے وسط میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دہلی کے بعض کاریگر کچھ غیر مہارت یافتہ نہیں تھے لیکن ان کی کمائی بہت ادنیٰ ہوتی تھی اور اس لئے وہ صرف عجلت کا خیال کرتے تھے تاکہ زندگی بسر کرنے کے لائق کما سکیں۔

باب ۵

صنعتوں کو لیتے ہیں ۔ اس کے متعلق کسی سابقہ فصل میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ تانبے اور اس کی آمیزش سے بنی ہوئی چیزیں یقیناً تعیشات میں شامل ہوں گی ۔ کیوں کہ اس دھات کی قیمت قریب قریب مانع خرید تھی ۔ اور معیار زندگی کے متعلق جس شہادت کی ہم کسی آئندہ فصل میں تنقیح کریں گے اُس سے پتا چلتا ہے کہ آبادی کے غریب طبقوں کے پاس ایسی چیزیں درحقیقت شاذ و نادر ہی موجود ہوتی تھیں ممکن ہے کہ کسی مزدور پیشہ کے گھر میں پانی پینے کا کوئی چھوٹا سا برتن موجود ہو لیکن بڑے بڑے مٹکے اور تھالیاں یقیناً ان کی استطاعت سے باہر تھیں ۔ لہذا اگر اس صنعت کے بارے میں ہمیں قریب قریب کوئی اطلاع دستیاب نہیں ہے تو چنداں تعجب کی بات نہیں کیوں کہ آبادی کے تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے اُس زمانے میں یہ صنعت بمقابل آجکل کے بہت چھوٹی تھی ۔ لوہے کے مال کی حیثیت بھی اس دھات کی اعلیٰ قیمت کے تابع تھی ۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں تو عام طور پر استعمال ہوتی تھیں لیکن بھاری چیزیں تقریباً نامعلوم تھیں اور پیداوار خام کی جو مقدار استعمال کی جاتی تھی وہ آبادی کے تناسب سے یقیناً بہت تھوڑی ہوتی ہوگی ۔ مجموعی طلب کا بہت بڑا جزو تلواریں اور دوسرے اسلحہ سازوں کی طلب کا ہوتا تھا کیوں کہ اُس زمانے میں کثیر التعداد لوگ ہتیار رکھا کرتے تھے ۔ اس بارے میں کوئی شبہہ نہیں کیا جاسکتا کہ خانگی طور پر ہتیار بنانے کا کام پہلے سے گھٹ گیا ہے ۔ لیکن اس کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں سرکاری کارخانوں اور اسلحہ خانوں کے تیار کردہ مال کو رکھنا چاہئے جس کی مقدار اکبر کے کارخانوں سے بہت زیادہ ہے ۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں دھات ڈھالنے کے جو کارخانے اور لوہے کے جو کاروبار آجکل قایم ہیں اور جو بھاری بھاری چیزیں وہاں سے تیار ہوکر نکلتی ہیں اگر ان کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بہ مقابل سولھویں صدی کے اس زمانے میں اس صنعت سے بہ حیثیت مجموعی بہت زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے

(۱۶۱)

جہاں تک ہمارا اندازہ ہے چوبی کام کی ترقی میں پیداوار خام کی گرانی کے باعث ویسی کوئی رکاوٹ واقع نہیں ہوئی جیسی کہ دھات کی صنعتوں میں جن کا کہ ہم ابھی حال معلوم کر چکے ہیں ۔ ممکن ہے کہ خاص خاص قسم کے چوبینے کی رسد میں

باب۴ نقل و حمل کی دقتوں کے باعث دشواری محسوس ہوتی ہو لیکن گمان غالب یہ ہے کہ تعمیر مکان یا زرعی آلات و اوزار جیسے معمولی اغراض کے لیے وسیع غیر مزروعہ زمین کے موجود ہوتے ہوئے خام پیداوار بہ مقابل آجکل کے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہوگی ۔ اس صنعت کے جو شعبے بہت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھے اُن میں سے جہاز سازی اور گاڑیوں کی تیاری کو ہم نے جداگانہ غور و خوص کے لیے علٰحدہ کر دیا ہے، اور یہاں صرف فرنیچر اور صندوق سازی کا حال معلوم کریں گے اس بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ ان شعبوں کی پیداوار آبادی کے تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے بمقابل آجکل کے اُس زمانے میں بہت کم تھی ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں متوسط طبقے کے لوگ بہت زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں اور اعلیٰ طبقوں کی مانند انھوں نے نہایت وسیع پیمانے پر مغربی فیشن اختیار کر لیا ہے ۔ اس کے برعکس اُس زمانے میں فرمانرواؤں کے شاہی قصر بھی فرنیچر سے خالی نظر آتے تھے ۔ حتیٰ کہ پرتگالیوں اور ساحل کے مسلمان تاجروں کو چھوڑ کر کہیں بھی (۲۶۷) کرسی یا میز کی موجودگی کا کوئی ذکر ہمارے سامنے نہیں آتا ۔ جہاں تک بڑے بڑے چوبی سامان کا تعلق ہے اس کی فہرست مکمل ہو جاتی ہے اگر ہم پلنگوں ۔ الماریوں اور تپائیوں کو اُسمیں شامل کر لیں ۔ ان کے علاوہ زیورات کے صندوقوں کی سی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی طلب موجود تھی ۔ پرتگالی اپنے ضروریات زیادہ تر خلیج کھیے کی بندرگاہوں سے حاصل کرتے تھے اور پیرارڈ ذکر کرتا ہے کہ وارنش شدہ پلنگ پچی کاری کیے ہوئے صندوق اور اسی قسم کی دوسری چیزیں گووا میں درآمد کی جاتی تھیں ۔ مغربی ساحل کے مسلمان تاجروں کے مکانات دوسرے ہندوستانیوں کے مکانات کی طرح عام طور پر برہنہ نہیں رہتے تھے ۔ کیوں کہ باربوسا ذکر کرتا ہے کہ سورت کے قریب راندیر میں وہ اپنے مکانات کو ٹھیک حالت میں اور ساز و سامان سے آراستہ رکھتے تھے ۔ لیکن ان مستثنیات کو چھوڑ کر فرنیچر کی عدم موجودگی سارے ملک کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے ۔ پس ہم بہ حیثیت مجموعی یہ کہہ سکتے ہیں کہ چوبی کام کی صنعت پیداوار خام کی قلت کے باعث تو نہیں البتہ طلب نہ ہونے کی وجہ سے بہت محدود تھی ۔

باب ۵

چرمی سامان کے بارے میں اس دور کے متعلق جس قدر اسناد موجود ہیں ان میں بہت کم توجہ کی گئی ہے لہذا ہمیں بالواسطہ اس شعبے کا حال معلوم کرنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل صاف ہے کہ آجکل جس وسیع پیمانے پر خام چمڑوں کی برآمد اور مختلف قسم کی چرمی اشیاء کی درآمد ہوتی ہے وہ بالکل حال کی بات ہے اور اکبر کے زمانے میں ہندوستان اس شعبے میں بہ حیثیت مجموعی آپ اپنی پرورش کر سکتا تھا لیکن اس کے بعد سے جو حالات قائم رہے اُن میں خام چمڑوں اور کھالوں کی امکانی رسد غالباً زرعی آبادی کی وسعت کے ساتھ ساتھ کم و بیش ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ اس بنا پر یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ چرمی سامان کی صنعت اُس زمانے میں نسبتاً زیادہ پیداوار تھی کیوں کہ برآمد نہ ہونے سے پیداوار خام کی زیادہ مقدار دستیاب ہوتی تھی اور ملکی ضروریات کی تکمیل قطعاً مال درآمد سے نہیں ہوتی تھی۔ اس استدلال کا دارومدار اس پنہاں مفروضے کی صحت پر ہے کہ خام چمڑوں کی جس قدر رسد دستیاب ہوتی تھی اُس سے چرم بنائے جاتے تھے۔ اگر طلب کافی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی بڑا حصہ بغیر استعمال یوں ہی پڑا رہتا ہوگا تو پھر پیداوار بہ لحاظِ آبادی آجکل کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہوگی۔ اور ہمارے خیال میں صورتِ حال غالباً یہی تھی۔ آجکل ملک میں جس قدر چرم استعمال کیا جاتا ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ بوٹ اور شوز۔ ڈول۔ گھوڑوں کے ساز اور زین بنانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ ان اہم شعبوں کے مقابلے میں بقیہ پیداوار بالکل ناقابلِ لحاظ ہے اسی کے ساتھ ہمیں کوئی مثال ایسی نہیں ملی جس سے ظاہر ہو کہ اکبر کے بعد سے کسی اہم چیز کی تیاری میں چرم کا استعمال ترک کر دیا گیا ہو۔ لہذا اگر ملک کی ساری خام پیداوار استعمال ہوتی تھی تو ہم نے جن چیزوں کے نام گنائے ہیں وہ سب یا ان میں سے بعض نسبتاً بہت زیادہ استعمال ہوتی ہوں گی۔ لیکن اس کا ہمیں کوئی نشان نہیں مل سکا۔ غیر ممالک کے ارباب مشاہدہ عام لوگوں کے جوتے پہننے کے متعلق شاذ و نادر ہی کوئی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں وہ جو کچھ شہادت پیش کرتے ہیں اس پر بحث کرنے کے لیے زیادہ موزوں جگہ کسی آئندہ باب میں آئے گی۔ الغرض اس بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اُسے ہم پہلے ہی بیان کیے دیتے ہیں اور وہ نتیجہ

(دس ۱۶۳)

باب ۶ یہ ہے کہ آجکل کے مقابلے میں اُس زمانے میں جوتے بہت کم پہنے جاتے تھے[1]
یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ڈولوں سے آبپاشی کا طریقہ اُس زمانے میں
آجکل سے زیادہ عام تھا ۔ بلکہ ملک کے بعض حصوں میں تو وہ یقیناً بہت ہی
شاذ تھا۔ پس بہ حیثیت مجموعی اس غرض کے لیے کمتر چرم درکار ہوتا تھا۔ گھوڑوں
کے ساز وغیرہ کا جہاں تک تعلق ہے آئین اکبری میں اُن اشیا کی مکمل تفصیل
درج ہے جو شاہی اصطبل میں استعمال کی جاتی تھیں ۔ اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ
اُس فہرست میں چرم کا کس قدر شاذ ونادر ذکر آتا ہے ۔ زین زیادہ تر کپڑے
کے بنائے جاتے تھے اور باگ ڈور اور اگاڑی پچھاڑی رسی کی بنائی جاتی تھیں
گاڑیوں میں گھوڑے شاذ ونادر استعمال کیے جاتے تھے رہے بیل جن سے اُس
زمانے میں نقل وحمل کا بہت زیادہ کام لیا جاتا تھا اِن کے ساز میں تو اب بھی بہت
کم چمڑا نظر آتا ہے ۔ لہذا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُس زمانے میں جانوروں سے
مقابلۃً زیادہ کام لیا جاتا تھا حالانکہ یہ خود کوئی یقینی امر نہیں ہے تو بھی اُس سے
یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کی تیاری میں زیادہ چمڑا استعمال کیا جاتا ہو ۔ حقیقت یہ
ہے کہ چرم کے استعمال کی ترقی بالکل حال کی بات ہے اِس کا آغاز انیسویں صدی
سے ہوا ہے ۔ پس چرمی سامان کے خاص خاص بازار آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے
بہ مقابل آجکل کے نسبتاً چھوٹے تھے اور درآمد کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی لہذا
ہمیں یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنعت بہ حیثیت مجموعی آجکل کے مقابلے میں
کم وسیع تھی اور یہ کہ آجکل پیداوار خام جو برآمد ہوتی ہے وہ کسی قدیم صنعت کی
تباہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ جو پیداوار ابتدائی دور میں یوں ہی ضائع ہوجاتی
تھی وہ اب کام میں لائی جاتی ہے ۔

کاغذ اُس زمانے میں سارے جنوبی ہند میں بتدریج استعمال ہونے لگا تھا ۔

---

[1] آجکل ہندوستان میں بوٹ اور شوز کے تقریباً تین تین جوڑے ہر سال درآمد ہوتے ہیں ،
یہ تعداد بجائے خود بہت بڑی ہے لیکن آبادی کے تناسب سے وہ اس قدر تھوڑی ہے کہ اُس سے
ہمارے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

ابتداً جو سیاح اس حصۂ ملک میں آئے انھوں نے دیکھا کہ جملہ کتابت کھجور کے پتوں پر ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۶۴۳ء میں بھی ڈیلا ویل نے ایک قلمی نوشتہ بہ طور نمونہ حاصل کیا تو وہ انھیں پتوں پر لکھکر اُسے دیا گیا تھا۔ پیرارڈ ذکر کرتا ہے کہ گوا میں پرتگالی اپنے کاغذ کی رسد کچھ تو یورپ سے درآمد کرتے تھے اور کچھ چین سے اور کچھ کھمبے کی بندرگاہوں سے کھمبے کے کاغذ کے ماخذ کے متعلق ہمیں کوئی صریح اطلاع نہیں مل سکی لیکن ہمارے خیال میں بلا کسی اندیشے کے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ کاغذ سارے شمالی ہند میں متعدد مقامات پر اُن دستی ترکیبوں سے بنایا جاتا تھا جو کہ اب تک بھی پورے طور پر معدوم نہیں ہوئی ہیں۔ البتہ جو مقدار استعمال کی جاتی تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ تعلیم بہت کم تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ زیادہ تر تحتانی درجے ہی پر جاکر رک جاتی تھی اور تعلیم کے جو طریقے اختیار کیے جاتے تھے ان میں بہت کم کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ طریقے اب تک بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ فن طباعت کو سولھویں صدی میں عیسائی مبلغین نے چند مقامات پر جاری کیا تھا لیکن وہ ایک مدت تک دنیاوی اغراض کے لیے کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ سرکاری دفاتر اور تاجروں کے حسابات میں کاغذ استعمال ہوتا تھا و نیز علما اور خوشنویس اپنے قلمی نوشتوں میں اسے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں نہ مطبوعہ کتابیں تھیں نہ اخبارات۔ نہ کشتیاں ہوتی تھیں اور نہ اشتہارات۔ اور خطوط بھی بہت کم جو پس ان واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ اسٹیشنری یا لکھنے کے سامان کی پیدائش اُس زمانے میں بہت ہی تھوڑی تھی۔

ہاٹ (۱۶۴۳ء)

کمہاروں کا کاروبار غالباً اسی حالت میں تھا جیسا کہ وہ اس وقت موجود ہے یہ لوگ زیادہ تر بھدے مٹی کے برتن عام لوگوں کے استعمال کے لیے بناتے تھے۔ لیکن بعض مقامات کو کسی قدر بہتر برتن بنانے کی وجہ سے تھوڑی بہت شہرت حاصل تھی۔ مسلمان چینی کے برتن استعمال کرتے تھے لیکن اُن کی درآمد چین سے ہوتی تھی اور مشرقی تجارت میں اس کو کسی قدر اہمیت حاصل تھی۔ اگر جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ دھات کے برتن نسبتاً کم استعمال کرتا تھا تو پھر مٹی کے برتنوں کا بازار اس زمانے میں مقابلۃً بڑا ہوگا اور کمہار آجکل سے زیادہ مشغول رہتے ہوں گے۔ چنانچہ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے اس نتیجے کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ

باب۸ اس ذات کے بہت سے لوگ اب زراعت میں مصروف نظر آتے ہیں۔
ہندوستان کی صنعتوں میں یہ ایک نہایت ہی کم ترقی کرنے والی صنعت ہے اور چونکہ لوگوں کو اپنی ضروریات رفع کرنے کے زیادہ قابل ترجیح ذرائع میسر آتے لگے یہ صنعت زوال پذیر ہوتی گئی۔

جہاں تک تعمیر کی صنعت کا تعلق ہے اینٹ اور پتھر کا استعمال غالباً اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ اب ہے۔ عوام تو اپنے مکانات مٹی یا سنٹھے سے بناتے اور ان پر پھوس کی چھت ڈالتے تھے۔ متوسط طبقے بہ لحاظ اپنی تعداد کے (۱۶۵) قریب قریب ناقابل التفات تھے۔ تاجروں کے متعلق ہم معلوم کر چکے ہیں کہ وہ ظاہری شان و شوکت کے خلاف تھے اور اعلیٰ طبقوں کا دار و مدار کم از کم شمالی ہند میں تو زیادہ تر خیموں پر تھا نہ کہ عالی شان محلات پر۔ لہٰذا اگر موجودہ زمانے کے معیار سے اندازہ کیا جائے تو خانگی تعمیر میں اینٹ۔ پتھر اور چونے کا صرف کم تھا۔ صنعتی اغراض کے لیے تعمیر کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور نہ ہمارے پاس یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ اس کمی کی تلافی سرکاری تعمیرات کی زیادتی سے ہو جاتی تھی۔ اس شعبے میں جو کچھ جد و جہد ہوتی تھی وہ زیادہ تر غیر متقل نوعیت کی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بہت بڑا کام شروع کر دیا جاتا اور اس کی تعمیر کے لیے کثیر مقدار میں سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ لیکن زمانۂ حال کی تنظیم کی طرح اس وقت کوئی چیز موجود نہ تھی۔ آجکل تو مملکت۔ مقامی حکام۔ ریلوں کے نظم و نسق ان سب کی جانب سے ملک کے ہر حصے میں تعمیری کاروبار مستقل طور پر جاری رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چند سال کی مدت میں جس قدر تعمیر اس باقاعدہ انتظام سے ہو سکتی ہے وہ سابقہ دور کے بے قاعدہ طریقوں سے نہیں ہو سکتی تھی۔ مزید براں تعمیر میں جو وقت صرف ہوتا تھا اس کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ہم الہ آباد کے قلعے اور محل کو لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمانۂ حال کے معیار سے بھی یہ ایک بہت ہی بڑی تعمیر ہے۔ لیکن اس کا کام نصف صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک جاری رہا۔ لہٰذا اگر ہر سال کے اضافہ کو دیکھا جائے تو اس کی مقدار بہت ہی تھوڑی ہوگی۔ پس اگر ہم آجکل کے پارچہ بافی کے کارخانوں کو آرائشی مقبروں کے مقابل رکھیں تو ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑیگا کہ آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے تعمیر کی صنعت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے

باب ۵

اس کا ضرور افسوس ہے کہ آجکل کی اکثر عمارتوں میں خوش مذاقی اور فنی مہارت کے اظہار کی بہت کم گنجایش ہوتی ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ معاشی نقطۂ نظر سے وہ اکبر کے زمانے کی عمارتوں سے زیادہ کارآمد ہوتی ہیں ۔

پس جہاں تک اس شعبے کی صنعتوں کا تعلق ہے ہم بجا طور پر یہ یقین کرسکتے ہیں کہ آبادی کے تناسب سے جو آمدنی بہ شکل اشیا حاصل ہوتی ہے پہلے سے بہت کچھ بڑھی ہوی ہے مٹی کے برتنوں کی پیداوار میں غالباً تخفیف ہوگئی ہے ۔ اسلحہ سازی کی صنعت بھی بہ حیثیت مجموعی گری ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ فنون دستکاری کی پیداوار میں بھی ایک عام تخفیف نظر آتی ہو اگرچہ اس بارے میں کوئی ٹھیک اطلاع ہمیں دستیاب نہیں ہوئی ہے ۔ اس کے برعکس ہمارے پاس یہ (۱۶۶) یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ تعداد کے تناسب سے پیتل اور تانبے کی اشیا اور اسلحہ کے سوا لوہے کی بقیہ چیزیں ۔ لکڑی کا بنا ہوا سامان ۔ کاغذ اور اسٹیشنری اور بجز غریب طبقوں کی جھونپڑیوں کے ہر نوعیت کی عمارتیں ان سب کی پیداوار میں بھی تخفیف کے مقابل اضافہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ۔ اب ان دونوں فہرستوں کے موازنہ کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے اس میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں ہے ۔ مزید براں ایک اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ساری تبدیلیوں کا رجحان یکساں طور پر معاشی خوبی و اصلاح کی جانب ہے کیونکہ تقریباً تمام چیزیں جو زیادہ مقداروں میں تیار کی جارہی ہیں وہ یا تو مقابلۃً زیادہ دیرپا ہوتی ہیں یا دوسری چیزوں کی پیدایش میں کام دیتی ہیں ۔

چھٹی فصل

ذرائع نقل وحمل کی پیدائش

اب ہم مال و اسباب اور مسافراں دونوں کے ذرائع نقل وحمل کی پیدائش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ گذشتہ تین صدی کے اندر یہ کاروبار پانی کو چھوڑ کر زمین پر منتقل ہوگیا ہے۔ لہذا سہولت اسی میں ہے کہ سواری کے جو ذرائع دونوں عناصر پر استعمال کیے جاتے تھے ان کو ایک ہی فصل میں شامل کردیا جائے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ آبادی کے تناسب سے اکبر کے زمانے میں ایسی گاڑیوں کی نسبتاً بہت کم اہمیت تھی جو زمین پر استعمال ہوتی ہیں۔ ہم کسی سابقہ فصل میں معلوم کرچکے ہیں کہ گولکنڈے سے آگے جنوب کی طرف ہندوستان میں گاڑیوں کی آمد ورفت موجود ہی نہ تھی۔ اور شمالی علاقوں میں سڑکوں کے جو حالات لکھے گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو وہاں گاڑیوں کی آمد ورفت ممکن تھی تاہم اُس میں بہت سی دقتیں بھی تھیں۔ مسطح حصوں میں تو گاڑیاں استعمال کی جاسکتی تھیں لیکن دریاؤں اور زبردست اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے سخت دشواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ اور ذرعی مال کی آمد ورفت زیادہ تر بارکش جانوروں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ مگر جب کبھی کوئی خزانہ یا نیل کی سی قیمتی اشیا منتقل کرنی ہوتیں تو زیادہ تر گاڑیاں ہی استعمال کیجاتیں کیوں کہ ایسی صورتوں میں بار بار لادنا اور اتارنا بدیہی طور پر نامناسب تھا۔ مسافروں کی آمد ورفت کے لیے ملک کے بعض حصوں میں ہلکی گاڑیاں ملتی تھیں جنھیں تیز رفتار بیل کھینچتے تھے لیکن پالکی کی سواری زیادہ عام تھی۔ گھوڑے یا ٹٹو بوجھ کھینچنے کے لیے شاذ و نادر ہی استعمال کیے جاتے تھے[1] اور موجودہ زمانے میں متوسط طبقے کی جو سواریاں ہیں یعنی یکہ اور گاڑی یہ غالباً اکبر کے بعد نمودار (۱۶۶)

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جہانگیر کو جو تحفے بھیجے گئے تھے ان میں ایک انگریزی وضع کی چار پہیوں کی گاڑی بھی تھی جس کو دیکھ کر دربار والے کسی قدر حیرت میں پڑ گئے۔ اور مقامی کاریگر اُسے بہ طور نمونے کے استعمال کرنے لگے۔ (رو، ۲۔ صفحہ ۳۲۰)۔ اکبر کے قواعد و ضوابط میں بوجھ کھینچنے کے گھوڑوں کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا اور اس کے وسیع اصطبل محض سواری کے لیے قائم تھے (آئین۔ ترجمہ ۱۔ ۱۲۶)۔

باب۵

ہوئی ہیں جن میں سے اول الذکر تو ہندوستان کا نمونہ ہے اور آخر الذکر یورپ کا۔ لہٰذا گمان غالب یہ ہے کہ آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی تعداد اب پہلے سے زیادہ ہے۔ اور اگر ہم وہ کام بھی پیش نظر رکھیں جو مختلف ریلوے کمپنیوں کے کارخانوں میں کئے جاتے ہیں تو پھر اضافہ کی مقدار بہت زیادہ ہو جاتی ہے کیوں کہ جنگ سے پہلے اِن کارخانوں میں ریل کے ڈبوں اور انجنوں کی تعمیر و ترمیم کے لیے ایک لاکھ آدمی نوکر رکھے جاتے تھے۔ مزید براں اس کیفیت کو مکمل کرنے کے لیے ریلوں اور پختہ سڑکوں کی تعمیر کا بھی شمار ضروری ہے سولھویں صدی میں اِن کے مقابل کوئی چیز نہیں تھی۔ پس نتیجہ یہ ہے کہ اس شعبے میں آجکل بکثرت نیا کاروبار پیدا ہو گیا ہے جس میں سے صرف جہازوں اور کشتیوں کی پیداوار کی تخفیف منہا کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک اندرون ملک کے ذرائع جہاز رانی کا تعلق ہے اس تخفیف میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بنگال کے دریائی راستوں کے متعلق ہمیں کوئی مواد نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ وہاں سَن کی تجارت کی ترقی کے باعث کشتیوں کی سابقہ تعداد برقرار رہی ہو یا اس میں کسی قدر اضافہ ہی ہو گیا ہو۔ لیکن گنگا اور انڈس کے راستوں پر اُس زمانے میں آجکل سے یقیناً بہت زیادہ تجارت ہوتی تھی۔ فینچ نے ۱۸۰ کشتیوں کے بیڑے کے ساتھ آگرے سے بنگال تک سفر کیا۔ جمنا پر کشتیوں کی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ موقع پڑنے پر اکبر کا زبردست کیمپ منتقل کرنے کے لیے کافی ہو جائے اور لاہور اور ملتان کے جو حالات ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ انڈس کے راستوں پر بھی کشتیوں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ کشتیاں جو استعمال کی جاتی تھیں وہ کافی بڑی ہوتی تھیں چنانچہ لاہور میں اُن کا وزن ۶۰۰ ٹن[1] اور اس سے زائد ہوتا تھا۔ لاہور اور الہ آباد میں ساحلی تجارت کے لائق کشتیاں بنائی جاتی تھیں۔ جمنا پر بعض مال لانے کی کشتیاں ۱۰۰ ٹن کی ہوتی تھیں۔ اور گنگا کی کشتیوں کا وزن ۴۰۰ یا ۵۰۰ ٹن تک پہنچتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بہت ہی زیادہ آمد و رفت ہو سکتی ہے۔ تاہم کشتیوں کی

(۱۶۲۸ء)

[1] ہمعصر اسناد میں یہ لفظ مختلف املا سے لکھا گیا ہے۔ ہم نے انھی میں سے ایک املا (Tun) یہاں اختیار کیا ہے اور اس کے اسباب آئندہ باب میں واضح کیے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ جہازوں کی پیمائش کی جو اکائی اکبر کے زمانے میں استعمال ہوتی تھی وہی ہمارے بھی پیش نظر ہے۔ جہازوں کے جدید ٹن (Ton) سے جس کی تشریح تجارتی جہازوں کے قوانین میں کی گئی ہے ہم کو کوئی سروکار نہیں۔

باب۵

تعداد یا سالانہ پیداوار کے بارے میں سرسری طور پر بھی کوئی اندازہ کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ محض کسی خاص بیڑے کی وسعت کو دیکھ لینے سے دھوکے کا اندیشہ ہوتا ہے جب تک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اسی قسم کے بیڑے کتنی بار نقل و حرکت کرتے ہیں۔ دریائی راستوں پر ڈکیتی کے خطرات بالکل واقعی تھے۔ خشکی کی طرح پانی کے سفر کے لئے بھی کسی بڑی جماعت کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے تاجر خوشی سے انتظار کرتے ہوں گے۔ اور ہماری رائے میں یہ فرض کر لینا غلطی ہے کہ جس بیڑے کا فنچ ذکر کرتا ہے ویسے بیڑے اکثر نظر آتے ہوں گے۔ جو کچھ اس بارے میں کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ شمالی ہند میں اب سے زیادہ کشتیاں بنتی تھیں مگر ان کے مقابل خشکی کے ذرائع آجکل کہیں زیادہ افراط کے ساتھ مہیا ہیں۔ پس اگر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ تری کے راستے صرف تین اہم دریاؤں سے متعلق تھے اور ہندوستان کا بہت بڑا حصہ ان کے اثر سے باہر تھا تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اکبر کے زمانے کی کشتی سازی کی مقامی صنعت کو مقابلۃً اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی جتنی کہ سڑکوں پر چلنے والی گاڑیاں اور ریل کے ڈبے اور انجن بنانے والے کاروبار کو جو ملک کے تقریباً ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں آجکل حاصل ہے۔ لیکن اگر توازن برابر بھی ہوتا جب بھی ریلوں اور پختہ سڑکوں کی موجودہ پیداوار کی بدولت حالیہ دور کی موافقت میں بہت بڑا اضافہ نظر آتا ہے۔

اِس فصل کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جو ساحل بحر پر جہازوں اور کشتیوں کی تیاری سے متعلق ہے۔ دوسری صنعتوں کی طرح جہاز سازی کا بھی دارومدار بہت بڑی حد تک ضروری پیداواریں اکٹھا کرنے کی سہولت پر ہے۔ وہ صرف انہیں مقامات پر جاری رہ سکتی ہے جو سمندر کے ساحل پر واقع ہوں۔ اور ساحل پر بھی جن مقامات میں پیداواروں کی جلد از جلد بہم رسانی ہو سکے وہی اس کے واسطے موزوں ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں وہ اُن مقامات میں پائی جاتی ہے جو فولاد اور ایندھن کی رسد سے قریب ہوں۔ لیکن سولھویں صدی میں لکڑی کی رسد اس بارے میں فیصلہ کن ہوتی تھی۔ اور جہاز صرف وہیں بنائے جاسکتے تھے جہاں موزوں لکڑی دستیاب ہوتی تھی۔ چنانچہ آجکل کی طرح اُس وقت بھی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی خاص ملک کی تجارت کسی اور ملک کے بنے ہوئے جہازوں سے ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے آبنائے ملاکا اور راس امید کے درمیان ہندوستانی سمندروں میں جس قدر جہاز رانی ہوتی تھی اُس سب کو اجتماعی حیثیت سے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعض جہاز

باب ۵

اِن سمندروں میں باہر سے بھی داخل ہوتے تھے اور یہ زیادہ تر پرتگالیوں کے اور کبھی کبھی آبنائے ملاکا[1] کے اُس طرف سے آنیوالے سیاحوں کے ہوتے تھے۔ لیکن مقامی تجارت کا اکثر و بیشتر حصہ انھیں جہازوں کے ذریعے سے جاری تھا جو اِن حدود کے اندر بنائے جاتے تھے۔ اِس نقطۂ نظر سے بحیرۂ ہند کے ساحلوں میں زبردست فرق نظر آتے تھے۔ ایک طرف تو ایسے وسیع ساحلی قطعات خاصکر بحیرۂ احمر پر موجود تھے جہاں ضروری پیداوار کی عدم موجودگی کے باعث جہاز سازی کا کاروبار ناممکن تھا۔ دوسری طرف مشرقی افریقہ اور ہندوستان کے مشرقی ساحل کی طرح ایسے قطعات بھی موجود تھے جہاں یہ کاروبار جاری کیا جاسکتا تھا۔ اِن کے علاوہ چند اور قطعات بھی تھے جیسے کہ مغربی ساحل اور خلیج مرتبان کے قرب وجوار کے مقام جہاں ساگوان کے جنگلات کی قربت سے نہایت زبردست فائدہ حاصل تھا۔

بحیرۂ احمر کے ساحلوں پر لکڑی کی کمی ہندوستان کے حق میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ کیوں کہ بحیرۂ ہند کی تجارت پر غلبہ حاصل کرنے میں پرتگالیوں کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ اسی واقعے پر تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے سواحل کا تعلق ہے پرتگالیوں کو کسی باقاعدہ مخالفت سے سابقہ نہیں پڑا۔ لیکن سولھویں صدی کی بالکل ابتدا میں ان کے لیے ایک سخت خطرناک صورت نمودار ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ سویز پر ایک بیڑہ تیار کیا گیا جس کے لیے خام پیداوار بحیرۂ روم سے خشکی کی راہ سے لائی گئی۔ اور بعد ازاں جب ترک جانب جنوب عربستان میں آگے بڑھے تو انھوں نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بھی کوششیں کیں چنانچہ ۱۵۸۶ء کے قریب انھوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل پر قدم جمانے کی کوشش کی جس کی خاص غرض یہ تھی کہ جہاز سازی کے لیے لکڑی حاصل کی جائے۔ اس کے کچھ بعد پیگو اور سماٹرا سے پیداوار درآمد کرنے کی انھوں نے سخت کوششیں کیں۔

---

[1] بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں چینی جہازوں کی آمد ہندوستانی سمندروں میں موقوف ہوچکی تھی۔ گو یہ صحیح ہے کہ ملاکا یا سماٹرا سے آگے وہ شاذ و نادر ہی آتے تھے تاہم ہندوستان میں اُن کے وارد ہونے کی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ ۱۵۹۶ء کے قریب ایک جہاز چین سے اور ایک جاپان سے نیگاپٹم پہنچا تھا (رہیے۔ صفحہ ۸۳۵)۔ اس کے علاوہ کوٹو بھی ۱۵۰۳ء میں اسی بندرگاہ پر ایک چینی کشتی کا ذکر کرتا ہے (ڈیکاڈا۔ ۱۔ ۱۔ ۲۵۔ ۲) اور ۱۵۸۵ء میں ایک اور چینی کشتی کا (۱۰۔ ۲۔ ۱۱۶)۔

باب ۵

لیکن دونوں صورتوں میں پرتگالی اس قابل تھے کہ اپنے دشمنوں کی ترکیبوں کو تباہ کردیں چنانچہ ڈچ لوگوں کے وارد ہونے تک ان کی بحری قوت یا کسی حریف مقابل کے برابر جاری رہی ۔ اگر کہیں ترک اس قابل ہوتے کہ اپنی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لیے ایک کافی زبردست بیڑا تیار کرسکیں تو پھر ہندوستان کی تاریخ ایک بالکل جداگانہ صورت اختیار کرتی ۔

(۱۶۰) ہمیں کوئی مواد ایسا نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ شرقی افریقہ کے وسائل اس زمانے میں بڑے پیمانے پر کام میں لائے جاتے ہوں ۔ ساحلی کشتیاں تو وہاں اور غالباً جہاں کہیں خام پیداوار دستیاب ہو سکے بنائی جاتی تھیں لیکن سمندر پر چلنے والے جہاز تعمیر نہیں کیے جاتے تھے یا کم از کم ان کی تعداد اس قدر تھوڑی ہوتی تھی کہ مسافروں کی توجہ ان کی طرف مبذول نہیں ہو سکتی تھی۔[1] جہاں تک پیگو کا تعلق ہے وہاں پر جہاز سازی کی شہادت واضح نہیں ہے ۱۵۸۳ء میں ایک سیاح نے لکھا ہے کہ وہاں خام پیداوار اس قدر وافر ہے کہ ایک جنگی بیڑہ تعمیر کرنے کے لیے کافی ہو سکے ۔ لیکن پھر بھی جہاز تعمیر نہیں ہوتے تھے کیوں کہ "اُن کو چلانے یا بنانے والوں" کی وہاں کمی تھی ۔ اِس بیان سے بامہارت کاریگروں کی کمیابی کا پتا چلتا ہے ۔ اس کے برعکس دہانۂ دریا کی بے شمار نہریں اُس زمانے میں قسم قسم کی کشتیوں سے بھری ہوتی تھیں جو یقیناً مقامی طور پر بنائی جاتی تھیں ۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس زمانے میں جس قدر کاریگر موجود بھی تھے وہ سمندر پر چلنے والے جہاز تو نہیں البتہ معمولی کشتیاں بنانے میں لگے رہتے تھے ۔ مرتبان کی صورت حال کے متعلق بھی کسی قدر اشتباہ کی گنجائش موجود ہے ۔ لیکن ہمارے خیال میں وہاں اس زمانے میں اگر کچھ کشتیاں بنائی بھی جاتی تھیں تو وہ بہت تھوڑی تھیں ۔ تناسرم اور سماٹرا میں بھی کچھ تھوڑا سا کام جاری تھا لیکن اسناد کے عام طرز بیان سے ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرتگالیوں کی یوروپی تجارت کو چھوڑ کر ، ہندوستانی سمندروں کی تجارت کا اکثر و بیشتر حصہ ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں کے ذریعے سے طے پاتا تھا ۔ اور اِن جہازوں میں جس قدر بڑے بڑے جہاز ہوتے تھے وہ سب اور اِن کے علاوہ بھی زیادہ تعداد مغربی ساحل پر تیار کی جاتی تھی اور

[1] فریا جھاتو ڈوس سینٹوس ذکر کرتا ہے کہ اس ساحل پر "جہاز" بنائے جاتے تھے ۔ لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کے بڑے سے بڑے جہاز بھی صرف ساحلی آمد و رفت کے لیے موزوں تھے ۔ (پرچاس ۲ - ۹۰۲ - ۱۵۵۵)

باب ۶ | وہ بھی کسی ایک مرکز پر نہیں بلکہ متعدد بندرگاہوں یا خلیجوں پر جو جنگلات سے قریب واقع ہوتے تھے۔ یہ ایک بالکل یقینی بات ہے کہ بنگال سے لے کر سندھ تک جس قدر ساحلی تجارت جاری تھی ان کے لئے بھی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہندوستان ہی میں بنائی جاتی تھیں۔ پس اگر ہمعصر معیاروں کو پیش نظر رکھکر اندازہ کیا جائے تو جہاز رانی کی مجموعی مقدار بہت زیادہ تھی۔

معمولی استعمال کے جہازوں کی گنجایش بہت کم ہوتی تھی۔ جیسا کہ آیندہ باب میں معلوم ہوگا سمندر پر چلنے والے جہازوں کا اوسط بوجھ غالباً ۲۰۰ ٹن (Tun) سے کم ہوتا تھا اور ساحلی کشتیاں شاید ۵۰ یا ۶۰ ٹن (Tun) کی ہوتی ہیں اس کے علاوہ اول الذکر جہازوں کی تعداد در اصل اتنی نہیں ہوتی تھی جتنی کہ بعض اوقات فرض کرلی جاتی ہے۔ لیکن زیر استعمال "بوجھ کی مقدار" (Tunnage) اور سالانہ پیداوار پر بحث مباحثہ اُس وقت تک ملتوی رہنا چاہئے جب تک کہ بحری تجارت کے بارے میں جو کچھ واقفیت ہمیں حاصل ہے اُس پر غور نہ کر لیا جائے۔ البتہ مسافروں کے بڑے بڑے جہازوں کا یہاں (۱۸۱) ذکر کیا جاسکتا ہے جن کی ساخت میں ہندوستان نے غالباً رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ کونٹی نے پندرھویں صدی میں یہ بات قلمبند کی ہے کہ یہاں ایک ایک ہزار ٹن [1] تک کے جہاز موجود تھے۔ جو بحیرۂ روم کے جہازوں سے جن سے کہ وہ واقف تھا کہیں زیادہ بڑے ہوتے تھے۔ اور مغربی ساحل پر جو انگریز سیاح ابتداءً وارد ہوتے تھے انھوں نے تو ان سے بھی زیادہ بڑے جہاز بیان کئے ہیں جو پرتگالیوں کی بڑی بڑی کشتیوں کے سوا اور کسی کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر نہیں تھے۔ یہ ہندوستانی جہاز محض حاجیوں کو بحیرۂ احمر تک پہنچانے کے لئے استعمال کیے جاتے تھے۔ اور اگر سب کا شمار کیا جائے تو ہمارے خیال میں ان کی تعداد کسی ایک وقت میں نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی بحیثیت بحری کشتیوں کے وہ چنداں اچھے نہ تھے اور ان کی گہرائی اکثر ہندوستانی بندرگاہوں کا لحاظ کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ بڑی تھی۔ لیکن کیا بہ لحاظ نمونہ اور کیا بلحاظ ساخت وہ بہت بڑا کارنامہ تصور کیے جاتے ہیں اور یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ

[1] وہ ۲۰۰۰ بٹ (Butts) بتاتا ہے اور ایک ٹن (Tun) دو بٹ کے برابر ہوتا ہے۔

باب۹

اِن کے بنانے کی کوئی کیفیت ہمارے لئے باقی نہیں رہ سکی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں کی داستان مکمل کرنے کے لئے اس قدر اور بتا دینا چاہیئے کہ پرتگالیوں نے بمبئی کے شمال میں ساحل پر بہ مقام بسین چند کشتیاں بنائی تھیں۔ لیکن عام طور پر اس قسم کے جہاز یورپ میں بنا کرتے تھے اور اُن کی جو کچھ مثالیں یہاں نظر آتی ہیں وہ مستثنیات میں شامل ہونی چاہئیں۔ اس کاروبار کی اہمیت کا دارومدار تو دراصل اسی بات پر تھا کہ بحری تجارت کے لئے چھوٹے جہاز اور ساحلی تجارت کے لیے چھوٹی چھوٹی کشتیاں کافی تعداد میں بہم پہنچائی جائیں۔

باب ۴

ساتویں فصل

مصنوعات پارچہ بافی

ریشم - اون - بال

اب ہم ہندوستانی مصنوعات کے آخری اور اہم ترین شعبے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہماری مراد اُن صنعتوں سے ہے جن میں ریشم۔ اون اور بال۔ پٹ سن۔ جوٹ اور روئی جیسے مختلف ریشوں کو لیکر کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ مذکورۂ بالا ترتیب کے مطابق ہم ان میں سے ایک ایک چیز کا حال معلوم کریں گے۔ ہندوستان کے ریشم کی صنعت کے زوال کے متعلق نہایت کثرت کے ساتھ خامہ فرسائی کی جاچکی ہے چنانچہ اکثر لوگوں کو یہ یقین ہے کہ اس صنعت کا وجود کئی صدیوں تک ملک کی معاشی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت رہا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رائے بہت کچھ مبالغہ آمیز ہے۔ ریشمی پارچہ بافی اکبر کے زمانے میں ایک چھوٹی سی صنعت تھی۔ بعد ازاں اس کو جو زوال ہوا اور جس پر اس قدر زور دیا گیا ہے اس کی وجہ سے پارچہ بافی کی صنعت اس قدر متاثر نہیں ہوی جس قدر کہ خام پیداوار کی پیدائش جو کہ اکبر کی وفات کے بعد ممالک یورپ کی طلب کیوجہ سے بہت زیادہ ترقی کرگئی تھی۔ غرض ۱۶۰۰ء کے قریب کے زمانے کے متعلق وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیار شدہ مصنوعات کی برآمد بہت تھوڑی تھی۔ خود ملکی بازار کی وسعت بہت محدود تھی اور اس کی رسد بھی اکثر و بیشتر بیرونی مال کی درآمد سے پوری ہوتی تھی۔ البتہ چند مرکزی مقامات پر ریشمی پارچہ تیار کیا جاتا تھا لیکن اس کی مجموعی پیداوار بہت تھوڑی ہوتی تھی اور یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں جو خام ریشم صرف ہوتا تھا اس کا بڑا حصہ مخلوط مال تیار کرنے میں استعمال کیا جاتا ہو۔ چنانچہ یہ اب تک بھی یہاں کی دستی پارچہ بافی کی ایک خصوصیت ہے۔ (۱۷۳)

ہندوستان سے جو مال برآمد ہوتا تھا اُس کی قلت ان اشخاص کے سکوت سے ظاہر ہوتی ہے جنھوں نے اس دور کی تجارت کے متعلق حالات و واقعات قلمبند کئے ہیں

بابٹ اور جوہر ایسی چیز کا جس سے ممالک یورپ کے باشندوں کو دلچسپی ہوتی تھی غور و احتیاط کے ساتھ مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ریشم یقیناً ایسی ہی ایک چیز تھی۔ مالِ برآمد کے متعلق جس قدر تفصیلی حالات باربوسا نے قلمبند کئے ہیں کسی اور مصنف نے نہیں کئے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اوائل صدی میں کچھ ریشمی سامان گجرات سے مشرقی افریقہ کے ساحل اور پیگو کو گیا تھا۔ اس کے علاوہ باربوسا کسی اور بازار کا پتہ نہیں دیتا۔ اور بقیہ مصنفین بجز ایک استثنا کے خاموشی کے ساتھ اس مضمون کو ترک کر دیتے ہیں۔ جس استثنا کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ ورتھما ہے جس کی کتاب میں یہ درج ہے کہ "کل ایران۔ تاتار۔ ترکی۔ شام۔ بربر۔ عربستان۔ حبش" اور بعض دوسرے مقامات میں "ریشمی اور سوتی کپڑے کی بہم رسانی گجرات سے ہوتی تھی۔ لیکن اس کتاب میں بہت سی باتیں ایسی موجود ہیں جن سے حالات و واقعات کے درج کرنے میں مصنف کی قدرے لاپروائی ظاہر ہوتی ہے ہم کیونکر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ ورتھما نے یہاں ریشمی مال کی وسیع تجارت دیکھی تھی جو اُس کے ہم عصروں سے پوشیدہ تھی۔ بلکہ جن ممالک کے اس نے نام بتائے ہیں ان میں سے بعض تو خود ہندوستان کو اُس زمانے میں سارا ریشمی مال بھیجا کرتے تھے۔ لہذا ورتھما کے اِس فقرہ کی جو توجیہہ سب سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے ریشمی اور سوتی مال میں ٹھیک ٹھیک امتیاز نہیں کیا۔ یہ بات بے شک یقینی ہے کہ اُس کے بتائے ہوئے اکثر و بیشتر ممالک کو ہندوستان سے سوتی مال بڑی بڑی تعداروں میں جاتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ سوتی تاگے کے ساتھ اس میں کچھ حصہ ریشمی تاگے کا بھی شامل ہو۔ لیکن باربوسا کی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کی تردید متعدد مصنفین کی مسلسل خاموشی سے ہوتی ہے ہمارا یہ خیال ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان سے ریشمی مال کی کثیر برآمد نہیں ہو سکتی تھی۔

تجارت برآمد کے مقابل خود ملک کے بازار کی اہمیت زیادہ تھی۔ کیوں کہ اعلیٰ طبقوں میں ریشمی کپڑا بہت استعمال ہوتا تھا۔ اور جو کوئی عمدہ سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا چاہتا تھا اُس کو اس وقت کے رواج کے لحاظ سے ایک وسیع توشہ خانہ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ (۱۷۳) ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر کے دار السلطنت میں نفیس چیزوں کا مذاق بہت عام ہو گیا تھا باربوسا نے وجیانگر کے امرا میں ریشم کا استعمال پایا اور جو طلب بہ سلسلۂ تعیش موجود تھی وہ اشخاص متعلقہ کی تعداد کے تناسب سے غالباً زیادہ تھی۔ یہ تعداد ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت ہی قلیل حصہ تھی۔ مزید براں اس بات کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ خاص خاص استعمال کرنیوالوں میں سے

باب ۳

اکثر لوگ بیرونی ممالک کے مال کو ترجیح دیتے تھے۔ ہندوستان میں مختلف قسم کا ریشمی مال مشرق اقصیٰ۔ وسط ایشیا۔ ایران اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلی ممالک سے آتا تھا چنانچہ باربوسا لکھتا ہے کہ اُس نے وجیا نگر میں بعض ریشمی کپڑے دیکھے جو چین سے آئے تھے۔ اور ابوالفضل کے بیان کردہ کپڑوں کی بھی بہت بڑی مقدار اُس کی رائے میں مذکورۂ بالا ممالک میں سے ایک نہ ایک سے تعلق رکھتی تھی۔ پس ایک محدود وسعت کے بازار میں ہندوستان کی صنعت کو زیادہ سے زیادہ صرف ایک حصہ حاصل تھا۔

اتفاقی طور پر ہمارے پاس ایک خبر محفوظ رہ گئی ہے جس کی بدولت ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِس صنعت میں کس قدر خام پیداوار صرف کی جاتی تھی۔ ریشمے کی جو تھوڑی سی مقدار کشمیر میں پیدا کی جاتی اور کام میں لائی جاتی تھی اُس سے قطع نظر صرف ایک بنگال ہی کی پیداوار ایسی تھی جس کا ہم اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر ذکر سنتے ہیں۔ ٹیورنیر نے سترھویں صدی کے وسط میں اس علاقے کی پیداوار کے اعداد وشمار حاصل کئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ڈچ لوگوں نے قاسم بازار میں اپنے قدم جمائے تھے اور ان کی بدولت ایک زبردست تجارت برآمد نمودار ہو چکی تھی۔ اُس زمانے میں مجموعی پیداوار تقریباً ڈھائی ملین پونڈ تھی[1] جس میں سے ایک ملین پونڈ تو مقامی طور پر کام میں لائی جاتی تھی۔ $\frac{3}{4}$ ملین پونڈ ڈچ لوگ خام حالت میں برآمد کر دیتے تھے اور $\frac{3}{4}$ ملین پونڈ ہندوستان بھر میں تقسیم ہو جاتی تھی جس کا اکثر و بیشتر حصہ تو گجرات کو جاتا اور کچھ مقدار وسط ایشیا کے تاجر بھی لے لیتے تھے۔ ڈچ لوگوں کی برآمد اس تجارت کی ایک نئی خصوصیت تھی۔ اُن کی طلب پوری ہوتی تھی اور بہت ممکن ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے پیداوار میں بھی بمقابل اکبر کے زمانے کے اضافہ ہو گیا ہو۔ پس اُن چھوٹے چھوٹے ذرائع کا لحاظ کرنے پر بھی جو کہ قلمبند نہیں کئے گئے ہیں سنہ ۱۶۰۰ء کے قریب مجموعی پیداوار کی مقدار ڈھائی ملین پونڈ سے زیادہ نہیں ہو سکتی جس کا تھوڑا سا حصہ ممکن ہے کہ بہ حیثیت خام پیداوار کے برآمد کر دیا جاتا ہو ہندستانی رسد کے ساتھ درآمد کی مقداریں شامل کی جاتی تھیں اور ذرائع درآمد میں سب سے زیادہ (۴۷!)

[1] ٹیورنیر نے ایک ایک سو لیور کے گٹھوں کے حساب سے اعداد درج کئے ہیں۔ لیور کے ان عددوں کو پونڈ میں لانے کے لئے ہم نے سرسری طور پر ۱۰ فیصدی کا اضافہ کر دیا ہے۔

اہمیت چین کی تھی۔ اور یہ تجارت کلیتاً پرتگالیوں کے زیر اقتدار تھی۔ سولھویں صدی کے وسط میں گرشیا ڈا اور ٹا[1] نے درآمد کی جو مقدار بیان کی ہے وہ ڈھائی لاکھ یا چار لاکھ پونڈ کے مساوی ہوتی ہے۔ لنچوٹن نے ۱۵۹۰ء کے قریب تحریر کرتے ہوئے اس کی مقدار چار لاکھ پونڈ (تین ہزار قنطال) بیان کی ہے اور یہ غالباً سرکاری عدد ہے۔ اس کے علاوہ درآمد کا ایک ذریعہ غالباً ایران تھا چنانچہ پیرارڈ کہتا ہے کہ آرمز سے کچھ خام ریشم برآمد کیا جاتا تھا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ وہ ہندوستان کو روانہ کیا جاتا تھا لیکن اگر ایسا ہوتا بھی ہوگا تو اس کی مقدار زیادہ نہیں ہو سکتی کیونکہ گجرات کے صنعتی مرکز جہاں قدرتی طور پر ایرانی ریشم جا سکتا تھا زیادہ تر بنگال اور چین سے اپنی رسد حاصل کرتے تھے۔ ایران میں جو مقدار دستیاب ہوتی تھی وہ زیادہ نہ تھی[2] اور معمولی حالات تجارت میں وہ مشرق کی طرف نہیں بلکہ جانب مغرب جایا کرتی تھی کیوں کہ دور زیر بحث کے چند سال بعد اس کا موجودہ رُخ بدل دینے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ لہذا ہندوستان کی مجموعی درآمد نصف ملین پونڈ سے زائد نہیں ہو سکتی اور جملہ صرف بشمول مقدار درآمد و پیداوار ملکی زیادہ سے زیادہ تین ملین پونڈ خام پیداوار ہو سکتا ہے۔ موجودہ ہندوستانی پیداوار کے جو تازہ ترین تخمینے ہماری نظر سے گذرے ہیں ان کے مطابق مجموعی مقدار تین ملین پونڈ ہے۔ اور درآمد کی مقدار (خاصکر چین سے) جنگ سے قبل کے سالوں میں تقریباً ڈھائی ملین پونڈ تھی۔ پس قریب قریب ڈیڑھ ملین پونڈ برآمد کی مقدار نکال کر اس صنعت میں کم و بیش ۴ ملین پونڈ صرف ہوتے تھے۔ ان اعداد کے لحاظ سے ہندوستان کی

[1] ایک مقام پر مترجم کہتا ہے کہ گرشیا ڈا اور ٹا نے جو اکائی استعمال کی تھی وہ ۳۵۲ پونڈ کے مساوی تھی لیکن ایک اور مقام پر وہ ۶۰۰ پونڈ کے مساوی بتلائی گئی ہے۔ اور ہم یہ تحقیق نہیں کر سکے کہ کون سا عدد صحیح ہے۔

[2] رچرڈ اسٹیل جو ایران کے ساتھ تجارت کرنے کا حامی تھا اور جو اسی وجہ سے اس کے امکانات کو گھٹا کر نہیں بیان کر سکتا تھا لکھتا ہے کہ (پرچاس ۱-۴-۵۲۳) بادشاہ کی کتابوں کے مطابق ایران میں ہر سال ...۱۰ من خام ریشم پیدا ہوتا تھا۔ ایک مَن ریشم تقریباً دس یا بارہ پونڈ کے مساوی ہوتا تھا (خطوط موصولہ ۳-۱۷۷)۔ پس جو مجموعی مقدار دستیاب ہوتی تھی وہ ایک لاکھ پونڈ سے کم ہوتی تھی۔ معمولاً وہ ترکی کے راستہ سے یورپ کو برآمد کر دی جاتی تھی (خطوط موصولہ -۴- ۱۹۲ و ۲۴۱)۔ پس جب تک کہ مغربی جانب کا راستہ کھلا تھا ہندوستان کو کوئی بڑی مقدار نہیں آ سکتی تھی۔

باب ۵

اس صنعت نے بہ حیثیت مجموعی اضافۂ آبادی کا ساتھ نہیں دیا جہاں تک خود اس صنعت کا تعلق ہے یہ اضافی تخفیف اہم ہے لیکن ہندوستان کی جملہ آبادی کی اوسط آمدنی میں اس کی بدولت کوئی بڑی تخفیف نہیں ہوئی ہے۔

(۱۰۵) ریشم بافی کی صنعت خاص خاص مقامات میں محصور تھی۔ جیساکہ اس کی پیداوار کی نوعیت ہی سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمعصر مصنفین زیادہ تر گجرات اور اس میں بھی خاص کر کیمبے۔ احمد آباد اور پٹن کے کپڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چول میں بھی جو بمبئی سے بجانب جنوب چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے ریشم بافی کا کام جاری تھا[1] ان کے بیانات سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس صنعت کا مدار کلیتاً چین کی پیداوار پر تھا لیکن ہمارے خیال میں غالباً بنگال سے بھی رسد حاصل کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب ٹیورنیر نے لکھا تھا تو یقیناً یہی صورت حال تھی۔ مصنف نے لکھا ہے کہ ایک بڑی مقدار بنگال میں مقامی طور پر صرف ہوتی تھی اور یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ گو سیزر فریڈرک یا رفیچ جیسے سیاحوں نے اس مضمون پر بہت کم قلم اٹھایا ہے۔ کشمیر کی پیداوار مقامی طور پر کام میں لائی جاتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ وسیع نہیں معلوم ہوتی۔ اور آگرہ۔ لاہور اور غالباً بعض دوسرے شہروں میں بھی یہ کاروبار کیا جاتا تھا لیکن ہندوستانی ریشمی مال کو جو کچھ بھی شہرت حاصل تھی اس کا مدار گجرات کے کپڑوں پر تھا۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اکبر نے ملکی پیداوار کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ بادشاہ نے بیرونی مال کی ساری پیداوار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کی محافظت میں بیرونی کاریگر ہندوستان میں بس گئے تھے ریشم کاتنے کا کاروبار درجۂ کمال پر پہنچ گیا تھا اور جس جس قسم کا مال دوسرے ملکوں میں بنتا تھا وہ سب شاہی کارخانوں سے فراہم ہونے لگا تھا جن مقامات پر ان تدبیروں کا اثر پڑا تھا ان میں وہ لاہور۔ آگرہ۔ فتح پور۔ احمد آباد اور گجرات کا ذکر

[1] چول میں اس صنعت کی ترقی حال کی بات معلوم ہوتی ہے سولھویں صدی کے اوائل میں جب بار بوسا نے اس بندرگاہ کے بارے میں لکھا تو وہ تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لیکن وہ ریشم کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور نہ کسی صنعت کا کوئی حال بیان کرتا ہے ختم صدی کے قریب لنچوٹن اور دوسرے مصنفین ایک اہم ریشم بافی صنعت کا حال قلمبند کرتے ہیں جو بار بوسا کے زمانے کے بعد نمودار ہوئی ہوگی۔

کرتا ہے۔ گو اس بیان میں رسمی خوشامدانہ کلمات کی رنگ آمیزی موجود ہے تاہم وہ بحیثیت مجموعی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لہذا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ شاہی سرپرستی کی بدولت اس صنعت کو اس کے خاص مرکز یعنی گجرات میں ترقی نصیب ہوئی ہوگی اور نیز تینوں شمالی دارالسلطنتوں میں جن دستکاروں کا انحصار براہ راست شاہی دربار پر تھا ان کی ہمت افزائی ہوئی ہوگی۔

اس چیز سے قطع نظر جس کو واقفکار سیاح ریشم تسلیم کرتے تھے بنگال کے اندر اس زمانے میں چند اور کپڑے تیار کئے جاتے تھے جو بعض ایسے ریشوں سے بنائے جاتے تھے جن کا وہ ریشم سے مقابلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ پیرارڈ ریشم کے نبات کا ذکر کرتا ہے۔ لنچوٹن ایک قسم (۱۷۶) کے کپڑے کا حال بیان کرتا ہے جو کسی نبات سے کاتا جاتا تھا۔ سیزر فریڈرک نے نباتات کے کپڑوں کی کیفیت قلمبند کی ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ "وہ ایک قسم کا ریشم ہے جو جنگلوں میں اوگتا ہے"۔ اور فنچ ایک ایسے کپڑے کا ذکر کرتا ہے جو وہ ایک قسم کی گھاس سے کہ جو یرُوا کہلاتی ہے بنایا جاتا ہے اور وہ ریشم کے مانند ہوتا ہے"۔ یہ کون سے کپڑے تھے اس کا ٹھیک پتہ لگانا کچھ غیر یقینی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں ان تمام بیانات کا اشارہ کم از کم جزئی طور پر چھوٹا ناگپور کے "جنگلی" ریشموں کی طرف ہے جو دراصل جنگلوں میں جمع کئے جاتے ہیں اور جن کی اصلیت زبانی روایت کے مطابق بجائے کیڑے کے کسی پودے سے بآسانی منسوب کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور ریشہ اس زمانے میں مقامی طور پر پیدا کیا جاتا ہو لیکن اس رائے کی حمایت میں کسی خاص سند کا ہمیں علم نہیں ہے بلکہ جس قدر شہادت دی گئی ہے وہ سب منقولہ ہے۔ چنانچہ پیرارڈ نے بہت تھوڑا وقت چٹاگانگ میں صرف کیا۔ اور جو کچھ وہ سن سکا اسی کا ہم سے ذکر کرتا ہے۔ لنچوٹن تو بنگال گیا ہی نہیں اور دوسرے معتمد اشخاص کے متعلق بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی اپنی واقفیت قصبات سے حاصل کی۔ بہرحال ریشہ کوئی سا ہو کپڑے کی تیاری زیادہ سے زیادہ مقامی اہمیت رکھتی تھی لہذا ہندوستان کی جملہ پیداوار کا تخمینہ کرنے میں اس کو شامل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ریشم کے برخلاف جو کہ ایک خاص کر تعیش کی چیز ہے اون امیر و غریب دونوں کی پوشاک میں استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک معاصر اسناد سے پتا چلتا ہے دور زیر بحث میں ہندوستان کے غریب طبقے بہت کم اون استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ایک مثال بھی ایسی نہیں بتا سکتے جس میں شمالی ہند کے کسی سیاح نے یہ ذکر کیا ہو کہ کوئی معمولی شخص اُس

باب ۴

زمانے میں اونی لباس یا کم از کم اونی کمبل ہی پہنتا یا استعمال کرتا ہو۔ حالانکہ جہاں تک سوتی کپڑوں کا تعلق ہے متعدد مصنفین نے اس طرح کے تفصیلی اور قلمبند کئے ہیں لہذا اگر وہ سردی یا بارش کے موسم میں ہندوستانیوں کو اونی کمبل اوڑھے ہوئے دیکھتے جس طرح کہ وہ آجکل کثرت سے دکھائی دیتے ہیں تو یقیناً وہ اس واقعہ کو بھی قلمبند کرتے۔ معمولی کمبل البتہ موجود تھے کیونکہ ابوالفضل اپنی قیمتوں کی فہرست میں انھیں شامل کرتا ہے۔ ان سب سے ارزاں کمبلوں کی قیمت دارالسلطنت کے قرب وجوار کے بازاروں میں دس دام یا یوں کہئے ۴۶ پونڈ گیہوں ہوتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۲ء کے قریب ایک کمبل تقریباً ۲۳ پونڈ گیہوں کے معاوضہ میں مل جاتا تھا۔ لہذا سابقہ دور میں بہ مقابل اس زمانے کے وہ بہت ہی گراں تھیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اکبر کے اصطبل میں اچھے سے اچھے گھوڑوں کے لئے بھی کمبل فراہم نہیں کئے جاتے تھے بلکہ بھرے ہوئے سوتی کپڑے کی جھولیں دی جاتی تھیں یہی عملدرآمد دوسرے بڑے بڑے اصطبلوں میں بھی جاری تھا اور اب تک بھی لوگ اس سے ناآشنا نہیں ہیں۔ (۱۷۸)

اعلیٰ طبقوں میں اونی اشیا کے استعمال کے متعلق ہمارے پاس زیادہ مکمل اطلاع موجود ہے۔ چکدار اور بالخصوص گلنار رنگ کا کپڑا نمائش اور دکھاوے کی غرض سے ہر جگہ طلب کیا جاتا تھا۔ جنوبی ہند کے مختلف درباروں میں اونی پوشاک قدرتی طور پر بہت کم استعمال ہوتی تھی۔ لیکن شمال میں اون کا لباس پہنا جاتا تھا۔ اور چونکہ اکبر کو یہ لباس مرغوب تھا آگرے اور لاہور کے رواج پر بلاشبہہ اس کا بہت اثر پڑا۔ لیکن ریشم کی طرح اون بھی جو اعلیٰ طبقوں میں استعمال ہوتا تھا زیادہ تر باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ خریدار ہمیشہ نئے نئے نمونوں اور نئی قسم کی بافت کے متلاشی رہتے تھے۔ اور اٹلی۔ ترکی اور ایران کا کپڑا خاص خاص شہروں میں عام طور پر فروخت ہوتا تھا۔ بار بار رواج بدلنے سے درآمد کرنیوالے تاجر ہمیشہ پریشان رہتے تھے اور بازار کی حالت غیراطمینان بخش رہتی تھی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو تاجر رہنمائی کی غرض سے ابتداءً یہاں آئے تھے انھیں بہت کچھ مایوسیاں اٹھانی پڑیں جن کا ذکر نہایت نمایاں طور پر ان کی رپورٹوں میں موجود ہے جب کبھی کسی نئے کپڑے کے چند ٹکڑے بہ طور نمونہ کے روانہ کئے جاتے وہ فوراً فروخت ہوجاتے تھے لیکن بعد ازاں اسی نمونہ کے مزید تھان روانہ کرو تو پھر کوئی اُن کی طرف پلٹ کر

نہیں دیکھتا تھا۔ اور اس کے مستقل طور پر فروخت ہونے کی جو توقع شروع میں قائم کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ بیرونی ممالک سے جو نئے نئے نمونے آتے تھے مقامی کاریگر فوراً ان کی نقل اتار لیتے تھے۔ ان کاریگروں کی تعداد غالباً اتنی زیادہ نہیں تھی کہ سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ بھیڑیں ملک کی زراعت کا کوئی اہم عنصر نہیں تھیں۔ اور نہ تبت سے خام اون کی تجارت ابھی تک قائم ہوئی تھی[1] نتیجہ یہ کہ خام پیداوار کی رسد بہت محدود تھی۔ اب رہی اُس کی خاصیت تو اُس کے متعلق ہمیں صرف ایک حوالہ ملا ہے اور وہ ٹری کی یہ رائے ہے کہ اُون عام طور پر بہت موٹا ہوتا تھا۔

اِس صنعت کے دو شعبے خاص طور پر قابل ذکر ہیں شال بافی اور اس میں بھی خاص کر بالوں کی شال بنانے کا کاروبار زیادہ تر کشمیر سے متعلق تھا۔ لیکن اکبر کی سرپرستی میں یہ صنعت اس زمانے میں لاہور کے اندر بھی[2] قائم ہو چکی تھی بلکہ شاید میدانی علاقے کے دوسرے مقامات میں بھی۔ قالین بافی کی صنعت نے بھی خاص کر آگرہ اور لاہور میں اکبر کے ہاتھوں سے پرورش پائی تھی۔ اس کی مقدار پیداوار کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی اگرچہ بعض اچھے اچھے نمونے تیار ہوتے تھے۔ ایرانی قالین ہی بازار میں زیادہ حاوی رہتے تھے اور چند سال بعد انگریز تاجروں نے اِس صنعت کو غیر ترقی یافتہ اور اس کے کاریگروں کو خستہ حالت میں پایا۔ اعلیٰ قسم کے کپڑے خواہ اونی ہوں یا بالوں کے محض شوقیہ سامان میں شمار کئے جانے چاہئیں چنانچہ ان کا کاروبار بھی اسی نوعیت کا تھا کیونکہ

---

[1] "بارہ صوبوں کی کیفیت" (آئین۔ ترجمہ ۲۔ ۱۷۲ و ۲۸۰) میں ابوالفضل نے ان اشیاء کی فہرستیں دی ہیں جو اودھ اور کماؤں میں درآمد کی جاتی تھیں۔ خام اون کا ذکر ان میں نہیں ہے اگرچہ اونی مال شمال سے اودھ پہنچتا تھا۔

[2] ابوالفضل کہتا ہے کہ لاہور میں ایک ہزار سے زیادہ کارخانے موجود تھے۔ ہمارے خیال میں ابوالفضل کامل اعداد کے استعمال میں کسی قدر فیاضی سے کام لیتا ہے۔ لہذا اس کے بیان کردہ ٹھیک عدد پر زیادہ زور نہ دینا چاہئے۔ تاہم یہ نتیجہ بالکل بجا ہے کہ ایک بڑی پوری صنعت اس طور پر وجود میں آگئی تھی پیداوار زیادہ تر ملوان چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

ملک کی معاشی زندگی میں بہ لحاظ مقدار کے اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی - اون اور بالوں کی بنی ہوئی اشیا کی مجموعی پیداوار کا ٹھیک تخمینہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی مواد موجود نہیں ہے تاہم سادہ اور شوقیہ دونوں قسم کی چیزوں کو ملا کر آبادی کے تناسب سے یہ صنعت اس زمانے میں غالباً اس قدر اہم نہیں تھی - اور دستکاروں کی پیداوار میں جو کچھ تخفیف ہوئی ہوگی اس کی تلافی کے لئے آجکل کے بڑے کارخانوں کی پیداوار کافی سے زیادہ ہے -

آٹھویں فصل

مصنوعات پارچہ بافی

پٹ سن ۔ جوٹ ۔ روئی

اب ہم اُن موٹے ریشوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہندوستان میں زراعتی فصلوں کے طور پر اگائے جاتے ہیں ۔ پٹ سن کے بارے میں ہمیں بہت کم واقفیت حاصل ہے ۔ سان کے پٹ سن پر تمام مغلیہ صوبوں میں مالگزاری تشخیص کی جاتی تھی اس کی شرحیں لکھی ہوئی موجود ہیں ۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ گو کثیر مقدار میں نہ سہی تاہم ایک وسیع رقبے پر اس کی کاشت ہوتی تھی ۔ لیکن اس بات کا کہیں پتا نہیں چلتا کہ وہ صنعت و حرفت میں بھی وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ قیاس یہ ہے کہ وہ زیادہ تر گھریلو اغراض کے لئے مستعمل ہوتا تھا جیسا کہ شمالی میدانی علاقوں کے اکثر حصوں میں اب تک بھی رواج ہے ۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس ریشے کے بنے ہوئے تھیلے مقامی طور پر استعمال ہوتے ہوں کیونکہ سن کی صنعت اعلیٰ درجے کی تنظیم یافتہ حالت پر نہیں پہنچی تھی ۔ اور گٹھڑیاں وغیرہ باندھنے میں کوئی موٹا گاڑھا سا کپڑا استعمال ہوتا ہوگا ۔ جوٹ کے متعلق ہمیں صرف ایک ہی خبر ملی ہے ۔ وہ یہ کہ بنگال کے ضلع گوراگھاٹ (رنگپور) میں "ایک قسم کا ٹاٹ" تیار ہوتا تھا ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں بنگال کے اندر جوٹ کی وہی حیثیت تھی جو سان کے پٹ سن کی اور آگے مغرب کی طرف تھی ۔ یعنی محض گھریلو استعمال کے لئے یہ ریشہ اُگایا جاتا تھا اور صنعتی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت نہیں تھی ۔ تاہم یہ یقین کرنے کی کچھ وجہ ضرور موجود ہے کہ اکبر کے زمانے میں جوٹ نے ایک حد تک روئی و نیز پٹ سن کی جگہ لے لی تھی ہمیں مستند ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ایک صدی سے بھی زیادہ قبل "مشرقی اور شمالی بنگال میں غربا اگر پورے طور پر نہیں تو زیادہ تر جوٹ کے ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے" اگرچہ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ طبقے سنہ ۱۶۰۰ء میں روئی بسنہ ۱۸۰۰ء میں جوٹ ۔ اور سنہ ۱۹۰۰ء میں دوبارہ روئی پہنتے ہوں تاہم زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹاٹ کا استعمال بحیثیت ایک ازال

باب ۵

چیز کے قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اور جب تک کہ مختلف ریشوں کی مالیتوں میں بمقابل ایک دوسرے کے تبدیلی واقع نہ ہوگئی وہ برابر قائم رہا۔ یہ تبدیلی انیسویں صدی میں نمودار ہوئی جبکہ جوٹ کو ایک اہم صنعتی فصل کی حیثیت حاصل ہوگئی اور روئی کے مال کی قیمت مشین کے رواج کی بدولت گھٹ گئی۔ اس دور کے لٹریچر میں ہمیں کوئی بات ایسی نہ مل سکی جس سے اس مسئلہ پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ تاہم سفری مال کی پیدائش کا جو کوئی بھی تخمینہ کیا جائے اس میں اس امکان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ بنگال کے غریب طبقے اس زمانے میں یا تو جوٹ کا لباس پہنتے تھے یا روئی کا اور اس صوبہ میں آبادی اس قدر گنجان تھی کہ اس کی پوشاک کی مقدار ملک کے مجموعی صرف کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہوتی ہوگی۔

اگر ہم یہ نتیجہ نکال بھی لیں کہ بنگال میں ٹاٹ پہنا جاتا تھا تب بھی اس واقعے میں کوئی فرق نہیں آتا کہ سوتی پارچہ بافی ہندوستان کا وسیع ترین کاروبار تھا۔ اور ہمارے خیال میں یہ کہنا بجا ہے کہ اس کی مجموعی مقدار سنہ ۱۶ء کی صنعتی دنیا کے اہم ترین واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ اس کی کثرت نے پرتگالیوں پر لازمی اپنا اثر ڈالا جیسا کہ پیرارڈ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ "راس امید سے لیکر چین تک ہر ایک متنفس خواہ وہ عورت ہو یا مرد سر سے پاؤں تک" ہندوستانی جولاہوں کے کرگھے کا کپڑا پہنتا ہے۔ صورت حال کی یہ ایک دلکش تصویر ضرور ہے لیکن اس میں چند اہم مبالغہ آمیز بیانات بھی شامل ہیں پس اس کاروبار کی اصلی وسعت معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے ان مبالغہ آمیز بیانات کو چھانٹ دیا جائے حتیٰ کہ ہم اصلی حالت تک پہنچ جائیں۔ سب سے پہلے جہاں تک خود ہندوستان کے بازار کا تعلق ہے یہ کہنا قریب قریب صحیح ہے کہ "ہر ایک شخص" ملک ہی کا تیار کیا ہوا کپڑا پہنتا تھا۔ اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی معلوم کر چکے ہیں یہ ممکن ہے کہ کپڑا جوٹ سے بنایا جاتا ہو۔ اونی اور ریشمی کپڑے اور مخمل یورپ اور دوسرے مقامات سے بلاشبہہ درآمد کیے جاتے تھے لیکن ان کا استعمال اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا جو کہ بہ لحاظ تعداد بہت کم اہمیت رکھتے تھے۔ لہذا باشندوں کی اکثر و بیشتر تعداد یقیناً ملک ہی کے بنے ہوئے کپڑے پہنتی تھی (۱۸۰) لیکن یہ کہنا کہ وہ "سر سے پاؤں تک" ملبوس ہوتے تھے صداقت سے بہت بعید ہے کیونکہ اس دور کے لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لباس پہنا جاتا تھا وہ نہ صرف ہندوستان کے گرم حصوں میں جہاں کپڑوں کا شمار رسمی ضروریات میں ہوتا ہے بلکہ ان خطوں میں بھی

باب۶ جہاں وہ کارکردگی کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں انتہا درجہ قلیل ہوتا تھا۔ اس خاص نقطہ کے متعلق جو شہادت موجود ہے اس پر کسی آئندہ باب میں غور کیا جائے گا۔ فی الحال ہمیں پیرارڈ کے بیان کی تصحیح پر قناعت کرنی چاہئے جس کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ ہندوستان میں اکثر لوگ ملک کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن ان کا لباس بہت ہی قلیل اور عام طور پر ایک لنگوٹی سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان کے علاوہ اکثر دوسرے ممالک کے بارے میں اس نقطہ کے متعلق اور بھی زیادہ قوی شہادت موجود ہے۔ راس امید اور چین کے درمیان رہنے والے باشندوں کی برہنگی کے ثبوت میں اس قدر کثیر شہادتیں موجود ہیں کہ اگر ان کو یہاں نقل کیا جائے تو بہت صفحے درکار ہوں گے۔ بلکہ درحقیقت یہی وہ چیز تھی جس نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں طور پر سیاحان یورپ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ لہذا جب ہم مختلف بازاروں کی اہمیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کریں تو اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

اب ہم سب سے پہلے افریقہ کے مشرقی ساحل کو لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ صحیح ہے کہ راس گردافوئی اور راس امید کے مابین[1] جس قدر کپڑے پہنے جاتے تھے ان کی رسد کلیتاً یا اکثر و بیشتر ہندوستان سے بہم پہنچائی جاتی تھی لیکن کپڑے پہننے والے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی چنانچہ خود پیرارڈ صاف طور پر کہتا ہے کہ یہ تمام قومیں برہنہ رہتی ہیں۔ فرائر جونوا اور دوسرے سیاح بھی یہی بات زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ہمیں علم ہے کسی نے مقدار درآمد کو بھی زیادہ نہیں بتایا ہے۔ کیوں کہ درآمد صرف پرتگالی قلعوں کی فوج اور مسلمان تاجروں اور سرداروں اور اُن دیسی باشندوں کے لئے درکار ہوتی تھی جو تہذیب و تمدن کے اثرات کو محسوس کرنے لگے تھے۔ شمال میں اور آگے کو ایک درحقیقت بڑا بازار موجود تھا۔ ہماری مراد عربستان سے ہے جہاں کپڑے کے تھان کثیر تعداد میں جاتے تھے۔ مصر میں بھی ان کی درآمد ہوتی تھی اور پھر بحیرۂ روم میں اسے ہوکر دوسرے مقامات میں

---

[1] بار بوسا ذکر کرتا ہے (صفحہ ۲۲۴) کہ مسلمانوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل پر مقام سونالا کے قریب کپڑا بُننے کا کام جاری کیا تھا۔ ہمیں کسی بات سے یہ پتا نہیں چلا کہ آیا یہ کاروبار ختم صدی تک برقرار رہا یا نہیں۔

باب ۸

وہ تقسیم ہو جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان علاقوں میں "ہر ایک شخص ہندوستانی کپڑے پہنتا تھا۔ ہندوستان کی دوسری جانب سولھویں صدی کے کم از کم کچھ حصہ میں ایک اور اہم بازار موجود تھا۔ اس سے ہماری مراد وہ سلطنتیں ہیں جو آجکل صوبہ برما کی صورت میں موجود ہیں۔ ختم صدی کے وقت یہ بازار غالباً نہایت ابتر حالت میں تھا کیوں کہ جنگ سیام کی وجہ سے سخت تباہی واقع ہو چکی تھی۔ تیسرا اہم بازار جزیرۂ ملاکا اور ان جزائر کے مجموعہ پر مشتمل تھا جن کا کہ وہ تجارتی مرکز بنا ہوا تھا۔ ہندوستان سے جو جہاز مصالحے یا چین کی پیداوار لینے کے لئے جاتے تھے وہ کثیر مقدار میں کپڑے کے تھان لے جاتے تھے جو یا تو ملاکا میں فروخت ہو جاتے تھے یا مقامی طور پر لونگ یا اسی قسم کی دوسری پیداواروں کے معاوضہ میں بدل لئے جاتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی طرح یہاں بھی لوگ بہت کم کپڑا پہنتے تھے۔ عام طور پر کمر کے اطراف ایک کپڑا باندھ لیتے تھے اور بس"۔ لہٰذا بازار کی وسعت کا تخمینہ کرنے میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ آبنائے سے آگے جو بازار تھے ان کی بہت کم اہمیت تھی۔ ہمیں کوئی تحریر ایسی نہیں ملی جس سے یہ پتا چل سکے کہ چین کو روئی کا کپڑا کثیر مقدار میں جاتا تھا اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پرتگالی جو کہ اس تجارت سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے کپڑوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خریداریوں کا معاوضہ دینے کے لئے ہندوستان سے چاندی لے جاتے تھے۔ جاپان کو کچھ مال فروخت کیا جاتا تھا لیکن اس کی مقدار کچھ بھی زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ ایک انگریز تاجر نے سنہ ۱۶۱۷ء میں جاپان سے لکھ بھیجا تھا کہ وہاں کے لوگ ہندوستانی کپڑے صرف "ان کے جدید طرز اور عجیب و غریب نقاشیوں کی وجہ سے خریدتے کیوں کہ یہ لوگ ہمیشہ نئی چیزوں کے خواہشمند رہتے ہیں"۔ آخر میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسپین کے جہازات کبھی کبھی ہندوستانی کپڑا مشرق اقصیٰ کے بازاروں سے فلپائن بلکہ شاید میکسیکو تک بھی لے جاتے تھے۔ لیکن قرین قیاس یہ امر ہے کہ اس کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

(۱۸۱)

پس ہم بیرارڈ کے دلکش اور مبالغہ آمیز بیان کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی راجپوتوں کو کپڑوں کے ملکی بازار کا تو عملاً اجارہ حاصل تھا لیکن اس کے علاوہ برآمد کے لئے بھی تین خاص بازار موجود تھے ایک تو عربستان اور اس کے آگے کے علاقے۔ دوسرے برما تیسرے مشرقی جزائر۔ ان کے علاوہ ایشیا کے

باب۵ دوسرے حصوں میں اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے بازار موجود تھے۔ اس طلب کو پورا کرنے کے لئے جو پیدائش کا کاروبار جاری تھا وہ ملک بھر میں منتشر تھا لیکن اس کی تقسیم یکساں طور پر نہیں تھی۔ البتہ خاص خاص مقامات کو خاص خاص کپڑوں کی پیدائش میں شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ مزید براں نقل وحمل کی سہولتوں کی بدولت ساحل سمندر یا اندرونی دریاؤں کے کناروں پر خاص خاص مقامات میں یہ صنعت بہت کچھ محصور ہو گئی تھی۔ عام انتشار کے بارے میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ جب کبھی کوئی یورپی شخص اندرون ملک داخل ہوا تو اس (۱۸۲) نے اپنے راستہ کے مقامات پر کپڑا بنتا ہوا پایا۔ لہٰذا یہ نتیجہ بالکل معقول ہے کہ جس تنظیم کے آثار ہمیں اب تک بھی نظر آتے ہیں وہ اُس زمانے میں نہایت مکمل طور پر جاری تھی۔ اور جملہ قصبات اور اکثر بڑے بڑے دیہات خود ہی وہ کپڑا تیار کرتے تھے جو مقامی طور پر صرف ہوتا تھا۔ آئین اکبری میں اس طرح کی روزمرہ کی مصنوعات بالعموم قلمبند نہیں کی گئی ہیں بلکہ پارچہ بافی کے بارے میں جتنی بھی خبریں اس کتاب میں ملتی ہیں وہ ایسی چیزوں کے متعلق ہوتی ہیں جنھیں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ ابوالفضل نے اُس نہایت نفیس ململ[1] کا ذکر کیا ہے جو کہ ڈھاکہ کے بیرشہر د سونار گاوں میں بنایا جاتا تھا۔ گنگا کے میدانی خطہ کے اندر بنارس۔ مئویا آگرہ جیسے مقامات میں جو مال دستیاب ہوتا تھا اُس کی اُس نے تعریف کی ہے۔ اور مالوہ دکن اور گجرات کے مال کی عمدگی اور نفاست کی اُس نے عام الفاظ میں تعریف کی ہے۔ سیاح اور تاجر بھی اسی طرح کبھی کسی شہر کے مال کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی کسی اور شہر کی چیزوں کی چنانچہ لاہور۔ ملتان۔ برہان پور۔ گولکنڈہ اور دوسرے شہروں کے نام اس سلسلہ میں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو غالباً مبالغہ نہ ہو گا کہ اعلیٰ درجے کے کپڑوں کے لئے قریب قریب ایک عام بازار سا موجود تھا اگرچہ وہ نقل وحمل کے کثیر مصارف کے ضرور زیر اثر ہو گا۔

برآمد کی غرض سے جو مال تیار کیا جاتا تھا وہ خاص کر چار خطوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ایک دریائے انڈس کے میدان سے جن کے لئے لاہیری بندر کا بندرگاہ موجود تھا۔ دوسرے خلیج کیمبے کے ساحلی ملک سے جو جنوب میں ڈابل تک چلا گیا تھا۔ تیسرے ساحل

[1] اس حصۂ ملک کی ململوں کو غالباً ابھی وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی تھی جو زمانۂ مابعد میں انھیں حاصل ہوئی۔ اور یہ زیادہ تر دربار شاہجہاں کی سرپرستی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

باب ۵

کارومنڈل سے چھوٹے بنگال سے۔ لاہور۔ ملتان۔ سکر۔ ٹھٹا اور انڈس اور اُس کے معاون دریاؤں پر جو دوسرے شہر واقع تھے ان سب میں جولاہوں کی بڑی بڑی برادریاں موجود تھیں۔ اور ان کی بہت سی پیداوار سمندر کی راہ سے برآمد ہوتی تھی۔ کچھ تو عربستان کی طرف جاتی تھی۔ اور بقیہ مال اس دور میں پرتگالی لے لیتے تھے۔ خلیج کیمبے اس تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ احمد آباد۔ پٹن۔ بڑودہ۔ بروچ۔ سورت اور بہت سے چھوٹے مقامات سے وہاں مال آتا تھا اور مشرق و مغرب دونوں جانب کثیر مقدار میں اس کی برآمد ہوتی تھی۔ چنانچہ تمام ساحل افریقہ۔ عدن۔ اور خلیج فارس میں کیمبے کا کپڑا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ سیلون۔ پیگو ملاکا اور اس کے جملہ جزائر میں بھی اور نیز ساحل چین تک ہم اس کا ذکر سنتے ہیں۔ ہندوستان کے شرقی جانب کی رسائی کے حدود مقابلۃً تنگ تھے۔ چنانچہ ساحل کارومنڈل سے آنیوالے مال کا بحیرۂ عرب میں نہیں (۱۸۳) کوئی پتا نہ لگ سکا۔ تاہم وہاں سے زیادہ تر پیگو۔ ملاکا اور جزائر کو برآمد ہوتی تھی اور یہ وہ بازار ہیں جنھیں کیمبے اور نیز چوتھے خط یعنی بنگال کے ساتھ ساحل کارومنڈل کو بھی ایک حصہ حاصل تھا۔ یہ تحقیق کرنا کہ برآمد کے مرکزوں کو کتنی کتنی دور کے مقامات سے مال حاصل ہوتا تھا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انگریز تاجروں نے تو بعض ایسے کپڑوں کا پتہ لگایا کہ اگر انھیں آگرہ میں خرید کر سورت سے جہاز پر روانہ کیا جائے تب بھی منافعہ حاصل ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اس میں سات سو میل خشکی کا راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس مثال کو معمولی حالات کا نمونہ نہیں تصور کرنا چاہئے کیوں کہ یہ تاجر آگرہ کو زیادہ تر اپنا مال بیچنے اور نیل خریدنے کے لئے جاتے تھے اور کپڑے کی خریداری اس حصۂ ملک میں اُن کا گویا ایک ضمنی کاروبار تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں کہیں تری کے راستہ موجود ہوتے تھے وہاں مقابلۃً دور دراز مقامات سے برآمد کے لئے مال حاصل کیا جا سکتا تھا۔ برخلاف اس کے خشکی کے راستہ سے اس قدر طول طویل نقل و حمل نفع بخش ثابت نہیں ہوتی تھی۔ لاہور اور سمندر کے درمیان خط مستقیم کی راہ سے تقریباً سات سو میل کا فاصلہ ہے اور دریا کا راستہ اس سے زیادہ طویل ہے۔ اس لحاظ سے گویا بنگال کے بندرگاہ الہ باد جیسے دور دراز مقامات سے بھی مال حاصل کر سکتے تھے۔ پس ہندوستان کا ایک کافی بڑا حصہ ایسا تھا جہاں سے برآمد کے لئے منافعہ کے ساتھ مال روانہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی سیاحوں اور تاجروں کے مذکورہ احوال سے ذہن میں جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گجرات اور ساحل کارومنڈل دونوں مقامات میں برآمد کے لئے جس قدر کثیر

باب۵

آتا تھا اس کا اکثر و بیشتر حصہ بندرگاہوں کے قرب و جوار ہی کے مقامات میں تیار کیا جاتا تھا۔

کپڑے کے علاوہ روئی کے چند اور متفرق اشیا بھی تیار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ہم سوتی قالین۔ غلاف۔ چادر۔ رسیاں۔ نواڑ اور روئی کی بعض دوسری چیزوں کا حال پڑھتے ہیں جن کی مجموعی پیداوار بلاشبہہ کافی بڑی ہوتی تھی تاہم ان کی مقدار کا تخمینہ کرنیکے لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ رنگ ریزی کی ضمنی صنعت کا اس موقع پر حوالہ دینا مناسب ہے۔ اس صنعت کا دار و مدار زیادہ تر روئی کی چیزوں پر تھا تاہم دوسری قسم کے کپڑے بھی رنگے جاتے تھے۔ رنگین مال کی طلب بالخصوص اُن ممالک میں جو اب صوبۂ برما کی شکل میں موجود ہیں بہت زیادہ تھی۔ دیسی ترکاریوں کے رنگ استعمال کئے جاتے تھے[۱] اور ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جن سے ہم اب تک آشنا ہیں یا جن کی جگہ حال میں یورپی کارخانوں کی پیداواروں نے لے لی ہے۔ (۱۸۲)

اوپر جو تفصیلی معلومات پیش کی گئی ہیں وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ روئی کی صنعت اس دور میں ہندوستان کی اہم ترین دستکاری تھی۔ لیکن مقدار پیداوار کا ہمیں ان کی بدولت کوئی سرسری اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس سوال کو حل کرنے کے لئے ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ ہندوستانی صرف اور تجارت برآمد کی مقدار کا حال معلوم کیا جائے۔ جو واقعات کہ صرف سے متعلق ہیں ان کا مطالعہ معیار زندگی کے سلسلے میں بہتر ہوگا اور جہاں تک تجارت برآمد کا تعلق ہے ہم آئندہ باب میں اس کا حال معلوم کریں گے۔ تب کہیں ہم اس قابل ہوں گے کہ سوتی مال کی مقدار کے مسئلے پر غور کر سکیں اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا ملک کی مجموعی آمدنی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔

[۱] رنگ ہمیشہ گہرے نہیں ہوتے تھے۔ ایک انگریز کارندہ نے ۱۶۱۳ء میں احمد آباد سے ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے مقامی اشیا کی اس بارے میں شکایت کی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے " وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے رنگ پختہ نہیں ہیں اور وہ قائم نہیں رہیں گے (خطوط موصولہ ۱ - ۳۰۲) -

باب ۵

نویں فصل

صنعتی تنظیم

سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستانی صنعت وحرفت کی تنظیم کس طور پر قائم تھی اس بارے میں اپنے اسناد سے ہمیں بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ نتیجہ قرین العقل ہے کہ اُن کے سکوت کا باعث کسی دلچسپ قابلِ ذکر خبر کی عدم موجودگی ہے۔ خود ملک کے اہل قلم کا جہاں تک تعلق ہے ان کے لئے موجودہ طریقہ۔ خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک معمولی روزمرہ کی بات تھا جو کسی خاص توجہ کا محتاج نہ تھا بلکہ جس کے متعلق خاموشی کے ساتھ یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ گویا ہر شخص اس سے واقفیت رکھتا ہے۔ یورپ سے آنے والے سیاحوں کو اس میں اگر کوئی جدید نمایاں خصوصیات نظر آتیں تو یقیناً وہ اُن کو ظاہر کر دیتے۔ لہذا اگر اس قسم کی خصوصیات قلمبند نہیں کی گئی ہیں تو اُس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی طریق خاص خاص امور میں اُس دور کے یورپی طریق کے مشابہ تھا یا بالفاظ دیگر انتظام کاروبار اور دستکاری کا کام ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ اور دستکار بغیر کسی اعلیٰ اصلدار کی رہنمائی کے پیدائش کا کام انجام دیتے تھے۔ یہ نتیجہ بالکل یقینی ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو صنعتیں ابھی جدید یورپین طرز پر تنظیم یافتہ نہیں ہوئی ہیں ان میں اب تک وہی طریقہ برابر چلا آرہا ہے۔ مزید براں معاصرین نے اتفاقی طور پر جو چند مشاہدات قلمبند کر دئے ہیں اُن سے بھی اس نتیجے کی پوری پوری مطابقت ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ مشاہدات غیر ملکی تاجروں کی ابتدائی مراسلت میں دستیاب ہوتے ہیں کیوں کہ جن بازاروں میں قدم جمانے کی یہ لوگ کوشش کر رہے تھے انھی کے موافق حال طرز عمل اختیار کرنا اور اپنا مطلوبہ مال خریدنے کے بہترین طریقے سیکھنا اور اس بارے میں تجربہ حاصل کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ ان کا پہلا سبق یہ تھا کہ پیشگی رقم کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ یہ کوشش کرنا کہ جب بندرگاہ میں جہاز پہنچ بس اُس وقت مال حاصل کیا جائے سراسر بے سود تھا بلکہ تاجروں کو ملک میں چھوڑ دینا اور انھیں کافی سرمایہ

(۱۸۵)

باب ۴

بہم پہنچانا ضروری تھا تاکہ جو کچھ مطلوب ہو اُس کی وہ فرمایش دے سکیں اور جیسے جیسے مال حوالہ کیا جائے اس کی قیمت نقد ادا کر سکیں۔ انھوں نے یہ بھی سیکھا کہ کم از کم بعض دستکار تو ضرور ناقابل اطمینان ہوتے ہیں کیوں کہ جب انھوں نے آگرہ کے قالین بافوں کو امتحاناً ایک فرمایش دی تو انھوں نے دیکھا کہ "کاریگر اس قدر کاہل، سست اور مفلس تھے کہ اُن کے ساتھ کوئی باقاعدہ کاروبار قائم کرنا دشوار تھا۔ لیکن دوسرے مقامات پر انھوں نے معلوم کیا کہ درمیانی اشخاص کے توسط سے خریدنا اس قدر اطمینان بخش نہیں تھا جس قدر کہ دستکاروں سے براہ راست معاملہ کرنا چنانچہ سر ٹھامس رو نے یہ تاکید کی ہے کہ سندھ اور بنگال کے مقابلے میں گجرات کے کپڑوں کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے اور وہ خاص کر اس وجہ سے کہ کیمبے یا بروچ میں "جس جس قسم کے کپڑے درکار ہوں، جو طول و عرض اور جیسی نفاست مطلوب ہو اُن سب کے متعلق آپ خود حکم دے سکتے ہیں اور بہترین طور پر کرگھے پر سے خرید سکتے ہیں۔" اس طرز پر کام کرنے سے ممکن تھا کہ غیر کل اشیا خریدنی پڑیں چنانچہ جولاہوں سے کپڑا خرید لیا جاتا تھا اور پھر رنگریز یا کپڑے سفید کرنیوالے لوگ نوکر رکھے جاتے تھے تاکہ اُس کو بازار کے لئے تیار کریں۔ ایک کارندہ نے ناموافق حالات کے اندر اس طریقۂ کار کی ایک واضح تصویر پیش کی ہے۔ وہ ذکر کرتا ہے کہ جب آبنائے ملاکا کے قریب کسی مقام پر ہندوستانی کپڑوں کی ایک مقدار فروخت کے لئے پیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ کپڑے میں سوراخ پڑ گئے ہیں جو نتیجہ تھا "اس دھوبی کی بدمعاشی کا جو انھیں سفید کرتا ہے۔ یہ شخص افیون حاصل کرنے کی غرض سے انھیں مہینہ بھر پہننے کے لئے کرایہ پر دیدیتا ہے۔ اور جب اس طرح پر وہ غلیظ ہو جاتے ہیں تو پاک کرنے کے لئے انھیں وہ اس قدر پٹکتا ہے کہ اُن کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔" اس قسم کے اتفاقات سے قطع نظر جو خیال اس ابتدائی تجارتی مراسلت سے پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آزاد پیشہ دستکار پیدایش کا کاروبار چلاتے تھے یہ لوگ بہت چھوٹی حیثیت کے ہوتے تھے اور اس بات پر مجبور ہوتے تھے کہ جونہی مال تیار ہو جائے اُسے بازار پہنچا دیں۔

دستکاری طریق پیدائش کے رواج سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہندوستان اس دور میں بڑے بڑے کام انجام دینے کے ناقابل تھا۔ یہ خیال فوراً مسترد ہو سکتا ہے اگر ہم تغلق آباد یا فتح پور سیکری کے جدید دار السلطنت یا بڑے پرتگالی جہازوں کی

(۱۸۶)

باب ۵

تعمیر کو پیشِ نظر رکھیں کیوں کہ اگر سولھویں صدی کے معیار سے جانچا جائے تو ان میں سے ہر ایک کام بڑا سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں صحیح نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ہر کاروبار کے لئے خاص طور پر ایک جداگانہ تنظیم پیدا کرنی پڑتی تھی۔ جب کسی تاجر کو کوئی بڑے جہاز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ کسی ایسے کارخانہ کو فرمائش نہیں دے سکتا تھا جہاں خاص طور پر صرف جہاز سازی کا کاروبار کیا جاتا ہو اور جو اس پیشہ کے جملہ تفصیلی امور کی ذمہ داری لے سکے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ اس کو لکڑی کٹوانے سے لے کر آخر تک سارے کاروبار کا خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا یا کم از کم کاروبار کے ہر جداگانہ شعبے کے لئے ٹھیکہ داروں کی خدمات کی تنظیم کرنی پڑتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار کثیر تعداد میں جاری کرکے کام چلانے کا طریق جیسا کہ ہم کسی سابقہ فصل میں معلوم کر چکے ہیں سترھویں صدی میں ہیرے کے میدانوں پر جاری تھا۔ ٹھیکے اور ذیلی ٹھیکے کے طریق سے جدید ہندوستان میں لوگ اب تک آشنا ہیں۔ اور ہمیں کوئی ایسے واقعات معلوم نہیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ اس دور میں معمولی کاروبار کے اندر اس سے زیادہ مکمل تنظیم موجود تھی۔ البتہ اُن شاہی کارخانوں کی شکل میں جو کہ مغلیہ دارالسلطنت میں قائم تھے ایک اور طریقے کی ابتدائی علامات موجود تھیں۔ چنانچہ برنیر نے ہمارے دور سے تقریباً ساٹھ سال بعد وہ حالات جو اس نے دہلی کے محل میں دیکھے حسب ذیل الفاظ میں بیان کئے ہیں: اکثر متقامات پر کاریگروں کے لئے بڑے بڑے کمرے جو کارخانے کہلاتے تھے دکھائی دیتے تھے۔ ایک کمرے میں کارچوبی کام کرنے والے ایک استاد کے زیر نگرانی مصروف رہتے ہیں۔ ایک اور کمرے میں سنار دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے کمرے میں نقاش۔ چوتھے میں وارنش کرنیوالے پانچویں میں نجار۔ لوہار۔ درزی اور موچی۔ چھٹے میں ریشم۔ کمخواب اور نفیس ململ بنانے والے۔ ابوالفضل وقتاً فوقتاً جن کارخانوں کا ذکر کرتا ہے وہی غالباً ترقی پا کر اس حیثیت تک پہنچے تھے۔ گو ابوالفضل اُن کی تنظیم کا حال مفصل طور پر بیان نہیں کرتا تاہم وہ ایک بالکل جداگانہ دورِ پیدائش کا نمونہ تھے۔ کیوں کہ ان میں کاریگر زیر نگرانی کام کرتے تھے اور خام پیداواروں کی بہم رسانی بھی غالباً عہدہ داران ذمہ دار کی طرف سے کی جاتی تھی۔ مزید براں جب کبھی بادشاہ ذاتی طور پر ان کے کاروبار میں دلچسپی لیتا جیسا کہ اکبر لیا کرتا تھا تو اُس صورت میں نمونوں اور کاریگری میں بھی بہت کچھ اصلاح کا امکان رہتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض بعض دستکاریوں میں اسی طرز کے خانگی کارخانے بھی موجود ہوں لیکن ہمارے اسناد (۱۸۷)

بابٌ اس بارے میں بالکل ساکت ہیں اور جو اقتباسات اوپر پیش کئے جا چکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم معمولی پارچہ بافی کے کاروبار میں دستکار آزادانہ طور پر کام کرتے تھے۔

جہاں تک دستکاروں کی معاشی حیثیت کا تعلق ہے اس مضمون سے اُن مصنفین کو بہت کم دلچسپی ہو سکتی تھی جنھوں نے سولھویں صدی کے ہندوستان کے چند حصوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کے متعلق کوئی عصری اطلاع قطعاً موجود نہیں ہے۔ البتہ چند اشخاص نے جو بعد میں یہاں وارد ہوئے تھے اس مسئلہ پر غور کیا ہے۔ چنانچہ برنیر کالبرٹ کو لکھتے ہوئے کہتا ہے "کسی صناع سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے پیشہ میں دل لگا کر کام کرے اگر وہ ایسے لوگوں میں رہتا ہو جو یا تو انتہا درجہ مفلس ہوں یا اگر دولتمند بھی ہوں تو مفلسوں کی سی حالت اختیار کرتے ہوں۔ جنھیں کسی چیز کی خوبصورتی اور عمدگی کی پروا نہ ہوتی ہو بلکہ جو محض اس کی ارزانی کا خیال کرتے ہوں۔ جن کے امرا کسی اعلیٰ درجہ کی کاریگری کا معاوضہ اُس کی واجبی قیمت سے بہت کم اور محض اپنے وہم و گمان کے مطابق دیتے ہوں۔" اسی سلسلے میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ شاہی کارخانوں کے اثر سے اور چند زبردست سرپرستوں کی حفاظت کی بدولت صناعوں کی دستکاریوں کا تنزل سست پڑ گیا تھا کیوں کہ ان وجوہ سے اُن کو کسی قدر زیادہ اجرتیں ملجاتی تھیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "میں جو کسی قدر زیادہ اجرت کہتا ہوں اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ کاریگر کی کوئی وقعت کی جاتی ہے یا وہ آزادی کی حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ ضرورتِ محض یا لاٹھی کی ضرب ان کے علاوہ کوئی اور چیز اُس کو کام پر نہیں لگا سکتی۔ وہ کبھی دولتمند نہیں بن سکتا۔ اور اگر اس کو بھوک کی تکلیف رفع کرنے اور اپنے بدن کو ایک موٹا سا کپڑا لے کر ڈھانکنے کے لئے کافی ذریعہ میسر ہو جائے تو اُس کے حق میں یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر روپیہ حاصل بھی ہو جائے تو وہ کسی طرح اس کی جیب میں نہیں جاتا بلکہ اس کی بدولت صرف تاجر کی دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔" اسی دور میں دہلی کے اندر صنعتوں کی حالت کے متعلق تھیونوٹ کو جو کچھ معلوم ہوا اُس سے برنیر کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ اُس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آجکل دستکاروں کی جو حالت ہے کم و بیش وہی

باب ۵

حالت سترھویں صدی کے وسط میں بھی تھی یعنی یہ لوگ زیادہ تر تاجروں یا درمیانی اشخاص کے فائدے کے لئے کام کرتے تھے اور بجز کسی دولتمند یا زبردست سرپرست کی توجہ کے اس کی ترقی کا کوئی قرینہ نہیں تھا۔ ۱۶۳۰ تا ۱۶۳۱ء کے گجرات والے قحط سے جو تجربہ حاصل ہوا اس سے دستکاروں کے اہم ترین طبقہ کی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس زمانے میں گجرات کو توسیع تجارت کی بدولت جو کہ بازار میں غیر ملکی خریداروں کے نمودار ہونے کا نتیجہ تھی فائدہ پہنچا تھا۔ اور یہ مفروضہ بالکل معقول ہے کہ جولاہے اور متعلقہ صنعتوں میں کام کرنے والے (۱۸۸) یہاں بھی کم از کم اتنے ہی خوشحال تھے جتنے کہ ان کے ہم پیشہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تھے۔ لیکن جب قحط کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کے عام معیار سے جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معاشی حالت غیر اطمینان بخش تھی۔ کیونکہ عصری بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ قحط کی بدولت صنعتی تنظیم مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی۔ نومبر ۱۶۳۰ء تک جولاہوں اور دوسرے دستکاروں نے اس قدر کثیر تعداد میں اپنے مکانات چھوڑ دیے تھے کہ انگریزی جہازوں کے لئے مال حاصل نہیں کیا جا سکا تھا۔ اور جب آیندہ جون میں مینہ برسا تو تاجروں نے بروچ اور بڑودہ میں جولاہوں کو اناج تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ کپڑے کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے جو کہ حوالہ کیا گیا "ایک سیر اناج" دیا گیا تھا۔

پس بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد اکثر و بیشتر دستکاروں کی معاشی حالت کم از کم اتنی ہی خراب تھی جتنی کہ آجکل ہے۔ کاریگر اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لئے خریداروں یا درمیانی اشخاص کے محتاج رہتے تھے اور جب کبھی کوئی مصیبت کا زمانہ آتا تھا تو اس کو برداشت کرنے کے ذرائع سے قطعاً محروم تھے۔ اکبر کے دورحکومت کے آخری سالوں میں جو حالات رائج تھے اُن پر بھی اس بیان کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کوئی راست شہادت موجود نہیں ہے لیکن یہ معلوم رکھتے ہوئے کہ اس درمیانی وقفہ میں کوئی معاشی انقلاب واقع نہیں ہوا ہے یہ نتیجہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال کم و بیش بالکل اُسی طرح تھی۔ یعنی انفرادی طور پر تو بعض بعض کاریگروں کو کسی زبردست اور روشن خیال سرپرست کی بدولت فائدہ پہنچ سکتا تھا لیکن کام کرنے والوں کی بڑی اکثریت کو اس سے زیادہ کوئی توقع نہ ہوتی تھی کہ محض روٹی کپڑے کے لائق ذرائع معاش ملجایا کریں۔

باب ۵

اس نتیجہ کے پیدا ہونے میں خاص کر دو باتوں کا غالباً بہت زیادہ اثر پڑا ہے: ایک پیداوار خام کی قیمت۔ دوسرے سرکاری محصول کا بار۔ ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ دھاتوں کی قیمتیں اعلیٰ تھیں جس کی وجہ سے ہر دھات کا کام کرنیوالا جس کے پاس کافی اصل نہ ہو کلیتاً اس شخص کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو اس کے لئے خام پیداوار مہیا کرے۔ کم از کم شمالی ہندوستان میں خام روئی کی قیمت بھی اعلیٰ تھی۔ کیونکہ تشخیص مالگزاری میں اس فصل پر جو شرحیں عائد کی جاتی تھیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہ مقابل گیہوں کے یہ فصل بہت زیادہ قیمتی تھی اور جہاں جہاں یہ تناسب قائم تھا وہاں درمیانی شخص یا سرمایہ بہم پہنچانے والے کو بہ مقابل آجکل کے بدیہی طور پر زیادہ تقویت حاصل رہتی تھی۔ یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اکبر کے زمانے کے درمیانی اشخاص کے دل بہ مقابل ان کے جدید جانشینوں کے زیادہ نرم ہوتے تھے اور چونکہ بے جا فائدہ اٹھانے کے لئے موافق حالات موجود تھے ہمیں برنیر کے اس بیان پر شبہہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ عام طور پر بے جا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ دستکاریوں پر جو محصول لگائے جاتے تھے ان کے بارے میں براہ راست ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ابو الفضل کہتا ہے کہ اکبر نے بہت سارے محصول معاف کر دئے تھے جن میں وہ محصول بھی شامل تھا جو مختلف طبقوں کے کاریگروں پر عائد کیا جاتا تھا و نیز جو محاصل خاص خاص پیداوار یا پیشوں پر لگائے جاتے تھے یا کمبلوں پر۔ دباغی پر۔ چونہ سازی پر یا اسی طرح کی اور باتوں پر عائد کئے جاتے تھے وہ بھی انھی میں شامل تھے لیکن جیسا کہ ہم کسی سابقہ باب میں معلوم کر چکے ہیں اس قسم کی معافیوں کو دوامی خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ مزید براں جو کچھ سرکار چھوڑ دیتی تھی وہ بسا اوقات ماتحت عہدہ دار وصول کر لیتے تھے۔ غیر ملکی سیاح اس قسم کے محاصل کی طرف بالعموم توجہ نہیں کرتے تھے۔ البتہ ٹری قطعی طور پر بیان کرتا ہے کہ مغل بادشاہ نے "ساری سلطنت میں اپنے عہدہ دار پھیلا دیئے تھے تاکہ جو لوگ یہ عجیب و غریب مصنوعات بناتے ہیں اُن کی محنت کی کمائی میں سے کچھ روپیہ وصول کر لیں" اور ٹیورنیر ذکر کرتا ہے کہ بنارس میں تمام جولاہوں کے لئے لازم تھا کہ جب تک وہ کپڑے کا ہر تھان اجارہ دار کے پاس لے جا کر اُس پر مہر نہ لگوا لیں اُس وقت تک وہ اُس کو فروخت کے لئے پیش نہ کریں۔ اجارہ دار سے مراد وہ شخص ہے جو محصول کا ٹھیکہ لے لیا کرتا تھا۔ اِن دو مثالوں کے علاوہ کوئی اور خاص مثال ہمیں دستیاب نہیں ہوئی۔ البتہ اس طرح کے عام بیانات موجود ہیں کہ ہر طبقے کے لوگ اپنے اپنے وسائل کے مطابق محاصل ادا کرتے تھے

پس جہاں یہ ثابت کرنے کے لئے کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے کہ اکبر کے دور حکومت کے آخری سالوں میں کاریگروں پر بھاری محصول لگائے جاتے تھے وہیں اُس زمانے کے حالات سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انھیں سرکاری آمدنی میں ضرور اپنا حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا جب کبھی ہم اُس دور کے اندر اُن کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں چاہیے کہ اِس امکان کو ذہن سے نکلنے نہ دیں۔

دسویں فصل

شہری اجرتیں

ہندوستان میں اس دور کے اندر اجرتوں کی جو شرحیں مروج تھیں اُن کے متعلق اگر اس موقع پر چند معلومات فراہم کئے جائیں تو باعث سہولت ہوگا۔ یہ مضمون دیہاتی زندگی سے اسقدر متعلق نہیں ہے جسقدر کہ شہری زندگی سے کیونکہ دیہات کی معاشی حالت کی جو تشریح ہم نے کی ہے اگر وہ صحیح ہے تو اکبر کے زمانے میں محنت کا بازار قریب قریب قطعی طور پر محض شہروں سے متعلق ہوتا تھا۔ زراعتی مزدور عام طور پر ایک غلام ہوتا تھا جو اپنے کام کے معاوضہ میں اشیاء کی ایک مقدار (۱۹۰) پاتا تھا۔ یہ مقدار رواج کی بنا پر معین ہوتی تھی اور مزدور اور اس کے اہل وعیال کی بسر اوقات کے لئے قریب قریب کافی ہوتی تھی۔ اسی طرح دیہاتی دستکار بھی انھی اشیا پر زندگی بسر کرتے تھے جو انھیں از روئے رواج ملتی تھیں اور جو اب بتدریج متروک ہوتی جارہی ہیں۔ صرف قصبوں اور شہروں میں البتہ لوگ کام کرنے کے لئے نوکر رکھے جاتے تھے اور انھیں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجرتوں کی شرحیں موجود ہوتی تھیں۔ اس رائے کے مطابق شہری اور دیہاتی آبادی کے مابین مکمل علٰحدگی لازم نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ برابر دیہات سے آکر شہروں میں کام کرتے یا فوج میں نوکر ہو جاتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ تو آبادی کی قدرتی زیادتی کی وجہ سے نکل آتے تھے اور کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو موسموں کی خرابی کے اثر سے یا کچھ اور ناموافق حالات کی بدولت کاشت چھوڑ بیٹھتے تھے۔ برنیر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ ہندوستان کا سفر کر رہا تھا شہروں کی جانب دیہاتی آبادی کی منتقلی زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہ کالبرٹ کو لکھتا ہے: یہ واقعہ ہے کہ بہت سارے کاشتکار ایسے ظلم وہ مظالم سے تنگ آکر گاؤں چھوڑ دیتے ہیں اور شہروں یا فوجی پڑاؤ میں جاکر کوئی زیادہ قابل برداشت طریق زندگی تلاش کرتے ہیں"۔ اس خاص سبب کا اثر بمقابل اکبر کے اورنگ زیب کے زمانے میں غالباً زیادہ قوی تھا۔ پس ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شہروں کی مزدور پیشہ آبادی میں دیہات سے آنے والے اشخاص کی بدولت اضافہ ہوتا رہتا تھا اور کچھ نہ کچھ مسابقت

ضرور موجود تھی جس کا اجرتوں پر بالواسطہ اثر پڑتا تھا گو اُن کی مقدار کھلے بندوں براہ راست طے نہیں کی جاتی تھی۔ ٹری کا تو یہ بیان ہے کہ لوگ اجرتوں پر کام کرنے کے لئے بازار میں کھڑے رہتے تھے جیسے کہ وہ آجکل اکثر شہروں میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت کوئی محنت کا بازار موجود تھا۔ لیکن اس کے طریقۂ کار کے متعلق بہت کم معلومات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور ابوالفضل کے بیان کردہ تفصیلات سے قطع نظر ہمیں صرف چند اتفاقی تحریریں ایسی ملی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کن شرحوں پر سیاح اور تاجر خانگی ملازمین کو نوکر رکھتے تھے۔

ابوالفضل کے بیان کردہ واقعات اہم ضرور ہیں لیکن اُن کی اہمیت محدود ہے[۱]۔ (۱۹۱) اس نے اجرتوں کی مروجہ شرحیں قلمبند کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شاہی محلات کے مختلف شعبوں کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے تنخواہوں کی وہ شرحیں درج کی ہیں جو اکبر نے منظور کیں تھیں یا جو آجکل کی اصطلاح میں انتظامی عملہ کے منظورہ گریڈ کہلائی جا سکتی ہیں۔ تنخواہوں کے ان پیمانوں کو دیکھکر یہ سمجھنا کہ وہ شاہی ملازمین کی واقعی یافت کو ظاہر کرتے ہیں غلطی ہے۔ بعض صورتوں میں انھیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی اپنی جانب سے بہم رسانی کرنی پڑتی تھی جن کی حقیقی قیمت نہیں معلوم کی جا سکتی۔ انھیں بار بار جرمانے بھگتنے پڑتے تھے جو بعض اوقات وہ ظالمانہ ہوتے تھے۔ اور اگر اکبر کا دربار دوسرے مشرقی انتظامات سے کلیتہً مختلف نہیں تھا تو انھیں اپنی اجرتوں کا کچھ حصہ اپنے بالادست عہدہ داروں کو بھی دینا پڑتا تھا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبر نے اجرتوں کی حسب ذیل شرحیں منظور کی تھیں اور اس کے نوکر جاکر اس سے زیادہ تو نہیں البتہ کسی قدر کم ہی کماتے تھے۔

---

[۱] جن واقعات پر یہ پیرگراف مبنی ہے وہ آئین اکبری کی پہلی دو جلدوں میں منتشر ہیں۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل بابتہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں (صفحہ ۸۱۵) ان میں سے بعض واقعات پر ہم نے بحث کی ہے۔ جرمانوں کے لئے خاص کر ملاحظہ ہو۔ (آئین ترجمہ ۱۔ ۲۱۷) اگر کہیں گھوڑے کی حالت خراب ہو جائے تو جرمانوں کا سلسلہ اصطبل کے کہاروں اور خاکروبوں تک پہنچتا تھا۔ جب کبھی غفلت سے کوئی ہاتھی مر جاتا تو نگہبانوں کو (جن سے بعضوں کو ماہانہ تین روپیوں سے بھی کم ملتا تھا) جانور کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی (ایضاً صفحہ ۱۳۲) یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کی بنا پر لفظ ظالمانہ کا استعمال جو کہ متن میں کیا گیا ہے حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔

۲۵۰

باب ۵

طبقہ	شرح منظور شدہ	حالیہ قدر
معمولی مزدور	روزانہ ۲ دام	۵ ½ آنے
اعلیٰ مزدور	” ۳ تا ۴ دام	۸ ½ تا ۱۱ آنے
نجار	” ۳ ” ۷ ”	۸ ½ آنے تا ۱۴ر
معمار	” ۵ ” ۷ ”	۱۴ آنے تا ۱۴ر

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ شرحیں خاص کر شاہی کیمپ کے مصارف سے متعلق تھیں جو کہ بجائے خود ساری سلطنت میں سب سے بڑا شہر ہوتا تھا۔ لہٰذا ابو الفضل کی بیان کردہ قیمتوں کی بنا پر اُن کی قوت خرید کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ اور اِسی بنیاد پر ہم نے ان کی حالیہ قدر ظاہر کی ہے۔ اس طرح حساب لگانے پر یہ شرحیں بہ حیثیت مجموعی اُن شرحوں کے بین بین ہوتی ہیں جو آگرہ اور لاہور میں ۱۹۱۱ء میں جبکہ اجرت شماری کی گئی تھی رائج تھیں ۱؎ اور اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اکبر کے مزدوروں کو پوری پوری منظورہ شرحیں مل جاتی تھیں تو وہ صوبجات متحدہ کے حالیہ مزدوروں سے کسی قدر بہتر حالت میں تھے لیکن پنجاب کے مزدوروں کے برابر خوشحال نہیں تھے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ انھیں منظورہ شرحوں سے کسی قدر کم اجرتیں ملتی تھیں۔ اور اُن کی واقعی حالت مقابلۃً کسی قدر خراب تھی لیکن ان اعداد سے جو عام نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے شہروں میں اجرت صحیحہ اکبر کے زمانے میں بھی کم و بیش اسی سطح پر تھی جس پر کہ وہ ۱۹۱۱ء میں قائم تھی اور یہ کہ آبادی کے اِن طبقوں کے معاوضے کے معیار میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس نتیجے کی تائید اُن ماہانہ شرحوں سے ہوتی ہے جو پیدل فوج کے لئے اور محلات کے مختلف شعبوں کے لئے منظور کی گئی تھیں۔ اکثر مثالوں میں تو ادنیٰ ترین درجہ کے ملازمین ماہانہ دو روپیوں سے بھی کم کے مستحق تھے (خاکروب کے لئے ۶۵ دام۔ شتربان کے لئے ۶۰۔ پہلوان کے لئے ۷۰ وعلیٰ ہٰذا) اکثر و بیشتر خدمتگار اور معمولی پیادہ سپاہی تین روپیوں سے کم پر آغاز کرتے تھے۔

(۱۹۲)

۱؎ معماروں کی شرحیں اس بیان سے مستثنیٰ ہیں۔ عہ کی اعلیٰ حد ۱۹۱۱ء میں پنجاب میں رائج تھی۔ لیکن مشرق کی طرف اور آگے یہ شرحیں ۸ر کے قریب قریب رہتی تھیں اور اس کے مقابل اکبر کے زمانے میں معمار کم از کم چودہ آنے اجرت پاتے تھے۔

باب ۴

دار السلطنت میں گذر اوقات کے لئے کم سے کم جو مقدار درکار تھی وہ غالباً ادنیٰ ترین درجہ کے غلاموں کی حالت سے واضح ہوتی ہے جنھیں ایک دام روزانہ دیا جاتا تھا جو کہ اُس زمانے کے زر کے حساب سے ایک روپیہ کے تین چوتھائی حصہ کے برابر ہوتا تھا۔

جو لوگ اس سے زیادہ اعلیٰ اور مخصوص کاموں پر نوکر رکھے جاتے تھے اُن کے معاوضے کے متعلق انھی کے مماثل کوئی اعداد ہمیں نہیں مل سکے اور چونکہ ہمیں یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ مختلف درجوں کے مزدوروں کے مابین اکبر کے زمانے میں بھی کم از کم ایسے ہی نمایاں فرق موجود تھے جیسے کہ آجکل نظر آتے ہیں اس لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ عام مزدوروں کی شرحوں سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اسی کا اطلاق ان تخصیص یافتہ مزدوروں پر بھی کیا جائے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عام طور پر دستکاروں کی حالت خراب تھی۔ اور وہ اپنے کارندوں کو مشکل ہی سے اعلیٰ اجرتیں دے سکتے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ کیا اجرتیں ادا کرتے تھے یہ اس وقت تک ایک محض قیاسی بات رہے گی جب تک کہ واقفیت کے جدید ذرائع کا ہمیں علم نہ ہو۔

سیاح اور تجار جو اجرتیں ادا کرتے تھے ان کے بارے میں جو کچھ واقعات ہمیں معلوم ہیں وہ قریب قریب پورے طور پر جنوبی اور مغربی ہند سے دستیاب ہوتے ہیں۔ پلیخ شلنگ یا ماہانہ دو روپیوں کے معاوضہ میں جو نوکر ملتے تھے اُن کی خوبی پر بڑی بہت زور دیتا ہے اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وہ اس کی نصف رقم گھر بھیجتے تھے۔ یہ بیان غالباً ان نوکروں کے متعلق ہے جو سورت میں نوکر رکھے جاتے تھے لیکن بہر صورت اس حصۂ ملک پر تو اُس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ ٹری منڈو سے آگے شمال کی جانب نہیں گیا۔ تقریباً دس سال بعد ڈیلا ویل سورت کے متعلق تحریر کرتے ہوئے شرح اجرت تین روپیوں سے زائد نہیں بتاتا۔ اور ڈی لیٹ کے مخبروں نے تین سے چار روپیوں تک اجرتیں بیان کی ہیں جن میں بعض اوقات اُس کمیشن کی وجہ سے جو خریداریوں پر عائد کیا جاتا تھا اضافہ ہو جاتا تھا۔ ۱۶۱۴ء میں ایک مسافر کو سورت اور سوالی ہیچم کے مابین سفر خرچ کے لئے سات یا آٹھ محمودیاں دی گئی تھیں (گویا تین اور چار روپیوں کے مابین)۔ اس کو تقریباً دو مہینے سفر میں لگے لیکن اس نے راستہ میں اپنا وقت ضائع کیا کیونکہ غالباً ایک مہینہ اس کیلئے کافی ہو جاتا۔ اِن مثالوں سے یہ نتیجہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے اوائل میں ماہانہ کم و بیش تین روپیوں میں غیر ملکی اشخاص کو مستند

(۱۹۳)

باب ۵

نوکر ملجاتے تھے۔ اجرت صحیحہ کی شکل میں یہ کس مقدار کے مساوی ہوتے تھے یہ ایک غیر یقینی بات ہے۔ جیسا کہ کسی سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے شمالی ہندوستان کے مقابل مغربی ساحل پر قیمتیں اعلیٰ رہتی تھیں۔ لیکن اُن کی ٹھیک ٹھیک سطح معلوم نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ غالباً ایک نا واجبی بات ہوگی اگر ہم اس شرح کا مقابلہ براہ راست اُن اجرتوں سے کریں (تخمیناً تیس روپے ماہانہ اور خریداریوں پر معقول کمیشن ملنے کی توقع) جو ٹری یا ڈیلاویل کو اگر وہ سنہ ۱۶۱۹ء میں بمبئی آتے تو ادا کرنی پڑتیں۔ یورپی اشخاص کو یہ اجرتیں غیر معمولی طور پر ادنیٰ معلوم ہوئیں اور اگر ان کے ساتھ شمالی دار السلطنت کی مروجہ شرحوں کو ملا لیا جائے تو پھر ہم گھریلو ملازمتوں کی اُس عظیم الشان ترقی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو کہ اُس زمانے میں ہندوستانی کی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہم کسی سابقہ باب میں اس بات کو واضح کر چکے ہیں۔

باب ۵

اسناد برائے باب پنجم

پہلی فصل۔ ندارد۔

دوسری فصل۔ سیاح جن جن جنگلات میں سے گذرے ان کے بارے میں وہ ہمیں بہت کم خبر دیتے ہیں۔ وہ گویا ان کے سفر کی ناخوشگوار خصوصیات تھیں جنھیں حتی الوسع جلد از جلد طے کر ڈالنا ضروری تھا۔ البتہ بنگال کے بمبو اور مغربی گھاٹ کی ساگوانی لکڑی کا کئی ایک سیاحوں نے حوالہ دیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو پیرآرڈ (ترجمہ ۱۔۳۳۸ و ۲۔۱۸۰)۔ ماہی گیری سے جو اسناد متعلق ہیں وہ آئین (ترجمہ ۲۔۱۲۴۔۱۲۶ سے ۳۳۸)۔ لنچوٹن (سی۔۸۴) تھیونوٹ (۷۷) ہیں۔ موتی گاہ کے لئے ملاحظہ ہو ٹیے (۷۳۵)۔

تیسری فصل۔ سونے کے بارے میں ٹیورنیر کا سکوت ہماری رائے میں فیصلہ کن ہے۔ اُسے اِس مضمون سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ ایشیائی پیداوار کی تحقیق کے لئے اس نے کچھ جگہ وقف کردی ہے (صفحہ ۳۹۳) جنوبی ہند میں اس نے نہایت لمبا چوڑا سفر کیا تھا۔ لہذا اگر وہاں کوئی سونے کی کان موجود ہوتی تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ وہ اسے دیکھنے کے لئے جاتا۔ آئین میں اسی دھات کا حوالہ موجود ہے (ترجمہ ۲۔۱۷۱۔۱۸۰۔۲۱۲۔۲۱۴) ان میں سے بعض عبارتوں میں چاندی کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آگرہ کی کان کا ذکر صفحہ ۱۸۱ پر موجود ہے۔

سیسہ اور جست کے لئے ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۲۔۲۶۸)۔ تانبے کے لئے ۱۷۴۔۱۸۲۔۱۹۴۔۲۶۸۔۲۸۰۔ لوہے کے لئے ۱۲۴۔۱۵۹۔۱۸۱۔۱۸۱۔۲۳۰۔۲۸۰ وغیرہ امپیریل گزیٹیر کے انڈکس میں تانبے اور لوہے کے تحت جو اندراجات ہیں ان پر نظر ڈالنے سے قدیم کاروبار کے مقامات کا تصور حاصل ہوسکتا ہے۔ تانبے کی درآمد کے لئے ملاحظہ ہو

باب۵ | باربوسا (۲۸۵)۔ دسویں ڈکاڈا (ا ۔ ۳۶۴)۔ بارھویں ڈکاڈا (۲۰)۔ تھیونوٹ (۳۱۸)۔ تانبے اور دوسری معدنیات کی قیمتوں کے لئے ملاحظہ ہو جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بابۃ اکتوبر ۱۹۱۶ء ۔ (۷۷۵۔ ومابعد)۔ ہندوستانی فولاد کے متعلق معلومات ہابسن جابسن میں سابحت کی گئی ہیں۔

ہیرے کی کانوں کی کیفیت (ٹیورنیر ۳۲۶ ومابعد) میں موجود ہے۔ نمک کے متعلق پنجاب کی کانوں کی کیفیت آئین (ترجمہ ۲ ۔ ۳۱۵) میں بیان کی گئی ہے تفصیل سانبھر کا حوالہ بدایونی نے دیا ہے (۲۔ ۴۰۷) بحری نمک کا حال آئین میں بتایا گیا ہے {ترجمہ ۲۔ ۱۳۹ وغیرہ (بنگال)۔ ۲۵۶ وغیرہ (گجرات)۔ ۳۳۸ (سندھ)}۔ اور ہیرارڈ نے (ترجمہ ا۔ ۳۵۵) ملیبار کی نمک کی گراں ہونکا ذکر کیا ہے۔ گو وایں لیبن کے پتھر کے استعمال کا بھی ہیرارڈ ہی ذکر کرتا ہے (۲۔ ۷۵)۔ شورے کے متعلق ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۲۔ ۲۳۱ و ۲۵۳)۔

(۱۹۴) **چوتھی فصل**۔ گڑ یا راب کا ذکر مختلف مصنفین نے کیا ہے۔ مثلاً باربوسا (۲۴۰) اور لنچوٹن (سی ۔ ۱۱)۔ بنگال کی شکر کے لئے ملاحظہ ہو باربوسا (۳۶۲)۔ لنچوٹن (سی ۱۶)۔ فنچ (پرچاس ۲۔ ۱۰۔ ۱۷۳۶) احمدآباد اور کھمبے کے لئے ملاحظہ ہو خطوط موصولہ (ا ۔ ۳۰۲) مصری کے لئے ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۲ ۔ ۱۸۱) خطوط موصولہ (۴ ۔ ۲۹۱)۔ لنچوٹن (سی ۷)۔ قیمتیں آئین میں دی ہوئی ہیں (ترجمہ ا ۔ ۶۴)۔

روئی اوٹانے کے بارے میں ملاحظہ ہو تھیونوٹ (۲۱)۔ نیل کے کاروبار کے لئے پرچاس (ا ۔ ۴ ۔ ۴۰۳)۔ گجرات میں برگ تمباکو کا دستیاب ہونا خطوط موصولہ میں مندرج ہے (۴۔ ۲۹۸)۔ اور تمباکو سازی کے فن سے ناواقفیت کا حال ٹری نے (۹۲) بتایا ہے۔ کم وبیش جملہ اسناد میں کسی نہ کسی قسم کی مسکرات کا حوالہ موجود ہے۔ اکبر کے قواعد وضوابط آئین میں درج ہیں (ترجمہ ۲۔ ۴۲)۔ جہانگیر کے فرامین توزک میں ہیں (ا ۔ ۸)۔ اور خود اس کی اپنی عادات کی کیفیت پرچاس میں ملے گی (ا۔ ۳۔ ۲۲۲)۔ رسد کے متعلق جو بیانات ہیں ان کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو باربوسا (۳۴۶)۔ پرچاس (ا ۔ ۴ ۔ ۴۲۴)۔ یا جوڈین (۱۲۴ و ۱۳۲)۔

پانچویں فصل۔ صناعیوں اور دستکاریوں کا ذکر اکثر سیاحوں نے کیا ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو باربوسا (۸۰ ۔ ۲)۔ لنچوٹن (سی ۹)۔ یا تھیونوٹ (۳۶ و ۱۴۰) فرنیچر کی قلت کے بارے میں ملاحظہ ہو خاص کر ٹری (۱۸۵)۔ لیکن اس بارے میں شہادت زیادہ تر منفی ہے

باب ۵

لہٰذا اصلی حالت معلوم کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مختلف عصری بیانات میں جو جو باتیں نہ ملتی ہوں انھیں درج کر لیا جائے۔ پرتگالی فرنیچر کے لئے ملاحظہ ہو پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۴۵)۔ تجار راندیر کے فرنیچر کے لئے ملاحظہ ہو باربوسا (۲۸۷)۔ ہندوستانی ساز اور زین وغیرہ کی نوعیت تفصیل کے ساتھ آئین میں دی ہوئی ہے (ترجمہ ۱-۱۲۶ تا ۱۵۳)۔

کاغذ کے متعلق جو کچھ بیانات کتاب میں درج ہیں وہ زیادہ تر ڈیلا ویل (۲۹۱) اور پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۷۵ و ۲۱۱ و ۲۴۵) پر مبنی ہیں۔ مکانات کی نوعیت کے متعلق معیار زندگی والے باب کے تحت میں حوالے ملیں گے۔ قلعہ الہ آباد کی تعمیر میں جو وقت لگا اس کے لئے ملاحظہ ہو پرچاس (۱-۴-۴۲۷)۔

چھٹی فصل۔ سڑک کے سفر کی بہترین کیفیت وہ ہے جو ٹیورنیر نے بیان کی ہے (۴۲ و مابعد ونیز ۱۲۱)۔ ہمارے دور سے وہ کسی قدر بعد کی حالت ہے لیکن یہ شتبہ ہے کہ اس وقفہ میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ دریائی آمد و رفت کی وسعت کے لئے ملاحظہ ہو پرچاس (۱-۴-۴۳۲-۲-۱۰-۱۷۳۳)۔ ایلیٹ کی تاریخ (۵-۳۷۴)۔ آئین (ترجمہ ۱-۲۸۰)۔ گنگا کی کشتیوں کی جسامت جورڈین نے بیان کی ہے (۱۲۲) اور جمنا کی فنچ نے (پرچاس ۱-۴-۴۳۹)۔ عرب اور مصر میں جہاز بنانے کی کوششوں کے متعلق ملاحظہ ہو باربوسا (۲۴۶)۔ دسویں ڈکاڈا (۲-۱۷۸) اور ہابسن جابسن لفظ "Teak" کے تحت۔ پیگو کے متعلق ہماری سند بالبی ہے (پرچاس ۲-۱۰-۱۷۲۸)۔ کونٹی نے حاجیوں کے جہازات کا جو ذکر کیا ہے وہ میجر (۲۷) میں موجود ہے۔ پرچاس میں بھی ان کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو ۱-۳-۳۰۸ و ۳۹۶) جیسی کہ ٹری بھی ان کی جسامت ٹنوں میں بیان کرتا ہے (ایضاً ۲-۱۰-۱۴۷۰)۔ منجملہ اور مصنفین کے پیرارڈ بھی بسین میں پرتگالی کشتیوں کی تعمیر کا ذکر کرتا ہے (۲-۱۴۴)۔

ساتویں فصل۔ ریشمی مال کی برآمد کے لئے ملاحظہ ہو باربوسا (۲۳۳ و ۳۶۶)۔ ورتھما (۱۱۱)۔ دوسرے اسناد ساکت ہیں۔ اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سیزر فریڈرک فیچ اور بالبی (جس کی تحریریں پرچاس میں اکٹھی کی گئی ہیں (۲-۱۰) ان میں سے کوئی بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ ریشمی مال بنگال سے پیگو کو برآمد کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں ریشمی چیزوں کے استعمال کے متعلق ملاحظہ ہو آئین۔ (ترجمہ ۱-۸۸) اور باربوسا (۲۹۷)۔ پیدائش کے

باب ۵ (۱۵۵) متعلق ٹیورنیر کی بیان کردہ کیفیت صفحہ ۲۹۰ پر ہے۔ خام پیداوار کی درآمد کے حوالے گرشیا ڈا اور تا دہ ۹۵)۔ لنچ ٹن (سی ۲۳)۔ اور پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۳۹) میں موجود ہیں۔ حالیہ پیدائش کی کیفیت ہم نے پروفیسر میکسویل۔ لفرائے (جرنل رائل سوسائٹی آف آرٹس سنہ ۱۹۱۶ء صفحات ۲۹۰ و مابعد) سے اخذ کی ہے۔ گجرات کی صنعت کا اکثر سیاحوں نے ذکر کیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو لنچوٹن (سی ۱۵)۔ کشمیر کے متعلق ملاحظہ ہو آئین۔ (ترجمہ ۲-۳۴۹)۔ اکبر کی اصلاحات کے بارے میں ایضاً (۱-۸۸)۔ نباتی ریشم کے لئے ملاحظہ ہو ہابسن جابسن "Grass-Clolt" اور "Moonga" کے تحت و نیز جو حوالے وہاں دیئے گئے ہیں۔

اونی مال کے حوالے آئین میں ہیں (ترجمہ ۱-۵۵ و ۹۰ تا ۹۶ و ۱۳۶)۔ انگریز تاجروں کی مایوسیوں کا خطوط موصولہ (مثلاً ۲-۹۶ و ۴-۱۰۱) میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی خاصیت کے متعلق ٹری کی رائے پرچاس میں مذکور ہے (۲-۹-۱۴۶۹)۔ قالینوں کا حوالہ "انگلش فیکٹریز" کی ابتدائی جلدوں میں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔

آٹھویں فصل۔ پٹسن پر جو مالگزاری کی شرحیں تشخیص کی جاتی تھیں وہ آئین میں ملیں گی (ترجمہ ۲-۹۱ و مابعد) جوٹ کا صرف ایک جگہ حوالہ دیا گیا ہے اور وہ ۲-۱۲۴ میں ہے۔ جوٹ کا لباس استعمال کرنے کے متعلق جو اقتباس ہے وہ امپیریل گزیٹیر (۳-۲۰۴) سے ماخوذ ہے۔

روئی کی تجارت کی طرف یورپی اشخاص کا جو طرز عمل تھا اس کے لئے ملاحظہ ہو پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۴۵)۔ افریقہ کی برہنگی کے متعلق پیرارڈ کی رائے ۲-۱۴۹ میں ہے۔ فوائر جو نو کیلئے ملاحظہ ہو پرچاس (۲-۹-۱۴۵۰)۔ جزائر میں پوشاک کی کمی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ باکلوت (۵-۲۶ و ۲۷۲) اور پرچاس (۱-۳-۱۶۵) میں ملیں گے۔ اس دور میں چین کے ساتھ جو تجارت کی رفتار تھی وہ پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۷۳) میں بیان کی گئی ہے۔ جاپان کے متعلق جو اقتباس ہے وہ خطوط موصولہ (۳-۲۳۰) سے ماخوذ ہے۔ نلپاٹن سے آگے کی تجارت کا ذکر لنچوٹن (سی ۲۲) میں موجود ہے۔

ہندوستان میں سوتی مال کے متعلق جو خبریں ہیں وہ "دربارہ صوبوں کی کیفیت" (مندرجہ آئین۔ ترجمہ ۲) میں منتشر ہیں اور وہ تقریباً ہر یورپی سیاح کی تحریروں میں ملیں گے۔ ڈیلے اند ہیں

کی گھانی والی صنعت کا حوالہ مزریق نے دیا ہے (۶۲ تا ۷۰) کیمبے۔ کارومنڈل اور بنگال کے مال کے تقسیم کا حال بہترین طور پر بار بوسا میں ملے گا۔

نویں فصل۔ شہروں میں دستکاروں کی حالت کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ خطوط موصولہ کی ابتدائی جلدوں کا بہ حیثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے۔ اس مضمون سے متعلق خاص خاص عبارتیں (۱۔ ۳۰ و ۳۰۲)۔ (۲-۱۱۲) (۳-۸۴)۔ (۴-۲۲۹) نیز انگلش فیکٹریز ۱۶۱۸ء تا ۱۶۲۱ء۔ (۱۶۱) میں ملیں گی۔ سرکاری کارخانوں کے لئے ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۱-۸۸) اور برنیر (۲۵۹)۔ دستکاروں کے افلاس کے لئے ملاحظہ ہو برنیر (۲۲۸)۔ اور تھیونوٹ (۱۴۰)۔ قحط کے اثر کے لئے ملاحظہ ہو "انگلش فیکٹریز" (۱۶۳۰ تا ۳۳ ۲ و ۹۷ و ۱۲۶ و ۱۵۰ وغیرہ)۔ محصول کے سلسلہ میں جن عبارتوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہیں، آئین (ترجمہ ۲-۶۶) اور ٹیری (۳۹۷) اور تھیونوٹ (۱۸)۔

دسویں فصل۔ شہروں کی جانب منتقلی کا حال برنیر بیان کرتا ہے (۲۰۵) محنت کے بازار کے لئے ملاحظہ ہو ٹیری (۱۷۳) ہندوستانی نوکروں کی اس نے جو تعریف کی ہے وہ اسکا صفحہ پر ہے۔ جنوب اور مغرب کے لئے جو دوسری شرحیں بیان کی گئی ہیں ان کے لئے ملاحظہ ہو ڈیلاویل (۴۲)۔ ڈی لیٹ (۱۱۷)۔ اور خطوط موصولہ (۲-۱۰۱) اور (۴-۲۸)۔

متن میں جس اجرت شماری کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ۱۹۱۱ء سے متعلق ہے جس کے اعداد و شمار کتاب موسومہ "ہندوستان میں قیمتیں اور اجرتیں" (جلد ۲ صفحات ۲۳۳ و مابعد) میں مندرج ہیں۔

چھٹا باب

تجارت

پہلی فصل

عام خصوصیات

کسی سابقہ باب میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہندوستانی زراعت کے اہم خصوصیات گذشتہ تین صدی کے دوران میں کم و بیش ایک ہی حالت پر قایم رہے ہیں۔ لیکن ہندوستانی تجارت کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے اور اکبر کے زمانے میں اُس کی نوعیت اور اس کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ ہندوستانی تجارت کے متعلق ہم نے جو کچھ سیکھا ہے اُسے کم و بیش کلیتاً اپنے دماغ سے نکال ڈالیں۔ یہ انقلاب اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ اس سے قبل جو تجارت کی عام حالت تھی وہ کم از کم ایک ہزار سال سے بلا کسی تغیر و تبدل کے برابر چلی آرہی تھی۔ "مشرقی تجارت کی اشیا نہایت عمدہ لیکن ناقابل لحاظ تھیں" گبن کا یہ چبھتا ہوا مقولہ سولھویں صدی عیسوی پر بھی اسی طرح صادق آتا ہے جس طرح کہ دوسری صدی کے حالات پر۔ لیکن جو کپڑا اور مشینیں آجکل ہندوستان خرید تا ہے یا جو غلہ۔ روغندار تخم اور ریشے اپنے قرضوں کی ادائی میں دیتا ہے اُن پر اسی قسم کے فقرے بالکل ناقابل اطلاق بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ جو تبدیلی کہ اس وقت زیر بحث ہے وہ اکبر کی وفات کے بعد واقع ہوئی ہے اور جہاں تک اس کے اسباب اور اس کی تدریجی ترقی کا تعلق ہے اُس کی کیفیت پیش کرنا اس وقت ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اُن واقعات کا جو کہ ہمارے زیر بحث دور کے خصوصیات میں شامل ہیں ایک صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو

باب ب

ہمیں چاہیئے کہ اس تبدیلی کے واقعے کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

سولھویں صدی میں بعض خاص خاص قسم کے غیر ملکی سامان کے لیے ہندوستان کی طلب بہ حیثیت مجموعی کافی موثر ہوتی تھی اور وہ ان چیزوں کے معاوضہ میں اپنے ہاں کی مختلف قسم کی پیداواریں برآمد کر سکتا تھا۔ بیرونی ممالک کی جو چیزیں طلب کی جاتی تھیں ان کی فہرست (۱۹۷) اتفاقی طور پر آخری باب میں درج ہو گئی ہے چنانچہ چند اہم اشیا کے منجملہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ضروریات شمار کی جا سکتی ہیں اور تین شعبے خام پیداوار پر مشتمل ہیں اور بقیہ اشیا کو محض تعیشات سمجھنا چاہیئے جن کا صرف یہ مقصد تھا کہ آبادی کے اعلیٰ طبقوں کے مذاق کی تکمیل کی جائے۔ ضروریات میں سے دو چیزیں سونا اور چاندی ہیں جو اس وجہ سے ضروریات کہلانے کی مستحق ہیں کہ وہ ٹکسال میں استعمال کی جاتی تھیں۔ گو اس کی رسد کا بہت بڑا حصہ صرف اظہار شان اور نام و نمود کی خاطر استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر ان دونوں کو ملا لیا جائے تو اشیا درآمد کی فہرست میں وہی سب سے زیادہ اہم نظر آتے ہیں اور جو قواعد و ضوابط ہندوستان کے ساحلوں اور سرحدوں پر نافذ ہوتے تھے ان کا خاص مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کی رسد کو برقرار رکھا جائے۔ اس شعبے کے تیسرے عنوان میں جانور اور بالخصوص گھوڑے شامل ہیں جو مروجہ فوجی طریقے کے مطابق کثیر تعداد میں درکار ہوتے تھے۔ اس صورت میں بھی تعیش کا جزو کلیتہً معدوم نہیں تھا۔ کیونکہ کام کے لائق گھوڑے شمالی ہندوستان میں پیدا کئے جاتے تھے اور ایران و عرب سے ان کی جو درآمد ہوتی تھی اس کا باعث ایک حد تک یہی اظہار شان اور نام و نمود کی خواہش تھی لیکن جنوب کی سلطنتوں میں رسد کے مقامی ذرائع بالکل مفقود تھے۔ اور متعلقہ مملکتوں کی حفاظت کے لئے اس تجارت کا برقرار رہنا نہایت ضروری تھا۔ خام پیداواروں کے جن تین شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ ایک خام ریشم جو ہندوستانی صنعت کے لئے درکار تھا۔ دوسرے دھاتیں۔ مثلاً تانبہ۔ ٹین جست سیسہ۔ پارہ۔ جن کی قلت کا گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ تیسرے ہاتھی دانت۔ مونگے۔ عنبر اور دوسری پیداواریں جو باریک صنعتوں اور دستکاریوں کے لئے مطلوب ہوتی تھیں۔ درآمد ہونیوالی اشیائے تعیش کی فہرست نسبتاً زیادہ طویل ہے۔ ہر قسم کے جواہرات قیمتی پارچے مثلاً ریشم۔ مخمل۔ اور کمخواب۔ مصالحے عطریات۔ اور قسم قسم کے مشروبات۔ مختلف قسم کی اشیا جنہیں بالعموم چینی مال کہا جاتا ہے یورپ کی شراب۔ افریقہ کے غلام اور کم و بیش ہر ایسی چیز جو نادر یا کمیاب کہلائی جا سکے خواہ

باب ۶ وہ کسی ملک سے بھی آئی ہو - ان اشیاء درآمد کے معاوضے میں ہندوستان سے بھی مختلف قسم کی چیزیں باہر بھیجی جاتی تھیں مثلاً قسم قسم کے کپڑے - کالی مرچ اور چند معمولی مصالحے بعض رنگ جن میں نیل سب سے زیادہ اہم تھا - افیون اور دیگر مشروبات اور مختلف دوسری چیزیں جو مقابلۃً اس قدر اہمیت نہیں رکھتی تھیں - ہندوستان ہر قسم کی پیداوار فروخت کرنے کا خواہشمند رہتا تھا اور (۱۹۸) سونے چاندی کے لئے اُس کی غیر تسکین پذیر اشتہا کا یہ نتیجہ تھا کہ جو گاہک اپنے ہاتھ میں زر لے کر آتے تھے اُن کے لئے تجارت ایک بالکل سیدھا سادہ معاملہ تھا -

ذرائع نقل و حمل میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ بھی اشیائے تجارت کی تبدیلی سے کچھ کم نمایاں نہیں ہے - جہاں تک خشکی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں نہ ریلیں تھیں اور نہ پختہ سڑکیں - شمال میں البتہ دریائی راستے موجود تھے اور ان کے علاوہ زیادہ تر بار کش جانوروں کے ذریعہ مال ایسے قریب ترین مقام پر روانہ کیا جاتا تھا جہاں دریائی نقل و حمل کا ذریعہ میسر ہوتا تھا - سمندر پر متعدد چھوٹے چھوٹے اور چند بڑے جہاز موجود ہوتے تھے لیکن ان میں کوئی بھی اتنا بڑا نہیں ہوتا تھا کہ بہ لحاظ گنجائش کے آجکل کے کسی معمولی مال لے جانے والے جہاز سے بھی اس کا مقابلہ کیا جاسکے - خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سمندر پر چلنے والے سارے جہازوں کا مدار ہواؤں پر تھا - اور نہ صرف اُن کی رفتار بلکہ ان کا رخ بھی ایسی قوتوں کے تابع تھا جو انسانی تصرف سے بالکل باہر تھیں - بندرگاہ نہ ابھی پیدا ہوئے تھے اور نہ فن انجنیری کی کارگذاری سے بنائے گئے تھے بلکہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے وہیں ان کی جگہ قرار دیجاتی تھی - اور ان میں سے اکثر و بیشتر تو سال کے بڑے حصہ میں بند پڑے رہتے تھے - قدرت کے معاملات میں انسان کی مداخلت چنداں قابل لحاظ پیمانے پر شروع نہیں ہوئی تھی - بلکہ وہ اس بات پر مجبور تھا کہ قدرت نے جو کچھ مواقع فراہم کردیے ہیں اپنے آپ کو انھیں کے مطابق بنالے -

بحری تجارت کی تنظیم کے متعلق سولھویں صدی کا زمانہ ایک غیر مستقل توازن کا دور تھا - اور ختم صدی کے وقت جو حالات مروّج تھے ان کو سمجھنے کے لئے ۱۴۹۸ء کی طرف پلٹنا ضروری ہے جبکہ واسکوڈاگاما نے راس امید کے اطراف ہوتے ہوئے جہاز میں سفر کیا تھا - اس نے دیکھا کہ مداغاسکر سے لے کر آبنائے ملاکا تک جملہ ہندوستانی سمندر مسلمان تاجروں کے قبضے میں ہیں جو اکثر و بیشتر جہازوں کے مالک تھے اور خود ہی اُن کا انتظام کرتے تھے - اس کے علاوہ خشکی کی تجارت میں بھی ان کا اہم حصہ تھا - دوسرے طبقوں کے تجار اپنے اپنے مال کے لئے ان

باب ۶

جہازوں میں کرایہ پر جگہ حاصل کر سکتے تھے اور اپنے مال کے ساتھ خود بھی سفر کر سکتے تھے لیکن اپنے مال کے لئے جگہ حاصل کرنے کے علاوہ جہاز رانوں پر اس کے علاوہ ان کا عملاً کوئی اثر نہ تھا کہ وہ خود اپنے جہاز رکھیں۔ ایسی مثالیں مقابلۃً شاذ تھیں۔ بار بوسا اور ورتھما نے جو حالات بیان کئے ہیں اُن سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ ساحل ملیبار کے کم وبیش سارے جہاز خلیج کھمبے سے روانہ ہونے والی اکثر وبیشتر تعداد اور ساحل کارومنڈل و نیز بحیرۂ بنگال کے جہازوں (۱۹۹) کا اکثر حصہ عملاً مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا۔ بنگالی۔ گجراتی اور کارومنڈل والے تاجروں کے جہازوں کی تعداد خواہ کتنی ہی ہو۔ مسلمانوں کے جہازوں کی تعداد کا غلبہ ناقابل تردید ہے چنانچہ بحر ہند کے سواحل کے اطراف بحری معاملات میں جو نمایاں یکسانیت نظر آتی تھی وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

مسلمان تاجروں کی حیثیت سے ان ساحلوں پر پھیل گئے تھے ان کی حیثیت فاتحوں کی سی نہ تھی۔ اور جن جن مقامات میں تجارت سے نفع حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے وہاں کے حالات سے انھوں نے اپنے آپ کو مانوس بنا لیا تھا۔ افریقہ کے مشرقی ساحل پر جہاں کوئی متمدن حکومت موجود نہیں تھی انھوں نے خاص اپنی بستیاں قائم کرلیں لیکن ہندوستان کی طرح جن مقامات میں پہلے سے تہذیب وتمدن کا وجود تھا وہاں وہ مقامی حاکموں کے زیر حفاظت آباد ہو گئے۔ اور چونکہ کسی بندرگاہ کی تجارتی حالت کو بنانا یا بگاڑنا اُن کے اختیار میں تھا انھیں ہر جگہ خاص خاص حقوق اور رعایتیں مل جاتی تھیں۔ کاروبار سے اُن کا صرف دست کش ہوجانا مقامی تاجروں کو برباد کردینے کے لئے کافی تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ اہمیت غالباً اس بات کی تھی کہ وہ ہر ایسے نظم ونسق کو جس کی اکثر وبیشتر آمدنی کا انحصار بندرگاہ کے محاصل پر ہوتا تھا یا ہر ایسے عامل کو جس نے اپنے خانگی نفع کے لئے کروڑگیری کا ٹھیکہ لے لیا ہو سخت نقصان پہنچا سکتے تھے۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر ہندوستانی سمندروں میں اُن کے قدم نہایت مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ اور کسی خطرناک حریف کے نمودار ہونے کی کوئی علامتیں نظر نہ آتی تھیں۔ مسلمان تاجروں کی بحری تجارت کی تنظیم کے بارے میں یہاں کوئی مفصل کیفیت بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ کاروبار کا اجتماع ہندوستان کے مغربی ساحل اور خاص کر ملیبار کے بندرگاہوں پر تھا جن میں اس وقت سب سے زیادہ اہمیت کالیکٹ کو حاصل تھی۔ مشرق اقصیٰ کی پیداوار عام طور پر

بابت

راست خلیج فارس یا بحیرۂ احمر کو نہیں پہنچائی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ صورت باعث طوالت اور بعض اوقات پرخطر ثابت ہوتی تھی۔ بلکہ پیگو اور ملاکا سے جہاز کالیکٹ یا کسی پڑوس کی بندرگاہ پر آتے تھے جہاں آئندہ سفر کے لئے مزید مال لے لیا جاتا تھا جس کا ایک جز اُن ہندوستانی اشیاء پر مشتمل ہوتا تھا جو ساحل سے لگے لگے وہاں تک لائی جاتی تھیں۔ اسی طرح پر جو مال بحیرۂ احمر سے آتا تھا وہ بھی وہیں اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے مختلف سمتوں میں روانہ کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح ملیبار ہندوستانی سمندروں کی کم و بیش جملہ تجارت کے لئے گویا ایک گودام اور تجارت کا ایک اہم ترین مرکز تھا۔[1]

(۲۰۰)

جب پرتگالی ہندوستانی سمندروں میں نمودار ہوئے تو یہ صورت حال بالکل بدل گئی مغرب اپنے جہاز راس امید کے اطراف گھماتے ہوئے نہیں لے جاتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے پاس یورپ کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے صرف دو بحری راستے رہ گئے تھے۔ ایک بحیرۂ احمر میں سے ہو کر۔ دوسرے خلیج فارس میں سے۔ اور یہ دونوں راستے ایسے تھے جن میں ممالک غیر کے طرز عمل اور ان کی مداخلت کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ خلیج فارس کے راستے سے جو مال بھیجا جاتا تھا اس کو خشکی پر شام میں سے ہو کر روانہ کرنا پڑتا تھا اور پندرھویں صدی کے اختتام پر ترکوں نے یہ راستہ بالکل بند کر دیا تھا۔ دوسرے راستے کے لئے مصر میں سے ہو کر جانا ضروری تھا۔ یہ راستہ کھلا ہوا تو تھا لیکن حکومت مصر کی جانب سے جو محاصل عائد کئے جاتے تھے وہ انتہا درجہ گراں ہوتے تھے اور ان کی وجہ سے ایشیائی مال یورپی ممالک میں بہت گراں قیمتوں پر فروخت ہوتا تھا۔ اس زمانے میں پرتگالی قوم کی اولوالعزمی بحری معاملات میں سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسا راستہ دریافت کیا جائے جو دوسری قوموں کی مداخلت سے بالکل آزاد ہو اور اس کی مدد سے مشرقی تجارت کو اپنے زیر اقتدار لانے کی کوشش کی جائے۔ اور مشرق کی پیداوار پرتگالی جہازوں میں یورپ پہنچائی جائے۔ لیکن اس فیصلہ کی محرک محض تجارتی ترقی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ ہندوستانی تجارت پر اپنا

---

[1] اس دور کا کچھ پتا انگریزی لفظ "کالیکو" میں ملتا ہے جو کہ تقریباً یقینی طور پر کالیکٹ سے ماخوذ ہے۔ سوتی مال کالیکٹ میں بالکل نہیں بنتا تھا۔ لیکن کالیکٹ کے بندرگاہ میں وہ یورپ کے لئے جہازوں پر لادا جاتا تھا چنانچہ اسی بندرگاہ کی وجہ سے مغربی ممالک میں یہ چیزیں کالیکو کے نام سے مشہور ہو گئیں۔

باب ۵

تصرف جمانے سے سلمان مملکتوں کو جو اُس وقت مسیحیت کی دشمن تصور کی جاتی تھیں سخت صدمہ پہنچے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس اولوالعزمی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جن ممالک کے ساتھ تجارت کرنا مقصود تھا وہاں تبلیغی جد وجہد کے مواقع نکل آئیں گے۔ چنانچہ مذہبی اور تجارتی اغراض کا یہ اجتماع ہی سولھویں صدی کے دوران میں پرتگالیوں کی ساری جد وجہد کی گویا کلید ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا بہت کچھ طرز عمل ایک تاجر کے نقطۂ نظر سے تو ناقابل تشریح معلوم ہوتا ہے لیکن تبلیغی جوش کی شکل میں جو اس ملک کے حکمرانوں کی امتیازی خصوصیت تھی ایسے طرز عمل کا بہانہ مل جاتا ہے اگرچہ وہ ہمیشہ حق بہ جانب نہ ہو۔

جیسا کہ کسی سابقہ باب میں کہا گیا ہے پرتگالیوں کا مقصد خشکی پر سلطنت قائم کرنا نہ تھا ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستانی سمندروں پر اپنا اقتدار قائم کیا جائے اور اس کے لئے صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ مستحکم بندرگاہوں کی کافی تعداد موجود ہو تاکہ بیروں کو پناہ مل سکے اور لڑنے والے آدمیوں کی رسد برقرار رہ سکے۔ چنانچہ کہیں تو اپنی طاقت کے زور سے اور کہیں گفت وشنید کے ذریعہ انھوں نے جلد جلد ضروری بندرگاہ حاصل کر لئے اور چند ہی سال کی مدت میں یہ نئی طاقت مزمبیق سے لے کر ملاکا تک مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی۔ اس کے بعد یہ کوشش شروع ہوئی کہ تجارتی کاروبار کو جو اب تک سیاسی اقتدار سے بالکل آزاد تھا آئین وضوابط کا پابند بنایا جائے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ خاص خاص راستوں پر اور خاص خاص چیزوں کی تجارت کرنے کا اجارہ سرکار کو حاصل ہے اور ایسی تجارت شاہ پرتگال یا اس کے نامزد کردہ اشخاص کے فائدہ کے لئے کی جاسکتی ہے۔ ان حدود کے باہر خانگی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت تھی بشرطیکہ اجازت حاصل کر لی گئی ہو اور اس کا معاوضہ ادا کیا جاچکا ہو۔ لیکن غیر اجازت یافتہ جہاز حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی تو مال غنیمت تصور کئے جاتے تھے اور کبھی ڈبو دئے۔ جلادئے یا گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ بہرحال اگر زمانۂ موجودہ کے معیاروں سے جانچا جائے تو نظم ونسق انتہا درجہ خراب معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدہ داروں کا کام بالعموم صرف اسی قدر تھا کہ جہاں تک جلد ہو سکے روپیہ پیدا کریں اور اسی وجہ سے جو آئین وضوابط بہ لحاظ اپنی شرائط کے بہ ظاہر سخت نظر آتے ہیں درحقیقت وہ اپنے عملدرآمد میں زیادہ لچکدار تھے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ پرتگالی اقتدار کے تحت ہندوستانی تاجر جس قسم کی تجارت کرنا چاہتے کر سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ یہ سمجھ چکے ہوں کہ کیونکر کام نکالنا چاہئے اور اس بات پر آمادہ ہوں کہ

(۳۰۱)

حق تجارت کے معاوضہ میں جو کچھ رقمیں طلب کی جائیں گی انھیں ادا کریں گے۔

مسلمان مالکان جہازان آئین وضوابط کی پابندی کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ لیکن وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ مساوی حیثیت سے نو واردین کا مقابلہ کرسکیں اور انھوں نے طرح طرح سے اپنے آپ کو اس صورت حال کے مطابق بنانے کی کوشش کی مثلاً انھوں نے ایک تو یہ کوشش کی کہ اپنے راستے تبدیل کردئے۔ چنانچہ باربوسا کہتا ہے کہ ملاکا سے جو جہاز آتے تھے وہ کبھی کبھی ساحل کارومنڈل کی طرف مڑ جاتے تھے کیونکہ اُن کے مالکوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہندوستان کی دوسری جانب پرتگالیوں کا مقابلہ کریں۔ اور جو جہاز جانب مغرب جاتے تھے وہ ساحل سے الگ رہتے اور جزائر مالدیو میں سے ہوتے ہوئے باہر ہی باہر دوسرا راستہ اختیار کرتے تھے حالانکہ اس میں جہازوں کی تباہی کا خطرہ لگا رہتا تھا[۱]۔ اس کے علاوہ اکثر صورتوں میں پرتگالی قواعد وضوابط تسلیم کر لئے جاتے تھے اور پرتگالیوں کے عطا کردہ اجازت ناموں کے ساتھ ہندوستانی جہاز مختلف مقامات اور خاص کر حاجیوں کے بندرگاہوں کو جو بحیرۂ احمر پر واقع تھے جایا کرتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں حالات (۲۰۲) موافق ہوتے وہاں ساحل کے مسلمان ایک بے قاعدہ جنگ وجدال جاری رکھتے اور پرتگالی جہازوں کے ساتھ بالکل وہی سلوک کرتے تھے جو پرتگالی ان کے جہازوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ معاصر مصنفین اس طرز عمل کو دریائی ڈکیتی کے نام سے موسوم کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے خاص کر ساحل ملیبار پر جس کے بعض حصوں میں یہ "بحری قزاق" نہایت مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے جہاز رانی سخت خطرے کی حالت میں رہتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک قزاق نے تو خود پرتگالیوں کے قائم کردہ طریقے کی تقلید شروع کردی تھی۔ چنانچہ وہ تجارت کرنے کے لئے خاص اپنے اجازت نامے جاری کرتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ پرتگالی رعایا بھی ان اجازت ناموں کو قبول کرلیتی تھی۔ پس مسلمان سمندروں سے بالکل نکال نہیں دئے گئے تھے بلکہ وہ

---

[۱] ملاکا سے بحیرۂ احمر تک کے طویل دریائی سفر کے لئے اس زمانے کے جہازوں پر اشیائے خوراک نہیں بہم پہنچائی جاسکتی تھیں جب انکے لئے ہندوستان کا ساحل بند ہوگیا تو غذا اور پانی حاصل کرنے کا موقع صرف جزائر مالدیو میں رہ گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے ان کے قرب وجوار میں جہاز رانی کو جو خطرات پیش آتے تھے اُن کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

باب ۶

کبھی تو اجازت لے کر اور کبھی اپنے حریفوں کا مقابلہ کر کے بہت کچھ بحری تجارت کرتے رہتے تھے۔ سولھویں صدی کے ختم پر مختلف اسباب کی بدولت جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے پرتگالیوں کی قوت بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ اور ڈچوں اور انگریزوں کے مقابلہ میں اس کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا[1] تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں یہ دونوں قومیں مشرقی تجارت میں براہ راست حصہ حاصل کرنے کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں۔ لیکن درحقیقت یہ واقعہ ہمارے زیر بحث دور کے کچھ ہی بعد کا ہے۔ لہٰذا اس دور میں تو سواحل کی تجارت کا اقتدار مسلمانوں اور پرتگالیوں ہی کے مابین منقسم تھا۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سمندروں پر اقتدار حاصل کرنے کی اس کشمکش میں ہندوستان کی بڑی بڑی مملکتوں میں سے کسی نے بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ خاص طور پر خشکی کی سلطنتیں تھیں اور اگرچہ وہ خارجی تجارت کے فوائد کو محسوس کرتی تھیں اور اس کی بدولت اُن کے بندرگاہوں کو جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اس کو بھی اچھی طرح جانتی تھیں تاہم دوران راہ میں اُس کی محافظت کے لئے انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اکبر نے گجرات سے بحیرۂ احمر کو اپنے جہاز روانہ کئے لیکن وہ پرتگالیوں کی اجازت سے روانہ ہوئے تھے سنہ ۱۵۶۵ء کے صلحنامہ کی بدولت وجیانگر کی بحری تجارت عملاً پرتگالیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ اور جہاں تک دکن کی سلطنت بیجاپور کا تعلق ہے وہ اسی بات پر قانع تھی کہ پرتگالیوں سے خشکی پر لڑتی رہے۔ بہرحال اُس سے یہ مشکل یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ پرتگالیوں کو سمندر سے نکال باہر کرے۔ زاموری حاکم کالی کٹ نے جو کچھ اُس سے ممکن تھا "بحری قزاقوں" کو محفوظ رکھنے کے لئے کیا جن میں سے بعض اُسے خراج دیا کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی اس قابل نہیں تھا کہ پرتگالیوں کے مقابلے پر آ کر علی الاعلان جنگ آزمائی کر سکے۔ اور اس کی خفیہ کوششوں اور جد وجہد کو چھوڑ کر کوئی اور محافظ ایسا نہیں تھا جس سے ملک کے تاجر کوئی امید کر سکیں بلکہ انھیں خود اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ (۲۰۳)

---

[1] ڈچ قوم کے جہاز پہلی مرتبہ سنہ ۱۵۹۶ء میں راس امید پر سے گذرے۔ لیکن ان کے ابتدائی سفر اُن جزائر کی جانب تھے جو ملاکا سے آگے واقع ہیں۔ سنہ ۱۶۰۵ء تک وہ پولی کٹ واقع ساحل کارومنڈل پر قدم جما چکے تھے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جن لوگوں نے سب سے پہلی مرتبہ سفر اختیار کیا وہ سنہ ۱۶۰۲ء میں سماٹرا پہنچے۔ تیسری مرتبہ کے سفر میں البتہ کمپنی کے جہازوں میں سے ایک جہاز اگست سنہ ۱۶۰۸ء میں ایک ہندوستانی بندرگاہ پر وارد ہوا۔

دوسری فصل

ہندوستان کے بڑے بڑے بندرگاہ

اس زمانے میں ہندوستان کی بحری تجارت کی اصلی صورتِ حال واضح طور پر بیان کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے ایک ایک بندرگاہ یا متعدد بندرگاہوں کے ایک ایک مجموعے کو لے کر یہ بتایا جائے کہ سمندر کے دوسرے حصوں سے اس کے کیا تعلقات رہتے تھے۔ جو طلبہ صرف آجکل کی تجارت سے واقف ہیں انہیں یہ مضمون بہت کچھ غیر مانوس معلوم ہوگا۔ چنانچہ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس یا کراچی جیسے شہروں کے نام جہاں آجکل ہندوستان کی اکثر و بیشتر تجارت طے پاتی ہے ہمیں نہیں ملتے۔ یا اگر وسیع تر شرقی سمندروں پر نظر ڈالی جائے تو رنگون۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ سڈنی یا کیپ ٹون جیسے مقامات کا ہم کہیں ذکر نہیں سنتے۔ بجائے ان کے ہمیں بندرگاہوں کی ایک زیادہ لمبی فہرست سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن میں سے اکثروں کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور بعضوں کے تو نام بھی جدید نقشوں میں نظر نہیں آتے۔ پہلے باب کے ساتھ جو نقشہ منسلک کیا گیا ہے اُس میں ہندوستانی بندرگاہوں کے مقامات بتلائے گئے ہیں۔ اور برابر کے صفحہ پر جو نقشہ پیش کیا گیا اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے ممالک کے بندرگاہوں کے لحاظ سے یہ بندرگاہ کس طور پر واقع تھے۔ ان بندرگاہوں سے روانہ ہونے والے جہازوں کی نوعیت اور جسامت پر کسی آئندہ فصل میں بحث کی جائیگی فی الحال یہ کہنا کافی ہے کہ وہ چار قسموں میں منقسم ہیں ایک پرتگالی کیرک۔ دوسرے بحیرۂ احمر کو جانے والے حاجیوں کے جہاز۔ تیسرے معمولی تجارتی جہاز۔ چوتھے ساحلی آمدورفت کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ جہازوں کی پیمائش کا جو طریقہ اس زمانے میں رائج تھا اُس کے مطابق کیرک ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ ٹن تک[1] اور حاجیوں کے جہاز ۵۰۰ سے ۱۵۰۰ ٹن تک ہوتے تھے۔ معمولی تجارتی جہاز

[1] اس لفظ کے لئے صفحہ ۱۶۰ پر جو نوٹ دیا گیا ہے وہ ملاحظہ کیا جائے۔

باب ٦

۰۰ہم سے شاذ و نادر ہی بڑھتے تھے اور ان کا اوسط غالباً ۲۰۰ ٹن سے بھی کم ہوتا تھا۔ اور جہاں تک ساحلی کشتیوں کا تعلق ہے وہ تقریباً ۶۰ ٹن سے نیچے ہر وسعت کی ہوتی تھیں۔

ہندوستان کے شمال مغرب سے شروع کرتے ہوئے ہم بدیہی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ملک کا یہ حصہ کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس کے لئے ہمیشہ دریائے انڈس کے دہانہ کے قریب کہیں نہ کہیں ایک بندرگاہ ضرور موجود رہا ہوگا۔ البتہ دریا کے بہاؤ کی تبدیلیوں کی وجہ سے اور شاید دوسرے اسباب کی بدولت جن کی نوعیت سے ہم ناواقف ہیں اس کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً دیبال یا دیوال کا بندرگاہ جس سے قدیم عرب جغرافیہ داں اچھی طرح مانوس تھے اس زمانے میں غائب ہو چکا تھا۔ لیکن ڈیول یا دیول۔ سندھ کی شکل میں اس کا نام باقی رہ گیا تھا۔ عام طور پر تو اس نام کا اطلاق سارے علاقہ پر ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی اس سے وہ خاص بندرگاہ مراد لیا جاتا تھا، جو سولھویں صدی کے اختتام پر موجود تھا۔ اس بندرگاہ کا معمولی نام لہاری بندر تھا۔ اور وہ دریا کے دہانوں میں سے ایک دہانہ پر واقع تھا۔ اور اس کے اور ٹھٹا۔ ملتان اور لاہور کے درمیان پانی کے راستے سے بلا واسطہ آمد و رفت ہوتی تھی[1] جنوبی سندھ (ٹھٹا) حال ہی میں اکبر کے زیر حکومت آیا تھا اور پرتگالی تاجروں کے نائب مغل عہدہ داروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر کے بندرگاہ میں جمے ہوئے تھے اشیائے برآمد میں سوتی مال نیل اور نمک کی مختلف پیداواریں شامل تھیں جو یا تو جانب مغرب ایران اور عرب کو جاتی تھیں یا ہندوستان کے ساحل سے لگے لگے جنوب کی طرف بھیجی جاتی تھیں۔ اشیائے درآمد بھی اسی معمولی قسم کی ہوتی تھیں مثلاً دھاتیں (خاص کر ایران کے نقرئی لار) مصالحے۔ اور مختلف قسم کی اشیائے تعیش جو انڈس اور اس کے معاونین کے ساحلی شہروں

(٢٨٠?)

[1] انڈس کے بندرگاہوں کے لئے ملاحظہ ہو ہابسن جابسن۔ الفاظ "دیول۔ سندھ" اور "لاری بندر"۔ "ڈنیسز بار بوسا مترجمہ سٹر لانگورتھ ڈیمس (۱-۱۰۵ و ۱۰۶)۔ عرب ماہران جغرافیہ سے جو اقتباسات ماخوذ ہیں ان میں دیبال کا کثرت سے ذکر آتا ہے۔ ایلیٹ کی تاریخ کی پہلی جلد میں ان کا ترجمہ موجود ہے۔ بار بوسا (صفحہ ۲۰۶) "سلطنت دیول" کا حال لکھتا ہے۔ سالبینک پرچاس میں (۱-۳-۲۳۸) صرف سندھ کا ذکر کرتا ہے۔ ہیٹن صرف دیول کا (۱-۴-۴۹۵)۔ وٹھنگٹن صرف لوری بندر کا (۱-۴-۴۸۵)۔ اور یہ آخری نام دوسری کتابوں میں بھی نظر آتا ہے مگر قسم قسم کے املا کے ساتھ۔

میں تقسیم کی جاتی تھیں ہمیں کوئی بات ایسی نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس زمانے میں مقامی تاجر اپنے ذاتی جہاز رکھتے ہوں۔ موسمی ہواؤں کے لحاظ سے بندرگاہ بے ڈھب واقع ہوا تھا اور اگرچہ کبھی کبھی آرمز کے راستہ پر جانے والے جہاز بھی وہاں وارد ہوتے تھے تاہم اُس کی آمد و رفت میں اکثر و بیشتر حصہ اُن ساحلی کشتیوں کا ہوتا تھا جو ایران اور خلیج کیمبے کو جاتی تھیں۔

سندھ سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کر ہمیں کیمبے کے بندرگاہ ملتے ہیں جن کی بہ حیثیت مجموعی اس زمانے میں ہندوستان کے اندر سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ سورت، بروچ اور خود کیمبے سب سے بڑے بندرگاہ تھے۔ لیکن اور بھی متعدد بندرگاہ کھلے ہوئے تھے۔ اور سب کم و بیش سلطنت مغلیہ کے زیر اثر تھے۔ اور اگرچہ پرتگالیوں کی تجارت اُن کے ساتھ نہایت وسیع پیمانے پر جاری تھی تاہم وہ خلیج کے اندر مضبوطی کے ساتھ قائم نہیں تھے بلکہ ڈامن اور ڈیو میں اُن کے جو مستحکم مقامات تھے وہاں سے خلیج کی جہاز رانی پر اپنا اقتدار قائم رکھتے تھے۔ یہ انتظام اُن کے نقطۂ نظر سے کافی کارگر تھا کیوں کہ (۲۰۵) بڑے بڑے جہازوں کے لئے خلیج کی جہاز رانی پُرخطر تھی اور عام عملدرآمد یہ تھا کہ ڈیو گوگائی یا کسی اور ساحلی مقام پر جو باعث سہولت ہو جہاز لادے اور خالی کئے جاتے تھے اور ان مقامات سے کیمبے تک خلیج کے انتہائے شمال کے اُتھلے پانی میں سے ہوتے ہوئے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے چھوٹے بیڑے جاسکتے تھے۔ ڈیو کاٹھیاوار کے جنوبی نقطہ پر واقع ہے۔ اور ڈامن بالکل اُس کے روبرو برِ اعظم پر واقع ہے۔ پرتگالی نہایت مضبوطی کے ساتھ اِن دونوں مقامات پر جمے ہوئے تھے جہاں سے وہ ان تمام جہازوں پر جو خلیج میں داخل ہوتے تھے نہایت موثر طور پر نگرانی کر سکتے تھے اور خشکی پر مغلیہ حکام کے معاملات میں مداخلت کئے بغیر اپنا اجازت ناموں کا طریقہ نافذ کر سکتے تھے۔ اجازت نامے حاصل کر کے یا کبھی کبھی پرتگالیوں سے لڑ کر اس ساحل سے جہاز مغرب اور جنوب کی طرف جاتے اور عرب۔ افریقہ۔ اور آبنائے ملاکا سے تجارت کرتے تھے۔ کپڑے اور متفرق سامان تجارت کی بڑی بڑی مقدار میں وہ ان بازاروں کو برآمد کرتے اور وہاں سے دھاتیں۔ مصالحے اور نیم سحر کا سامان عیش واپس لئے جاتے تھے۔ اسکے علاوہ مسافروں کی آمد و رفت کی بھی۔ ایک اہم مثال موجود تھی اور اس زمانے میں یہ ایک قابل لحاظ مثال تھی۔ خلیج کے بندرگاہ اور خاص کر سورت سے عرب کے مقاماتِ مقدسہ کو

باب ۶

جانے والے حاجیوں کا راستہ شروع ہوتا تھا اور ہندوستان سے مسافروں کی ایک کثیر تعداد ہر سال یہ سفر اختیار کرتی تھی۔ سفر حج کے آخری ایام کے اخراجات پورا کرنے کے لئے اِن میں سے اکثر لوگ غالباً فروخت کی غرض سے اپنے ہمراہ مال بھی لے جاتے تھے۔ بہر صورت مسافروں اور مال تجارت دونوں کی آمدورفت ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملی ہوئی تھی۔

خلیج کے بندرگاہوں اور یورپین ممالک کے مابین اس زمانے میں براہ راست کوئی تجارت نہیں تھی وطن کو جانے والے جہازوں پر پرتگالی گوا یا کسی اور زیادہ جنوبی مقام میں مال لادتے تھے۔ اور کیمبے سے جس قدر مال پرتگال بھیجا جاتا تھا اور جس قدر اشیائے خوراک اور دوسری تجارتی چیزیں سارے مغربی ساحل کو روانہ کی جاتی تھیں یہ سب چھوٹی چھوٹی ساحلی کشتیوں (فری گیٹ) کے بیڑوں میں جو ڈنڈوں کے ذریعہ چلائی جا سکیں گوا پہنچائی جاتی تھیں[1] اِن کشتیوں کا ہر بیڑہ قافلہ کہلاتا تھا اور ایک ایک قافلہ میں تین تین سو کشتیاں بھی شامل ہو سکتی تھیں۔ اور ہر سال دو یا تین بیڑے بالعموم روانہ ہوتے تھے۔ لڑنے والے جہاز بھی ان کے ہمراہ رہتے تھے لیکن اِس احتیاط کی بدولت ہر وقت امن وحفاظت کا

[1] جو لوگ دورِ مابعد کے لٹریچر سے واقف ہیں انھیں لفظ فری گیٹ کے اس استعمال سے غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں فری گیٹ ایک بڑے جنگی جہاز کو کہنے لگے تھے جو زمانۂ حال کے کروزر کے مساوی اور بہ لحاظ جسامت "جنگی جہازوں" سے صرف دوسرے ہی نمبر پر ہوتا تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں یہ لفظ برابر اسی معنی میں استعمال کیا جاتا تھا جو متن میں بتائے گئے ہیں۔ ہنٹر کی کتاب "انڈین امپیر" (ایڈیشن بابتہ ۱۸۹۳ء) کے صفحہ ۲۲۴ پر قافلہ کا ایک غلط مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "گوا سے کیمبے یا سورت کو جانے والے پرتگالی تجارتی جہازوں کے ایک تنہا بیڑے میں ڈیڑھ سو یا ڈھائی سو کی تعداد میں بڑے بڑے جہاز (کیرک) شامل رہتے تھے" یہ ایک یقینی بات ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے سمندروں میں بہ ایک وقت کبھی دس سے زیادہ کیرک موجود نہیں تھے۔ خلیج کیمبے میں کسی کیرک کے داخل ہونے کا ہمیں کہیں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر کبھی کوئی کیرک اس پُرخطر سمندر میں چلا جاتا تو پھر وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ سر ولیم ہنٹر نے ایک غلطی کی وجہ سے جو اُن کے بلا تصحیح پیش کردہ اقتباس میں موجود تھی دھوکہ کھایا غلطی یہ تھی کہ "فری گیٹ" کے بجائے "کیرک" کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بیڑے کی گنجائش تقریباً چالیس گنی زیادہ ہو گئی۔

حاصل ہونا کچھ یقینی نہ تھا۔ کیونکہ دریائی ڈاکو بہت ہی شوق سے اس موقع کے متلاشی رہتے تھے اور کبھی کبھی اس قابل ہوتے تھے کہ ان کی ایک بڑی تعداد کو تباہ کردیں یا گرفتار کرلیں۔ قافلہ درحقیقت ایک ایسا انعام ہوتا تھا جس کی خاطر لڑائی لڑنا نامناسب نہیں تھا۔ کیونکہ ان جہازوں پر بیرونی بازاروں کے لئے کثیر مقدار میں کپڑا، نیل۔ اور مختلف قسم کی چیزیں لدی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ گیہوں اور دوسرے اشیائے خوراک اور اکثر ضروریات اور اشیائے راحت جو پرتگالی آبادی کے لئے درکار ہوتے تھے ان جہازوں پر موجود ہوتے تھے[۱]

خلیج کیمبے سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کر ہمیں بمبئی کا کچھ حال معلوم کرنے کی توقع ہوتی ہے لیکن اس زمانے میں یورپین اہل قلم اس نام سے قریب قریب ناواقف تھے اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس بندرگاہ کی کوئی اہمیت نہ تھی[۲] البتہ تین بندرگاہ ساحل کے اس حصے پر قابل لحاظ تھے۔ ایک تھانہ جو جزیرۂ بمبئی کے ٹھیک شمال میں واقع ہے۔ دوسرے چول جو جنوب کی طرف تھوڑے سے فاصلہ پر موجود ہے۔ تیسرے ڈابل جو اب ڈابھول کہلاتا ہے اور ضلع رتناگیری میں ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ تھانہ پرتگالیوں کے قبضہ میں تھا۔ اس کی تجارت کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ سابقہ باب میں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی قدر قابل اہمیت جہاز سازی کا مرکز تھا۔ چول بھی پرتگالیوں ہی کے ہاتھوں میں تھا اور وہاں ریشم کی صنعت موجود تھی جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس طرح پر چین کے ساتھ اس کا تعلق قائم تھا اور بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ساتھ براہ راست

(۲۰۸)

۱؎ مغربی ساحل کے پرتگالی مقامات میں سامان کی رسد کا انحصار قریبی پڑوس کے مقامات سے کہیں زیادہ ساحلی تجارت پر تھا۔ پیرارڈ نے (ترجمہ ۲-۲۴۵) ان چیزوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو سورت اور کیمبے سے حاصل کی جاتی تھیں جس میں اشیائے خوراک کے علاوہ کاغذ۔ پلنگ۔ صندوقچے۔ افیون اور موم جیسی اشیاء بھی شامل ہیں۔ بنگال سے جو ساحلی تجارت ہوتی تھی وہ بھی اس خطہ کے لئے کافی اہمیت رکھتی تھی۔

۲؎ باربوسا (صفحہ ۱۸۱) ایک مقام کا حال لکھتے ہوئے جسے وہ تانا مجبو کہتا ہے رقمطراز ہے کہ وہاں پر "ایک بہت اچھا بندرگاہ اور ایک اچھی خاصی تجارت موجود ہے"۔ لیکن اس کے طرز بیان کا لحاظ کرتے ہوئے "اچھی خاصی" تجارت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ہابسن جابسن میں اس نام کی تعبیر تھانہ۔ بمبئی کی گئی ہے لیکن مسٹر لینگورتھ ڈیمس نے اپنے ترجمہ باربوسا (۱-۱۵۲- نوٹ) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کا دوسرا حصہ غالباً ماہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ جزیرۂ بمبئی کے شمال میں واقع ہے۔

اس کی تجارت جاری تھی۔ لیکن وہاں کا اکثر وبیشتر ریشمی مال غالباً ہندوستان ہی میں صرف ہوتا تھا۔ ڈابل دراصل پرتگالیوں کے ہاتھوں میں نہیں تھا لیکن آرمز اور موچا کے ساتھ اُس کے تجارتی تعلقات قائم تھے اور جورڈین نے لکھا ہے کہ وہاں سمندر پر چلنے والے جہاز موجود تھے۔

اس کے بعد ہم گوا اور بھٹکل پر پہنچتے ہیں پرتگالیوں کے فتح کرنے سے قبل گوا کا دکن سے تعلق تھا اور بھٹکل[1] سے وجیانگر کی ضروریات پوری ہوتی تھیں اور اس وجہ سے وہاں بہت کثیر تجارت ہوتی تھی۔ لیکن پرتگالیوں نے صلحناموں اور دوسرے ذرائع سے وجیانگر کی تجارت کا عملی طور پر اجارہ حاصل کر لیا جس کی وجہ سے بھٹکل کو زوال نصیب ہوا اور ختم صدی پر ہمیں اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے برعکس گوا ایک نہایت ہی اہم بندرگاہ تھا اور بہ حیثیت ایک بڑے مرکز کے جو رتبہ پہلے کالی کٹ کو حاصل تھا وہ اب گوا اور کوچن کو مِل گیا تھا۔ مقامی برآمد کچھ بڑی نہیں تھی لیکن ہندوستان کے ایک کثیر حصہ اور چند ملحقہ ممالک سے پیداوار یہاں لائی جاتی تھی تاکہ جہازوں پر لاد کر دور دراز مقامات کو بھیجی جائے یا مغربی ساحل ہی پر تقسیم کر دی جائے۔ اسی طرح بیرونی ممالک کا درآمد شدہ مال بھی اس مرکز سے مغربی ہندوستان کے تقریباً پورے ساحل پر تقسیم کیا جاتا تھا جب تک وجیانگر کی سلطنت برقرار تھی مقامی تجارت کی کافی اہمیت تھی۔ اُس وقت اشیائے تعیش کی تجارت کا اکثر و بیشتر حصہ گوا کو حاصل تھا اور جو بات اس سے بھی زیادہ نفع بخش تھی خواہ تجارتی حیثیت سے یا سیاسی وہ جنوبی سلطنتوں کے لئے گھوڑوں کی درآمد تھی۔ وجیانگر کے زوال کی وجہ سے اشیائے تعیش کی تجارت بہت کچھ گھٹ گئی تھی۔ گھوڑوں کی اُس وقت بہت زیادہ طلب نہیں تھی لہذا ختم صدی کے وقت گوا کا مدار خاص کر اس کاروبار پر تھا جو وہاں بہ حیثیت اُس کے ایک مرکز ہونے کے

---

[1] بھٹکل اور بیٹلول ان دو ناموں کو لوگ کبھی کبھی خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اول الذکر مقام تو جدید نقشوں میں نظر آتا ہے لیکن دوسرا مقام بھٹکل اور گوا کے مابین کرور سے قریب واقع تھا۔ سولھویں صدی میں قسم قسم کا املا استعمال کیا جاتا تھا اس لئے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ دونوں میں سے درحقیقت کون سا مقام مقصود تھا ملاحظہ ہو ہابسن جابسن۔

باب۵ کیا جاتا تھا[1]۔

گووا اور کوچن کی تجارت خارجہ خاص کر چار سمتوں میں جاری تھی؛ ایک مشرق اقصیٰ دوسرے ایران وعرب۔ تیسرے افریقہ۔ چوتھے یورپ۔ یہاں یہ جان لینا مناسب ہے کہ ان دونوں بندرگاہوں میں کاروبار ایک ہی طریقے کے مطابق چلائے جاتے تھے چنانچہ آگے چلکر ہمیں اس کا حال معلوم ہوگا۔ مشرق کی طرف جانے والے جہازوں کی پہلی منزل ملاکا پر ہوتی تھی۔ یہ آبنائے میں مسلمانوں کا ایک شہر تھا جس پر بہت ہی شروع میں پرتگالیوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ پارچہ اور ہندوستان کا دوسرا تجارتی مال جہازوں پر لاد کر اس بازار کو جاتا تھا اور وہاں سے یہی جہاز مصالحے۔ سونا اور دیگر متفرق اشیا جو بالعموم چینی مال کہلاتی تھیں مثلاً چینی کے برتن۔ زرد وارنش کیا ہوا سامان۔ کافور اور قسم قسم کی جڑی بوٹیاں اور عطریات لے کر واپس ہوتے تھے۔ تجارت کی اس شاخ کا اصلی مقصد مصالحے حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ سماٹرا اور جاوا سے کالی مرچ۔ ملکاس سے لونگ۔ جزیرہ باندا سے جوزا اور جوتری حاصل ہوتے تھے۔ اور ان چیزوں کی جو مقداریں تمام یورپ اور ایک کثیر حصۂ ایشیا کی طلب پورا کرنے کے لئے درکار تھیں وہ بہ حیثیت مجموعی اتنی کثیر ہوتی تھیں کہ اگر اس زمانے کے مروجہ معیاروں سے جانچا جائے تو کیا بہ لحاظ مقدار کے اور کیا بہ لحاظ مالیت کے ان کی بدولت ایک کافی بڑی تجارت جاری تھی۔ جاوا سماٹرا۔ بورنیو اور سلیبس سے سونا حاصل ہوسکتا تھا اور چین اور جاپان سے مختلف قسم کی ایسی چیزیں حاصل ہوتی تھیں جو دوسرے مقامات میں میسر نہیں آسکتی تھیں۔ اس تجارت کے علاوہ جو ملاکا اور مصالحوں کے جزائر سے کی جاتی تھی پرتگالی اپنے چند جہاز اور بھی آگے بھیجتے تھے۔ چنانچہ پیرارڈ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس دلیرانہ بحری سفر کا حال تحریر کیا ہے

---

[1] مسٹر سیول (ایک فراموش شدہ سلطنت' صفحات ۱۵۶ - ۲۱۰) کا یہ خیال صحیح ہے کہ پرتگالیوں کی قوت کے زوال کا ایک سبب وجیانگر کی تجارت کا انحطاط تھا۔ یہ صدمہ بجائے خود ایسا سخت نہیں تھا کہ ایک سچے اور عمدہ نظم ونسق کے لئے مہلک ثابت ہو۔ کیونکہ ایسے نظم ونسق کو اس کی تجارتی جد وجہد کے لئے دوسرے جدید راستے ملجاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرتگالیوں کی طاقت اس وقت خود زوال پذیر حالت میں تھی اور جو تباہی پہلے ہی سے آنے والی تھی وہ وجیانگر کے زوال کے باعث بہت جلد ظہور پذیر ہوگئی۔

باب ۶

گو وا سے جو جہاز روانہ ہوتے تھے وہ اپنا مال مکاؤ میں جو کینٹن کا بندرگاہ تھا فروخت کرتے تھے اور وہاں سے جاپان کے لئے چینی مال لاد کر روانہ ہوتے تھے۔ جاپان میں وہ ان چیزوں کو زیادہ تر چاندی کے عوض فروخت کرتے تھے۔ وہاں سے پھر مکاؤ کو واپس ہو کر وہ اپنی چاندی ملاکا کے لئے چینی سامان خریدنے میں لگا دیتے اور وہاں سے ہندوستان کے لئے مصالحے خرید کر اپنے کاروبار کا دائرہ ختم کر دیتے تھے۔ اس تمام سفر میں تقریباً تین سال لگتے تھے اور پرتگالی حکام نے اس کو بطور اجارہ کے محفوظ کر رکھا تھا یعنی چین اور جاپان کو جہاز لے جانے کا حق کسی بڑے امیر کو جو اس انتہا درجہ تخمینی کاروبار کو انجام دینے کا خواہشمند ہوتا عطا کیا جاتا تھا یا زیادہ تر اس کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔

ایران اور عرب کی سمت میں جو تجارت جاری تھی اس کا مرکز آرمز تھا جس پر پرتگالیوں کا قبضہ نہایت مضبوط تھا اور جہاں تمام چیزیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں منتقل کر دی جاتی تھیں تاکہ وہاں سے خلیج فارس کو پہنچائی جا سکیں۔ ایشیا کے اس حصہ سے خاص کر (۲۰۹) جو چیزیں ہندوستان آتی تھیں اُن میں لارن کی شکل میں مسکوک چاندی۔ موتی۔ گھوڑے اور ریشمی اشیا شامل تھیں۔ اور سوتی کپڑا تجارت برآمد کی خاص چیز تھی۔ بڑے بڑے بندرگاہ یعنی عدن۔ موچا۔ اور جدہ ترکوں کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر بندرگاہ زوال پا چکا تھا۔ اس لئے ہندوستان سے جس قدر جہاز جاتے تھے وہ اپنا اپنا مال یا تو موچا پر خالی کر دیتے تھے یا جدے پر۔ لیکن پرتگالی عام طور پر آبنائے سے نہیں گذرتے تھے۔ افریقہ کی تجارت کے لئے ان کے پاس مزمبیق میں ایک اہم قلعہ موجود تھا اور اس کے علاوہ سوفالہ (جنوب میں اور آگے کو)۔ موما سا مگادا کسو (ساحل سومالی پر) اور دوسرے بندرگاہوں میں بھی ان کی چھاونیاں موجود تھیں۔ ان بندرگاہوں کو ہندوستانی پارچہ۔ مصالحے اور پرتگالی باشندوں کے لئے اشیائے خوراک حاصل ہوتی تھیں اور وہاں سے ہاتھی دانت۔ عنبر آبنوس۔ غلام اور خاص کر سونے کی برآمد ہوتی تھی۔ سوفالہ اور مزمبیق کے ساتھ جو تجارت قائم تھی اس کا دار و مدار درحقیقت سونے پر تھا۔ ساحل کے اس حصہ کی اُس زمانے میں عام طور پر آفیر سے مطابقت کی جاتی تھی جہاں سے حضرت سلیمان کو سونے کی رسد حاصل ہوئی تھی

باب ۶

بہر حال جو مقدار دستیاب ہوتی تھی وہ اُس زمانے کے مروجہ معیاروں کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ موزمبیق پرتگالی نظم ونسق کا بہت ہی نفع بخش مرکز تھا اور اس کے ساتھ تجارت کرنے کا حق بھی چین اور جاپان کے بحری سفر کی طرح گوا کے حکام نے محفوظ کر رکھا تھا۔

آخر میں ہم یورپ کے ساتھ جو تجارت قائم تھی اس کا حال معلوم کریں گے۔ لسبن سے ہر سال ایک بیڑہ ہندوستان کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ اُس میں چار یا پانچ کیرک اور شاید چند چھوٹے جہاز بھی شامل ہوتے تھے۔ اُس کو بلا ضرورت کسی اور مقام پر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اور اثنائے سفر میں موسم کے متعلق جیسا تجربہ حاصل ہوتا اُسی کے مطابق وہ یا تو گوا پر پہنچتا تھا یا کوچن پر۔ ان بیڑوں کی آمد ورفت زیادہ تر حکومت کے فائدے کے لئے ہوتی تھی اور ان میں صرف مسکوک چاندی بادشاہ کے حساب میں لی جاتی تھی۔ لیکن خانگی تاجروں کو اجازت تھی کہ دوسری چیزیں مثلاً دھاتیں اور اشیائے تعیش روانہ کریں۔ یہ بیڑے جب سال بھر بعد واپس ہوتے تھے تو نسبتاً چھوٹے ہو جاتے تھے کیونکہ جہازوں کی تباہی کا نقصان کثیر ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں عام طور پر سفر کے قابل جہاز محفوظ نہیں رکھے جاتے تھے۔ ۱۵۹۰ء سے ۱۵۹۹ء تک دس سال کے عرصہ میں ہندوستان سے کوئی چھتیس کیرک روانہ ہوئے جن میں صرف سولہ پرتگال تک محفوظ پہنچ سکے۔ جو کیرک گوا پہنچتے تھے ان پر کچھ مال اس بندرگاہ میں لادا جاتا تھا لیکن عام طور پر کوچن میں اُن کے سامان کی تکمیل ہوتی تھی۔ جو کیرک جنوبی بندرگاہ پر پہنچتے تھے ان پر وہیں مال لادا جاتا تھا اور گوا کی چیزیں ساحلی کشتیوں پر آگے بھیجی جاتی تھیں ہر جہاز کا ایک حصہ کالی مرچ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا تھا جو مملکت کے حساب میں روانہ کی جاتی تھی۔ لیکن بقیہ جگہ خانگی سامان تجارت کے لئے حاصل کی جا سکتی تھی چنانچہ زائد از گنجائش مال لاد دینا منجملہ ان اسباب کے ایک سبب تھا جو واپسی کے سفر میں اکثر جہازوں کی تباہی کا باعث ہوتے تھے۔

(۲۱۰)

گوا کے جنوب میں منگلور اور راس کماری کے مابین ملیبار کے مختلف بندرگاہ واقع تھے جن میں کالیکٹ اور کوچن سب سے زیادہ اہم تھے۔ کوچن تو یقینی طور پر پرتگالی بندرگاہ تھا۔ اور بہ حیثیت ایک مرکز کے گوا کے بعد اسی کی اہمیت تھی۔ اس کے علاوہ کالی مرچ کی تجارتِ برآمد کا وہ صدر مقام تھا۔ لیکن کالی کٹ پرتگالیوں کے مخالفین کا مرکز

خیال کیا جا سکتا ہے چنانچہ اسی جوار میں عرب "بحری قزاقوں" کے بڑے بڑے قلعے موجود تھے۔ ملیبار اور کھمبے کے بندرگاہوں میں یہ فرق تھا کہ اول الذکر سے مقامی مصنوعات کی قطعاً کوئی برآمد نہیں ہوتی تھی۔ کالی مرچ خاص پیداوار تھی اور وہی اشیائے برآمد میں سب سے زیادہ اہم تھی۔ اور اس کو مستثنیٰ کر کے ان کی مقامی تجارت گویا محض خردہ فروشی پر مشتمل تھی۔ اسی دور میں ان بندرگاہوں کے مسلمان جہاز رانوں کے متعلق یہ سنا جاتا ہے کہ وہ پرتگالیوں سے اجازت نامے حاصل کئے بغیر بحیرۂ احمر کو اپنے جہاز روانہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کوششوں کی کیفیت تو اریخ میں بہت بڑھی چڑھی نظر آتی ہے لیکن ان کی بدولت جو تجارت ہوتی تھی دراصل اس کی کوئی بہت بڑی مقدار نہیں تھی۔ مقامی جد وجہد بہت کچھ ساحلی تجارت سے متعلق ہوتی تھی جس کی بدولت مشرقی ساحل سے اناج اور دیگر اشیائے خوراک آتی تھیں اور یہاں سے ناریل کے درخت کی مختلف پیداواریں تقسیم کی جاتی تھیں۔

ہندوستان کے انتہائی جنوب میں ساحل سیلون پر بھی پرتگالیوں ہی کا اقتدار قائم تھا اور انھوں نے کولمبو میں اپنا ایک قلعہ بھی تعمیر کر رکھا تھا۔ لیکن اندرونی علاقہ کے باشندوں سے ان کے تعلقات دوستانہ نہیں تھے اور انھیں اپنی حالت برقرار رکھنے میں بہت دقت پیش آتی تھی۔ دارچینی اور بعض جواہرات کی اس جزیرہ سے برآمد ہوتی تھی اور ہندوستان سے اشیائے خوراک اور کپڑے کی بہم رسانی کی جاتی تھی۔ سیلون کے سامنے جو ہندوستانی بندرگاہ واقع تھے ان کی بدیہی طور پر کوئی اہمیت نہیں تھی اور مشرقی ساحل پر سب سے پہلا قابل لحاظ مقام نیگا پٹم ہے جہاں پرتگالیوں نے صرف اپنا ایک نائب رکھ چھوڑا تھا اور سیاسی حکومت و اقتدار کے مدعی نہیں تھے۔ اس بندرگاہ میں و نیز جانب شمال پولیکٹ تک جس قدر بندرگاہیں تھیں ان سب میں بہ حیثیت مجموعی کافی بڑی مقدار میں تجارت ہوتی تھی۔ ان مقامات سے اَبنائے کو کپڑے کی برآمد ہوتی تھی اور وہاں سے مصالحے اور مختلف قسم کا "چینی مال" آتا تھا۔ کپڑے۔ دھاگہ اور افیون پیگو کو جاتے تھے اور وہاں سے خاص کر سونا۔ چاندی اور جواہرات آتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک جانب بنگال کے ساتھ اور دوسری جانب سیلون اور ملیبار کے ساتھ بھی کثیر مقدار میں ساحلی تجارت جاری تھی۔ شمال میں اور آگے گو سولی پٹم واقع ہے جو کہ اس زمانے میں سلطنت گولکنڈہ کا خاص بندرگاہ تھا۔ سنہ ۱۵۹۰ء میں وہ ایک اہم مقام تھا جس کے تجارتی تعلقات پیگو اور ملاکا و نیز ہندوستان کے دوسرے

باب ۶ حصوں کے ساتھ قائم تھے۔ اس کی تجارت میں کچھ ہی عرصہ بعد ایک ڈچ ایجنسی کے قیام کی بدولت بہت بڑی توسیع ہونے والی تھی۔ اس ایجنسی کے قیام سے ایک بہت ہی قابل قدر کاروبار نمودار ہو گیا تھا۔ مصالحے۔ دھاتیں۔ اور اشیائے تعیش درآمد کی جاتی تھیں اور کپڑے مشرق اقصیٰ کو روانہ کئے جاتے تھے۔

مسولی پٹم کے شمال میں ایک طویل ساحل پھیلا ہوا ہے جس کسی اہم تجارتی کاروبار کا وجود نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے بعد ہم بنگال کے بندرگاہوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ معاصرنفین نے ان بندرگاہوں کے جو نام بتائے ہیں وہ پریشاں کن ہیں اور ان کی ٹھیک جگہ شک و شبہ سے بالکل پاک نہیں ہے۔ ہم نے ضمیمۂ ج میں اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے۔ یہاں صرف اس قدر کہد ینا کافی ہے کہ اُس زمانے میں یہاں تین اہم بندرگاہ تھے۔ سات گاؤں ہگلی۔ سری پور۔ چٹاگانگ۔ ان میں سے پہلا دریائے ہگلی پر کسی جگہ واقع تھا۔ سات گاؤں قدیم بندرگاہ تھا لیکن ریگ اور مٹی سے بھر گیا تھا اور ابوالفضل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہگلی کا بندرگاہ زیادہ اہم تھا اور وہی عیسائی اور دوسرے تاجروں کا گذرگاہ تھا۔ اگرچہ وہ پرتگالی نظم ونسق کے زیر اثر نہیں تھا تاہم وہ درحقیقت ایک پرتگالی آبادی تھی۔ اُس کے باشندوں میں بہت سے حفاظتِ قانونی کے غیر مستحق اشخاص شامل تھے جو پرتگالی عملداری سے فرار ہو کر اپنی ایک علحدہ جماعت بنائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مغل بادشاہ کے عہدہ داروں کے ساتھ صلح وامن سے رہتے تھے لیکن اس کی رعایا پر چھاپے مارنے کے عادی تھے۔ سری پور دریائے میگھنا پر سونارگاؤں کے قریب جو کہ اُس زمانے میں بنگال کا مشرقی دارالسلطنت تھا واقع تھا[1] اُس کا موقع محل اب مٹ گیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق فچ اور جسویٹ مبلغین نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت اہم مقام تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں واضح کر چکے ہیں چٹاگانگ اس زمانے میں غالباً مغلیہ سلطنت کے حدود سے باہر اور اراکان کے تابع تھا۔ لیکن یہاں معلوم ہوتا ہے کہ

[1] سونارگاؤں تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ڈھاکہ کے مشرق میں واقع تھا جو کہ ۱۶۰۸ء میں بنگال کا دارالسلطنت بن گیا۔ ہمارے خیال میں اس دور کے یورپی سیاحوں میں سے کسی نے بھی ڈھاکہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

خارج از قانون پرتگالی اشخاص نے بہت کچھ جو چاہا کیا۔ اور قزاقی کے کاروبار میں جس کے لئے یہاں کے باشندے مشہور و معروف تھے کافی حصہ لیا۔ اِن بندرگاہوں کی تجارت اہم تھی۔ کیونکہ دہانہ گنگا کے متعدد دریائی راستوں کی بدولت بنگال کے ایک بہت بڑے حصہ سے ذیرا آگرے تک شمالی ہندوستان کے ساتھ نہایت سہل ذرائع آمد و رفت قائم ہو گئے تھے۔ کپڑے اور اشیائے خوراک (چاول۔ شکر وغیرہ) کی کثیر مقدار اور دوسری ملکی پیداوار اِن بندرگاہوں سے برآمد کی جاتی تھی۔ اور درآمد میں چاندی اور دوسری دھاتیں۔ مصالحے اور متفرق اشیا شامل تھیں جو پیگو اور ملاکا و نیز ہندوستان کے دوسرے حصوں سے آتی تھیں۔

اب ہم ساحل کی مذکورہ بالا کیفیت کا عام نتیجہ بہت ہی مختصر الفاظ میں درج کرتے ہیں۔ (۱) کیمبے کے بندرگاہ (۲) بنگال (۳) ساحل کارومنڈل اور (۴) دریائے انڈس یہ ملکی پیداوار کی برآمد کے خاص راستے تھے۔ اُن کی باہمی اہمیت کے متعلق ہماری رائے اس ترتیب سے ظاہر ہوتی ہے جو ہم نے اوپر اختیار کی ہے۔ اِن کے ساتھ ساحل ملیبار کو اور شامل کر لینا چاہئے جس کی قابل قدر خصوصیت کالی مرچ کی پیداوار تھی۔ آخر میں گودا کا نمبر آتا ہے جو کہ دور دراز ممالک کی تجارت کے سلسلہ میں مال جمع اور تقسیم کرنے کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ غیر ممالک کے جن بندرگاہوں کے ساتھ یہ تجارت جاری تھی وہاں صورت حال کیا تھی۔

تیسری فصل

ہندوستانی سمندروں میں خاص خاص غیر ملکی بندرگاہ

مشرق کی جانب چاٹگانگ تک ہندوستان کے ساحل کی کیفیت ہم سابقہ فصل میں معلوم کر چکے ہیں۔ اس بندرگاہ سے آگے جو ساحل چلا گیا ہے وہ ہمارے زیر بحث دور میں سلطنت اراکان کے علاقہ میں تھا اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی البتہ دوسری سلطنت یعنی پیگو کی تجارت اس سے بہت بڑھی ہوئی تھی اور تین مقامات اس کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایک کاسمین جو کہ موجودہ بسین کے قریب کہیں واقع تھا۔ دوسرے دریائے پیگو کا علاقہ جو اُسی نام کے شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ تیسرے مرتبان جو کہ دریائے سالوین کے دہانہ پر جانب مشرق اور آگے کو واقع تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ملک کے باشندے بحری تجارت خارجہ میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اور پرتگالی اور ہندوستانی مسلمان اس تجارت کو چلاتے تھے۔ اول الذکر نے بندرگاہوں میں اپنی ایجنسیاں قائم کر رکھی تھیں لیکن ہمارا یہ خیال ہے کہ انھیں اختتام صدی تک کوئی ملکی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا۔ تجارت کے خاص خاص راستے ملاکا اور اچین۔ بنگال اور ساحل کارومنڈل کو جاتے تھے لیکن بحیرۂ احمر سے بھی براہ راست تعلق موجود تھا۔ ملاکا اور اچین سے مصالحے اور چینی سامان کی بہم رسانی ہوتی تھی۔ ہندوستان سے کپڑے۔ رنگین دھاگے اور بعض ادویات خاص کر افیون روانہ ہوتی تھی اور بحیرۂ احمر سے یورپی کپڑا اور دوسری اشیائے تعیش بھیجی جاتی تھیں۔ سونا۔ چاندی اور جواہرات۔ لوبان۔ دھاتیں اور قسم قسم کی چھوٹی پیداوار یہی چیزیں حاصل کرنے کے لئے زیادہ تر تاجر پیگو آتے تھے۔ اور دوسری طرف مرتبان سے اگر واقعی نہیں تو امکانی طور پر جہاز سازی کا سامان برآمد کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی پارچوں اور افیون کو چھوڑ کر اس ملک کو اشیائے درآمد کی کوئی ایسی سخت ضرورت نہیں تھی چنانچہ سیزر فریڈرک تاکیداً بیان کرتا ہے کہ تاجر جو مال خود لے جاتے تھے اُس پر انھیں نقصان اٹھانا پڑتا تھا

۱۶۱ب
اور وہاں سے جو چیزیں واپس لاتے تھے صرف انھیں پر نفع حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے۔ سولھویں صدی کے اختتام پر مسلسل جنگ وجدال کی بدولت جس کا پہلے ہی حوالہ دیا جاچکا ہے پیگو کی تجارت درہم برہم ہوگئی اور جو کیفیت ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اس کا اطلاق ٹھیک اُس دور پر نہیں ہوتا جو ہمارے زیر غور ہے بلکہ وہ عام معمولی حالت سے متعلق ہے۔

اس کے بعد ساحل پر ٹناسرم کا حصہ واقع ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معاصر اطلاع موجود نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ورتھما اس کا حال بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اُس کا موقع ہندوستان میں ساحل کارومنڈل کے شمال میں کسی جگہ بتاتا ہے۔ پس یہ ممکن ہے کہ اس نے ٹناسرم اور اوریسہ ان ناموں میں خلط ملط کر دیا ہو۔ باربوسا کہتا ہے کہ اس کے وقت میں عرب اور "سغیر مسیحی" تاجر موجود تھے جن کے ذاتی جہاز ہوتے تھے اور جو بنگال اور ملاکا سے تجارت کرتے تھے اور اس تجارت کی مقدار بہت بڑی تھی۔ سیزر فریڈرک وسط صدی کے بعد تحریر کرتے ہوئے اس تجارت کو بجز ایک نشہ آور عرق کی برآمد کے جو نیپا کہلاتا تھا بالکل ناقابل اہمیت بتاتا ہے۔ فچ صرف ٹو اے سے ٹین کی برآمد کا ذکر کرتا ہے۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس ساحل کی تجارت کی مقدار تھوڑی تھی لیکن دھاتوں کی جو کچھ محدود رسد ہندوستان پہنچتی تھی اس میں اس کا ایک اہم حصہ شامل تھا۔

(۲۱۴)
اب ہم ملاکا پر پہنچتے ہیں جو کہ سماٹرا اور جزیرہ نمائے مالے کے مابین واقع ہے۔ یہ حیثیت ایک تجارتی مرکز کے ملاکا مسلمان تاجروں کا بنایا ہوا تھا اور پرتگالیوں کے آنے سے قبل ہندوستان اور چین کے سمندروں کے درمیان جس قدر تجارت جاری تھی اس کا مرکز تھا۔ باربوسا لکھتا ہے کہ وہ "سب سے زیادہ دولتمند تجارتی بندرگاہ ہے۔ بڑے سے بڑے تاجر وہاں رہتے ہیں اور دنیا بھر میں وسیع ترین جہاز رانی اور آمد و رفت وہاں موجود ہے۔" اُس کی آبادی میں دنیا کے ہر حصے کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ ہم سنتے ہیں کہ دولتمند مسلمان تاجروں کے علاوہ ساحل کارومنڈل کے چٹی اور جاوا اور مختلف دوسرے جزائر کے باشندے بھی اُس شہر میں بسے ہوئے تھے۔ مقامی پیداوار وہاں قطعًا کوئی نہیں تھی حتیٰ کہ غذا بھی اکثر و بیشتر درآمد کی جاتی تھی۔ اُس مقام کی ساری اہمیت صرف اس بات میں تھی کہ وہ ایک طرف چین، سیام اور جزائر اور دوسری طرف ہندوستان، عرب اور یورپ کے مال کے باہمی مبادلے کا مرکز تھا۔ اس سے پچھلے دور میں چین کے لوگ اپنے جہاز بحیرۂ احمر کے داخلے اور خلیج فارس کے سرے تک لے جانے کے

بابٹ عادی تھے۔ لیکن وہ بہ تدریج اپنے سفر کم کرتے گئے حتیٰ کہ پندرھویں صدی میں انھوں نے ساحل ملیبار تک آنا بھی موقوف کر دیا۔ اس تبدیلی کا سبب نامعلوم ہے۔ لیکن ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ چینی اور مسلمان دونوں نے یہ محسوس کیا کہ تجارتی کاروبار چلانے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ ملاکا کا مرکزی بازار اختیار کیا جائے۔ پس تجارت بھی انھی راستوں کے مطابق چلنے لگی۔ جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں سولھویں صدی کے آخری سالوں میں بھی چینی جہاز کبھی کبھی ساحل کارومنڈل تک پہنچتے تھے۔ لیکن اس قسم کی آمد ورفت عام طور پر مستثنیات میں شامل تھی۔ اکثر وبیشتر چینی جہاز موسم خزاں میں ملاکا پہنچتے۔ وہاں اپنا مال اتار دیتے اور بحیرۂ احمر۔ ہندوستان اور مجمع الجزائر سے جو تجارتی مال وسامان آتا تھا اس کو لے کر واپس ہوتے تھے مغربی ہند کے جہاز اس سے کسی قدر پہلے پہنچ جاتے تھے کیونکہ انھیں موسمی ہوائیں شروع ہونے سے قبل سیلون سے گذرنا پڑتا تھا اور واپسی میں ختم دسمبر کے قریب وہ ملاکا سے روانہ ہوتے تھے۔ اسی اثنا میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ سے پیگو۔ سیام۔ کوچن چین جاوا۔ باندا۔ بورنیو اور جزائر ملوکاس کی پیداوار یں بھی پہنچ جاتی تھیں اور اس طرح پر اس مرکزی بازار میں مختلف قسم کی اشیاء کا باہمی مبادلہ ہوتا تھا۔

ایسا اہم تجارتی مقام حاصل کرنے کی کوشش کرنا پرتگالیوں کے لئے ایک امر ناگزیر تھا چنانچہ ۱۵۱۱ء میں انھوں نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا اور تجارت کی تنظیم بہت کچھ اپنے ذاتی مفاد کے مطابق کی۔ ملاکا کی اہمیت اس صدی میں تو شروع سے آخر تک برقرار رہی لیکن پرتگالیوں کے مالی قوانین اور اس سختی کی وجہ سے جو ان کو نافذ کرنے میں اختیار کی گئی ملاکا کا اجارہ بتدریج غائب ہو گیا اور جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مبادلہ کے دوسرے مرکز اس سے مسابقت کرنے لگے۔ قدیم انگریز تاجروں نے دیکھا کہ جاوا کے مغربی ساحل پر مقام بینتام چینی پیداواروں کی خریدی کا بڑا مرکز تھا۔ اسی طرح سماٹرا کے شمال مغربی نقطہ پر اچین بھی کافی اہم مقام تھا اور پرتگالیوں کے دعووں کے صریح مخالف تھا۔ اس طرح پر تجارت کی تقسیم میں تو وسعت پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کی خاص نوعیت بغیر کسی تغیر کے اسی طرح برقرار تھی چنانچہ جو چیز ڈچ اور انگریزوں کو ہندوستانی سمندروں میں کھینچ لائی وہ اسی تجارت میں حصہ لینے کی خواہش تھی۔ لیکن ان لوگوں کے یہاں آنے کا کیا اثر ہوا یہ بات ہمارے زیر بحث دور سے خارج ہے۔ اس دور میں تو مشرق اقصیٰ کے ساتھ ہندوستان کی تجارت

‹۲۱۵›

باب ۶

یا تو ملاکا کے توسط سے جاری رہی یا پڑوس کے ان بندرگاہوں کے توسط سے جو اس کے ساتھ مسابقت کرنے لگے تھے۔ ملاکا اور اس کے پڑوس کے بندرگاہ مجموعی طور پر ہندوستانی کپڑوں کے نہایت اہم بازار تھے اور انھیں اشیائے خوراک اور دوسرا سامان بھی کافی بڑی مقدار میں حاصل ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی ضرورت کی جو چیزیں وہاں سے دستیاب ہوتی تھیں اُن میں مصالحے خام ریشم۔ سونا اور دوسری اشیا کی ایک طویل فہرست شامل تھی اور یہ چیزیں تقریباً سب کی سب تعیشات کے زیر عنوان آتی ہیں۔

آبنائے ملاکا کے مشرق میں جو ممالک واقع تھے ان کے بارے میں یہ کہنا کافی ہے کہ چین کے ساحل پر بمقام مکاؤ میں۔ جاپان کی ایجنسیوں میں اور مجمع الجزائر کے بڑے بڑے جزیروں میں پرتگالی بسے ہوئے تھے۔ مکاؤ سے جانب مشرق جزائر فلپائن میں ہسپانوی باشندوں کی آبادی ملتی ہے۔ یہ گویا اُن کے قلمرو امریکہ کی ایک بیرونی چوکی تھی۔ یہیں ہم پرتگالی حکومت کے حدود سے خارج ہوتے ہیں[۱]۔ بحر الکاہل کی ہسپانوی تجارت کو (۲۱۶) اِس زمانے میں ہندوستان سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا گو جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں ہندوستانی کپڑے ساحل امریکہ تک پہنچ جاتے تھے۔ بالواسطہ طور پر اِس تجارت کی ہمارے خیال میں یہ اہمیت تھی کہ اس کی وجہ سے مکسیکو کی چاندی ایشیا میں آتی تھی اور اس طرح پر ہندوستان کے لئے چاندی کی رسد برقرار رکھنے میں اس کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ آسٹریلیا سے یورپ والے ابھی تک ناواقف تھے۔ اور جزیرۂ ٹمور میں جو پرتگالیوں کی بستی تھی وہی اِس سمت میں تجارت کی حد تھی۔

ملاکا سے گذر کر بحیرۂ ہند کو عبور کرتے ہوئے ہم افریقہ کے ساحل پر پہنچتے ہیں۔

[۱] یہ یاد ہوگا کہ لفظ ”انڈیز“ اپنے وسیع ترین مفہوم کے مطابق ہسپانیہ اور پرتگال کے مابین منقسم تھا جس دور کے متعلق ہم لکھ رہے ہیں اُس وقت پرتگال عارضی طور پر شاہ ہسپانیہ کے زیر اقتدار آگیا تھا لیکن دونوں قوموں کے درمیان تجارتی مفاد کی علحدگی نہایت سختی کے ساتھ برقرار رکھی گئی۔ اور جو کچھ کہ ہندوستانی سمندروں میں کیا گیا وہ سب ”شاہ پرتگال“ کے نام سے کیا گیا حالانکہ وہ رتبہ درحقیقت شاہ ہسپانیہ کو حاصل تھا۔ کوٹو نے اِن دونوں قوموں کے مابین تجارتی رقابت کی مثالیں پیش کی ہیں منجملہ اُن کے ایک مثال چین کے بازار کی رقابت ہے (بارھویں ڈکاڈا ۱ - ۲۴۳)۔

باب ۶

آجکل جو ملک جنوبی افریقہ کہلاتا ہے وہاں اس زمانے میں تمدن کے قطعاً کوئی علامات موجود نہیں تھے۔ یورپ سے جو جہاز آتے تھے وہ کبھی کبھی ساحل کے کسی مقام پر ٹھہر جاتے تھے اور وہاں کے باشندوں سے اشیائے خوراک حاصل کر لیتے تھے لیکن سب سے پہلا مقام جو کہ تجارت کا ایک باقاعدہ مرکز تھا وہ سوفالہ تھا۔ اس مقام سے جانب شمال راس گردافوئی تک مسلمان تاجروں نے ملک کی تجارت کو ترقی دی تھی۔ ان لوگوں نے موزوں مقامات پر اپنی تجارتی چھاؤنیاں قائم کر لی تھیں جو اگرچہ دیسی باشندوں سے بالکل آزاد تھیں لیکن بالعموم ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتی تھیں۔ لیکن پرتگالیوں نے ان میں کی سب سے زیادہ پسندیدہ چھاؤنی پر قبضہ کر لیا تھا اور مشرقی افریقہ کی اکثر و بیشتر تجارت ہمارے زیر بحث دور میں انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے سونا ملک کی سب سے زیادہ قابل قدر پیداوار تھی لیکن اس کے علاوہ غلاموں اور اسی طرح کی دیگر تعیشات کی بھی یہاں سے بہم رسانی کی جاتی تھی مثلاً ہندوستان کی عیش افروز دستکاریوں کے لئے عنبر۔ آبنوس اور ہاتھی دانت جیسی پیداوار بھی یہیں سے ملتی تھیں۔ ہندوستان سے جو درآمد ہوتی تھی اس میں زیادہ تر پرتگالی چھاونیوں کے ضروریات شامل ہوتے تھے جو کہ مقامی طور پر بہت کم دستیاب ہوتے تھے بلکہ ان کی اکثر و بیشتر غذا اور ہر قسم کی پوشاک کا دارومدار جہازوں پر ہوتا تھا۔ جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہیں خود ملک کے باشندے ان میں سے بمشکل کوئی چیز لیتے تھے البتہ گجرات کے بنے ہوئے منکے اور کپڑوں کی تھوڑی سی مقدار اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی جو کہ اُن باشندوں کے لئے درکار ہوتی تھی جنھوں نے کپڑوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

بحیرۂ احمر میں پرتگالیوں کی قوت مقابلۃً بہت ہی کم آشکار تھی۔ اس میں شک نہیں کہ عدن پر قبضہ کرنے سے اُن کا مقصد یہی تھا کہ یورپی تجارت پر اپنا پورا پورا اقتدار قائم کر دیں چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے یہ بندرگاہ پرتگالیوں ہی کے ہاتھوں میں تھا لیکن وہ اُس پر اپنا تصرف برقرار رکھنے میں ناکام رہے اور اختتام صدی پر عرب کا ساحل (۲۱۷) قطعی طور پر ترکوں کے زیر اقتدار تھا۔ اس زمانے میں پرتگالی جہاز بالعموم بحیرۂ احمر میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ انھوں نے اپنے ہندوستانی مرکزوں سے اجازت ناموں کا طریقہ نافذ کیا یا کبھی کبھی جنگی بیڑوں کے ذریعہ آبنائے باب المندب کو روانہ کرتے تھے۔ ہندوستانی جہاز اپنا سفر خلیج سویز تک پورا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ساحل کے کسی بندرگاہ پر

اپنا مال اتار دیتے تھے۔ جہاں ایران کے لئے قافلے وغیرہ شمال کی جانب سے جہاز آکر تیار رہتے تھے۔ مبادلہ کے اس بندرگاہ کا موقع جسے مصنفین "منڈی" کہتے ہیں وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ ۱۶۰۰ء کے قریب عدن تقریباً ویران ہو گیا تھا اور تجارت کا مرکز یا تو موچا تھا جو کہ آبنائے باب المندب کے اندر واقع ہے یا مکہ کا بندرگاہ جدہ جو کہ اور آگے شمال میں واقع ہے۔[۱] شمال سے جو تجارت جاری تھی وہ وسیع تو نہیں لیکن قیمتی ضرور تھی۔ قاہرہ۔ قسطنطنیہ۔ اور مشرقی بحیرۂ روم کے مختلف مقامات کے تاجر نہایت نفیس اون یا ریشم اور بعض دھاتیں خاص کر مسکوک سونا اور چاندی یہاں لاتے تھے لیکن پھر بھی جہاز رانی کی مقدار بہت بڑی نہ تھی اور جو ہوائیں چلتی تھیں ان کی وجہ سے تجارت کا موسم بہت تنگ ہو جاتا تھا۔ ہندوستانی جہازوں کی تعداد البتہ زیادہ ہوتی تھی۔ وہ ہندوستان سے انواع و اقسام کے کپڑے وغیرہ نیل اور متفرق پیداواریں اور مشرق اقصیٰ سے مصالحے اور دوسرا تجارتی مال یہاں لاتے تھے اور اس کے علاوہ اس زمانے کے لحاظ سے مسافروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو عرب کے مقدس مقامات کی زیارت کو جایا کرتی تھی ساتھ لے جاتے تھے۔[۲] بحیرۂ احمر کے دوسرے ساحل سے سونا۔ ہاتھی دانت اور غلام بہم پہنچائے جاتے تھے چنانچہ خاص طور پر ابی سینیا کے حبشیوں کی بہت زیادہ طلب تھی۔ اور گھوڑے۔ قہوہ مجیٹھ۔ اور بعض ادویہ اور عطریات۔ یہ چیزیں خود عربستان سے بازار کو حاصل ہوتی تھیں۔

عدن سے مسقط تک عرب کا ساحل آجکل کی طرح اس وقت بھی کوئی تجارتی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مسقط پرتگالیوں کے قبضہ میں تھا لیکن اس زمانے میں ان سمندروں پر ان کی قوت کا مرکز آرمز تھا جو کہ خلیج فارس کے دہانہ پر واقع ہے۔ سمندر پر چلنے والے جہازوں کی یہی انتہائی حد تھی کیونکہ بصرہ کی تجارت چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ہوتی تھی۔ پس جس طرح جدہ بحیرۂ احمر کی منڈی تھی اسی طرح خلیج فارس میں آرمز کی حالت تھی۔ یہاں مقامی تجارت بہت ہی کم تھی۔

(۲۱۸)

---

[۱] جورڈین جو ۱۶۰۹ء میں موچا میں موجود تھا کہتا ہے (صفحہ ۱۰۳) کہ "منڈی" حال ہی میں جدہ سے اس بندرگاہ کو منتقل ہو گئی ہے۔

[۲] ٹیری (صفحہ ۱۴۰) نہایت جوش کے ساتھ اس جہاز کا ذکر کرتا ہے جو عام طور پر سورت سے موچا تک جاتا تھا اور کہتا ہے کہ جس سال وہ خود ہندوستان سے روانہ ہوا اسی سال ۱۷۰۰ حاجی مسافر اس میں واپس ہوئے۔

باب ۶ کیونکہ یہ آبادی ایک بنجر زمین کے جزیرہ پر واقع تھی اور اپنی معمولی سے معمولی اشیائے خوراک بھی اس کو براعظم سے حاصل کرنی پڑتی تھی البتہ وہاں بہت ہی قیمتی مال تجارت کا آپس میں مبادلہ ہوتا تھا۔ ہندوستان اور دوسرے شرقی ممالک سے کپڑے۔ مصالحے اور دیگر اشیا جو ایران اور بحیرہ روم تک کے علاقوں میں مطلوب ہوتی تھیں روانہ کی جاتی تھیں اور انھی جہازوں میں لارن کی شکل میں سکوک چاندی۔ گھوڑے۔ خشک میوے اور ایرانی ریشم اور قالین جیسی اشیائے تعیش واپس جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ خلیج کی دوسری جانب بحرین میں سمندر سے جو موتی دستیاب ہوتے تھے ان کے خریدار بھی اس مقام کو آنے والے تاجروں میں موجود ہوتے تھے۔ آرمز سے جانب مشرق سندھ تک ساحل بہت ہی نامہربان اور بحری ڈاکوؤں کی ایذا رسانی کا مرکز تھا۔

اس طرح ہم نے ہندوستانی سمندروں کا سفر جو کہ دریائے انڈس کے دہانہ سے شروع ہوا تھا ختم کر دیا۔ اب ہندوستان کی بحری تجارت کی سرگذشت مکمل کرنے کے لئے صرف اس تجارت کا حال معلوم کرنا باقی ہے جو سیلون اور بحر ہند کے چھوٹے چھوٹے جزائر کے ساتھ جاری تھی۔ اس کی کوئی بڑی مقدار نہیں تھی اور وہ زیادہ تر ساحلی کشتیوں میں کی جاتی تھی۔ پھر بھی ہمیں خشکی کی سرحد کا حال معلوم کرنا ہے لیکن جغرافی وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں اس سے جس قدر دلچسپی کی توقع ہو سکتی تھی اُس سے وہ بہت کم دلچسپ ہے۔

باب

چوتھی فصل

خشکی کی سرحد پر تجارت کے راستے

عصری تواریخ سے جس حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی خشکی کی سرحدوں سے جو تجارتی مال گذرتا تھا اس کی اس زمانے میں بہت کم اہمیت تھی۔ تجارت کے لئے جو راستے کھلے ہوئے تھے وہ بہت تھوڑے تھے اور یکے بعد دیگرے جو قافلے گذرتے تھے ان کے درمیان طویل وقفے واقع ہوتے تھے۔ شمال مشرق میں قافلہ کا ایک راستہ چین کو جاتا تھا لیکن عام طور پر وہ باقاعدہ استعمال میں نہیں تھا۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو سے کہا گیا تھا کہ آگرہ سے ہر سال ایک قافلہ چین کو جاتا ہے[1]۔ لیکن چند سال پیشتر اس کی روانگی مشتبہ خیال کی جاتی تھی۔ اور جب سنہ ۱۵۹۸ء میں پادری ہیرونیمس زیویر ایک تبلیغی سفر کی تجویز کر رہا تھا تو اس نے فیصلہ کیا کہ یہ راستہ نہ اختیار کیا جائے گو "بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ بلکہ کابل کا راستہ اختیار کرے جہاں سے چین کو جانیوالی سڑک تاجروں کے قدموں تلے "روندی" ہوئی تھی۔ ہم شاید یہ نتیجہ نکال سکیں کہ برہمپترا کی گھاٹی کے راستے سے کچھ آمد و رفت موجود تھی لیکن تجارت کی رفتار نہایت بے قاعدہ اور اس کی مقدار بہت تھوڑی تھی۔ برہمپترا سے درہ خیبر تک کسی راست تجارتی سڑک کا ہمیں کوئی نشان نہیں ملا ابوالفضل مختلف اشیاء کا ذکر کرتا ہے جو شمال کی جانب سے ہندوستان میں آتی تھیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر ہمالیہ کی پیداواریں معلوم ہوتی ہیں اور تبت کے ساتھ جو تجارت تھی اس کی اہمیت آجکل کی حالت سے بھی کم تھی اس کے علاوہ فرشتہ کا بیان ہے کہ کاشغر سے کشمیر تک قافلوں کے لئے کوئی گذرگاہ نہ تھی گو حمالوں کے ذریعہ تھوڑا بہت تجارتی مال آتا تھا۔ پس عملی طور پر کل سرحد کے اوپر صرف دو باقاعدہ راستے موجود تھے:

(۲۱۹)

[1] ٹری کہتا ہے کہ "آگرہ سے چین کی دیواروں تک" سفر کرنے میں دو سال سے زیادہ مدت لگی (پرچاس - ۲ - ۹ - ۱۴۲۸)

باب ایک لاہور سے کابل تک اور دوسرا ملتان سے قندھار تک۔ کابل ایک بہت بڑا تجارتی مرکز اور ہندوستان، ایران اور شمالی ملکوں سے آنے والے تاجروں کے ملنے کا مقام تھا۔ مزید براں وہ اس راستے پر واقع تھا جو ہندوستان سے نکل کر اس بڑی سڑک تک پہنچتا تھا جس پر مغربی چین اور یورپ کے درمیان قافلے آتے جاتے تھے۔ قندھار گویا اس راستہ کا دروازہ تھا جو ہندوستان سے ایران کے اکثر علاقوں کو جاتا تھا اور اگر اس زمانے کے مروجہ حالات کے مناسب معیار سے جانچا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں راستوں پر بہت زبردست آمد و رفت جاری تھی۔

لیکن زبردست آمد و رفت کے الفاظ سے آجکل جو مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کے لئے وہ حالات ناموزوں تھے۔ سڑکیں گاڑیوں کے لائق نہیں تھیں اس لئے بار کش جانوروں کے ذریعہ آمد و رفت ہوتی تھی۔ چوری اور ضرر رسانی کا خطرہ بالعموم اس قدر زبردست ہوتا تھا کہ چھوٹے یا غیر محفوظ قافلے ان پر سے گذر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے روانگی کے مسلمہ مقامات پر تجار انتظار کیا کرتے تھے حتی کہ وہ اس قدر جمع ہو جائیں جس سے ایک اچھا خاصہ قافلہ تیار کیا جا سکے جو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ چنانچہ اس وجہ سے انھیں مدتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان سڑکوں پر کوئی مستقل سلسلۂ آمد و رفت جاری نہیں تھا۔ بالعموم وہ خالی پڑی رہتی تھیں اور طویل وقفوں کے بعد کثیر التعداد جانور وہاں سے گذرتے تھے۔ مثلاً مانریق کہتا ہے کہ وہ ملتان میں ایک قافلہ کو نہ پا سکا اور معلوم ہوا کہ دوسرے قافلہ کے لئے اسے چھ مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر خوش قسمتی سے کوئی امیر کثیر التعداد اہالی موالی کے ساتھ ایران کی طرف (۲۲۰) کوچ کرنے والا تھا اور اسے اس جماعت میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ معمولی تجارتی قافلوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ اور اس زمانے میں مغربی ایشیا کے اکثر و بیشتر حصہ میں بھی بالعموم یہی صورت حال تھی۔

ایک عیسائی مبلغ بنی ڈکٹ گویز نے اسی راستے پر لاہور سے چین تک سفر کیا تھا۔ اس نے جو کیفیت قلمبند کی ہے اس سے کابل کے سفر کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ تقریباً پانسو آدمیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اٹک اور پشاور کے درمیان چوروں کا اندیشہ تھا۔ اس آخری مقام سے گذرنے کے بعد انھوں نے چار سو سپاہیوں کا ایک محافظ دستہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اور جب وہ ایک درّے میں سے گذر رہے تھے تو انھیں ڈاکوؤں کی مرتفع زمین صاف کرنی پڑی کیونکہ یہ لوگ قافلوں پر

اوپر سے پتھر لڑھکایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس جماعت پر حملہ بھی ہو گیا اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے لیکن بالآخر وہ کابل پہنچ گئے اور وہاں پہنچکر رک گئے کیونکہ "بعض تجار آگے جانا نہیں چاہتے تھے اور بقیہ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس قدر تھوڑی تعداد کے ساتھ روانہ ہوں"۔ لیکن گوڈیز نے بہر صورت ایک جماعت فراہم کر لی جو سفر کرنے کے لئے کافی بڑی تھی اور اپنا سفر جاری رکھا۔ ہمیں اور آگے اس کا حال معلوم کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ یہاں اس کی سرگذشت ختم نہیں ہو گئی تھی۔ دوسری سڑک جو ملتان سے قندھار کو جاتی تھی اس پر چند سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی معاملہ کے لئے دو انگریز تاجروں کو گذرنا پڑا۔ ملتان سے دو منزل آگے جہاں ایک مسلح محافظ دستہ کا انتظار ہو رہا تھا یہ دونوں ایک قافلہ کے ساتھ مل گئے۔ اور یہ جماعت بہ سلامت ایک قلعہ تک پہنچ گئی جو مسافروں کی حفاظت کے لئے قائم تھا۔ راستہ میں قطعاً کوئی رسد میسر نہیں تھی اور باشندے ہر وقت تاک میں لگے رہتے تھے کہ اگر موقع ملے تو چوری کر لیں۔ مزید براں قلعہ کا کپتان انہی مسافروں سے جنکی کہ حفاظت کے لئے وہ وہاں مقرر تھا جبراً چوتھ وصول کرتا تھا۔ اس قلعہ سے سات کوچ تک سڑک عام طور پر محفوظ تھی لیکن اس کے بعد کی چوکی پر کمانڈر کو چوتھ کی مقدار طے کرنے میں انہیں تین دن تک پڑا رہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ملیک درہ پر پہنچے جہاں بہت سے قافلے الگ ہو چکے تھے۔ یہاں انہیں پھر چوتھ ادا کرنا پڑا لیکن اس مرتبہ باشندوں کو۔ ایک اور قلعہ پر سے گذر ہوا اور یہاں بھی روپیہ ادا کیا گیا اور اس کے بعد وہ قندھار پہنچ گئے۔ اس مقام پر قافلہ منتشر ہو گیا۔ راستہ کا سب سے زیادہ پر خطر حصہ طے ہو چکا تھا اور آگے کا ملک اس قدر ویران تھا کہ صرف چھوٹی چھوٹی جماعتیں اپنی ضروریات کے لایق چارہ اور پانی حاصل کرنے کی توقع کر سکتی تھیں۔
۱۶۱۵ء میں جبکہ یہ سفر کیا گیا تو ایران جانے کا بحری راستہ جنگ کی وجہ سے بند تھا اور اس وجہ سے قندھار کی سڑک آباد تھی۔ اُن اونٹوں کی تعداد جو اس ایک سال کے اندر لاہور سے گذرے بارہ ہزار سے چودہ ہزار تک بیان کی گئی ہے جو اسباب سفر و اشیائے خوراک و نیز تجارتی مال شامل کر کے مجموعی طور پر غالباً تین ہزار ٹن وزن لے جا سکتے تھے۔ لیکن معمولی حالات کے اندر اونٹوں کی تعداد بہ مشکل تین ہزار تک پہنچتی تھی اور اس طور پر مجموعی وزن تقریباً چھ سو یا سات سو ٹن تک ہوتا ہوگا۔ سڑک کا اکثر و بیشتر حصہ ویران تھا اس لئے مجموعی وزن میں بہت بڑا حصہ محض اشیائے خوراک کا ہوتا تھا۔ (۲۲۱)

اسی قسم کے سفروں کے دوسرے حالات سے بھی دیری۔ پریشانی۔ چوتھ۔ اور

کبھی کبھی حملوں کی بالکل ایسی ہی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے - اور یہ اُن قافلوں کے حالات ہیں جو اپنی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے تھے نہ ان قافلوں کے جو کہ راستہ ہی میں تباہ و برباد ہو گئے - پس اس طریقۂ نقل و حمل کی وسعت نہایت سختی کے ساتھ صرف ایسی چیزوں تک محدود تھی جنکی قدر ان کی جسامت کے تناسب سے بہت زیادہ ہوتی تھی اور جن سے منزل مقصود پر پہنچکر نسبتاً بہت بڑا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا - یہ تجارت نظر انداز کرنے کے قابل تو نہیں تھی لیکن یہ ایک مشتبہ امر ہے کہ آیا اُس زمانے کی بحری تجارت کے ساتھ اس کا تناسب اُس سے زیادہ تھا جو آجکل ہندوستان کی خشکی کی تجارت کو بہ مقابل بحری تجارت کے حاصل ہے -

باب ۶

پانچویں فصل

یورپ کے ساتھ راست تجارت

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی جو کیفیت سابقہ فصلوں میں بیان کی گئی ہے اس کا منشا صرف اس قدر ہے کہ جس جس سمت میں خاص خاص اہم پیداواریں آتی جاتی تھیں ان کا ایک عام تصور حاصل ہو جائے۔ اس کے ساتھ اُن امور معلومہ کی تحقیق کا شامل کرنا بھی ضروری ہے جن سے اس تجارت کی مقدار کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ تحقیق شروع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے ایک اور مضمون کی طرف متوجہ ہوں اور یہ معلوم کریں کہ مغربی یورپ کے ساتھ جو راست تجارت بذریعہ سمندر ترقی پا گئی اُس کے کیا اسباب تھے۔

اس مضمون کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ خیال بھی ہے کہ جس چیز نے غیر ملکی تاجروں کو ہندوستان کی طرف مائل کیا وہ اس ملک کی دولت کا لالچ تھا۔ ہمارے خیال میں یہ بات صحیح ہے کہ پندرھویں صدی میں انڈیز (وسیع ترین مفہوم کے مطابق) کے متعلق عوام الناس کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ ملک سونے۔ چاندی اور جواہرات (۲۴۲) سے بھرا ہوا ہے۔ اور ممکن ہے کہ بعض افراد نے اسی خیال کے اثر سے مشرق کی ابتدائی مہموں میں حصہ لیا ہو۔ لیکن انفرادی مہمیں بہت کم قابل لحاظ تھیں۔ اس جدید تجارت کی ترقی منفرد اشخاص کی بدولت نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ سلطنتوں یا بڑی بڑی طاقتور سند یافتہ جماعتوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی جن کی نیتوں کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ سب سے پہلے شاہ پرتگال نے اور بعد ازاں ڈچ اور انگریزی کمپنیوں نے صریحاً اس ارادے سے کہ تجارت کے ذریعہ روپیہ پیدا کریں اپنے اپنے جہاز ہندوستانی سمندروں کی طرف روانہ کئے۔ یہ معلوم تھا کہ بعض بعض چیزیں جو مغربی یورپ میں نہایت اعلیٰ قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں مشرق میں ادنیٰ قیمتوں پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی امید تھی کہ انڈیز کے لوگ یورپ کی بہت سی خاص پیداواریں خریدنے کے لئے آمادہ

باب ۱۲ ہوں گے چنانچہ ہر ایک جہاز راں قوم نے اس ممکنہ اہم تجارت میں سے کثیر حصہ حاصل کرنے کے لئے باری باری سے کوشش شروع کی ۔

مغربی یورپ کو پندرھویں صدی میں انڈیز سے جو چیزیں مطلوب تھیں وہ مختصراً مصالحے اور جڑی بوٹیاں تھیں ان میں سے اکثر چیزیں بہت تھوڑی تھوڑی مقدار میں درکار ہوتی تھیں ۔ لیکن کالی مرچ کی حالت اس سے مستثنیٰ تھی کیونکہ باوجود اعلیٰ مصارف نقل وحمل کے اس کا استعمال کثرت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا ۔ اور اس قول میں در اصل کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ہندوستان اور مغربی یورپ کے درمیان براہ راست تجارت کی تاریخی بنیاد کالی مرچ ہی پر ہے ۔ اہل یورپ کو مصالحوں کی کس قدر شدید طلب تھی اس کو سمجھنے کے لئے اس زمانے کی معاشرتی زندگی سے کسی قدر واقفیت ضروری ہے ۔ زیادہ شمالی ممالک میں کثرت کے ساتھ گوشت کھایا جاتا تھا لیکن مروجہ طریق زراعت کے تحت صرف موسم گرما اور خریف میں جانور ہلاک کئے جا سکتے تھے اور بقیہ سال کے لئے خوراک کا انتظام موسم میں ہلاک کئے ہوئے جانوروں کا گوشت محفوظ رکھکر کیا جاتا تھا ۔ اس طرح پر محفوظ رکھنے کے دو طریقے تھے نمک بھرنا یا مصالحے لگانا ۔ اس آخری طریقہ کے لئے مرکب مصالحوں کی ایک کثیر مقدار استعمال کرنی پڑتی تھی ۔ چنانچہ اس زمانے کے انگریزی ادب میں مصالحہ لگے ہوئے گوشت کا جس کثرت سے ذکر آتا ہے اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس حد تک تو مصالحے اس زمانے کی ضروریات میں شامل کئے جا سکتے ہیں لیکن اس ضروری طلب میں کھانے والوں کے مذاق کی وجہ سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا ۔ تقریباً ہر ایک قسم کی غذا ۔ گوشت ۔ مرغ ۔ شکار ۔ مچھلی ۔ میوہ حتیٰ کہ روٹی کچھ اس طور پر ذائقہ دار بنائی جاتی تھی کہ آجکل ہر شخص اس کو (۲۲۳) وحشیانہ کہکر ملامت کرے گا ۔ اور اس کا اندازہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ انتظام خانہ داری کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو کہ مطبخی انقلاب سے پہلے جس کا آغاز انگلستان میں چارلس ثانی کے دور حکومت میں ہوا تھا شائع ہوئی ہوں پس اگر اس زمانے کے معیار سے جانچا جائے تو ان مصالحوں کا بازار بہت بڑا تھا ۔ اور کم از کم انگلستان میں تو وہ بہت قدیم زمانے سے ایک تنظیم یافتہ حالت میں تھا ۔ مثلاً لندن کمپنی آف گروسرس (لندن کے پنساریوں کی کمپنی) کی ابتدا کالی مرچ بیچنے والوں کی جماعت سے ہوئی تھی جو کہ ہنری دوم کے دور حکومت میں موجود تھا اور ۱۳۴۵ء میں اس کی رکنیت صرف کالی مرچ

باب۱۱

اور مصالے بیچنے والوں، تک محدود تھی۔ ان ناموں ہی سے خود اُن کی سرگذشت کا پتہ چلتا ہے۔[۱]
پندرھویں صدی میں اُن کے اغراض و مفاد کی وسعت کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ
۱۴۴۷ء میں "ہر قسم کے مصالحوں اور تجارتی مال" کی تجارت کی نگرانی اس کمپنی کے سپرد کر دی گئی
سونف۔ زیرہ۔ کالی مرچ۔ ادرک۔ لونگ۔ جوتری۔ دارچینی۔ الائچی۔ اور ان کے علاوہ
"ہر قسم کا تجارتی مال۔ مصالحے اور ایسی جڑی بوٹیاں جن کو دوائیوں سے کچھ نہ کچھ تعلق ہو"
یہ سب چیزیں انھی کی نگرانی میں شامل تھیں۔

پندرھویں صدی کے آخر میں اس تجارت کے لئے جو چیزیں ہندوستانی سمندروں
سے درکار ہوتی تھیں وہ زیادہ تر مصر کے راستہ سے حاصل کی جاتی تھیں۔ چنانچہ کسی سابقہ فصل
میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ نقل و حمل نہایت طویل اور گراں تھی۔ مثلاً ساحل ملیبار پر کسی جہاز
کے لئے مال اکٹھا کیا جاتا تھا جس میں کچھ تو مقامی کالی مرچ اور کچھ دوسرے مصالحے اور جڑی
بوٹیاں جو ملاکا یا اور آگے کے مشرقی مقامات سے لائی جاتی تھیں شامل ہوتی تھیں۔ یہ مال عدن
یا موچا پر دوسرے جہاز میں منتقل کیا جاتا۔ پھر خلیج سویز میں وہ جہاز پر سے اتارا جاتا اور خشکی یا تری
کے راستہ سے بحیرۂ روم کے ساحل پر پہنچایا جاتا تھا۔ مزید براں مصر کے آر پار جانے کے لئے ٹیکس
پر بہت گراں محاصل ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہاں پہنچکر وہ اطالوی تاجروں کے ہاتھوں میں منتقل
ہو جاتا تھا، جو اُسے وینیس یا جنیوا روانہ کر دیتے تھے۔ اِن مقامات سے وہ بذریعہ دریا اور
آگے مغرب کو بھیجا جاتا تھا یا خشکی کی راہ سے کوہ آلپس پر سے ہوتے ہوئے دریائے رہائن
کے ذریعہ انٹورپ پہنچایا جاتا تھا جو کہ اُس زمانہ میں مغربی یورپ کے لئے مال تجارت کی
تقسیم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پس اولوالعزم پرتگالیوں کے لئے اس تجارت میں نمایاں طور پر بہت ساری
ترغیبیں موجود تھیں۔ سب سے پہلے تو کثیر منافعہ کی امید تھی جس کو حاصل کرنے میں وہ ایک طرف
تو اپنے دشمن اہل وینیس کو اور دوسری طرف دشمنانِ نصاریٰ یعنی اہل مشرق کو نقصان (۲۲۳)
پہنچا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ نامعلوم سمندروں میں جہاز چلا کر دین عیسوی کی اشاعت کیلئے
راستہ صاف کرنے کی توقع علٰحدہ تھی۔ لیکن پہلا نمبر تجارت ہی کا تھا۔ چنانچہ ہم شروع سے
پرتگالی سرداروں کو تجارت کے لئے گفت و شنید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ

---

[۱] اسی کا ہم معنی فرانسیسی لفظ (epicier) اب تک عام طور پر مستعمل ہے جس کے معنی پنساری کے ہیں۔

باب

کالی کٹ میں مسلمان تاجروں کے ساتھ ان کا پہلا کھلا ہوا جھگڑا کالی مرچ ہی کے سلسلے میں نمودار ہوا تھا۔ اور کوچین میں اپنے قدم جمانے کا انھوں نے جو مصمم ارادہ کیا وہ زیادہ تر ان سہولتوں پر مبنی تھا جو اس چیز کے حاصل کرنے میں وہاں موجود تھیں۔ جب پرتگالیوں نے چند سال بعد ہندوستانی تاجروں کو اجازت نامے عطا کرنے کا طریقہ جاری کیا تو مصالحے خاص طور پر مستثنیٰ کر دیئے گئے اور کالی مرچ مخصوص شاہی اجارہ کی حیثیت سے برقرار رہی۔ ۱۵۸۰ء تک بھی لسبن سے روانہ ہونے والے بیڑے کے لئے جو معاہدہ کیا گیا تھا اس میں یہ شرط موجود تھی کہ ہر سال تیس ہزار قنطال یا یوں کہئے ۱۵۰۰ ٹن کالی مرچ درآمد کی جائے۔ ظاہر ہے کہ تجارت کے عصری معیاروں سے جانچا جائے تو یہ ایک نہایت ہی کثیر مقدار تھی۔

جس زمانے میں پرتگالی راس امید کے اطراف ہوتے ہوئے اس تجارت کو ترقی دے رہے تھے ہسپانیہ امریکہ کے راستہ سے مشرقی مجمع الجزائر سے مصالحے حاصل کرتا تھا اور ۱۵۸۱ء ہی میں ایک انگریز مسمی رابرٹ تھارن نے "مصالحوں کی اسی نئی تجارت" کا حال لکھتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اگر شاہنشاہ بھی شاہ پرتگال کی تقلید کر کے "ایک تاجر بن جائے" تو بہت کچھ نفع حاصل ہوگا۔ لیکن یوروپی بازار کے اندر اہم حیثیت پرتگالیوں کو ہی حاصل رہی اور یہ حیثیت خاص کر کالی مرچ سے زیادہ متعلق تھی کیوں کہ یہ چیز زیادہ تر ہندوستان سے آتی تھی اور ہسپانوی تجارت کی وہاں تک بہ آسانی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور جب تک کہ سیاسی دقتیں پیدا نہیں ہوئیں انگلستان میں جو قیمتیں لی جاتی تھیں وہ اتنی زیادہ نہیں تھیں کہ ان سے شکایت پیدا ہو سکے۔ لسبن کو کالی مرچ بڑی مقدار میں آتی تھی اور وہاں اسے ڈچ اور انگریز تاجر خرید کر انگلستان۔ فلانڈرس اور جرمنی کے بڑے بڑے بازاروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ جب پرتگال نے ہسپانیہ کی اطاعت اختیار کر لی تو اس تجارت کا برقرار رہنا خطرہ میں پڑ گیا۔ ڈچ ہسپانیہ کے ساتھ برسر پیکار تھے۔ لسبن کا بندرگاہ ان کے تاجروں کے لیئے بند تھا۔ کالی مرچ کی قیمت بہت زیادہ گراں ہو گئی لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ جن مقامات سے اس کی برآمد ہوتی ہے وہاں اپنے جہازوں روانہ کئے جائیں لیکن پہلے پہل ڈچ کالی مرچ کے لئے ہندوستان نہیں آئے بلکہ اسے دوسرے مصالحوں کے ساتھ جاوا اور سماٹرا سے حاصل کرتے رہے۔ ان کے بیڑے اس قابل تھے کہ اپنی مدافعت کے لئے پرتگالیوں کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ اختتام صدی تک مجمع الجزائر کے ساتھ ان کی

باب ۷

تجارت قایم ہوگئی۔ ہندوستان کے ساتھ ان کے تعلقات کسی قدر بعد میں بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ یورپ سے ایسا کوئی تجارتی مال نہیں لے جاسکتے تھے جو مصالحوں والے جزایر میں فوراً فروخت ہو جائے۔ لہٰذا انھوں نے بہ طور ضمنی کاروبار کے ہندوستان میں کارخانے[1] قائم کئے۔ البتہ یورپ کے لئے کالی مرچ اور دوسرے مصالحوں کی بہم رسانی ان کا خاص کاروبار رہا۔

جن اغراض نے ڈچوں کو یہاں آنے پر آمادہ کیا تھا بالکل اسی قسم کے مقاصد لیکر انگلستان کے تجار نے مشرق کا رخ کیا۔ اس زمانے میں انگلستان ہسپانیہ کا سخت دشمن تھا۔ انگریز دیکھ چکے تھے کہ ڈچ باضابطہ طور پر لسبن کی تجارت سے خارج کر دئیے گئے ہیں۔ انھیں خوف تھا کہ اسی طرح کی ممانعت ان پر بھی عائد کر دی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں کالی مرچ کی قیمت سخت گراں ہوگئی اور سب سے پہلے جو کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ ایسی متعدد کمپنیاں بنائی جائیں جو بحیرۂ روم کے راستے سے مشرقی پیداواروں کی براہ راست تجارت اپنے قبضے میں لے لیں۔ یہ تجویز پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی۔ اور جب اختتام صدی پر ڈچوں نے بازار پر تسلط حاصل کرکے کالی مرچ کی قیمت حد سے زیادہ بڑھادی تو انگریزی تاجروں نے پہلی ایسٹ انڈیا کمپنی قایم کرکے اس کا جواب دیا۔ کمپنی کو جو سند عطا کی گئی اس کی عبارت بالکل عام تھی۔ ملک کی عزت۔ جہازرانی کا اضافہ اور تجارت کی ترقی بھی اس کے مقاصد بیان کئے گئے تھے۔ انھیں مقاصد کو پیش نظر رکھکر اس امیدوار اور آنبائے مگیلان کے درمیان جہاں کہیں "مال واسباب کی تجارت" کا موقع ملے تجارت کرنے کی اجازت عطا کی گئی۔ اور یہ بات صریح طور پر تسلیم کی گئی کہ ابتدائی سفر محض امتحاناً لئے جائیں گے۔ سنہ ۱۶۰۱ء میں جو قوانین و فرامین مرتب کئے گئے ان کے دیباچے میں کمپنی کے ابتدائی مقاصد زیادہ توضیح کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلا سفر سماٹرا۔ جاوا اور اس کے قرب و جوار کے جزائر کی طرف اس ارادے سے اختیار کیا گیا کہ کالی مرچ۔ مصالحے۔ سونا اور دوسرے اشیا کی تجارت کی جائے۔ پرچاس نے جس جملے سے پہلے سفر کی کیفیت کا آغاز کیا ہے اس میں نہایت اختصار کیسا (۲۲۰)

[1] یہاں یہ تشریح کر دینا مناسب ہے کہ اس لفظ کا مفہوم بدل گیا ہے۔ ہمارے زیر بحث دور میں اس سے ایسی جگہ مراد نہیں تھی جہاں مال تیار کیا جائے بلکہ وہ صرف ایک تجارتی مقام ہوتا تھا جہاں کارندے (فیکٹرس) معین کئے جاتے تھے۔

باب ۶

اُس رائے کی تشریح کی گئی ہے جو اس مہم کے بارے میں مروج تھی۔ "سنہ ۱۶۰۰ء میں لندن کے تاجروں نے آپس میں متفق ہو کر بہتر ہزار پونڈ سرمایہ جہازوں اور مال تجارت میں لگانے کی غرض سے اکٹھا کیا تاکہ ملک میں مصالحے اور دیگر اشیا لانے کے لئے مشرقی ہندوستان کے ساتھ تجارت پیدا کی جائے"۔ اس بیان سے دراصل حقیقی صورت حال مکمل طور پر پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ڈچوں کی طرح انگریز بھی مصالحے خریدنے کے لئے مشرق گئے تھے۔ پہلے انھوں نے جاوا اور سماٹرا میں کوشش کی۔ لیکن جو بندرگاہ پہلے حریفوں کے قبضے میں آ گئے تھے ان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ چنانچہ خاص کر اسی وجہ سے کمپنی نے یہ فیصلہ کیا کہ خود براعظم ہند میں قسمت آزمائی کی جائے اور اسی فیصلہ کی بنا پر اپنے تیسرے سفر کے جہازوں میں سے ایک جہاز کو سورت جانے کی ہدایت کی۔

پس تیس قوموں کے جہاز یکے بعد دیگرے ہندوستان کے سمندروں میں خاص کر مصالحوں کی تلاش میں آئے۔ لیکن اُن کے ذریعہ سے ایسے تجار اس طرف نکل آئے جو تجارتی تعلقات قائم کرنے کے آرزومند تھے چنانچہ جیسے جیسے بازاروں کے امکانات سے واقفیت ہونے لگی تجارت کی بنا بھی سرعت کے ساتھ وسیع ہونے لگی۔ جہاں تک خود ہندوستان کا تعلق تھا اس کا رد بار کے برآمد والے پہلو میں چنداں دقتیں پیش نہیں آئیں۔ کیونکہ ہندوستان کے تجار بیچنے کے لئے عام طور پر بہت زیادہ آمادہ رہتے تھے۔ اس کے برعکس جو چیزیں یورپ سے لائی جا سکتی تھیں ان کے لئے ہندوستان یا اس کے قرب و جوار کے ممالک میں کوئی بڑا یا مستقل بازار نہیں تھا۔ اور اسی لئے جو مال روانہ کیا جاتا تھا اس میں متواتر نا کامیوں کے تجربہ سے یہی طے پایا کہ صرف چاندی برآمد کر کے ہندوستان کے ساتھ تجارت کی جا سکتی ہے۔ ولیم ہاکنس نے مغلیہ دربار میں دو سال قیام کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "ہندوستان بہ لحاظ چاندی کے بہت دولتمند ہے۔ کیونکہ تمام قومیں یہاں سکے لائی ہیں اور اُن کے عوض اشیا لے جاتی ہیں۔ اور یہ سکے ہندوستان میں مدفون رکھے جاتے ہیں اور آگے نہیں جانے پاتے"۔ اس کے چند سال بعد ٹیری لکھتا ہے کہ "جس طرح تمام دریا سمندروں کی طرف دوڑتے ہیں اسی طرح بہت چاندی کی نہریں اس طرف بہتی ہیں اور یہاں پہنچکر ٹھہر جاتی ہیں"۔ چاندی برآمد کرنے کی اس ضرورت کی وجہ سے تجارت میں سخت رکاوٹ محسوس ہوتی تھی کیونکہ اس زمانے میں یورپ کی حکومتوں پر اس نظریہ کا اثر بہت غالب تھا کہ تجارت خارجہ کی قدر و اہمیت کا

باب ۳

(۲۲۷)

اندازہ سونے چاندی کی اُس مقدار سے ہوتا ہے جو اس کی بدولت ملک میں داخل ہو اور اسی وجہ سے یہ حکومتیں اپنا سکہ باہر بھیجنے کو انتہا درجہ ناپسند کرتی تھیں۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لئے اِس نظریہ کے مغالطے پر یا اُن اہم حقیقتوں پر جن پر کہ اس کا دارومدار تھا بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ ہمارے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ اس قسم کا نظریہ اُس زمانے میں موجود تھا اور ہندوستان کے ساتھ معاملہ کرنے والے تاجروں کو اس کا لحاظ کرنا لازمی تھا۔ انگریزی کمپنی کو اُس کے منشور کی رو سے ہر بیرونی سفر پر چاندی کی ایک زیادہ سے زیادہ معینہ مقدار باہر لے جانے کی اجازت عطا کی گئی تھی لیکن اُس کو اپنا کاروبار اس طور پر چلانا لازمی تھا کہ بالآخر کم از کم اتنی ہی مقدار ملک میں واپس آجائے۔ اور اگرچہ ہندوستانی اشیا دوسرے یورپین ممالک میں فروخت کر کے یہ آخری شرط پوری کی جاتی تھی تاہم باہر جانے والی چاندی کی مقدار محدود کر دینا سخت نقصان تھا۔ تاجران کمپنی کی ابتدائی مراسلت کا زیادہ دلچسپ حصہ درحقیقت وہ ہے جہاں وہ بازاروں کی باقاعدہ تلاش کرتے اور یہ پتہ لگاتے ہیں کہ ہندوستان میں کن کن چیزوں کی فروخت ممکن تھی تاکہ انھیں اپنی چاندی کے محدود ذخیرہ کے ساتھ شامل کرلیں۔ جن طریقوں سے یہ مشکل بالآخر حل کی جاتی تھی ان کا حال ہمارے زیر بحث دور سے خارج ہے البتہ اس کا وجہ نہایت صاف طور پر ذہن نشیں کر لینا ضروری ہے۔

سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے بہت زیادہ آمادہ تھا لیکن مبادلہ میں بجز چاندی کے کوئی اور چیز لینا اسے منظور نہ تھا۔ عوام الناس میں تو یورپ کی اشیا کے لئے بازار موجود ہی نہ تھا اور اعلیٰ طبقے کے لوگ بجز معمولی اور انوکھی چیزوں کے کسی اور شئے کی بہت کم پرواکرتے تھے اور جب تک کوئی چیز کافی مقدار میں فروخت کے لئے لائی جاتی وہ اُس سے بیزار ہو جاتے تھے۔

باب ۷

چھٹی فصل

تجارت خارجہ کی مقدار

سابقہ فصلوں میں ہم جس تجارت کا حال بیان کر چکے ہیں اب اس کی مقدار کے پہلو کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ جو چیزیں ہندوستانی بندرگاہوں میں داخل ہوتیں یا وہاں سے روانہ کی جاتی تھیں ان کے وزن یا ان کی قیمت کے متعلق کوئی قطعی تعداد کا نتائج اخذ کرنا تو ناممکن ہے۔ البتہ ایسا کافی مواد موجود ہے جس کی بنا پر بحری تجارت کی تعداد کا عام تصور کیا جا سکتا ہے اور کاروبار نقل وحمل کی ترقی کی بدولت جو تغیر پیدا ہو گیا ہے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس مواد کو سمجھنے کے لئے موسمی ہواؤں کے اثر کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اوقات معینہ پر نہایت پابندی کے ساتھ جہازوں کی روانگی آجکل اتقدر عام بات ہو گئی ہے کہ ہم بسا اوقات اس کا انوکھا پن بھلا دیتے اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہر جہاز جب کبھی اور جہاں کہیں اس کے مالک چاہیں سفر کر سکتا ہے۔ لیکن جس زمانے میں جہاز ہوا کے زور سے چلتے تھے ان کے راستے کا دارومدار مالکوں کی مرضی پر نہیں بلکہ (۲۲۸) موسم کی حالت پر ہوتا تھا اور ایشیائی سمندروں پر بالعموم ہر سال صرف ایک پورا دریائی سفر کیا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں جہاز رانی جن حالات کے تابع رہتی تھی ان کی تشریح کے لئے ہم ہندوستان کے مغربی ساحل پر جو تجارت کی رفتار تھی اس کا حال بیان کرتے ہیں۔ آجکل کی طرح اس زمانے میں بھی جنوب مغربی بادبرشگال کا آغاز اوائل جون میں ہوتا تھا۔ اور جب تک کہ اس کی قوت گھٹ نہ جائے کوئی جہاز کسی بندرگاہ سے نکلنے یا اس میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ مخالف ہواؤں کی وجہ سے روانگی تو قطعاً ناممکن تھی۔ اور مغرب کی طرف سے آنے والے جہاز ہندوستان کی جانب چلے تو آتے لیکن بجائے اس کے کہ وہ کامیابی کے ساتھ کسی بندرگاہ میں داخل ہو سکیں ان کا ساحل پر تباہ ہو جانا بہت زیادہ قرین قیاس تھا۔ ایسے بندرگاہ جہاں اس موسم میں جہازوں کو امن میسر ہو سکے بجائے خود تعداد میں بہت تھوڑے تھے۔ پس مئی سے اوائل ستمبر تک بندرگاہ بالکل بند

باب ۲

رہتے تھے[1]۔ جب یہ موسمی ہوائیں کمزور پڑجاتی تھیں تو تجارت کا موسم شروع ہوتا تھا۔ اور مغرب کی طرف سے آنے والے جہاز ساحل کے قریب پہنچنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ساحل تک پہنچنے کے لئے جو وقت درکار ہوتا تھا۔ اس کا کوئی تعین ہی نہ تھا۔ موسم خزاں میں یہ ہوائیں جنوب مغرب سے بتدریج شمال کی طرف مڑجاتی ہیں اور ہر ایسے جہاز کے لئے جو زیادہ شمال کے بندرگاہوں تک پہنچنا چاہے ہے وقت بڑھتی ہی جاتی ہے اس لئے اگر وقت ضائع کیا گیا تو ممکن ہے کہ مطلوبہ بازار ناقابل رسائی ثابت ہو۔ شمالی ہوائیں روانگی کے لئے بدیہی طور پر موافق ہوتی تھیں لیکن یہاں بھی وقت کی کافی اہمیت تھی کیونکہ جنوب مغربی باد برشگال کے خلاف جہاز روانہ نہیں ہو سکتے تھے لہذا ان کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان سے اس قدر جلد نکل جائیں کہ دوسری باد برشگال کا آغاز ہونے سے قبل مشرق کی طرف جانا ہو تو سیلون اور مغرب کی طرف جانا ہو تو راس امید کے پار پہنچ سکیں۔ پس مغربی ساحل پر جہاں تک مغربی ممالک کی تجارت کا تعلق تھا کاروبار کا موسم ستمبر سے جنوری تک رہتا تھا۔ لیکن ملاکا کے ساتھ اپریل تک تجارتی جاری رہتی تھی۔ اسی طرح دوسرے سواحل کے بھی اپنے اپنے موسم موجود تھے۔ اور چونکہ مالک جہاز کو وقت روانگی اور وقت ورود دونوں کا لحاظ کرنا پڑتا تھا لہذا جو وقت کسی خاص سفر کے لئے مل سکتا تھا وہ بہت ہی محدود ہوتا تھا۔ اگر وہ روانہ ہونے میں دیر لگا دے تو اُسے یا تو پہنچنے کی توقع نہیں ہوسکتی تھی یا وہ کم از کم اس طور پر نہیں پہنچ سکتا تھا کہ بروقت واپس ہوسکے۔

(۲۲۹) تجارت کی رفتار کیونکر موسموں کے مطابق مقرر کی جاتی تھی اُس کی چند اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان جانے والے کیرک (پرتگالی جہاز) ایسٹر سے قبل ہی لزبن سے روانہ ہوجاتے تھے کیونکہ اگر دیر ہوجائے تو ممکن تھا کہ وہ راس امید کے اطراف ہوتے ہوئے آگے کو نہ جاسکیں اور انہیں دوسرے سال تک انتظار کرنے کے لئے یورپ

[1] بعض اوقات اُن کے بند رہنے کا موسم اس سے بھی زیادہ طویل ہوجاتا تھا کیونکہ باد برشگال کی وجہ سے بندرگاہ میں داخل ہونے کی جگہ پر ریت کے تودے لگ جاتے تھے۔ اور اس مزاحمت کے رفع ہونے تک کئی کئی ہفتے گذر جانا ممکن تھا چنانچہ پیرارڈ (ترجمہ ا۔ ۴۳۷) ذکر کرتا ہے کہ کوچن میں یہی حالت تھی لیکن اس کے اڈیٹر نے اُس بندرگاہ پر جو دقت پیش آتی تھی اس کی کچھ اور ہی توضیح بیان کی ہے۔

باب ۶

واپس ہونا پڑے۔ اگر وہ وقت پر راس امید کے اطراف سے گذر جاتے تھے۔ تو پھر افریقہ اور مداغاسکر کے درمیان جانب شمال روانہ ہوجاتے اور وہاں بادبرشگال کم ہونے تک انتظار کرکے اس کے آخری حصہ سے فائدہ اٹھا کر بحیرۂ عرب کے آر پار ہوتے ہوئے گووا پہنچ جاتے تھے۔ لیکن اس میں شمالی ہواؤں کے شروع ہوجانے کا اندیشہ لگا رہتا تھا جن کی وجہ سے یہ راستہ اختیار کرنا ناممکن ہوجاتا تھا اس لئے اگر انھیں راس امید کے اطراف گذرنے میں دیر لگ جاتی تھی جیسا کہ بعض اوقات ہوچکا ہے تو وہ گووا کا راستہ چھوڑ کر سیدھے کوچن کی طرف روانہ ہوجاتے تھے۔ اس طور پر وہ ستمبر یا اکتوبر میں ہندوستان پہنچتے تھے اور جس قدر جلد ہوسکے جہازوں پر مال لاد کر انھیں پھر واپس ہونا پڑتا تھا تاکہ دوسری بادبرشگال شروع ہونے سے قبل وہ راس امید پر سے گذر جائیں۔ کیونکہ اگر دیر ہوجائے تو انھیں مزمبیق میں پناہ لینی پڑتی تھی اور سال کا بہترین حصہ ضائع کردینا پڑتا تھا بلکہ اپنے جہاز کھو بیٹھنے کا بھی سخت اندیشہ لگا رہتا تھا۔ بحیرۂ احمر کی آمد و رفت کے لئے آبنائے باب المندب میں سے گذرنے کا بہترین وقت اپریل تھا۔ اس لئے ہندوستان سے جانے والے جہاز مارچ کے قریب روانہ ہوجاتے تھے۔ موچا یا جدے میں سے جس مقام پر بھی منڈی مقرر کی جائے وہاں مئی اور جون کاروبار کے مہینے ہوتے تھے۔ اور واپس ہونے والے جہاز بالعموم جزیرۂ سقوطرہ سے پرے پناہ لیتے تھے حتیٰ کہ بادبرشگال اتنی کمزور ہوجائے کہ وہ بلا کسی خوف کے ہندوستان کی طرف روانہ ہوسکیں جہاں انھیں ستمبر کے مہینے میں پہنچ جانے کی امید ہوتی تھی۔ خلیج بنگال کے بارے میں ماسٹر فریڈرک بیان کرتا ہے کہ کیونکر ایس تھومی (مدراس) سے کپڑے کی سالانہ برآمد پیگو کو ایک ہی جہاز میں جاتی تھی جو ۱۲ ستمبر کو روانہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات پورا پورا مال لادنے میں جہاز کو دیر ہوجاتی تھی '' اور اگر کہیں وہ بارہ تاریخ تک رک جائے اور پھر بھی بغیر سفر کئے واپس نہ ہوجائے تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔'' یہ ممکن تھا کہ جہاز کے پیگو پہنچنے سے قبل ہوا مشرق کی طرف بدل جائے اور چونکہ تین یا چار مہینے تک کسی اور تبدیلی کی توقع نہیں ہوسکتی اس لئے جہاز کو اسی طرح اپنا مال لادے ہوئے ایس تھومی واپس جانا پڑے۔ اسی طرح ہم ایسے جہازوں کا حال پڑھتے ہیں جو کہ '' بادبرشگال نہ ملنے '' کی وجہ سے مدتوں تک ملاکا یا مکاؤ یا دوسرے ایشیائی بندرگاہوں پر رکے رہتے تھے۔ غرض ان تمام سمندروں میں موسم کا اثر بہت زیادہ (۲۳۰)

باب ۶

غالب رہتا تھا اور جو جہاز ٹھیک موسم میں روانہ نہیں ہو سکتا تھا وہ دوسرا موسم آنے تک بندرگاہ میں پڑا سڑتا رہتا تھا۔

ان حالات میں یہ تحقیق کرنا کہ کسی خاص راستہ پر جہاز رانی کی مقدار کیا تھی ایک نسبتاً آسان کام ہے۔ کیونکہ اگر ہمارے اسناد سے ہمیں یہ معلوم ہو جیسا کہ اکثر معلوم ہوتا ہے کہ اُس راستہ پر موافق موسم میں سفر کرنے والے جہازوں کی کیا تعداد ہوتی تھی تو پھر ہم سال بھر کے لئے اس کی مجموعی تجارت کا اندازہ لگا سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ مستعملہ جہازوں میں مال اٹھانے کی کس قدر گنجایش ہوتی تھی۔ آجکل کی طرح سولھویں صدی میں بھی گنجایش کی اکائی جہازوں کا ٹن ہی تھی۔ لیکن درمیانی وقفے کے اندر اس اکائی کی مقدار میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے اور ان دونوں زمانوں پر جس بات کا عام طور پر اطلاق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہازوں کا ٹن وزن کی اکائی نہیں بلکہ گنجایش کی اکائی ہے۔ اور اس کا حساب مکعب فیٹ کے ذریعہ سے کیا جائے نہ بہ واسطہ اودیرڈوپوئیس (Avoirdupois) پونڈ کے۔ مختلف اوقات میں جہازوں کے جو جو ٹن قلمبند کئے گئے ہیں اُن کا باہمی مقابلہ ایک بہت ہی غیر یقینی چیز ہے۔ ہم نے اُس پر ضمیمہ ڈ میں بحث کی ہے۔ لیکن موجودہ مقصد کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ ہم اپنی توجہ صرف اس اکائی تک محدود رکھیں جو سولھویں صدی کے ختم پر عام طور پر مستعمل تھی۔ اور خلط ملط سے بچنے کے لئے ہم نے جہاں کہیں اس اکائی کا ذکر کیا ہے وہاں لفظ (Tun) استعمال کیا ہے اور اس لفظ کا جو جدید املا ہے یعنی (Ton) اس کو آجکل کی مستعملہ اکائی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ ہمارے زیر بحث دور کے یورپی مصنفین کے نزدیک ٹن (Tun) سے مراد تقریباً ۶۰ مکعب فیٹ کی وہ گنجائش ہوتی تھی جو کسی جہاز کے مال کے لئے حاصل ہو جائے۔ مثلاً جب کبھی انھوں نے لکھا کہ فلاں ہندوستانی جہاز کا وزن ۲۰۰ ٹن (Tun) تھا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کے اندازہ میں اس جہاز کے اندر ۱۲۰۰۰ مکعب فیٹ مال رکھنے کی گنجایش تھی۔ ظاہر ہے کہ اُن کے سارے بیانات محض اندازے ہیں۔ وہ جن جہازوں کی وسعت[ل]

ل ہندوستانی جہازوں کی درحقیقت پیمایش کئے جانے کا ہمیں صرف ایک واقعہ معلوم ہے جس میں دو حاجیوں کے جہاز رحیمی اور محمدی کی ۱۶۱۲ء میں کپتان سارس نے پیمایش کی تھی (پرچاس ۱ - ۴۰۱ - ۳۲۹)۔

بابۃ لکھتے تھے ان کی کچھ پیمایش نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ اکثر و بیشتر اُن کے کاروبار سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔ اور جو مکمل اعداد وہ بیان کرتے ہیں ہم انھیں معقول حدود کے اندر قابل اعتماد تصور کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی سمندروں میں جو تجارتی جہاز استعمال کئے جاتے تھے وہ چار عنوانوں کے تحت بیان کئے جا سکتے ہیں ایک کیرک (پرتگالی جہاز)۔ دوسرے حاجیوں کے جہاز۔ تیسرے معمولی ہندوستانی جہاز۔ چوتھے جنک یعنی چینی جہاز۔ لیکن ان کے علاوہ گیلی کے نمونہ کے جنگی جہازوں و نیز ساحلی کشتیوں کا جو کبھی کبھی ہندوستانی حدود کے (۲۲۱) باہر سفر کرتی تھیں شمار کرنا بھی ضروری ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بڑے کیرک یعنی پرتگالی جہاز ہوتے تھے۔ لنچوٹن تحریر کرتا ہے کہ جس بیڑے کے ساتھ اس نے لسبن سے سفر کیا اس میں ۱۴۰۰ سے ۱۶۰۰ ٹن (Tun) تک کے جہاز شامل تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پیرارڈ بیان کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں ۱۵۰۰ ٹن (Tun) سے لیکر ۲۰۰۰ ٹن (Tun) تک کے جہاز ہوتے تھے اور گو اس سے چھوٹی وسعت کے کیرکوں کا بھی ذکر آیا ہے تاہم یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کے راستے پر جانے والے جہازوں کی اوسط گنجائش تقریباً ۱۰۰۰ ٹن (Tun) اور چین و جاپان کی طرف جانے والوں کی گنجائش اس سے کسی قدر کم ہوتی تھی۔ ہندوستان اور بحیرۂ احمر کے درمیان ایک ہزار ٹن (Tun) کے حاجیوں کے جہاز پندرھویں صدی میں بھی چلا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے دور زیر بحث کے متعلق پیرارڈ نے لکھا ہے کہ بعض بعض جہاز۔ لیکن بہت کم۔ ایک ہزار سے بارہ سو ٹن (Tun) تک پہنچ جاتے تھے ۱۶۱۲ء میں جب سر ہنری مڈلٹن نے بحیرۂ احمر میں بعض ہندوستانی جہازوں سے تاوان وصول کیا تو انھوں نے رحیمی (۱۵۰۰ ٹن) حسنی (۶۰۰ ٹن) اور محمدی ان میں جہازوں کو جن میں سے ہر ایک کا تعلق سورت سے تھا چلنے کی ممانعت کر دی۔ آخر الذکر کی جسامت انھوں نے ۱۵۰ ٹن (Tun) بتائی ہے لیکن کپتان سارس کی پیمائش کے مطابق اُسے ۱۵۰۰ ٹن (Tun) کے قریب ہونا چاہئے۔ اور ہمارے خیال میں ۱۵۰ کا عدد محض ایک غلطی ہے۔ اُسی وقت دو اور جہازوں کا بھی داخلہ لیا گیا تھا۔ ایک بندرگاہ ڈیو کا جہاز سلامتی (۵۰۰ ٹن) دوسرے

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ جس چیز نے اس کو اُن کی طرف متوجہ کیا وہ بجا طور پر ان کی بڑی جسامت تھی۔

باب ۲

بندرگاہِ ڈابُل کا جہاز قدیری (۴۰۰ ٹن) پس حاجیوں کے جہازوں کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ چار سو ٹن (Tun) سے لیکر زیادہ سے زیادہ ایک ہزار یا پانسو ٹن (Tun) تک کے ہوتے تھے۔

پرتگالی کیرک اور حاجیوں کے بڑے بڑے جہاز بہ لحاظ اپنی جسامت کے اُن جہازوں سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے تھے جو اس زمانے میں یورپ کے اندر استعمال کئے جاتے تھے۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں لیوانٹ کمپنی جس بیڑے کی مالک تھی وہ تیس جہازوں پر مشتمل تھا جن کا اوسط ۱۷۵ ٹن (Tun) تھا۔ اسی طرح سنہ ۱۵۹۶ تا سنہ ۱۵۹۷ء میں انگلستان میں جو ستاون "بڑے"[1] جہاز تعمیر کئے گئے تھے اُن کا اوسط دو سو ٹن (Tun) سے کم تھا اور اُن میں سب سے بڑے جہاز کی گنجائش ۴۰۰ ٹن (Tun) سے کم تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں (کیونکہ آجکل کی اصطلاح میں انھیں اسی سے تعبیر کیا جائے گا) طویل اور دشوار سفر کرنے کے قابل ہوتی تھیں چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو پہلا بیڑہ روانہ کیا اس میں ۳۰۰ اور ۲۶۰ ٹن (Tun) کے جہاز شامل تھے اسی طرح پیرارڈ نے جس فرانسیسی مہم کے ساتھ سفر کیا اس میں ایک جہاز ۴۰۰ اور ایک ۲۰۰ ٹن (Tun) کا موجود تھا۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۶۰۱ء میں ڈیوڈ مڈلٹن ۱۱۵ ٹن (Tun) کے کانسنٹ نامی جہاز میں انگلستان سے روانہ ہوا اور جزائر ملوکا سے اُس پر مال لاد کر واپس ہوا۔ پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے معمولی تجارتی جہاز پہلی دو قسموں کے مقابلہ میں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں بہت زیادہ چھوٹے ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ دونوں جہاز مخصوص قسم کے ہوتے تھے اور ایک بالکل جداگانہ نوعیت کے کاروبار کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ حاجیوں کے جہازوں کو مستثنیٰ کر کے جملہ ہندوستانی جہازوں کی جسامت کا

---

[1] "بڑے" کا لفظ جو اس طرح استعمال کیا گیا ہے اس پر ذرا غور کر لینا ضروری ہے۔ ہم کثرت سے "بڑے" یا "کشادہ" یا "اونچے" جہازوں کا ذکر سنتے ہیں اور ان صنعتوں کی آجکل کے مفہوم کے مطابق تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ "بڑے" جہازوں کا اوسط ۲۰۰ ٹن (Tun) سے بھی کم ہو سکتا تھا۔ کم و بیش اسی جسامت کے جہازوں کو "بڑا" کہا گیا ہے اور ہمارے خیال میں ان صنعتوں سے ساخت کے اختلافات ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ گنجائش کے متعلق کسی قسم کے امتیازات قائم کرنا۔

حسابی اوسط جو اس زمانے میں پرچاس - لنچوٹن - پیرارڈ اور جورڈین کی تصانیف میں قلمبند کیا گیا ہے وہ ۱۸۰ اور ۱۹۰ ٹن (Tun) کے مابین واقع ہوتا ہے اور یہ بھی غالباً مبالغہ سے پوری طور پر خالی نہیں ہے[1]۔ اِن مستند مصنفین نے جو اعداد بیان کئے ہیں وہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے محض تخمینے لیکن تجربہ کار اشخاص کے تخمینے ہیں لہٰذا یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ معمولی تجارتی جہازوں کی اوسط جسامت تقریباً ۲۰۰ ٹن سمجھی جائے اِلّا ان صورتوں کے جہاں یہ ظاہر کر دیا گیا ہو کہ کسی خاص راستہ پر اس سے بڑے یا اس سے چھوٹے جہاز استعمال کئے جاتے تھے لفظ جنک سے درحقیقت خاص چینی ساخت کا جہاز مراد ہے جس کا آگا اور پچھا دونوں ایک ہی شکل کے ہوں[2]۔ جو دور ہمارے زیر غور ہے اِس میں جنک (چینی جہاز) بہت ہی

[1] ہر ایک جہاز جو دکھائی دیتا تھا اُس کی جسامت ان تصانیف میں نہیں دی گئی ہے تاہم ایک کافی تعداد کے متعلق جسامت کی تفصیلات دی ہوئی ہیں - ہمارے خیال میں یہ مصنفین بمقابلہ چھوٹے جہازوں کے بڑے بڑے جہازوں کی جسامت قلمبند کرنے کے غالباً زیادہ عادی تھے ۔ اس لئے اُن کے مشاہدات کا اوسط اُس وقت کے جملہ مستعملہ جہازوں کے حقیقی اوسط سے زیادہ ہوگا ۔ بڑے جہازوں کی گنجائش قلمبند کرنے کا رجحان حاجیوں کے جہازوں کے بارے میں تو بدیہی ہے ۔ چنانچہ ترّی جیسا شخص بھی ان کے متعلق کہتا ہے کہ وہ بہت زیادہ وزن کے ہوتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اُن میں سے بعض کم از کم چودہ یا سولہ سو ٹن (Tun) کے ہوں گے"

[2] ہابسن جابسن کے مصنفین جنک کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ وہ "ایک بڑا مشرقی اور خاص کر چینی جہاز" ہوتا ہے ۔ جس دور کی حالت ہم لکھ رہے ہیں اس کے بارے میں تقریباً بیس عبارتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ متن میں جو تعریف دی گئی ہے وہی زیادہ موزوں ہے ۔ وہ اس کیفیت پر مبنی ہے جو گرِیشیا ڈا اور ٹا نے بیان کی ہے (اور جس کا ہابسن جابسن میں حوالہ دیا گیا ہے) وہ ایسے معاملات میں بہت زیادہ محتاط تھا اور اغلب یہ ہے کہ اس نے وہی مفہوم بتایا ہے جس کو پرتگالی ملّاح بھی اس کے زمانے میں تسلیم کرتے تھے ۔ اوپر جتنی عبارتوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان سب میں جنک کہلانے والے جہاز ملاکا کے مشرق سے آتے تھے جن میں سے بعض چین سے اور بقیہ جاوا اور اس کے پڑوس کے جزائر سے آتے تھے لیکن یہ لفظ اس سے زیادہ وسیع معنی میں بھی جو کہ ہابسن میں بتائے گئے ہیں استعمال کیا گیا ہے چنانچہ کپتان سارِس پرچاس ۱-۳۴۸۰ و ما بعد) ہندوستانی جہازوں کو بار بار جنک کہتا ہے اور ٹرنڈی (۲-۳۰) اسی اصطلاح کا اُن جہازوں پر اطلاق کرتا ہے جن کا تعلق سورت سے تھا حاجیوں کے جہاز بھی شامل تھے۔

باب ۶

شاذ و نادر ہندوستان پہنچتے تھے لیکن ملاکا اور بنتام میں وہ پابندی کے ساتھ وارد ہوتے تھے۔ جورڈین کہتا ہے کہ چین کے جہاز ۳۰۰ ٹن (Tun) یا اس سے بھی زائد ہوتے تھے اُس کے علاوہ مختلف مصنفین نے جو پرچاس میں مذکور ہیں ۴۰۰ سے لیکر ۰ ٹن (Tun) تک مختلف جسامتوں کے جنک یعنی چینی جہازوں کا ذکر کیا ہے۔ پس اگر اوسط نکالا جائے تو ان کی اور ہندوستانی جہازوں کی گنجایش میں بہت زیادہ فرق نہیں معلوم ہوگا۔

گیلی اور اسی قسم کے دوسرے جنگی جہاز[1] اُس زمانے میں تجارتی اغراض کے لئے شاذ و نادر استعمال کئے جاتے تھے۔ اُن کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ڈنڈوں کے ذریعہ چلائے جا سکتے تھے چنانچہ اسی غرض کے لئے اُن میں مسلح سپاہیوں کے علاوہ غلام یا قیدی ملاح بھی ساتھ رکھے جاتے تھے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ہندوستانی سمندروں میں گیلیوں کے تنہا مالک ترک اور پرتگالی ہوتے تھے۔ اول الذکر بحیرۂ احمر کے بندرگاہوں میں اس قسم کے دو یا تین جہاز متعین رکھتے تھے لیکن اس سمندر کے باہر انھیں صرف لڑائی کی غرض سے استعمال کرتے تھے۔ البتہ پرتگالیوں کے پاس غالباً ایسے ایک درجن جہاز باقاعدہ طور پر مستقل رہتے تھے اور مغربی ساحل کے "بحری ڈاکوؤں" کے خلاف چھوٹے جہازوں کے بیڑوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی عام طور پر کام میں لائے جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ان میں سے ایک یا دو جہاز ملاکا یا کولمبو کو اشیائے خوراک لے جانے کے لئے بھی استعمال کئے جاتے تھے حتیٰ کہ جب کبھی کیرکوں کی تعداد کافی نہیں ہوتی تھی تو کالی مرچ سے لاد کر انھیں یورپ بھی روانہ کیا جاتا تھا۔ بہ لحاظ گنجایش کے وہ تقریباً ۸۰۰ ٹن (Tun) تک پہنچ جاتے تھے اور فلکاکو کے نزدیک ان کی اوسط جسامت ۵۵۰ ٹن (Tun) ہے۔

آخر میں ہمیں ساحلی کشتیوں پر غور کرنا باقی ہے جو کبھی کبھی تجارت خارجہ میں حصہ لیتیں اور آرمز، بحیرۂ احمر، پیگو اور چند دوسرے مقامات تک جاتی تھیں۔ اُن کی گنجایش کا شاذ و نادر ہی کہیں ذکر آتا ہے۔ لیکن اِن میں کی سب سے بڑی کشتی جس کا ہمیں حال معلوم ہوا ہے

---

[1] ہمارے نزدیک اس اصطلاح میں ہر وہ جہاز شامل ہے جو گیلی کہلاتا ہے وہ نیز کسی قدر بہتر نمونہ کے وہ جہاز جو گیلین (Galleons) اور (Galleasses) کہلاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گیلیوں کو جو گیلیاٹ (Galliot) کہلاتی ہیں ساحلی کشتیوں کے ساتھ شمار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

باب۸ ۶۰۰ ٹن (Tun) کی تھی اور غالباً ۳۰ یا ۴۰ ٹن (Tun) کا اوسط ان کے لئے موزوں ہوگا لیکن چونکہ بڑی بڑی کشتیاں غالباً دور دراز کے سفروں میں استعمال کی جاتی ہوں گی لہٰذا ہم اپنے موجودہ اغراض کے لئے اُن میں سے ہر ایک کا اوسط ۵۰ ٹن (Tun) فرض کر لیتے ہیں۔ اُن کے نام متعدد اور حیران کن ہیں کیونکہ وہ ہر ساحل پر مختلف ہوتے تھے۔ چنانچہ عربستان کے قریب (Jelbas)، خلیج فارس میں (Terradas) ساحل ملیبار پر (Proas) اور اسی طرح کے دوسرے نام ہمارے مطالعہ میں آتے ہیں۔ لیکن بہ لحاظ کاروبار کے وہ ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک ہی قسم کے کام انجام دیتی تھیں۔ اور جہاں تک ہم اندازہ کر سکتے ہیں ان میں سے کوئی کشتی ۶۰ ٹن (Tun) کی مذکورہ بالا حد سے متجاوز نہیں تھی۔

استعمالی جہازوں کی گنجایش کے متعلق اس قدر تفصیلی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ہم اُس تجارت کی مقدار کا تخمینہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں جو ہندوستان سے جانے والے مختلف راستوں پر جاری تھی۔ مغرب کی طرف سے شروع کرتے ہوئے یورپ کے ساتھ (۴۳) راست تجارت کی مقدار فوراً تحقیق کی جا سکتی ہے۔ ۱۵۹۰ء سے ۱۵۹۹ء تک ہندوستان سے یورپ کی طرف ۴۳ کیرک (پرتگالی جہاز) روانہ ہوئے اور ان کے علاوہ کوئی اور جہاز اس جانب نہیں گیا۔ لہٰذا اگر اوسط جسامت ۱۰۰۰ ٹن (Tun) رکھی جائے تو تقریباً ۶۰۰۰ ٹن (Tun) سالانہ گنجایش نکلتی ہے[1]۔

اِس کے بعد ہم افریقہ کے مشرقی ساحل کو لیتے ہیں اس بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ مزمبیق تو مملکت یا اُس کے نامزد کردہ اشخاص کے لئے محفوظ تھا۔ اور سوفالہ اور دوسرے بندرگاہ ہندوستان کے ساتھ اپنی اپنی تجارت اسی کے مرکز توسط سے کرتے تھے۔ مزمبیق کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ دو معمولی جہاز کافی ہو جاتے تھے۔ جہاں تک شمالی بندرگاہوں اور سقوطرہ کا تعلق ہے اُن کی تجارت کے تفصیلی حالات ہمیں نہیں ملے لیکن اگر وہاں کچھ تجارت تھی بھی تو وہ اِس سے چھوٹے پیمانہ پر تھی پس پورے ساحل کے لئے ایک ہزار ٹن

[1] تینتیس میں سے صرف سولہ لسبن پہنچے تھے۔ بقیہ میں سے اکثر یا تو تباہ ہو گئے یا سمندر پر گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن ایک جہاز بندرگاہ میں جلا دیا گیا اور دو کو بندرگاہ مزمبیق کے اندر بے کار کر دیا گیا تا کہ وہ چھوٹ کر بھاگ نہ سکیں۔

باب ۶

تخمینہ نہایت کافی ہوگا۔

بحیرۂ احمر کی تجارت کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ہی بندرگاہ میں مجتمع ہوگئی تھی چنانچہ جورڈین لکھتا ہے کہ جس سال وہ وہاں وارد ہوا تھا اس سال تقریباً پینتیس چھوٹے اور بڑے جہاز تمام مقامات سے موچا کو آئے تھے۔ اس کے برعکس عدن کو صرف دو یا تین چھوٹے جہاز آئے تھے۔ یہ سب جہاز ہندوستان سے نہیں آئے تھے بلکہ اس تعداد میں سویز، مسقط اور پڑوس کے سواحل و نیز پیگو۔ ملاکا اور سماٹرا سے آنے والے جہاز بھی شامل تھے۔ سر ہنیری مڈلٹن نے جن دو موسموں میں ان سمندروں پر سفر کیا اُن میں اس کے بیان کردہ جہازوں کے منجملہ ایک ثلث جہاز ہندوستان کے علاوہ دوسرے مقامات سے آئے تھے۔ سویز یا اس کے پڑوس کے سواحل سے آنے والے جہازوں سے اُسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پس اُس کے تجربہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مجموعی تعداد میں ہندوستان کا حصہ غالباً بیس جہازوں تک پہنچتا تھا۔ ڈونٹن ان جہازوں کے بارے میں جوکہ ۱۶۱۲ء میں راستہ میں روک لئے گئے تھے کچھ تفصیلی امور بیان کرتا ہے۔ ان میں کل ہندوستانی حاجیوں کے جہاز و نیز دوسرے مختلف جہاز شامل تھے۔ اول الذکر مجموعی طور پر ۴۰۰۰ ٹن (Tun) سے زیادہ تھے اور آخر الذکر میں سے ہر ایک تقریباً ۲۰۰ ٹن کا تھا۔ اس مواد کی بنا پر بحیرۂ احمر کی طرف جانے والے ہندوستانی جہازوں کی مجموعی گنجائش ۱۰۰۰۰ ٹن (Tun) سے کم کہی جاتی ہے وہ اس طور پر کہ حاجیوں کے جہازوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ۵۰۰۰ ٹن (Tun) رکھے جائیں اور معمولی تجارتی جہازوں کی بڑی تعداد کے لئے زیادہ سے زیادہ ۴۰۰۰ ٹن (Tun)

ساحل عرب اور آرمز کے ساتھ اس زمانے میں ہندوستانی تجارت کی مقدار کے متعلق ہمیں کوئی مواد دستیاب نہیں ہوا۔ ایران سے جو اشیا لائی جاتی تھیں ان میں سے اکثر و بیشتر جسیم نہیں بلکہ قیمتی ہوتی تھیں۔ اور مسکوک چاندی اور ریشمی کپڑوں کی مجموعی درآمد لے جانے کے لئے بہت تھوڑے ٹن (Tous) درکار ہوتے تھے۔ البتہ گھوڑوں کی تجارت کے لئے جگہ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی لیکن اس تجارت کی وسعت بمقابل سابق کے اس دور میں گھٹ گئی تھی اور اشیا کی فہرستوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارا امیلان اس نتیجہ کی طرف ہے کہ یہاں کی مجموعی گنجائش بہ حساب ٹن (Tun) کے بحیرۂ احمر والے جہازوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی پس اگر ہم ۱۰۰۰ ٹن (Tun) تسلیم کرلیں تو اس میں گھٹا کر بیان کرنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ اور ہم

(۲۲۵)

باب یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سیلون اور دوسرے جزائر والی تجارت اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے مدات کا شمار کرنے کے بعد ہندوستان کی مجموعی تجارت مغرب کے ملکوں کے ساتھ ۳۰۰۰۰ ٹن سے کم تھی اور غالباً ۲۵۰۰۰ ٹن (Tun) سے زائد نہیں تھی۔

ہندوستان کے دوسری جانب پیگو۔ ملاکا۔ جاوا اور سماٹرا کے ساتھ جو تجارت جاری تھی اس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ پیگو کی تجارت عارضی طور پر درہم برہم ہو گئی تھی۔ لیکن سیزر فریڈرک اور فیچ کے بیانات سے ہم معمولی حالات میں اس کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ پیگو میں ہر سال سینٹ تھومی اور "بنگالہ" (اس سے مراد ہمارے خیال میں سری پور ہے) سے ایک ایک "بڑے" جہاز کی توقع کی جاتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہی تجارتی سال کے اہم واقعات ہوتے تھے۔ لیکن بنگال کے بندرگاہوں اور ساحل کارومنڈل سے متعدد چھوٹے چھوٹے جہاز بھی آیا کرتے تھے کیونکہ اگر موسموں کا خیال رکھا جائے تو ساحلی کشتیوں کو سفر کرنے کا موقع حاصل تھا۔ پس ۵۰۰۰ ٹن (Tun) کی مقدار "بڑے اور چھوٹے" تمام جہازوں کے لئے جو پیگو کی بندرگاہوں اور ٹناسرم کو جایا کرتے تھے نہایت کافی ہوگی۔

ملاکا کے ساتھ جو ہندوستانی تجارت جاری تھی اس پر دو عنوانوں کے تحت غور کرنا چاہئے، ایک تو وہ سفر جو براہ راست ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئے جاتے تھے۔ دوسرے وہ جو آبنائے میں پہنچکر ختم ہو جاتے تھے براہ راست سفروں میں سب سے زیادہ اہم گوڈا یا کوچن سے چین اور جاپان تک کا سفر تھا۔ اس کو مملکت نے محفوظ کر رکھا تھا اور پیرارڈ کہتا ہے کہ "دو یا تین" جہاز ہر سال روانہ ہوتے تھے لیکن پرتگالی بیانات سے پتا چلتا ہے کہ کبھی کبھی صرف ایک کیرک استعمال کیا جاتا تھا اور یہ کہ بہرصورت وہ جہاز غیر معمولی جسامت کے ہوتے تھے۔ اس تجارت کا تخمینہ ہم زیادہ سے زیادہ تین ہزار ٹن (Tun) کے قریب کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرف ایک اور براہ راست سفر ہوا کرتا تھا اور وہ ملوکاس کا سفر تھا۔ اس غرض کے لئے کبھی کبھی کوئی گیلین (Galleon) بھی کام میں لایا جاتا تھا اور اس سفر کا تخمینہ ایک ہزار ٹن (Tun) کیا جا سکتا ہے۔ جو جہاز صرف ملاکا تک آتے جاتے تھے اُن کے متعلق ہمیں چاہئے کہ مغربی و مشرقی دونوں سواحل و نیز بنگال سے آنے والے جہازوں کا شمار کریں۔ گوا اور کوچن کے ساتھ جو تجارت (۲۳۶)

باب ۶

ہوتی تھی اس کی مقدار کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۵۹۶ء میں جب کسی ڈچ بیڑے کی موجودگی کی وجہ سے وطن جانے والے تجارتی جہازوں کو ایک ساتھ سفر کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو محافظ بیڑے میں چین سے آئے ہوئے دو جہاز۔ ملاکا میں بھرے ہوئے دو جہاز اور ان کے علاوہ دو جنک شامل تھے۔ چین والے جہازوں کو جن کا ہم پہلے ہی شمار کر چکے ہیں مستثنیٰ کرکے ان کا تخمینہ بمشکل ایک ہزار ٹن (Tun) تک پہنچتا ہے۔ بجز اس تجارت کے جو پرتگالیوں کے ہاتھوں میں تھی مغربی ساحل کی طرف اس زمانے میں بہت کم تجارت ہوتی تھی اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پرتگالی محافظتی بیڑہ کی قوت اس موقع پر معمول سے کم تھی تب بھی اس ساحل کی جانب مجموعی تجارت کی مقدار ۳۰۰۰ ٹن (Tun) سے زائد نہیں ہو سکتی تھی۔ مشرقی ساحل پر پیناٹ ہوئی کے لئے ایک جہاز تھا اور ہمارا خیال ہے کہ وہ غیر معمولی جسامت کا ہوتا تھا۔ نیگاپٹم اور مسولی پٹم کے لئے بھی غالباً جہاز موجود تھے لیکن ہمارے پاس اُن کے متعلق کوئی صریحی اطلاع نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ بنگال کے بندرگاہوں سے بھی ایک غیر محدود تعداد آتی جاتی تھی جن میں منجملہ اور اشیا کے چاول جیسی جسیم چیزیں بھی لی جاتی تھیں ٹھیک ٹھیک مواد کی عدم موجودگی میں ہم اس تجارت کی مجموعی مقدار کل دس ہزار ٹن (Tun) فرض کر سکتے ہیں۔ ہم نہیں خیال کرتے کہ وہ اس قدر بڑی ہوئی ہوگی لیکن ہم گھٹا کر بیان کرنے سے بالکل احتراز کرنا چاہتے ہیں۔ اِن اعداد کی بنا پر ہندوستان اور ملاکا اور اس کے آگے کے مقامات کے درمیان تجارت کی مجموعی مقدار سترہ ہزار ٹن (Tun) سے زیادہ نہیں ہوگی۔ حریف بندرگاہ اچین کے متعلق کہا گیا ہے کہ خاص مصروفیت کے موسم میں اِس بندرگاہ کے اندر سولہ یا اٹھارہ جہاز تک ٹھہرتے تھے جن میں سے کچھ تو پیگو اور سیام سے اور بقیہ گجرات۔ ملیبار۔ کالی کٹ اور بنگال سے آتے تھے۔ ہر مقام کی علیحدہ تعداد درج نہیں کی گئی ہے لیکن اکثر تعداد غالباً ہندوستانی جہازوں کی ہوتی تھی۔ لہٰذا ہم اس بندرگاہ کی مجموعی تجارت کا تخمینہ تقریباً تین ہزار ٹن (Tun) کر سکتے ہیں۔ بنتام کے بارے میں اسی طرح کی کوئی تحریر ہمیں نہیں ملی۔ لیکن جو ڈچ جو وہاں کچھ دنوں کے لئے ٹھہرا تھا لکھتا ہے کہ ہر سال ۲-۳-۴-۵ یا ۶ جنک چین سے آتے تھے اور جسامت میں ۳۰۰ ٹن (Tun) یا اس سے زیادہ ہوتے تھے۔ پس اس بنا پر ہم ہندوستان اور جاوا کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی اس کی انتہائی مقدار مقامی پیداوار

باب کو شامل کر کے لیکن دوسرے مقامات کو جانے والے چینی مال کو خارج کر کے دو ہزار ٹن (Tun) فرض کر سکتے ہیں ۔

اِس طور پر ہندوستان کی تجارت کی مجموعی مقدار اُن ممالک کے ساتھ جو شمال کی طرف واقع ہیں ۲۷۰۰۰ ٹن (Tun) تک پہنچتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ تخمینہ مبالغہ کی طرف مائل ہے لیکن بہر صورت مشرق اور مغرب کو ملا کر اور نیز اُس تجارت کا شمار کر کے جو دونوں جانب کے جزائر کے ساتھ جاری تھی ہندوستانی تجارت خارجہ کی مجموعی مقدار اُس زمانے کے ساٹھ ہزار (۲۲۷) ٹن (Tun) سے غالباً کم تھی جو نہایت ہی سرسری طور پر آجکل کے چوبیس ہزار سے چھتیس ہزار خالص ٹن (Tun) کے مساوی ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک تین سال کے عرصہ میں ہندوستان سے جو مال روانہ ہوا اس کا سالانہ خالص وزن ۶ $\frac{3}{4}$ ملین ٹن (Ton) سے زائد تھا[1] اور باوجود بہت سارے شبہات کے جو ہمارے پیش کردہ تفصیلی تخمینوں کے متعلق پیدا ہوتے ہیں اِن دونوں مجموعوں کا باہمی فرق اِس قدر کثیر ہے کہ ہم اُس کی بدولت کافی صحت کے ساتھ اُس تغیر کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اکبری دور کے بعد سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جہازرانی کی مقدار میں کم از کم دو سو گنا اضافہ ہوا ہے۔ عام رفتار تجارت کی جو حالت بیان کی جا چکی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک قدر یا مالیت کا تعلق ہے اِن دونوں زمانوں کا فرق مقابلۃً بہت ہی کم نمایاں ہونا چاہئے۔ کیونکہ ادنیٰ قیمت کی چیزیں اُس زمانے میں بہت شاذ و نادر روانہ کی جاتی تھیں۔ مزید برآں جس زمانے میں جہاز کپڑوں۔ مصالحوں اور خام ریشم سے لدا کرتے تھے ایک ٹن (Tun) کی اوسط قدر بمقابل آجکل کے جبکہ جہازوں کے اندر اِس قدر کثیر جگہ اجناسِ خوراک۔ روغندار تخم۔ اور خام پیداوار سے گھر جاتی ہے بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ لیکن اِس اوسط قدر کا ایک سرسری اندازہ کرنا بھی

---

[1] تختہ جات تجارت و جہازرانی، کے مطابق جو ہندوستان کے سررشتۂ اعداد و شمار کی جانب سے شائع کئے جاتے ہیں برطانوی ہند کے بندرگاہوں سے جہازوں پر جو مال روانہ ہوا اس کا اوسط سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیانی سالوں میں ۸۱۵۳۰۰۰ ٹن (Ton) تھا۔ برما کی بندرگاہوں سے جس قدر مال روانہ ہوا اسکو منہا کر کے اور فرانسیسی و پرتگالی ہندوستان کی برآمد کی بابتہ جس کے کوئی اعداد و شمار نہیں دستیاب نہیں ہو سکے تھوڑا سا اضافہ کر کے ہم نے وہ عدد حاصل کیا ہے جو کہ متن میں درج کیا گیا ہے۔

باب ۶

ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا جو واحد ذریعہ میسر ہے وہ ان قصوں پر مشتمل ہے جو کسی نہ کسی خاص جہاز کی تباہی کے لامحدود نقصانات کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں۔ اور اس قسم کے بیانات میں مبالغے کا اس قدر نمایاں اندیشہ ہے کہ انھیں یہاں دہرانا محض بے سود ہوگا۔ زمانۂ موجودہ کے حالات کے لحاظ سے ہم ہندوستان کی تجارت خارجہ کی یوں تشریح کر سکتے ہیں کہ وہ مقابلۃً گراں اشیا کی انتہا درجہ قلیل مقدار پر مشتمل تھی لیکن اُس کی قدر کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قبل و بعد منتقلی چیزوں کی قیمتوں میں امتیاز کیا جائے۔ نقل و حمل کے مصارف اور خطرات کی بابت برآمد والی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس کاروبار کا لُبّ لُباب ہی یہ تھا کہ صرف ایسی چیزوں کا لین دین کیا جائے جن کی قیمتوں کے فرق میں کافی گنجایش نکل آئے۔ یہ گنجایش اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ آجکل کوئی تاجر اس کی توقع نہیں کر سکتا۔ مَن کی کتاب ’تذکرۂ تجارت‘ (Discourse of Trades) میں اس بحث کے متعلق کچھ دلچسپ حالات بیان کئے (۲۳۸) گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے بتایا ہے کہ مصالحوں، نیل اور خام ریشم کے متعلق اہل یورپ کے سالانہ ضروریات ایسٹ انڈیز میں تقریباً ۵۱۱۰۰۰ پونڈ کے عوض حاصل کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اگر ان چیزوں کی وہی مقداریں الیپّو میں خریدی جاتیں تو اُن کی لاگت ۱۴۶۵۰۰۰ پونڈ ہو جاتی۔ بالفاظ دیگر انڈیز اور الیپّو کے درمیان اُن کی قدر تقریباً سہ گنی ہو جاتی آگے چلکر وہ چند اعداد اور پیش کرتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہندوستان میں ۱۰۰۰۰۰ پونڈ کے عوض خریدی جاتیں اور سمندر کی راہ سے انگلستان لائی جاتی تھیں وہاں پہنچکر اُن کی مالیت ۴۹۲۰۰۰ پونڈ سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ اس قسم کے اعداد سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ تجار کس طور پر اپنے منافعہ کا تخمینہ کرتے تھے چنانچہ ہم پڑھتے ہیں کہ بعض چیزیں ”چار بعوض ایک“ بلکہ اس سے بھی اعلیٰ نسبت کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں۔ اور یہ نتیجہ بالکل قرین عقل ہے کہ ہندوستانی سمندروں میں کامیاب کاروبار کے معنی ہی یہ تھے کہ جہاز پر مال لادتے وقت جو قیمتیں ادا کی جائیں اُن میں کم از کم دوگنا یا سہ گنا اضافہ کیا جا سکے بلکہ دور دراز مقامات کے سفروں میں شاید اس سے بھی بڑھکر قیمت وصول ہو سکے۔ لیکن ان کثیر منافعوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کاروبار میں اوسط شرح منافعہ بھی بلند ہوتی تھی۔ اگر کسی تاجر کا کاروبار کامیاب ہوتا تھا تو اسے

باب غالباً ایک کے عوض چار کی قیمت پانے کی توقع ہوتی تھی لیکن اِس معاوضے میں اُس کا صرفہ۔ سود اور نقصان کا خطرہ سب شامل ہوتے تھے۔ نقل وحمل کے لئے جو وقت درکار ہوتا تھا اس کی وجہ سے صرفہ اور سود کی مدیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ دشمنوں۔ قزاقوں اور موسم کی وجہ سے فی الواقع بے انتہا خطرات پیش آتے تھے اور طویل سفروں میں مشغول شدہ سرمایے کے اکثر حصے پر کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دس سال کے زمانے میں منجملہ تینتیس کیرکوں کے سولھا جہاز ہندوستان اور پرتگال کے درمیان ضائع ہوگئے تھے۔ پس جہاز اور بار جہاز دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے اشیائے برآمد کی گویا زائد از نصف مالیت غائب ہوگئی ہندوستان سے جاپان کے راستے پر اگر منجملہ تین کے دو جہاز اپنا سفر مکمل کر لیتے تھے تو مالکانِ جہاز کے اطمینان کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ وطن کی طرف واپس ہوتے ہوئے بھی اِسی قدر کثرت کے ساتھ نقصانات لاحق ہوتے تھے۔ پس اگر نو جہاز تین سال کی مہم پر روانہ ہوں تو چار کی واپسی کی توقع کی جاتی تھی۔ چھوٹے راستوں پر جہاں ہندوستانی جہاز آتے جاتے تھے خطرات کم ہوتے تھے لیکن پھر بھی اُن کی اچھی خاصی مقدار ہوتی تھی پیرارڈ نے جزائر مالدیو میں اپنے قیام کی جو کیفیت بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمندر گویا موت کا جال تھے۔ پرتگالی وقائع نگار متعدد واقعات قلمبند کرتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کیونکر ساحل کے "بحری قزاق" نہایت قیمتی اشیاء سے لدے ہوئے جہازوں کو گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ اور ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ہندوستانی جہاز بعض اوقات تباہ بھی ہوجاتے ہوں گے اگرچہ ایسے واقعات کبھی قلمبند ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ (۲۳۹)

سمندر کے خطرات سے قطع نظر ایک یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ مبادا اپنی منزل پر پہنچکر تجارتی مال غیر نفع بخش ثابت ہو۔ بازار انتہا درجہ تنگ تھے۔ صرف ایک جہاز کا پہنچ جانا قلت کو کثرت سے مبدل کرنے کے لئے کافی ہوجاتا تھا۔ اور اُس زمانے کی تجارتی مراسلت میں کاروبار کی غیر یقینی حالت کے کثرت سے حوالے ملتے ہیں مثلاً مسولی پٹم کا ایک تاجر شکایت کرتا ہے کہ جواہرات اس قدر گراں ہیں کہ ان میں روپیہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ "اراکان کا جہاز اِس سال وارد نہیں ہوا"۔ جب کبھی گاہک نمودار ہوتے تو مقامی بازار فوراً اُن کی طلب پوری کر دیتے تھے۔ اور ایک دوسرا

باب ۶

تاجر لکھتا ہے کہ "ہمارے جہازوں کے وارد ہونے پر تمام اشیا چالیس یا پچاس فیصدی چڑھ جاتی ہیں"۔ ایک اور تاجر شکایت کرتا ہے کہ مقامی بازار میں غیر متوقع مال آجانے سے کپڑے کا زائد از ضرورت ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ ایک اور یوں لکھتا ہے کہ اُن کے مال کی زیادہ طلب نہیں تھی حالانکہ اگر وہی مال کسی قدر پہلے آجاتا تو "سونا ہوتا"۔ غرض بہ حیثیت مجموعی جان گرنی کا یہ پرمغز قول معقول وجوہ پر مبنی تھا کہ "جہاں تک ان ملکی اشیا کا تعلق ہے۔ دوسروں کی لائی ہوئی مقداروں سے مال کی اس قدر کثرت ہوجاتی تھی کہ لبا اوقات تاجروں کو سخت مایوسی ہوتی تھی"۔

اِن حالات کے اندر ہندوستان کو تجارت خارجہ سے جو خالص نفع حاصل ہوتا تھا اس کا ایک سرسری تخمینہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیاب تجار دولتمند آدمی ہوتے تھے لیکن ہم صرف کامیابوں کا حال سنتے ہیں اور ناکاموں کا نہیں سنتے۔ مزید براں ہم اِس کا تو یقین کر سکتے ہیں کہ نفع حاصل ہوا لیکن جیسا کہ زیادہ تخمینی کاروبار میں اکثر واقع ہوتا ہے اوسط شرح منافعہ کا اعلیٰ ہونا مشتبہ رہتا ہے۔ منافعہ کا بہت بڑا حصہ پرتگالیوں کے ہاتھوں میں مجتمع ہوجاتا تھا۔ یورپ۔ چین۔ جاپان۔ ملاکا۔ آرمز اور مزمبیق کے ساتھ راست تجارت سے جس قدر فائدہ حاصل ہوتا تھا وہ سب اُنھی کو ملتا تھا۔ اور بقیہ تجارت کے جس قدر حصہ پر بھی ان کا بس چلتا اس پر وہ۔ یا تو اجازت ناموں کی فیس کی شکل میں یا بہ طور رشوت۔ نہایت گراں محاصل عائد کرتے تھے[1]۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا تھا وہی گویا ہندوستانی تاجروں کا سارا منافعہ تھا۔

---

[1] ہمارا خیال یہ ہے کہ عملدرآمد میں یہ محاصل کسی معینہ شرح کے مطابق نہیں لئے جاتے تھے بلکہ ان کا دار و مدار فریقین کی کوشش اور باہمی رضامندی پر ہوتا تھا۔ چنانچہ فنچ کا یہ بیان ہے (پرچاس ۱۔۴۲۲) کہ حاجیوں کے کسی خاص جہاز پر ابتداءً ایک لاکھ محمودی (تقریباً چالیس ہزار روپیہ) کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن بالآخر جو رقم طے ہوئی وہ تقریباً ایک ہزار ریال (تقریباً دو ہزار روپے) تھی۔ اور اس کے علاوہ چند تحائف اور تھے۔

باب۲

(۳۰۴)

ساتویں فصل

ساحلی اور اندرونی تجارت

جیساکہ کسی سابقہ باب میں واضح کیا جاچکا ہے سولھویں صدی میں ہندوستان کے اندر نقل وحمل کے حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ تاجروں کو بجائے خشکی کے تری کے راستے سے اپنا سامان روانہ کرنے کی ترغیب ہوتی تھی۔ اور مغربی ساحل پر تو ان حالات کا اثر خاص طور پر محسوس ہوتا تھا کیونکہ ملک کا وہ حصہ بہت دشوار گزار واقع ہوا ہے حتی کہ وہاں اب بھی کراچی سے بمبئی یا بمبئی سے منگلور تک براہ راست کوئی ریل کا راستہ موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دونوں جانب ساحلی تجارت کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ لیکن اس کی تنظیم میں یکسانیت نہیں تھی۔ مشرقی ساحل پر تو چھوٹی چھوٹی کشتیاں کم وبیش آزادی کے ساتھ سارے تجارتی موسم میں آیا جایا کرتی تھیں لیکن مغرب کی طرف ”بحری قزاقوں“ کا خطرہ اس قدر زبردست تھا کہ عملی طور پر ساری آمدورفت جنگی جہازوں کے زیر حفاظت عمل میں آتی تھی۔ ہر سال جب موسمی ہوائیں کمزور پڑ جاتی تھیں تو پرتگالی گووا کے شمال وجنوب میں دس دس بیس بیس مسلح کشتیوں (فری گیٹ) کے بیڑے جن کی تائید کے لئے دو ایک گیلیاں بھی ہمراہ رہتی تھیں روانہ کرتے تھے۔ یہ بیڑے سواحل کے قریب گشت کرتے۔ ”بحری قزاقوں“ پر انھی کے بندرگاہوں میں حملہ آور ہوتے اور وقتاً فوقتاً کوچن اور گووا یا گووا اور کیمبے کی بندرگاہوں کے درمیان تاجروں کی کشتیوں کا ساتھ دیتے اور ان کی حفاظت کرتے تھے۔ تاجر ہمیشہ اس قسم کی حفاظت کا مواقع حاصل کرنے کے منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کیمبے۔ گووا اور درمیانی بندرگاہوں کے مابین سارے موسم میں جس قدر تجارت ہوتی تھی وہ کلیتاً بڑے بڑے قافلوں کی شکل میں طے پاتی تھی جو ستمبر اور مئی کے درمیانی موسم میں دو یا تین مرتبہ سفر کیا کرتے تھے۔ ان قافلوں کا مدار کلیتاً ہواؤں پر نہیں تھا۔ کیونکہ اُن میں جو کشتیاں شامل ہوتی تھیں

باب ۶

وہ چلائی جاسکتی تھیں اور اُن کی روانگی کا وقت حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے معین کیا جاتا تھا جن میں گووا کے ضروریات کا غالباً سب سے زیادہ لحاظ کیا جاتا تھا کیمبے کے قافلے میں کشتیوں کی تعداد عام طور پر ۲۰۰ سے ۳۰۰ تک ہوتی تھی جن کی مجموعی گنجائش آٹھ ہزار سے دس ہزار ٹن (Tun) تک پہنچ جاتی تھی۔ اس طور پر ہر ایک جانب سالانہ تجارت کی مقدار بیس ہزار اور تیس ہزار ٹن (Tun) کے قریب ہوجاتی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ تجارت کی تعداد کافی بڑی تھی۔ اور اس کا جو عدد بیان کیا گیا ہے وہ بالکل قرینِ عقل معلوم ہوتا ہے کیونکہ گووا یا کوچن سے جو اشیاء برآمد کی جاتی تھیں ان کا ایک بڑا حصہ انھی قافلوں میں جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ جملہ پرتگالی آبادیوں کی ضروریات جن میں گیہوں اور دالیں۔ تیل اور شکر۔ فرنیچر او متفرق چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اِن سب کی نقل و حمل بھی انھی قافلوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اِن قافلوں کو بھی جو حفاظت میسر ہوتی تھی وہ کسی طرح مکمل نہیں تھی اور کبھی کبھی بھاری نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ چنانچہ ۱۶۱۶ء میں فنچ نے یہ سنا تھا کہ "بحری ڈاکوؤں" نے آرمز کا ایک جہاز اور تین کشتیاں۔ کوچن کی پچیس کشتیوں میں سے سولہ کشتیاں اور تیس کشتیاں جو ڈیو کو جارہی تھیں گرفتار کرلیں۔ پرتگالی تواریخ میں بھی اسی طرح کی تباہیوں کے کثرت سے حوالے ملتے ہیں۔

(۱۴۱)

کوچین اور گووا کے درمیان بھی قافلے کیمبے کے قافلوں ہی کے طرز پر آیا جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے اور ایک موسم کے دوران میں ان کی مجموعی مقدار تقریباً دس ہزار ٹن (Tun) تک پہنچتی تھی۔ اس ساحل کے تیسرے قافلے کی نوعیت کسی قدر مختلف تھی۔ ملاکا اور مشرق کی جانب سے جو جہاز آتے تھے وہ اور بنگال اور ساحل کارومنڈل سے آنے والی ساحلی کشتیاں یہ سب سیلون کے قریب کسی مقام پر ایک دوسرے سے ملجاتی تھیں اور یہ سارا بیڑا مسلح کشتیوں کی زیر حفاظت کوچن پہنچایا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مشرقی سمت سے اس طور پر جو جہاز رانی ہوتی تھی اس کی مقدار کے متعلق ہمیں کوئی مواد نہیں ملا۔ لیکن یہ یقین ہے کہ وہ مقدار بہت زیادہ تھی اور اس میں چاول کی تجارت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اور نہ ایسی کوئی تحریر ہماری نظر سے گزری جس سے مشرقی ساحل پر سے گزرنے والی تجارت کی مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوسکے۔ ایک پرتگالی مصنف کہتا ہے کہ اس صدی کے شروع شروع میں

باب ۶ اُس نے سات سو بادبان دیکھے جن پر نیگا پٹم میں چاول لادا جا رہا تھا[1]۔ اس سے شاید یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ وہاں غیر معمولی جد و جہد رہتی تھی لیکن جو کچھ نامکمل بیانات موجود ہیں اُن سے ہم اس نتیجے کی طرف مائل ہیں کہ معمولی تجارت کی مقدار اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی کہ مغربی ساحل پر۔ غرض بہ حالت موجودہ اس کی وسعت غیر یقینی ہی رہے گی۔

اندرونِ ملک جو تری کے راستے تھے اُن کے متعلق سابقہ بابوں میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ انڈس اور گنگا کے دریائی راستوں سے و نیز بنگال میں جو نہروں کا جال بچھا ہوا تھا اس سے پورا پورا کام لیا جاتا تھا۔ اور بلاشبہ شمالی ہند کے دریا وہاں کی خاص شاہراہ تھے۔ لیکن سال کے تمام موسموں میں وہ مساوی طور پر سہل نہیں تھے۔ طغیانی کی قوت اور ہوا کا رُخ اہم امور تھے۔ اور قیاس یہ ہے کہ ان پر آمد و رفت بہت بڑی حد تک موسمی ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے بھی موسموں کے بہت (۲۴۲) زیادہ زیر اثر تھے۔ بارش کے زمانے میں آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی تھی اور موسم گرما میں جبکہ چارہ اور پانی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا اس میں بہت تخفیف ہو جاتی تھی۔ چنانچہ سورت کا ایک انگریز تاجر یہ شکایت کرتا ہے کہ سال میں چار مہینے گرم ہوتے ہیں اور چار مہینے تر، جن میں سفر نہیں کیا جا سکتا اور جو اسی لئے تجارت کے لئے غیر موزوں ہیں۔" سورت سے آگرہ جانے کے دو مختلف راستوں پر بحث کرتے ہوئے ٹیورنیر نے موسموں کے اثر کی ایک نمایاں مثال بیان کی ہے۔ مغربی سڑک جو راجپوتانہ میں سے ہو کر گذرتی تھی وہ اُس وقت دونوں سڑکوں میں نسبتاً زیادہ خطرناک تھی اور اُس کا باعث وہ سلوک تھا جو اُن علاقوں کے سردار اور قبیلے مسافروں کے ساتھ اختیار کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی جن مسافروں کے پاس کافی وقت نہیں ہوتا تھا وہ اسی راستے کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ ریتیلے ملک میں واقع ہونے اور ندیوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے بارش کا موسم ختم ہوتے ہی وہ فوراً قابل گذر ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس مشرقی سڑک جو مالوہ میں

[1] اُن کا لداؤ ۲۰۰۰ (Moios) بیان کیا گیا ہے جو تقریباً پندرہ ہزار ٹن (Tun) کے مساوی ہوتا ہے۔ اس لئے کشتیاں چھوٹی ہوتی ہوں گی اور اوسطاً ۲۰ ٹن (Tun) سے کچھ ہی زیادہ وزن لے جاتی ہوں گی۔

باب ۷

سے ہو کر گئی تھی اور زیادہ محفوظ سمجھی جاتی تھی تقریباً دو مہینہ تک ناقابل گذر رہتی تھی کیونکہ ایک تو وہاں کی مٹی بہت بھاری ہوتی تھی اور دوسرے جن دریاؤں میں ابھی تک طغیانی جاری رہتی تھی ان کی وجہ سے بار بار رکاوٹ پیش آتی تھی۔ اس لئے ہر معمولی مسافر اسی بات کو ترجیح دیتا تھا کہ جب تک ملک خشک نہ ہو جائے سورت ہی میں ٹھہرا رہے اور پھر برہان پور اور گوالیار میں سے ہو کر اپنا سفر طے کرے۔ لیکن اگر کوئی تاجر یہ راستہ اختیار کرے تو وہ سورت کو بر وقت واپس نہیں پہنچ سکتا تھا اور جہازرانی کا موسم ختم ہونے سے پیشتر اپنا آگرہ سے لایا ہوا مال فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے جاتے وقت وہ مغربی راستہ اختیار کرتا اور اس کے خطرات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد صورتِ حال بالکل بدلجاتی تھی۔ اُس وقت راجپوتانہ میں چارہ یا پانی بہت کم دستیاب ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص وجوہ نہ ہوں تو شمال سے آنے والے مسافر قدرتاً مالوہ والی سڑک پسند کرتے تھے جہاں بہت کم مشکلات پیش آتی تھیں۔

موسموں کے اثرات و نیز ملک کے مختلف حصوں میں امن و امان کے مختلف حالات کا لحاظ کرنے کے بعد اندرونی تجارت آجکل کی طرح اُس زمانے میں بھی قیمتوں کے اختلافات کے زیر اثر رہتی تھی لیکن چونکہ مصارف اور خطرات بہت زیادہ تھے اس لئے جب تک قیمتوں میں بہت زیادہ فرق نہ ہو تجارت کے لئے ترغیب پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اِس زمانے میں تجارت کے امکانات کا اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ جب جنگ کی وجہ سے خلیج فارس تک رسائی بند ہو گئی تو ایران کے لئے مصالحے سولی پٹم سے سارا ہندوستان طے کرتے ہوئے قندھار پہنچائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتی اشیا تھوڑی تھوڑی مقداروں میں بہت دور دراز مقامات تک منتقل کی جا سکتی تھیں۔ جو کچھ رکاوٹیں موجود تھیں ان کا اثر زیادہ بدیہی طور پر اناج جیسی جسیم اشیا کی نقل و حمل میں محسوس ہوتا تھا جن کی تجارت چند قبائل کے ہاتھوں میں جو بنجارے کہلاتے تھے محصور ہو گئی تھی۔ اِن قبائل کی جدوجہد کے متعلق ہمیں کوئی عصری حالات نہیں ملے۔ لیکن بعد کے مصنفین مثلاً منڈی اور ٹیورنیر نے کچھ مفصل حالات تحریر کئے ہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہمارے زیر بحث دور پر بھی وہ اہم امور بیں قابل اطلاق ہیں تو پھر ہم اُس جسامت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں جو اُس زمانے میں منتقل

باب

کی جاسکتی تھی ۔ چنانچہ دس دس بلکہ بیس بیس ہزار بیل مال و اسباب سے لدے ہوئے روزانہ چھ چھ یا آٹھ میل کی مسافت طے کر سکتے تھے ۔ اور چونکہ ہر ایک جانور کم و بیش تین ہنڈرڈ ویٹ بوجھ لے جاسکتا تھا اس لئے مجموعی وزن کی مقدار ایک ہزار پانسو ٹن (Tun) اور اس سے زیادہ ہوتی ہوگی[1] ۔ بلاشبہہ یہ ایک بڑی مقدار ہے اور آجکل تین یا چار معمولی مال گاڑیاں جس قدر وزن لے جاسکتی ہیں اُس کے برابر ہے ۔ لیکن اس قسم کی نقل و حرکت بار بار نہیں ہوتی تھی ۔ کیونکہ نمایاں طور پر ایسے بڑے بڑے گلوں کے لئے چارہ اور پانی مہیا کرنا سال کے صرف چند مہینوں میں ممکن ہوسکتا تھا ۔ اور اگر ہم اُن کی رفتار کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پورے ایک موسم میں جس قدر مال و اسباب منتقل ہوتا تھا اس کے ہم وزن مال آجکل ریلوے کے ذریعہ سے مساوی فاصلہ پر ایک ہفتہ سے بھی کم مدت میں پہنچ جاتا ہے ۔ پس ہندوستان میں اندرونی نقل و حرکت کا ایک ایسا طریقہ نشو و نما پاچکا تھا جو اُس زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی بحری تجارت کی طرح ایک نمایاں کارنامہ سمجھا جاسکتا ہے لیکن جب زمانۂ حال کے نتائج سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ بالکل ہیچ نظر آتا ہے ۔ اس فرق کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم اندرونی تجارت کی اہم خصوصیات کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ شمالی ہندوستان کے بارے میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ یہ ہے کہ وہاں سے اشیائے خوراک ۔ روغندار تخم اور خام روئی کی آجکل جو زبردست برآمد ہوتی ہے اس کے مقابل اُس زمانے میں کوئی چیز نہ تھی ۔ جنوب کی طرف ملک کی آبادی قلیل منتشر اور معمولاً خود بر ور تھی اور سڑک کے مشکلات عام طور پر اس بات کے لئے کافی تھے کہ گجرات جیسے دور دراز علاقوں کی جانب اس قسم کے مال کی نقل و حرکت میں مانع ہوں ۔ راجپوتانے سے نمک کی منتقلی یہی دریائے گنگا کی خاص تجارت تھی ۔ اور دریائے انڈس والی اشیا میں پارچہ اور نیل سب سے زیادہ اہم تھے ۔ اس کے برعکس بنگال میں اجناس کی تجارت بہت اہم تھی ۔ اعلیٰ قسم کی اشیائے خوراک آگرہ کی جانب روانہ کی جاتی تھیں ۔ شکر " تمام ہندوستان " یعنی مغربی ساحل کو سمندر کی راہ سے حاصل ہوتی تھی اور چاول بھی اسی جانب و نیز سیلون بلکہ ملاکا تک روانہ کیا جاتا تھا ۔ ہندوستان کی دوسری جانب گجرات

---

[1] منوچی تین سو تا تین سو پچاس لیورے کہتا ہے اور منڈی چار بڑے من بیان کرتا ہے جو اُس زمانے میں تقریباً دو سو بیس پونڈ کے مساوی ہوتے تھے ۔ موجودہ زمانے میں معمولی بوجھ تقریباً چار حد یدمن یا تین سو تیس پونڈ کے برابر ہوتا ہے

خود پرور نہیں تھا۔ اُس کی کثیر شہری اور جہازوں کے کاروبار میں مشغول رہنے والی آبادی کے لئے خوراک بہم پہنچانا ضروری تھا چنانچہ وہاں اجناس خوراک کی درآمد زیادہ تر شمال اور مشرق سے۔ چاول کی دکن سے۔ گیہوں اور دوسرے اناج کی مالوہ اور راجپوتانہ سے کی جاتی تھی بلاشبہ وہ بھی آخر الذکر تجارت تھی جس نے ٹسر تھامس رُو کو جبکہ وہ دریائے تاپتی کی وادی سے ہو کر برہان پور کی جانب سفر کر رہا تھا اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وسط ہند کے کم آباد علاقوں میں باہر بھیجنے کے لئے کافی ماحصل زائد موجود رہتا تھا۔ آیا اور آگے کے جنوبی مقامات سے اسی قسم کی برآمد ہوتی تھی یا نہیں اس بارے میں ہمیں کوئی مواد نہیں مل سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مغربی گھاٹ کی بدولت نہایت سخت دشواریاں پیش آتی تھیں چنانچہ ڈیلاویل کا بیان ہے کہ وہاں جانوروں سے زیادہ انسانوں کے کاندھوں پر مال و سامان کی نقل و حرکت عمل میں آتی تھی۔ مزید براں ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہو چکا ہے کہ ساحلی شہروں کے لیے اشیائے خوراک سمندر کی راہ سے دور دراز مقامات سے لائی جاتی تھیں۔ مثلاً گیہوں خلیج کیمبے سے اور چاول بنگال اور ساحل کارومنڈل سے۔ جزیرہ نمائے ہند کی دوسری جانب چاول کی برآمد زیادہ اہم تھی۔ لیکن ہمیں اس بات کا کوئی پتہ نہیں ملا کہ وہ اندرون ملک کسی دور دراز فاصلہ سے آتا تھا۔ پس اگر بحیثیت مجموعی تمام ہندوستان پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خشکی کے راستہ سے زرعی پیداوار کی عام تقسیم کا اُس زمانے میں کوئی طریقہ رائج نہ تھا۔ گو خاص خاص مقامات میں اس طرح کی تجارت موجود تھی۔

ملک کی اندرونی تجارت کے سلسلہ میں ایک اور امر کی طرف توجہ کرنی ضرور ہے۔ سولھویں صدی کے ختم پر وہ اسباب وجود میں آنے شروع ہو گئے تھے جن کی بدولت آگے چلکر مختلف اجناس کی قیمتوں میں نمایاں اضافہ اور تجارت میں بڑی ترقی ہو گئی تھی ۱۶۱۰ء کے قریب پرتگالی تجارت کے تنزل پر بحث کرتے ہوئے پیرارڈ نے ڈچوں کی نئی مسابقت کو بہت اہمیت دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خریدنے اور بیچنے میں انتہا درجہ چالاک تھے اور بازار میں اُن کے داخلہ کی وجہ سے قیمتیں بہت چڑھ گئیں تھیں۔ چنانچہ اسی مصنف کے بیان کے مطابق "جو چیز پہلے پرتگالیوں کو ایک سول کے صرفے سے ملجاتی تھی اس کی اب انھیں چار یا پانچ سول قیمت دینی پڑتی ہے"۔ اس کے چند سال بعد سر تھامس رُو نے

باب (۲۴۵)

لکھا ہے کہ انگریز تاجروں کے نمودار ہونے سے بھی ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام اپنے آخری خط میں (مورخہ ۱۶۱۹ء) وہ تاکیداً بیان کرتا ہے کہ ہندوستان کو انگریزی تجارت کے خلاف کوئی وجہ شکایت نہیں تھی کیونکہ "جن جن اشیا کی ہم تجارت کرتے ہیں ان سب کی ہم نے قیمتیں بڑھادی ہیں" اور آگے چلکر وہ ڈچوں کے ساتھ مسلسل مسابقت کے خطرات بتاتا اور اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ دونوں قومیں مشرقی تجارت کو آپس میں تقسیم کرکے ان خطرات سے محفوظ رہیں۔ جیسا کہ سالہائے آئندہ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے اُس کے اندیشے حقیقی اسباب پر مبنی تھے چنانچہ جب غیر ملکی اشخاص جلد جلد ملک میں داخل ہونے اور اُس کی قسم قسم کی پیداواروں کے لئے روز افزوں مسابقت کرنے لگے تو ملک کے پیدا کرنے والوں کے حق میں درحقیقت ایک نہایت ہی قابل قدر صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی لیکن جو دور کہ ہمارے زیر غور ہے اُس میں ابھی یہ ترقی شکل ہی سے شروع ہوئی تھی۔ اور ملک کی اندرونی تجارت اُن اسباب کا نتیجہ تھی جن کا عملدرآمد ایک غیر معین زمانے سے جاری تھا۔ ہم اُس کی مقدار کا کوئی تخمینہ پیش نہیں کرسکتے۔ اگر موجودہ زمانہ کے معیاروں سے جانچا جائے تو وہ یقیناً بہت تھوڑی تھی۔ لیکن اگر عصری حالات کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ ایک اچھا خاصہ کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔

باب ۶

آٹھویں فصل

ہندوستانی تجارت کی تنظیم

جس کثیر المقدار تجارت کی کیفیت سابقہ فصلوں میں بیان کی گئی ہے اُس کو چلانے والے صرف معدودے چند ذاتوں یا نسلوں کے لوگ تھے جو اِس شعبہ میں تخصیص حاصل کر چکے تھے۔ اور ہمارے خیال میں یہ کہنا صحیح ہے کہ جو لوگ ان خاص برادریوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے وہ بمقابل آجکل کے اُس زمانے میں تجارت میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اُس زمانے کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں تین فرقے نظر آتے ہیں۔ ایک ساحلِ سمندر کے مسلمان۔ دوسرے گجرات کے بنیے۔ تیسرے ساحل کارومنڈل کے چیٹی۔ مشرقی سمندروں میں مسلمانوں کو جو خاص حیثیت حاصل تھی اس کا ہم پہلے ایک ہی خاکہ پیش کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے دونوں جانب تمام اہم مقامات میں وہ نظر آتے ہیں۔ کبھی بہ حیثیت جہاز رانوں کے کبھی بہ حیثیت بحری قزاقوں کے اور کبھی بہ حیثیت خشکی کے تاجروں کے اور پھر یہ پیشے کچھ ایکدوسرے سے بالکل علیحدہ بھی نہیں تھے۔ کیونکہ پیرارڈ کا بیان ہے کہ جس موسم میں جنوب مغربی باد برشگال کیوجہ سے بندرگاہ بند ہو جاتے تھے تو ساحل ملیبار کے بحری قزاق اپنا مال فروخت کرنے کے لئے ادھر اُدھر آتے جاتے اور اچھے خاصے تجار بن جاتے تھے۔ مسلمان ہندوستانی بندرگاہوں میں بادشاہی کے مدعی نہیں تھے لیکن ساتھ ہی انھیں عام طور پر ایک طرح کی امتیازی حیثیت حاصل تھی (۲۴۶) مقامی حکام کے ساتھ وہ دوستانہ تعلقات قائم رکھتے تھے اور بمقابل عام باشندوں کے انھیں زیادہ آزادی حاصل رہتی تھی۔ غیر ممالک سے تعلقات قائم رکھنے کی وجہ سے اُن میں معاملات کے اندر ایک طرح کی غیر معمولی وسعتِ نظر پیدا ہو گئی تھی اور افریقہ اور ملاکا کے درمیان کے سمندروں میں ہم اُن کی حالت کی توضیح کے لئے بجا طور پر اصطلاح کاسماپولٹن یا عالمی استعمال کر سکتے ہیں۔ برخلاف اِس گجرات کے بنیوں کی نوعیت زیادہ تر مقامی تھی اور وہ حکام وقت کے

باب بہت زیادہ تابع رہتے تھے۔ لیکن خشکی و نیز تری پر بھی سفر کرنے کی انھیں پوری آزادی حاصل تھی۔ چنانچہ وہ بنتام میں، بحیرۂ احمر کے بندرگاہوں اور دوسرے دور دراز مقامات میں بسے ہوئے تھے۔ تیسرا فرقہ جینیون کا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ لوگ ان ممالک تک نہیں پھیلے تھے جو ہندوستان کے مغرب میں واقع تھے لیکن آبنائے اور مجمع الجزائر میں وہ کافی معروف تھے۔ اور ہندوستانی ساحل پر اُن کی خصوصیات اس قدر مشہور ہوگئی تھیں کہ لفظ "جینٹی" ایک طرح کا حقارت آمیز نام بن گیا تھا جس کا اطلاق گووا میں اُن پرتگالیوں پر کیا جاتا تھا جو کھلے بندوں کوئی تجارتی پیشہ اختیار کرکے اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں کی نظروں میں ذلیل کرتے تھے۔

اس زمانے میں شمالی ہند کے تجارتی فرقوں کے متعلق ہمیں کوئی خاص اطلاع نہیں مل سکی۔ لہٰذا ہم بلا کسی اندیشے کے یہ فرض کرسکتے ہیں کہ جو فرقے ہمیں آجکل معلوم ہیں اس زمانے میں بھی وہی موجود تھے۔ ایرانی اور آرمنی ان میں اور شامل ہوگئے تھے۔ اور قندھار میں سے ہوکر جانب مغرب خشکی کی تجارت اِن کا خاص کاروبار تھا۔ یہ لوگ ہندوستان میں بہ حیثیت مسافروں کے نظر آتے اور کسی ایک شہر میں زیادہ عرصہ تک جم کر نہیں رہتے تھے بلکہ جب تک اپنا مال فروخت نہ کردیں اور واپسی کے لئے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل نہ کرلیں وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ کوچن اور جنوب کے دوسرے مقامات میں یہودی بسے ہوئے تھے۔ لیکن اندرونِ ملک بھی وہ سڑکوں پر دکھائی دیتے تھے۔ یورپی باشندے کبھی کبھی خانگی کاروبار میں مصروف نظر آتے تھے[1]۔ پس ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساحل کی طرح اندرونِ ملک بھی تجارت نمایاں طور پر عالمی نوعیت کی تھی۔ (۲۴۴) البتہ بعض بعض باتوں میں غیر ملکی تاجروں کو باشندگانِ ملک کے مقابلہ میں خاص خاص فوائد حاصل تھے۔ مکان اور اس سے بڑھکر خاندان مقامی عہدہ داروں کے ہاتھوں میں گویا کفالت کا کام دیتے تھے۔ وقتاً فوقتاً ارزاں قرضے دیکر یا لاگت سے کم

[1] مثلاً فنچ لکھتا ہے کہ جب وہ آگرہ پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ کپتان تھامس بوائنر مع تین فرانسیسی سپاہیوں کے ایک ڈچ انجنیر۔ اور ایک وینس کا تاجر مع اپنے لڑکے اور ایک ملازم کے نصرانیوں کی ولایت سے نکلکر حال میں آئے تھے"۔ (پرچاس۔ ا۔ ۴۔ ۴۲۷)

قیمت پر مال بیچ بیچ کر ان ان عہدہ داروں کو راضی رکھنا ضروری تھا۔ اگر بدقسمتی سے وہ کبھی ناراض ہو جاتے تھے تو ان کی خفگی کا اظہار انھی قدیم طریقوں سے ہوتا تھا جنکی یاد اب تک بھی باقی ہے۔ برخلاف اس کے ایک اجنبی تاجر کو بجز اس مالِ تجارت کے جو اس وقت اس کے قبضہ میں ہوتا تھا کوئی اور خطرہ در پیش نہیں ہوتا تھا۔ بعض صورتوں میں وہ اپنے ملک کے وقار کیوجہ سے محفوظ رہتا تھا۔ اور جس دور کا حال ہم لکھ رہے ہیں اس زمانے میں تو غیر ممالک کی عجیب وغریب اشیا کی طلب اس قدر زیادہ تھی کہ عہدہ داران انتظامی ان اشخاص پر خصوصیت کے ساتھ مہربان رہتے تھے جو ان چیزوں کی رسد بہم پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ سر تھامس رُو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ نصیحت کی تھی کہ "تم اُن حقوق ومراعات کا یقین رکھو جو کسی اور غیر ملکی کو حاصل ہوتے ہیں درانحالیکہ رعایا میں سے کسی کو یہ ہمت نہیں پڑتی کہ اپنے حقوق جتلا سکے"۔ ہندوستان کے اکثر وبیشتر حصہ میں جو صورتِ حال موجود تھی ہمارے خیال میں اس کا یہ بالکل صحیح خلاصہ ہے۔

یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر تجارتی قوانین کا ایسا کوئی مقررہ مجموعہ نہیں تھا جو رعایائے ملک اور غیر ملکی اشخاص دونوں پر یکساں قابل اطلاق ہو۔ اول الذکر ملکی قانون کے تابع رہتے تھے لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اُس کا انحصار زیادہ تر قانون کا اطلاق کرنے والے عہدہ دار کی شخصیت پر ہوتا تھا۔ اس کے برعکس غیر ملکی تاجروں کے ساتھ سلوک کرنے میں جس مملکت سے ان کا تعلق ہوتا تھا اس کی بین الاقوامی حیثیت کا مناسب لحاظ کیا جاتا تھا۔ اور یہ لوگ بالعموم اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ کم وبیش باضابطہ صلحنامے یا معاہدے حاصل کر لیں جن میں بصراحت کر دی جائے کہ وہ کن شرائط پر تجارت کر سکتے ہیں اور کن خاص شرحوں کے مطابق انھیں کروڑگیری ادا کرنی پڑے گی۔ چنانچہ پرتگالی۔ ڈچ اور انگریزی آبادیوں کی ابتدائی تاریخ میں اس قسم کے صلحناموں کی گفت وشنید کے واقعات بکثرت نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ طریقہ تجار یورپ نے ایجاد کیا تھا۔ کیونکہ اسی سے ایک صدی قبل کالی کٹ اور دوسرے مقامات میں مسلمانوں کو جو خاص حیثیت اور حقوق حاصل تھے وہ بھی اسی قسم کے کوکسی قدر کم باضابطہ عہد وپیمان کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں جو ایک طرف حکام اور دوسری طرف تاجروں کی جماعت کے مابین طے پاتے تھے۔ اور ایشیائی سمندروں میں جو حالات رائج تھے

باب ۷

اُن سے بھی یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اِس قسم کے معاہدات بالکل عام طور پر رائج تھے۔

(۲۸۸) چند تجارتی فرقوں کے اراکین کا ایک بڑے رقبہ پر تقسیم ہو جانا کاروباری تنظیم کی ترقی کے حق میں بدیہی طور پر موافق تھا۔ اور یہ نتیجہ کاروبار مبادلہ میں خاص طور پر نمایاں معلوم ہوتا ہے چنانچہ ابتدائی انگریز تاجر سورت میں وارد ہونے کے بعد بہت جلد اُن سہولتوں سے فائدہ اٹھانے لگے جو ہنڈیوں کے ذریعہ خواہ مقامی طور پر جیسے کہ سورت اور بروچ کے درمیان یا دور دراز فاصلوں پر جیسے کہ سورت اور آگرہ کے درمیان روپیہ روانہ کرنے کے لیے موجود تھیں۔ لیکن یہ طریقہ صرف ہندوستان کے حدود کے اندر محدود نہیں تھا۔ چنانچہ جب تاجروں کی کوئی جماعت ایران روانہ کی جاتی تھی تو اسے یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ آگرہ میں یا تو لاہور کے نام ہنڈیاں حاصل کرے یا اصفہان کے نام۔ اور انھیں ایک اعتباری چٹھی دی جاتی تھی جس کی بنا پر وہ ایران میں رہکر اپنی سہولت کے مطابق انگلستان یا آگرہ کے نام ہنڈیاں لکھ سکتے تھے۔ اِس طریق کے واقعی عملدرآمد کی کوئی عصری کیفیت تو ہمیں نہیں ملی لیکن ہمارے خیال میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اُس کی اہم خصوصیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ ٹیورنیر نے نصف صدی بعد بیان کی ہے۔ اِس بیان کے مطابق جو تاجر سورت کے لیے مال خریدنے کی غرض سے روپیہ کا خواہاں ہوتا تھا وہ اندرون ملک آگرہ تک کسی مقام سے بھی سورت کے نام دو ماہی ہنڈی لکھکر روپیہ حاصل کر سکتا تھا۔ آگرے کے مشرق میں ڈھاکہ۔ پٹنہ یا بنارس جیسے مقامات میں وہ آگرے کے نام ہنڈی لکھیگا جہاں اس کا مبادلہ سورت کے نام کی ہنڈی سے کر لیا جائے گا۔ مصارف جیسا کہ ٹیورنیر کہتا ہے کافی بلند تھے۔ احمد آباد میں ایک یا ڈیڑھ فی صدی سے لیکر وہ بنارس میں ۶ فیصدی اور ڈھاکہ میں ۱۰ فیصدی تک پہنچ جاتے تھے[۱]۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ خطرہ بہت بڑا

[۱] ظاہر ہے کہ اِن شرحوں سے وہ مصارف مراد ہیں جو فی الحقیقت وقت کے وقت لاحق ہوتے تھے۔ اُن سے وہ سالانہ شرحیں مراد نہیں ہیں جو آجکل بنک والے لکھا کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ سالانہ شرحیں ہوتیں تو ٹیورنیر بہ حیثیت ایک وسیع کاروباری تجربہ والے آدمی کے اُن کو حیرت انگیز نہ سمجھتا چند سال پیشتر ہنڈی (۲-۲۹۰) نے جہانگیر اور احمد آباد کے درمیان شرح مروجہ ۸ سے ۱۰ فیصدی تک پائی۔

باب ۷

رہتا تھا۔ کیونکہ اگر مال اثنائے نقل وحمل میں چوری ہوجائے تو ہنڈی قبول نہیں کی جاتی تھی۔ لہٰذا ان مصارف میں خطرات نقل وحمل و نیز مروجہ شرح سود شامل رہتی تھی۔
ٹیورنیر یہ بھی کہتا ہے کہ جب مقامی سردار تجارت میں مداخلت کرتے اور محاصل راہداری کے خاطر تاجروں کو خاص خاص راستے اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے تو شرح میں ایک یا دو فیصدی اضافہ ہوجاتا تھا۔ اور یہ ایذا رسانی آگرہ اور احمد آباد کے درمیان کی سڑک پر بہت زیادہ عام تھی۔ وہ یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ آیعز ہوچا۔ بنام۔ حتیٰ کہ جزائر فلپائن کو جو ہنڈیں روانہ کی جاتی تھیں اُن پر بھی اسی طرح سے سورت میں پیشگی رقم حاصل کی جاسکتی تھی۔ البتہ ان صورتوں میں جو شرحیں عائد کی جاتی تھیں وہ نسبتاً بہت اعلیٰ ہوتی تھیں۔ (آرمز کے لیے ۱۵ سے ۲۲ فیصدی تک اور زیادہ فاصلہ کے بندرگاہوں کے لیے اور بھی زیادہ) لیکن پھر ان میں بھی جہازوں کی تباہی اور بحری ڈاکوؤں کے مطالبات بیمہ شامل تھے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ خطرات معمولاً بہت زیادہ تھے۔ (۲۴۹)

اعتبار کا یہ طریقہ ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا اور سیاسی حدود سے بالکل آزاد تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طریقے کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُس زمانے میں تجارتی اخلاق کی سطح کافی بلند تھی۔ اور اس خیال کی تائید میں بعض معاصرین کی شہادت کا حوالہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسری جانب ایسے اقتباسات پیش کرنا بھی ممکن ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی تاجر ضمیر یا دیانت جیسی باتوں کا بہت کم لحاظ کرتے تھے۔ لیکن ہمارے خیال میں ایسی شہادتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا بے کسود ہوگا کیونکہ اُن کی صحیح تعبیر بدیہی ہے۔ مساوی تجربہ والی دوسری تمام قوموں کے تاجروں کی طرح ہندوستانی تاجروں میں بھی دیانت داری کا ایک خاص معیار رسمی طور پر قائم ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنے نزدیک چند خاص حدود تسلیم کرلیے تھے جن کے اندر اُن کی ساری جد وجہد محدود رہتی تھی۔ اور ان حدود کے اندر غیر ملکی اشخاص و نیز اُن کے ہم قوم افراد اُن پر اعتماد کرسکتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں کے بھی خاص رسوم اور قاعدے موجود تھے لیکن وہ ہندوستان کے قاعدوں سے مختلف تھے۔ بعض اوقات تو انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ہندوستانی تاجر خاص خاص موقعوں پر فائدہ اٹھانے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خود ان کے نزدیک ایسی صورتوں میں استفادہ کرنا حق بجانب سمجھا جاتا تھا۔

باب ۶

لیکن بعض اوقات انھیں یہ بھی تجربہ ہوتا تھا کہ جو کام اُن کے نزدیک غیر پسندیدہ خیال کیے جاتے تھے ہندوستانی تاجر اُن سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ تجارتی معاملات میں ہندوستانیوں کی رواجی دیانت نہ کبھی مکمل تھی اور نہ اب ہے۔ اس کی خوبی صرف اس بات میں تھی کہ اس کی بدولت ایک ایسا طریق وجود میں آگیا تھا جس کے تحت تجارت جاری رہ سکتی تھی اور اسی قسم کے دوسرے طریقوں کی طرح وہ ہر ایسے شخص کے حق میں جو "اس بازی کے قاعدوں" سے واقف ہو کافی انصافانہ تھا۔ البتہ جو ناواقف اشخاص اُس میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے انھیں عام طور پر اپنے تجربہ کا کسی قدر گراں معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض اشخاص نے آئندہ نسلوں کے فائدہ کی خاطر اپنے خیالات اور تجربات قلمبند کیے ہیں۔ یہ خیالات اس لیے قابل قدر ہیں کہ اُن سے ہندوستان کے کاروباری اشخاص کی خاصیت اور قابلیت کی تصدیق ہوتی ہے۔ آجکل کی طرح سولھویں صدی میں بھی وہ اعلیٰ ترین طبقے کے تاجروں کا رتبہ رکھتے تھے۔ یورپی سیاحوں نے بعض اوقات انھیں یہودیوں سے بھی برتر بیان کیا ہے اور یہودیوں کو اُس دور کے بازاروں میں جو حیثیت حاصل تھی اُس سے جو شخص بھی واقف ہو اس کے لیے یہ شہادت بالکل قطعی ہے۔ اس بارے میں ٹیورنیر نے جو تعریف بیان کی ہے اس کا یہاں حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو۔ کیونکہ اس کے وسیع تجربہ کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اس بارے میں اظہار رائے کے لیے موزوں ترین شخص تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "ترکی سلطنت میں جو یہودی زر کے کاروبار انجام دیتے ہیں وہ بالعموم غیر معمولی طور پر قابل سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بمشکل ہندوستان کے صرافوں کی شاگردی کے لائق ہیں"۔

(۲۰۰

اسناد برائے باب (۶)

فصل ۱۔ سولھویں صدی کے آغاز میں مسلمان تاجروں کی حیثیت کا اندازہ بار بوسا، ورتھما اور ڈکاڈاس کے ابتدائی حصوں کے مطالعہ سے بہترین طریقہ پر کیا جا سکتا ہے۔ وھائٹ وے نے پرتگالی قوت کے نشو و نما کا ایک مفید خلاصہ پیش کیا ہے۔ پرتگالیوں کے طرز عمل کی وجہ سے تجارت کے راستوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کے متعلق ملاحظہ ہو بار بوسا (۳۵۲ و ۳۵۸) اور پیرارد (ترجمہ ۱-۲۰۹) ملیبار کے بحری قزاقوں کی بہترین کیفیت پیرارڈ میں ملیگی (ترجمہ ۱-۴۳۸ تا ۴۴۷)۔ اُس زمانے کے تمام مصنفین نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن پیرارڈ کو ان کا مشاہدہ کرنے کے لئے خاص مواقع حاصل تھے۔ یہ بیان کہ پرتگالی رعایا ایک قزاق سے اجازت نامے حاصل کرتی تھی ہے صفحہ ۱۳۸ میں درج ہے۔ وہ ایک پرتگالی ذریعہ سے ماخوذ ہے۔ اور اسی لئے غالباً صحیح بھی ہے۔ کیونکہ یہ بات قومی وقار کے لئے تہتک آمیز تھی۔ اکبر کے جہازوں کو اجازت نامے عطا کرنے کا ذکر ڈکاڈاس میں موجود ہے (مثلاً ملاحظہ ہو ۱۰-۱-۱۴۴) اور مسلمان وقائع نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو ایلیٹ کی تاریخ ۵-۴۰۳) وجیانگر کے ساتھ پرتگالیوں کے صلحنامہ کے شرائط سیویل ۱۸۶ میں مذکور ہیں۔ ایک طرف پرتگالیوں اور دوسری طرف بحری قزاقوں کے ساتھ زاموری کے تعلقات کی کیفیت آخری ڈکاڈاس میں کثرت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

فصل ۲۔ لاہاری بندر کی کیفیت پرچاس (۱-۴-۴۸۹) میں ملتی ہے۔ اُس بندرگاہ کے جہازوں کے بارے میں ہمیں صرف دو بیانات مل سکے جو پرچاس میں درج ہیں ایک ۱-۳-۲۷۳ میں ("سندھ کا ایک چھوٹا جہاز")۔ دوسرے ۱-۳-۳۰۷ میں ("ایک چھوٹا جہاز")۔ کیمبے کے بندرگاہوں کی کیفیت اُس زمانے کے تقریباً تمام مصنفین نے بیان کی ہے۔ قافلہ کے بارے میں ملاحظہ ہو خاص کر پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۴۵)۔ اور بحری

باب ۶ قزاقوں کی وجہ سے جو نقصانات لاحق ہوتے تھے ان کے متعلق ملاحظہ ہو فنچ (مندرجۂ پرچاس ۱-۴-۲۱) چول کے متعلق لنچوٹن (سی - ۱۰) اور پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۵۹) ڈابل کے متعلق جورڈین (۱۹۸)۔

گووا کی تجارتی چہل پہل کی غالباً سب سے زیادہ واضح کیفیت وہ ہے جو پیرارڈ نے اپنی دوسری جلد میں بیان کی ہے۔ لیکن جو شخص اس کے وینیز کوچن کے بارے میں مکمل حالات معلوم کرنا چاہے اُسے آخری ڈکاڈا اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جاپان کی جانب بحری سفر کے متعلق ملاحظہ ہو پیرارڈ (ترجمہ ۲-۵، ۱۰ و مابعد)۔ بحیرۂ احمر میں جو حالات رائج تھے اُن کی بہترین کیفیت، جورڈین نے بیان کی ہے (۴، و مابعد)۔ آرمز اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے حالات آخری ڈکاڈا اس سے جمع کرنے چاہئیں۔ مزمبیق اور آفر دونوں سے ایک ہی مقام مراد ہونے کی ایک مثال (گو تنہا نہیں) پرچاس میں ملیگی (۲-۷-۱۰۲۲) ملٹن اپنی کتاب (Paradise Lost) میں لکھتا ہے "وہ سوفالہ جس کو آفر خیال کیا جاتا ہے"۔

سیلون کے بارے میں ملاحظہ ہو پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۴۰)۔ اس جزیرہ میں لڑائی کے طویل حالات دسویں اور بارھویں ڈکاڈا اس میں درج ہیں۔ کارومنڈل اور پیگو کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی اس کے متعلق ملاحظہ ہو پرچاس (۲-۱۰-۱۷۱۸ و ۱۷۲۳ و ۱۷۳۹) (۱ء۲) بنگال کے بندرگاہوں کے حوالے ضمیمہ ج میں دئے گئے ہیں۔ پرتگالی باشندوں کی حیثیت عیسائی مبلغین کے تذکروں سے (جو کہ صفحہ ۲۸ و مابعد میں مذکور ہیں) معلوم کی جاسکتی ہے۔

فصل ۳۔ پیگو کی تجارت اور اس کے بندرگاہوں کے جو حالات سیزرفریڈرک، بالبی اور فنچ نے بیان کیے ہیں وہ پرچاس میں ملیں گے۔ (۲-۱۰-۱۷۱۶ و مابعد۔ ۱۷۲۵ و مابعد، ۱۷۳۰ و مابعد) و نیز ملاحظہ ہو ہابسن جابسن زیر عنوان "کوسمین"۔ "سیریام"۔ اور "مرتبان"۔ ٹناسرم کے بارے میں ملاحظہ ہو باربوسا (۳۶۹) پرچاس (۲-۱۰-۱۷۲۱ و ۱۷۴۱) اور ہابسن جابسن زیر عنوان "ٹیوائے"۔ ٹناسرم"۔ اور "نیپا"۔ ملاکا کی قدیم و مستند کیفیت وہ ہے جو باربوسا نے بیان کی ہے (۳۷۰ و مابعد)۔ چینی جہاز رانی کی تخفیف کا حال یول میں مذکور ہے (کیتھے ۱-۸۳ و مابعد)۔ بنٹام کے متعلق بہ حیثیت اُس کے ایک حریف تجارتی مرکز ہونے کے ملاحظہ ہو جورڈین (۳۰۸) اور ایچین کے متعلق پرچاس (۱-۳-۱۲۴ و ۱۵۰)

جنوبی افریقہ کے مروجہ حالات کا مختلف سیاحوں نے ذکر کیا ہے۔ مثلاً پرچاس

(۱-۳-۱۴۹)۔ شمال کی طرف اور آگے تجارت کی جو نوعیت تھی وہ بار بوسا (۲۳۳ و مابعد) اڈ پیر ارڈ (ترجمہ ۲-۲۴۲ و مابعد) میں بیان کی گئی ہے وینیز ڈ کا ڈا اس میں کبھی کبھی اُس کے حوالے نظر آتے ہیں۔ بحیرۂ احمر کے بارے میں ملاحظہ ہو جور ڈین (۔۔۔۳-۱۰۳-۳۵۳) اور ہنری مڈلٹن اور ڈ ونٹن کے تذکرے مندرجہ پرچاس (۱-۳) آرمز کے بارے میں ملاحظہ ہو فیچ مندرجہ پرچاس (۲-۱۰-۱۷۳۱)۔ بار بوسا (۲۰۶ و مابعد) اور لنچوٹن (سی-۶)۔

فصل ۴۔ رو ۹۷۔ ہیٹے ۷۹۸۔ آئین (ترجمہ ۲-۱۷۲-۲۰۰-۳۱۲) اور پرچاس (۱-۴-۴۳۴) ان میں شمالِ مشرقی راستہ کا حوالہ ملتا ہے۔ کابل کی کیفیت مانزیرٹ نے بیان کی ہے (۶۱۷)۔ منریق کا تجربہ سی-۱۷ میں مندرج ہے۔ گو یز نے جو سفر کیا تھا اس کا حال پرچاس میں موجود ہے (۳-۲-۳۱۱)۔ انگریز تاجروں کے سفر کا حال بھی پرچاس ہی میں مذکور ہے (۱-۴-۵۱۹)۔

فصل ۵۔ جن معاملات پر اس فصل میں بحث کی گئی ہے اُن کے یورپی پہلو کا مطالعہ کننگھم۔ تھورولڈ روجرس۔ ہیت۔ ایٹین اور اسکاٹ کی کتابوں میں کیا جائے۔ چنانچہ انگریزی طباخی کے طرز کے بارے میں جس کی وجہ سے خواہ مخواہ مصالحوں کی ضرورت لاحق ہوتی تھی تھورولڈ روجرس نے سختی کے ساتھ لکھا ہے (۵-سی-۱۷) جو ناظرین اس مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ ایک چھوٹی سی کتاب "در اصلاح ہیت" مصنفۂ تھامس منٹ کا مطالعہ کریں جس میں اس کی مکمل کیفیت وضاحت کے ساتھ درج ہے۔ کرسٹو فر بنٹ نے اس کتاب کی تصحیح کی اور اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور وہ ۱۶۵۵ء میں لندن میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ "خطوط پاسٹن" میں بھی اس مضمون کی طرف اتفاقیہ اشارے منتشر ملیں گے۔

پرتگالیوں کے کاروبار کا طرز اور ان کے اغراض وہائٹ وے میں وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ کالی مرچ کی برآمد کے جو اعداد دیے گئے ہیں وہ دسویں ڈ کا ڈا (۲-۱۲۱) سے ماخوذ ہیں۔ گریشاڈا اور ٹا (۳۶۷) نے بتایا ہے کہ اُس کی بہ مشکل تھوڑی سی مقدار پرتگال میں استعمال کی جاتی تھی چنانچہ وہ اس کی آخری منزل مقصود کا پتہ دیتا ہے۔ تھورن کا رسالہ ہاکلویت کی دوسری جلد میں موجود ہے۔ انگریزی کمپنی کے شاہی فرمان کے متعلق ملاحظہ ہو پرچاس (۱-۳-۱۴۰ و مابعد) قوانین اور فرامین کے لئے ملاحظہ ہو اسٹیونس (۱۹۸) نیز خود پرچاس کی بیان کردہ کیفیت (۱-۳-۱۴۷)۔

باب ۶

ہندستان کی طرف چاندی کی روانی کے بارے میں جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ پرچاس سے ماخوذ ہیں (۱-۳-۲۲۱ اور ۲-۹-۱۴۷۰) ہندوستان میں انگریزی مال فروخت کرنے کی کوششوں کا حال "خطوط موصولہ" کی ابتدائی جلدوں میں مل سکتا ہے۔

فصل ۰۶۔ تجارت پر موسموں کا جو اثر پڑتا تھا اُس کا ذکر اس دور کے اکثر مصنفین نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر لنکاسٹر نے یورپ سے بحری سفر کرنے کے متعلق جو یادداشت لکھی ہے اس کا مطالعہ کیا جائے (فرسٹ لٹر بک ۱۳۶)۔ پرتگالی جہازوں کا راستہ منجملہ اور مصنفین کے پیرارڈ نے بھی بیان کیا ہے (ترجمہ ۲-۱۹۶ و مابعد) بحیرۂ احمر کے موسم پر مختلف مقامات میں بحث کی گئی ہے مثلاً دسویں ڈکاڈا ۲-۱۷۰۔ ایس تھومی وا کے جہاز کا حال پرچاس سے ماخوذ ہے (۲-۱۰۰-۱۷۱۶)۔

جہازوں کے ٹن کی تاریخ کے حوالے ضمیمہ ڈ میں دیئے گئے ہیں کیرکوں کی جسامت کے لئے ملاحظہ ہو تنجو ٹن۔ (سی-۱) پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۸۰)۔ پرچاس (۱-۳-۱۵۹)۔ جاپانیوں کے جہازوں کے متعلق ملاحظہ ہو تیجر (۲۷) اور پرچاس (۱-۳-۳۰۸) عصری یورپی جہازوں کے لئے ملاحظہ ہو او پنہیم (۱۶۸-۱۶۹)۔ پرچاس (۱-۳-۸و۱۴۷ و۲۲۴) اور پیرارڈ (ترجمہ ۱-۱۵)۔ جنک کے بارے میں ملاحظہ ہو جورڈین (۳۱۶) اور ترکی گیلیوں کے بارے میں دسویں ڈکاڈا (۲-۱۷۰) دسویں اور بارھویں ڈکاڈا میں جو مراسلات قلمبند کئے گئے ہیں اُن کا شمار کر کے ہم نے پرتگالی گیلیوں کی تعداد معلوم کی ہے۔ ان کی جسامت کا حوالہ پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۸۰) اور فالکنڈ (۲۰۵) میں دیا گیا ہے۔ (۲۵۲)

یورپ کی طرف روانہ ہونے والے کیرکوں کی تعداد گیارھویں اور بارھویں ڈکاڈا کے سالانہ اندراجات سے حاصل کی گئی ہے۔ موزمبیق اور بعض دوسری بندرگاہوں سے جو تجارت ہوتی تھی اُس کو محفوظ کرنے کی طرف پیرارڈ نے اشارہ کیا ہے (ترجمہ ۲-۱۴۸)۔ بحیرۂ احمر کے بارے میں ملاحظہ ہو جورڈین (۷۰ و ۱۰۳) اور پرچاس (۱-۳-۲۶۰ و مابعد)۔ پیگو کے متعلق ملاحظہ ہو پرچاس (۲-۱۰۰-۱۷۱۶)۔ ملاکا کے متعلق پیرارڈ (ترجمہ ۲-۱۷۳)۔ دسویں ڈکاڈا (۱-۲۱۲-۲۱۴) اور بارھویں ڈکاڈا (۱۲۱)۔ ایچین کے متعلق پرچاس (۱-۲-۱۵۳) اور بنتام کے لئے جورڈین (۳۱۶)۔

"رسالۂ تجارت" (Discourse of Trades) مصنفہ مَن کا پرچاس (۱-۵-۷۳۴)

ومابعد) میں اندراج ہے۔ جاپان کے راستہ پر شرح اموات کا حوالہ میفیوس کے "منتخبہ خطوط" (۷) سے دیا گیا ہے۔ بازارات کی تنگی ایک بہت عام بحث ہے۔ جو مثالیں دی گئی ہیں وہ "خطوط موصولہ" (۲-۵۹ و ۸۴ و ۱۱۲ - ۳-۸۴) سے ماخوذ ہیں۔

فصل ۷۔ پیرارڈ (ترجمہ ۲-۲۴۵ ومابعد) مغربی ساحل کے قافلہ کی مختصر کیفیت بیان کرتا ہے۔ اور بھی مختلف مصنفین نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ڈوکاڈا میں ان کی نقل وحرکت کا زیادہ مفصل مطالعہ کیا جا سکتا ہے نقصانات کے بارے میں فنیج کا بیان پرچاس (۱-۴-۱۴۲۱) (S. V. " Xerafine ") میں موجود ہے۔ نیگاپٹم کی تجارت کا حوالہ ہابسن جابسن سے ماخوذ ہے خشکی کے سفر کے لیے موزوں موسموں کا حوالہ "خطوط موصولہ" (۱-۲۹۸) اور ٹیورنیر (۲۴) میں ملتا ہے۔ خشکی کے راستہ سے مصالحوں کی جو تجارت ہوتی تھی اس کا ذکر پرچاس میں موجود ہے (۱-۴-۵۲۰)۔ بنجاروں کی کیفیت ٹیورنیر (۲۶ ومابعد) اور منڈی (۲-۹۵) میں بیان کی گئی ہے۔ گنگا کی تجارت کے لیے ملاحظہ ہو جورڈین (۱۶۲)۔ انڈس کی تجارت کے لیے پرچاس (۱-۴-۴۸۵)۔ بنگال کی تجارت برآمد کا حوالہ سابقہ فصلوں میں دیا جا چکا ہے۔ گجرات کی درآمد کے لیے ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۲-۲۳۹) اور ٹرو (۸۸)۔ گھاٹوں پر جو آمد ورفت ہوتی تھی اس کے بارے میں ملاحظہ ہو ڈیلاویل (۲۹۲)۔

سترھویں صدی کے اوائل میں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اس کے متعلق ملاحظہ ہو ٹرو (۴۸۰) اور پیرارڈ (ترجمہ ۲-۳-۲۰۳)۔

فصل ۸۔ مسلمان تاجروں کی عام قابلیت واستعداد کا ذکر پیرارڈ نے کیا ہے (۱-۲۴۴)۔ باہر جانے والے بنیوں کے متعلق ملاحظہ ہو پرچاس (۱-۳-۱۶۶ و ۲۶۴)۔ چیٹیوں کے متعلق ملاحظہ ہو باربوسا (۳۷۳) اور لنچوٹن (سی - ۳۰)۔ آرمینیوں اور ایرانیوں کے متعلق ملاحظہ ہو ٹرو (۳۹۴) اور یہودیوں کے بارے میں پرچاس (۱-۳-۲۳۲)۔ حقوق کے بارے میں ٹرو کا بیان صفحہ ۲۶۷ پر ہے۔

تجارتی معاہدات کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو "خطوط موصولہ" (۴-۲۸) اور پرچاس (۱-۴-۵۸۴) طریق مبادلہ کی مکمل کیفیت ٹیورنیر (۲۳ - ۲۵) میں درج ہے۔ "خطوط موصولہ" میں اس کا کثرت سے ذکر آتا ہے۔ (مثلاً ۱-۲۵ اور ۲-۲۲۸ و ۲۲۶) ہندوستان کے کاروباری لوگوں کی جو تعریف ٹیورنیر نے کی ہے وہ صفحہ ۱۰ پر درج ہے۔

۲۵۳

ساتواں باب

معیار زندگی

پہلی فصل:- مقدمہ

ہندوستان کی آبادی کو چند خاص طبقوں میں منقسم کر کے ہر طبقے کے ذرائع آمدنی کی ہم تحقیق کر چکے - اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ ذرائع کس طور پر استعمال کیے جاتے تھے - اس بارے میں جو کچھ واقفیت حاصل ہے اس کو ہم یکجا کریں گے بالفاظ دیگر ہم یہ کوشش کریں گے کہ سولھویں صدی کے اختتام پر زندگی کے جو معیار مروج تھے اُن کی تشریح کریں - یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ اُس دور کے ادبیات میں اس مضمون کے متعلق کوئی مکمل یا باقاعدہ تحقیق موجود نہیں ہے جیسا کہ ہم متعدد مرتبہ اظہار رائے کر چکے ہیں ہندوستانی مصنفین تو موجودہ صورتِ حال کو خواہ وہ کچھ ہی ہو قدرتی یا ضروری تسلیم کر لیتے تھے - اور جہاں تک غیر ممالک کے مشاہدہ کرنے والوں کا تعلق ہے وہ بالعموم اُن مخصوص حالات کو قلمبند کرتے تھے جن کی طرف اتفاق سے اُن کی توجہ منعطف ہو جاتی تھی - لہٰذا جو واقفیت ہمیں حاصل ہے وہ نامکمل اور منتشر ہے - لیکن اِن نقائص کے مقابل اُس میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ وہ تعصب سے کلیتاً معرّا ہے جن اہلِ نظر کے بیانات پر ہمیں بھروسہ کرنا ہے وہ معاشی نظریوں کے زیر اثر

نہیں تھے اور نہ انھیں اپنا کوئی دعویٰ ہی ثابت کرنا تھا[۱]۔ یہ ممکن ہے کہ ہمیں کہیں کہیں
غلطیوں کے احتمالات کا لحاظ کرنا پڑے لیکن یہ شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ
محض تعصب کی وجہ سے یا جو رائیں پہلے سے قائم کرلی گئیں تھیں ان کو حق بجانب
ثابت کرنے کی کوشش میں یہ شہادت خراب ہو گئی ہے۔ پس ہم عام طور پر بلا کسی خوف
کے ان واقعات کو جس طرح کہ وہ بیان کیے گئے ہیں تسلیم کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ
ہمیں کبھی کبھی اُن نتائج کے مسترد کرنے کی ضرورت لاحق ہو جو واقعات کے قلمبند کرنے
والوں نے اُن سے اخذ کیے ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان منتشر مشاہدات کو اس طور پر ترتیب
دیا جائے کہ اُس سے کم و بیش ایک مسلسل کیفیت ہمارے پیش نظر ہو جائے۔ اور اس
کام میں بہت بڑی سہولت اس وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے اسناد میں منتفاد بیانات
بہت شاذ ہیں۔ اختلافات زمانی و مکانی کا تو لازمی طور پر لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے لیکن
باوجود اس کے معاصر بیانات سے ذہن پر حقیقی یکسانیت کا اثر زیادہ غالب ہوتا ہے
جب کبھی کوئی سیاح ایک لمحہ کے لیے بھی پردہ اٹھاتا ہے تو ہمیں جس تصویر کی جھلک
نظر آتی ہے اُس کے خاص خاص خط و خال سے ہم پہلے ہی سے آشنا ہوتے ہیں اور
جو کچھ ہم پہلے سے سیکھ چکے ہوتے ہیں اُس کی روشنی میں تمام معلومات جزو جزو یکے
بعد دیگرے فوراً سمجھ میں آتی جاتی ہیں۔ پس شہادت کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اگر ہمارے
ہندوستان کے متعلق اظہار رائے کیا جائے تو حق بجانب ہے۔ البتہ یہ ذہن نشین
کرلینا ضروری ہے کہ کل آبادی کے متعلق جو کچھ کہا جائے اُس کا اطلاق ہر منفرد شخص پر لازمی
نہیں ہے۔ ہم اس بات میں شبہہ نہیں کرتے کہ کفایت شعار اور حریص اُمرا بھی درباروں میں

[۱] اگر کسی کو اس بیان سے مستثنیٰ کہا جا سکتا ہے تو وہ برنیر ہے جس کا ایک خاص معاشی مسلک تھا
اور جس کے عام نتائج شاید اسی وجہ سے پورے طور پر تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن ہمارے موجودہ
اغراض کے لیے اُس کی اہمیت خاصکر اس وجہ سے ہے کہ جن واقعات کو وہ بہ طور اپنے مشاہدات کے
پیش کرتا ہے وہ چند ایسے نتائج ہیں جن کی نصف صدی بعد بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ان کے
اسباب و رجحانات کا عمل اکبر ہی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔

باٹ

پائے جاتے تھے۔ اور انفرادی طور پر بعض خوشحال بلکہ دولتمند کسان یا دستکار بھی نظر آتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے ان واقعات میں کوئی فرق نہیں آتا کہ بحیثیت مجموعی امرا عام طور پر تعیشات میں ڈوبے ہوئے تھے اور عوام اکثر وبیشتر انتہا درجے کے مفلس تھے حتی کے اُن کا افلاس آج کل کے افلاس سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس یکسانیت کی موافقت میں جو شہادت موجود ہے اس کی قوت محسوس کرنے کے لیئے ضرورت ہے کہ اسناد کا بلا توسط مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ آیندہ فصلوں میں ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ اس یکسانیت کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیئے کافی تعداد میں اقتباسات یکجا کر دیں لیکن پھر بھی اپنی اصلی عبارتوں سے علیحدہ ہو جانے کی وجہ سے اُن کا اثر لازمی طور پر ضعیف ہو جاتا ہے اور جب تک کہ ہم متواتر سیاحوں کے قلمبند کردہ واقعات کا یکے بعد دیگرے مطالعہ نہ کریں ہم اُن کے بلاواسطہ بیانات کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ اور جو خیالات کہ اتفاقی طور پر اُن سے ظاہر ہوئے ہیں اور اُن کے تذکروں میں منتشر ہیں ان کی اہمیت کا اندازہ تو اور بھی مشکل ہو جائے گا جس یکسانیت کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ تو آگے آنیوالی فصلوں میں ظاہر ہو گی لیکن یہاں ایک نمایاں مثال قابل توجہ ہے۔ ایک جیسوٹ پادری مسمی مانسریٹ نے ۱۵۸۰ء میں اکبر کے دربار میں اپنے داخلے کی مفصل کیفیت قلمبند کی ہے۔ اور اس کے تقریباً پندرہ سال کے بعد جیسوٹ پادریوں نے جنوب کے دور دراز ہندو درباروں کے حالات لکھے ہیں اور یہ دونوں بیان خاص امور میں اس قدر مشابہ ہیں کہ ایک کی جگہ دوسرے کو رکھ سکتے ہیں [1] بلاشبہ

(۲۵۵)

اُن میں اختلافات موجود ہیں جو زیادہ تر آب وہوا اور ماحول کے اختلافات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً شمال میں اون کا استعمال تھا تو جنوب میں اُس کی جگہ سوتی کپڑے استعمال کیئے جاتے تھے۔ شمال میں گیہوں کا آٹا مستعمل تھا تو جنوب میں اس کی جگہ چاول موجود تھے لیکن یہ جزئیات اس قدر اہم نہیں ہیں۔ اور جہاں تک درباری زندگی کے اہم خصوصیات کا تعلق ہے ان میں عجیب وغریب یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بہر حال محض اقتباسات سے

---

[1] مانسریٹ کا بیان اُس کے تذکرہ کے صفحہ ۵۵۹ و صفحات مابعد میں ہے۔ جنوب میں پادریوں کے تجربات ہئے کی کتاب (۵۶، ۷۶۔ ۳۷۳ وغیرہ) میں طبع ہوئے ہیں۔

باب ۵

اس شہادت کی پوری پوری اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے ہمیں چاہیئے کہ پورے تذکرے پڑھ جائیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے آپ کو حالات بیان کرنے والوں کی جگہ پر رکھیں اور انھیں کی آنکھوں سے ملک اور اس کے باشندوں کو دیکھیں۔ صرف اس طریقے پر ہم اس ماحول کا ایک مکمل اور اطمینان بخش خاکہ نظر میں لے سکتے ہیں جس کے اندر ان اشخاص کو تجربے حاصل ہوئے تھے۔

جو حالات ہم نے ظاہر کئے ہیں اُن کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ طبقوں کی زندگی کے حالات مقابلتہً بہت زیادہ بیان کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں ہمارے مستند اشخاص نے صرف وہ حالات قلمبند کئے جن سے انھیں دلچسپی تھی۔ اور اس بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ جس قسم کی زندگی اُمرا بسر کرتے تھے اس کا مشاہدہ انتہا درجے کا دلچسپ تھا۔ اس کے برعکس عوام کی غذا۔ یا اُن کے لباس یا اُن کے مکانات کے متعلق دلکش تصاویر پیش کرنے کی بہت کم گنجائش تھی مثلاً جب یہ کہدیا جائے کہ لوگ قریب قریب برہنہ رہا کرتے تھے تو گویا لباس کا عنوان عملاً ختم ہو چکا۔ اس طرح جس خاندان کے مقبوضات میں صرف دو ادھ بلنگ اور چند نہایت معمولی پکانے کے برتن شامل ہوں اُس کے فرنیچر کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ بعض مصنفین تو عام باشندوں کو اپنے بیانات سے کلیتاً خارج کر دیتے ہیں۔ مثلاً کونٹی یہ کہتا ہے کہ اس ملک کے باشندے "ریشمی توشکوں پر سوتے ہیں جو سونے سے منڈھے ہوئے پلنگوں پر ڈالی جاتی ہیں"۔ کن قیود کے ساتھ اس بیان کو قبول کرنا چاہیئے؛ اس کا اظہار خود اس بیان سے کافی طور پر ہوتا ہے۔ دوسرے بیانات میں یہ بات ہمیشہ اس قدر صاف نہیں ہوتی اس لئے کسی قدر غور و فکر کے ساتھ یہ اطمینان کرنا پڑتا ہے کہ آیا کوئی خاص بیان عام باشندوں پر صادق آتا ہے یا اس کا اطلاق صرف کسی چھوٹی سی جماعت پر ہوتا ہے جس کے حالات سے مصنف کو اس وقت خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس واقعے سے اصلی اسناد کا مطالعہ کرنے کی مزید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ایک مرتبہ اور یہ بتا دینا مناسب ہے کہ آئندہ فصلوں کو یہ سمجھ کر نہ پڑھا جائے کہ وہ اس بارے میں جو کچھ شہادت موجود ہے اس کو مکمل طور پر ظاہر کرتی ہیں۔ انہیں تو صرف اس کی عام نوعیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب۵

دوسری فصل

اعلیٰ طبقے

اعلیٰ طبقوں کی معاشی حالت بہت تھوڑے الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ ہم تیسرے باب میں دیکھ چکے ہیں اُن کی آمدنیاں بالعموم زر کی شکل میں وصول ہوتی یا کم از کم تخمینہ کی جاتی تھیں۔ اور ضروریات زندگی اور اشیائے راحت کی ادنیٰ قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اِن آمدنیوں کی مقدار درحقیقت بہت بڑی تھی نتیجہ یہ تھا کہ اپنی اور اپنے گھر بار کی معمولی ضرورتوں کے لئے کافی اہتمام کرنے کے بعد کاروبار میں لگانے یا تعیشات پر خرچ کرنے کے لئے طبقہ امرا کے اراکین کے پاس بڑی مقدار میں فاضل آمدنی موجود ہوتی تھی۔ لیکن کاروبار میں سرمایہ لگانے یا حالیہ مفہوم کے مطابق شغل اصل کی مثالیں مقابلۃً شاذونادر پائی جاتی تھیں جن طریقوں سے ہم اس زمانے میں مانوس ہیں وہ اُس وقت موجود نہ تھے۔ سرکاری قرضے کھلے بازاروں میں فروخت نہیں کئے جاتے تھے۔ اور نہ کمپنیوں کے حصوں کا کہیں وجود تھا۔ زمین پر قبضہ فرمانروائے وقت کی خوشنودی کے تابع تھا اور بجز چھوٹے چھوٹے قطعات کے جو مکانات تعمیر کرنے یا باغات لگانے کے لئے حاصل کئے جاتے تھے کوئی شخص زمین نہیں خرید سکتا تھا یہ ممکن ہے کہ لوگ اپنا اپنا سرمایہ تاجروں کے پاس بہ طور امانت رکھواتے ہوں یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس قسم کے عملدرآمد کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملا۔ لیکن بہرصورت وہ طریقہ اس پیمانے پر تو کسی طرح موجود نہیں ہو سکتا بس پر کہ جدید ہندوستان میں بنکوں کی امانتیں پائی جاتی ہیں۔ غالباً بعض بعض اُمرا اپنے اپنے طور پر تجارتی کاروبار میں سرمایہ لگاتے تھے چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ اکبر کے خاندان کے اراکین نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ عام لوگ ان کی تقلید

باب ۴

کرتے ہوں گے [1]۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں صنعت و حرفت میں جو کہ تجارت سے ایک بالکل جداگانہ چیز ہے اشتغالِ اصل کی قطعاً کوئی گنجایش نہ تھی۔ اور تجارت کا کاروبار بہت ہی پر خطر تھا۔ بجز اُن لوگوں کے جو اُسی میں اپنی تمامتر توجہ صرف کر دیتے تھے معمولی اشخاص کی کامیابی کا اس میں کوئی قرینہ نہ تھا۔ اہل دربار اور عہدہ داروں میں سے بعض افراد غالباً اس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ لیکن بالعموم جو روپیہ فوراً خرچ نہیں ہو جاتا تھا وہ نقد یا زیور کی شکل میں دفینہ کے طور پر جمع کر دیا جاتا تھا تاکہ آیندہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔ یا ممکن ہے کہ یہ طرزِ عمل اِس امید پر مبنی ہو کہ مالک کے مرنے پر اُس کا پس انداز حکام کے علم سے مخفی رہے [2]۔

---

[1] مثلاً جورڈین ذکر کرتا ہے (صفحہ ۱۶۴) کہ ۱۶۱۱ء میں ملکہ نے بیانہ میں نیل خریدا تھا تاکہ اپنے جہاز پر لاد کر موچا کی جانب روانہ کرے۔ یہ غالباً حاجیوں کا بڑا جہاز رحیمی ہوگا جس کو دوسرے موقعوں پر ملکہ کا جہاز کہا گیا ہے۔

[2] ہمارے زیر غور دور کے نصف صدی بعد ٹیورنیر نے اپنے تجارتی تجربہ کی بنا پر رقم زنی کرتے ہوئے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ طلائی سکّوں کی طلب جن کا حاصل کرنا بہت مشکل تھا اِس بات کا نتیجہ تھی کہ لوگ عام طور پر اس دھات کو رکھنے کے خواہشمند ہوتے تھے ''کچھ تو اِس وجہ سے کہ اُس کے لئے بہت تھوڑی جگہ درکار ہوتی تھی اور وہ باآسانی چھپائی جا سکتی تھی اور کچھ اِس وجہ سے کہ اپنے اپنے خاندانوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں چھوڑنا جن کا بادشاہ کو علم نہ ہو ان کے لئے باعث مسرت تھا'' (ٹیورنیر ۲-۱۵)۔ برنیر (صفحہ ۱۶۷) ایک خط کا حوالہ دیتا ہے جو اورنگ زیب کی جانب سے شاہجہاں کو لکھا گیا تھا اور جس میں اِس بات کا ذکر ہے کہ کیونکر اُس زمانے کے دستور کے مطابق ہر فوت شدہ شخص کے صندوقوں پر مہر توڑا کر دیا جاتا تھا اور اُس کے نوکروں کو سخت اذیت دی جاتی تھی تاکہ وہ کل جائداد حتیٰ کہ ''ادنیٰ ترین زیور'' کا بھی پتہ بتادیں۔ اکبر اور شاہجہاں کے درمیان جو وقفہ گذرا ہے اس میں غالباً افسرانِ مالیات کی سخت گیری بہت بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اِس کے یہ ایک بجا خیال ہے کہ اول الذکر فرمانروا کے ماتحت بھی اِس بات کی احتیاط کی جاتی تھی کہ کسی متوفی امیر کی جائداد خزانہ شاہی میں داخل ہونے سے بچ نہ سکے۔

باب ۲

لیکن اس کے باوجود روپے کو دفینے کی شکل میں رکھنے کے بجائے، اس کا صرف کر دینا ہی اس دور کی نمایاں خصوصیت تھی۔ شاہنشاہ اور بادشاہ شان و شوکت کی جو مثالیں قائم کرتے تھے اہل دربار اور عہدہ داران کی تقلید کیا کرتے تھے۔ اور اگرچہ ملک کے وسائل سے بھی خوب کام لیا جاتا تھا تاہم اس دور کے مذاق کے مطابق ان نئی نئی چیزوں کو ترجیح دی جاتی تھی جو باہر سے آتی تھیں۔ غیر ملکی تاجروں کی سرکاری طور پر جو ہمت افزائی کی جاتی تھی اس کا ایک بہت بڑا سبب در حقیقت یہ تھا کہ یہی لوگ اس شدید طلب کو آسودہ کرنے کے قابل تھے۔ اشیائے درآمد کے اس شوق کے لئے غذا کے معاملے میں البتہ بہت ہی کم گنجائش تھی۔ کیونکہ غذا کی نوعیت ہی ایسی ہے۔ پس غذا کا اکثر و بیشتر حصہ ملک ہی کے اجناس اور گوشت پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاہم اشیائے درآمد کا شوق کچھ تو مصالحوں کے مصرفانہ استعمال سے (جس کا ذکر کسی سابقہ باب میں کیا جا چکا ہے) اور کچھ ان انتظامات سے ظاہر ہوتا ہے جو برف۔ تازہ میوے اور اسی طرح کی دوسری معاون اشیا حاصل کرنے کے لئے کئے جاتے تھے۔ برف اس زمانے میں نسبتاً ایک نئی ایجاد تھی اور اس کی بہم رسانی کے لئے جو انتظام قائم تھا اس کی مفصل کیفیت ابوالفضل نے قلمبند کی ہے۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ عام لوگ تو صرف گرما میں برف استعمال کرتے تھے لیکن بڑے بڑے امرا کے وہاں سال بھر اس کا استعمال جاری رہتا تھا۔ اس دور کے ایک سیر کے لئے اس کی قیمت بیس دام تک بھی بڑھ جاتی تھی لیکن معمولی شرح دس دام کے قریب رہتی تھی۔ یا اگر قوت خرید کی تبدیلی کا لحاظ کیا جائے تو اس کی قیمت فی پونڈ ایک روپیہ سے زائد ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ قیمت اس امر کے لئے کافی ہے کہ برف کو بجا طور پر تعیشات میں شامل کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغل میووں کے خاص طور پر شوقین تھے۔ چنانچہ بابر ایک پھل اور میوہ پرکھنے والے کی حیثیت سے ہندوستانی میووں کا حال لکھتا ہے۔ اکبر بھی اپنے گھر کے اس شعبے کی تنظیم میں نہایت فیاضی سے کام لیتا تھا۔ اور جہانگیر تو اپنے میووں کی خوبی پر پھولوں نہیں سماتا تھا چنانچہ یہ اس کی توزک کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اور جہاں تک بیرونی میووں کے لئے ہندوستان میں موافقت

۲۵۸

آب وہوا کا تعلق ہے اکبر کی کوششیں بہ حیثیت مجموعی ملک کے لئے بلا شبہہ نفع بخش تھیں تاہم
لیکن خاصکر اپنے ذاتی استعمال کے لئے بدخشاں اور سمرقند جیسے دور دراز مقامات سے درآمد
کا انتظام کرنا محض ایک عیش پرستی کا طریقہ تھا جیسا کہ اُن کی قیمتوں سے ظاہر ہوتا
ہے مثلاً بدخشاں کے ایک خربوزے کی قیمت ڈھائی روپے تھی جو آجکل کے معیار
کے مطابق ایک پونڈ کے مساوی ہوتی ہے ۔ لیکن مصارف خوراک کا انحصار
اس قسم کے اشیائے متعلقہ کی قیمتوں پر نہیں تھا اور نہ مرغن غذاؤں کا ان پر چنداں
اثر پڑتا تھا بلکہ وہ زیادہ تر اس بات کا نتیجہ ہوتے تھے کہ کھانے کھلانے میں
بے انتہا افراط سے کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اکبر کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ خود
اپنے لیے عمدہ غذا کی بہت کم پروا کرتا تھا لیکن اس کے مطبخ میں ”تمام ملکوں کے
باورچی“ روزانہ ایسے کھانے تیار کرتے تھے ”جو امراکو بہ شکل میسر آسکتے تھے“
جو کھانے کھلائے جاتے تھے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی ۔ اور اس سے
بھی زیادہ نمایاں وہ اہتمام تھا جو کھانے کھلانے کے متعلق کیا جاتا تھا۔ آصف خاں
کی جانب سے سر تھامس رو کی جو ضیافت کی گئی تھی اس کا حال ٹری نے بیان
کیا ہے جس کا اکثر مصنفین حوالہ دیتے ہیں ۔ اور اکبر کے دسترخوان کی کیفیت ابوالفضل
نے بیان کی ہے ۔ اِن دونوں بیانوں کا مقابلہ کرنے سے اس بات کا ایک
کافی صحیح اور عام اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں بڑے بڑے آدمی کھانے
پینے کے اہتمام میں کسقدر اسراف سے کام لیتے تھے ۔ اور ہم بجا طور پر یہ نتیجہ
اخذ کر سکتے ہیں کہ چھوٹی حیثیت کے درباری بھی جس حد تک کہ ان کے ذرایع
اجازت دیتے تھے مروجہ طریقہ کی تقلید کرتے تھے ۔

اسی طرح لباس میں بھی خرچ کرنے کے مواقع بکثرت موجود تھے ۔
ایک تو خود کپڑوں کی مقدار بہت زیادہ ہوتی تھی ۔ دوسرے جس قسم کے
کپڑے استعمال کئے جاتے تھے وہ بہت قیمتی ہوتے تھے ۔ اگر ہم ابوالفضل کے
بیان کو صحیح سمجھیں تو اکبر خوراک سے زیادہ لباس میں دلچسپی لیتا تھا اور اُس نے
نہ صرف خاص خاص کپڑوں کے نام بدل دیئے بلکہ ان کی تراش اور ان کا مادہ
بھی تبدیل کر دیا ۔ اُس کا توشہ خانہ اس قدر وسیع تھا کہ اسمیں باقاعدہ تقسیم و ترتیب

کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اکبر کے لئے ہر سال ایک ہزار جوڑے تیار کئے جاتے تھے تو ہمیں اس بات کا بھی لحاظ کرنا چاہئے کہ اس زمانے میں بہ طور انعام یا امتیاز کے دربار میں حاضر ہونے والوں کو لباس عطا کرنے کا رواج عام تھا۔ ابوالفضل اپنا سارا توشہ خانہ ہر سال اپنے ملازمین میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد اتفاقیہ بیانات سے پتا چلتا ہے کہ کپڑوں کا ایک بڑا ذخیرہ رکھنا درباری زندگی کی ایک معمولی خصوصیت تھی۔ خام پیداوار جو استعمال کی جاتی تھیں ان کی انواع و اقسام بہت کثیر تھیں جیسا کہ آئین اکبری کی مندرجہ فہرستوں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں اشیائے درآمد کی جگہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ روئی کے کپڑے ایک سو پچاس روپے فی تھان تک بھی ملتے تھے۔ اونی مال دو سو پچاس روپے فی تھان تک اور ریشم تین سو روپے تک اور کارچوبی مخمل اور کمخواب سات سو بلکہ (ایک مثال میں) پندرہ سو روپے تک قیمتی ہوتے تھے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق ایک تھان میں اتنا کپڑا ہوتا تھا جو ایک مکمل جوڑا بنانے کے لئے کافی ہو سکے۔ اس معیار کے لحاظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ توشہ خانہ پر روپیہ صرف کرنے کا کس قدر امکان موجود تھا۔ خاصکر اس حالت میں جبکہ لباس دربار میں ایک نمایاں جگہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ جہاں تک زیورات کا تعلق ہے تفصیلی حالات کا بیان کرنا غیر ضروری ہے زیورات بکثرت پہنے جاتے تھے۔ کمیاب پتھروں کے لوگ نہایت شوق سے جویا رہتے تھے۔ اور جس حد تک ذرائع آمدنی اجازت دیتے تھے مصارف پر کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ (۲۵۹)

ہمارے خیال میں اہل دربار زیورات کو مستثنی کر کے خانہ داری کے کسی اور شعبے پر اتنا روپیہ نہیں خرچ کرتے تھے جتنا کہ اصطبلوں پر۔ شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی ایک کافی تعداد برقرار رکھنا لازمی تھی۔ اور ان کی آراستگی اور زیب و زینت پر روپیہ خرچ کرنے کا غیر محدود امکان تھا۔ ہاتھی ہر قیمت پر مل سکتے تھے کیونکہ ابوالفضل کہتا ہے کہ ان کی قیمتیں ایک لاکھ روپے سے لیکر سو روپے تک ہوتی تھیں۔ شریف آدمیوں کی سواری کے لائق گھوڑے دو سو سے لیکر ایک ہزار سے زیادہ

باب ۵

تک کے ملتے تھے[1] اور اعلیٰ قیمت کے جانوروں کا ایک بڑا اصطبل قایم رکھنا دانے اور چارے کی ارزانی کے باوجود یقیناً ایک نہایت صرف خرچ کام تھا جہاں تک زیبایش وآرایشگی کا تعلق ہے بہترین صورت یہ ہے کہ ہم ابوالفضل کا یہ بیان تسلیم کریں کہ اُس کی کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ البتہ یہ ایک قابل لحاظ بات ہے کہ ہاتھی گھوڑے کی زنجیر لوہے۔ چاندی یا سونے کی ہو سکتی تھی[2] اور اس شعبے پر روپیہ خرچ کرنے کی درحقیقت کوئی حد وانتہا نہیں تھی۔ کھیل اور جوا آجکل کی طرح اُس زمانے میں بھی دوش بدوش تھے اور یہ بھی تفریح کا ایک گراں بہا ذریعہ ہوتے تھے اور کم از کم اکبر کے دور میں تو یہ مشاغل زیادہ ممتاز درباریوں کے لئے لازمی تھے۔ بازیوں کی مقدار بعض صورتوں میں از روئے ضابطہ محدود ہوتی تھی۔ اور گو اس طرح کا عملدرآمد تسلیم کیا جاتا تھا تاہم یہ امر کہ یہ حد بندی کہاں تک موثر ہوتی تھی محض ہمارے قیاس پر منحصر ہے۔ (۲۷۰)

مکانات کی بہم رسانی پر جو روپیہ خرچ ہوتا تھا وہ ہمارے خیال میں اعلیٰ درجے کے مصارف کا کوئی اہم جزو نہیں تھا کیونکہ دربار بسا اوقات متحرک رہتا تھا۔ اور جو لوگ اس کے ہمراہ رہتے تھے اُن کے قیام کے لئے بڑے بڑے خیمے کام میں لائے جاتے تھے۔ اوسان پر بھی نام ونمود کی خاطر روپیہ خرچ کرنے کا غیر محدود امکان تھا یعنی خیموں کی تعداد۔ وسعت۔ اور آرائشگی یہ ایسے معاملات تھے جن کا انحصار ہر شخص کی انفرادی خواہشات پر ہوتا تھا۔ اور شاہی خیمے کی بدولت اِن کا معیار

---

[1] جنوبی ہند میں گھوڑوں کی قیمت کسی قدر گراں تھی۔ عربی اور ایرانی نسل کے گھوڑے گوا میں تقریباً ۵۰۰ پرڈائیوں یعنی ایک ہزار روپیوں تک فروخت ہوتے تھے۔ اور جو مقامات ساحل سے دور واقع ہوتے تھے وہاں ان کی قیمتیں اور بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ (پیلرڈ ترجمہ ۲-۶۷)

[2] واضح رہے کہ یہ محض انشا پردازی نہیں ہے۔ کیونکہ بدایونی (۲-۲۱۹) سونے اور چاندی کی زنجیروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ونیز یورپی مخمل اور ترکی زرتار کپڑے کے زین پوشوں کا جو دورِ اکبری میں کسی سرکاری رسم کے موقع پر استعمال کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ تھامس کوریاٹ نے ٹھوس سونے کی زنجیریں پہنے ہوئے ہاتھی دیکھے۔ (پرچاس ۱-۴-۵۹۵)

بابٌ بہت ہی بلند رہتا تھا ۔ ابوالفضل ذکر کرتا ہے کہ مخمل اور کمخواب سے آرائش کی جاتی تھی اور کرپیچ کے پردوں کے لئے ریشمی بندھن استعمال کئے جاتے تھے۔ بہرحال ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ہر ممتاز امیر کا خیمہ اس قدر شاندارا ور پر تکلف ہوتا تھا کہ اِس لفظ کے موجودہ استعمال سے اُس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جہاں تک فرنیچر کا تعلق ہے اُس زمانے میں آجکل کے برابر اُس کے انواع و اقسام نہیں تھے۔ کیونکہ کوچ میز۔ کرسیاں معمولاً استعمال نہیں ہوتی تھیں ۔ البتہ قالین ۔ پلنگ۔ آئینے ۔ اور ظروف بہ افراط استعمال کئے جاتے تھے اور ہر شخص اپنے ذرایع آمدنی کے مطابق اُن پر روپیہ خرچ کرتا تھا۔

اِس طرز زندگی کے لئے نوکروں چاکروں کی ایک بڑی تعداد درکار ہوتی تھی ۔ اور جیسا کہ ہم کسی سابق باب میں کہہ چکے ہیں خانگی ملازمتوں کی یہ وسعت اُس زمانے کی ایک اہم معاشی خصوصیت تھی ۔ اگر ہم ابوالفضل کے بیان کردہ پیمانے پر کسی امیر کے گھر کا اندازہ کریں تو اس کے لئے جو نوکر درکار ہوتے تھے ان کا شمار قریب قریب سیکڑوں میں کیا جائے گا ۔ مثلاً ہر ہاتھی کے لئے چار اور ہر گھوڑے کے لئے دو یا تین آدمی رکھے جاتے تھے ۔ مطبخ میں ایک بہت بڑی جماعت ہوتی تھی اور خیمہ زنوں کے دو بڑے گروہ ہوتے تھے (ایک گروہ اگلے خیموں کے لئے اور دوسرا پچھلے خیموں کے واسطے)۔ باربرداری کا کافی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ مشعل بردار علیحدہ ہوتے تھے ۔ اور ایک ذی عزت گھرانے کے جس قدر لوازم تھے سب موجود ہوتے تھے ۔ اور اگرچہ غلام سستے داموں ملتے تھے اور اجرتیں اس قدر ادنیٰ تھیں کہ اُس وقت کا ایک روپیہ آجکل کے سات روپیوں کے مساوی تھا تاہم ملازمین کے مصارف بلاشبہہ بہت زیادہ ہوتے تھے۔ کثیر التعداد خدمتگاروں کی موجودگی یہ کچھ صرف مغلیہ دربار کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ وہ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں پائی جاتی تھی ۔ ایک سیاح مغربی ساحل کی زندگی بیان کرتا ہے یا دکن کے درباروں میں سے کسی دربار میں پہنچتا ہے۔ ایک سفیر گوا میں وارد ہوتا ہے یا جسوئٹ پادری وجیانگر کے کسی امیر سے ملاقات کرتے ہیں ۔ اِن تمام صورتوں میں ہمیں وہی کیفیت دکھائی دیتی ہے ۔ یہ بات قابل لحا

باٹ

ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی گووا کے پرتگالیوں نے ملک کے مروجہ عملدرآمد کی تقلید کی تھی۔ اور کوئی ذی مرتبہ آدمی بغیر کثیر التعداد ہمراہیوں خدمتگاروں۔ اور افریقہ کے غلاموں کے گلی کوچوں میں نظر نہیں آتا تھا۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ غالباً یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ڈی لیٹ نے اپنے جمع کردہ واقعات سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ درست ہے۔ یعنی یہ کہ امرا کی عیش پرستی کی بمشکل تشریح کی جا سکتی ہے کیونکہ اگر انھیں اپنی زندگی میں کسی ایک چیز سے سروکار تھا تو وہ صرف یہ تھی کہ ہر طرح کا حظ و لطف بے حد و حساب حاصل کیا جائے۔ اس رائے کا مقابلہ رُو کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ "وہ شہوت پرستی اور دولتمندی کا ایک پریشان کن مجموعہ ہیں اور بس"۔ روپیہ صرف کرنے کے ایک اور ذریعہ کا ابھی ذکر کرنا باقی ہے۔ ہماری مراد ان تحائف سے ہے جو بادشاہ اور ذی اثر افراد کو دیے جاتے تھے۔ تکلفات مروجہ کی رُو سے ان تحائف کا پیش کرنا ضروری تھا اور ان کی مالیت کا انحصار خاصکر پیش کرنے والے کی فراخ حوصلگی پر ہوتا تھا۔ خفیہ رشوت ستانی کا طریقہ بھی اُس زمانے میں رائج تھا لیکن وہ اس دستور سے بالکل جداگانہ تھا۔ تحائف کھلے بندوں بلکہ خود نمائی سے دیئے جاتے تھے اور وہ گویا مروجہ طریق عمل کا ایک جزو تھے۔ کوئی شخص اپنے افسر کے پاس خالی ہاتھ حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ترقی حاصل کرنے کے لئے جو تحائف دیئے جاتے تھے وہ کم و بیش شغل اصل کے مشابہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ انگریز بھی گذشتہ صدی تک ان رقوم کے متعلق جو سرکاری دفاتر میں خدمات حاصل کرنے کے لئے ادا کی جاتی تھیں یہی خیال کرتے تھے۔ ہندوستانی درباروں کی فضا میں انوکھی اشیا اور مال و متاع سب سے زیادہ پسندیدہ چیزیں تھیں۔ اس لئے اس دستور نے وہاں جو شکل اختیار کی تھی وہ اُس کے اُن آثار سے بہت ہی مختلف تھی جو آجکل موجود ہیں۔ تقرر یا ترقی کے لئے مسابقت بہت سخت تھی۔ دربار میں کسی خدمت کے انعامات زیادہ تر اسی حریف کو ملا کرتے تھے جس کے تحائف سب سے زیادہ مقبول ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کے نتائج توزک جہانگیری کے صفحات میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں

جہاں یکے بعد دیگرے ہر امیدوار کے پیشکش کی تشریح اور خالص مالی نقطۂ نظر سے اُن کی قدردانی کی گئی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ امتداد زمانہ سے یہ طریقہ زیادہ گراں بار ہو گیا ہو۔ اور جہانگیر کے تحائف بمقابل اکبر کے تحائف کے زیادہ قیمتی ہوں۔ لیکن اکبری دور میں اُس کا وجود بالکل مسلم ہے۔ چنانچہ جسویٹ پادریوں کے تذکروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر و نیز اُس کے جنوبی معاصر کس قدر اشتیاق کے ساتھ انواع و اقسام کے تحائف وصول کیا کرتے تھے۔

(۲۶۲) اُمرا میں افلاس کا پھیلنا مذکورۂ بالا حالات کا لازمی نتیجہ تھا چنانچہ اس دعوی کی تائید میں برنیر کی سند موجود ہے کہ فی الواقع یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ برنیر لکھتا ہے کہ "میں بہت کم دولتمند امرا سے واقف تھا۔ اس کے برعکس ان میں سے اکثر و بیشتر افراد انتہا درجہ قرضداری میں مبتلا ہیں۔ قیمتی تحائف بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے اور کثیر التعداد نوکر چاکر رکھنے سے یہ لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔" طبقۂ اُمرا کی مالی تباہی فی نفسہ کوئی بہت اہم معاملہ نہیں تھا۔ لیکن عوام کی معاشی حالت پر اس کا نہایت زبردست اثر پڑا۔ صوبوں کے عاملوں اور دوسرے عہدہ داروں کو عملاً بہت وسیع اختیارات حاصل تھے اور جب ان کے ذرایع کم ہونے لگے تو اُس کا بار کسانوں اور دستکاروں پر پڑنے لگا۔ پس شاہجہاں کے دور حکومت کے اختتام پر عوام کی تباہی کی جو تصویر برنیر نے کھینچی ہے اس کی حقیقی صحت کے متعلق شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اُمرا کا افلاس ایک ایسا معاملہ تھا جس کے لئے وقت درکار تھا۔ لہٰذا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ عوام کی حالت کا انحطاط بھی تدریجی تھا۔ اور یہ کہ وہ اکبر کے دور حکومت میں کسی قدر بہتر حالت میں تھے۔ تاہم اُس کے نظم و نسق کے معاشی نتائج کا تخمینہ کرتے وقت ہمیں اس بات کا لحاظ کرنا چاہئے کہ اُس میں وہ میلانات موجود تھے جو اس وقت ہمارے زیر غور ہیں۔

لیکن یہ نہیں فرض کرنا چاہئے کہ ہندوستانی درباروں میں ہر شخص اپنی آمدنی سے بڑھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔ کثرت تو ہمارے خیال میں بے شک ایسے ہی لوگوں کی تھی۔ لیکن کفایت شعار لوگ بھی وہاں موجود ہوتے تھے

جو کثیر مقدار میں مال و دولت جمع کرتے تھے۔ لہٰذا چند الفاظ اس بارے میں بھی
ضروری ہیں کہ کیونکر یہ مجتمعہ مال و دولت صرف ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ جب تک
اس دولت کا پتہ لگ سکتا تھا وہ مالک کے مرنے کے بعد کم از کم شمالی ہند میں
تو خزانۂ شاہی میں واپس ہوتی تھی اور چونکہ اپنی مجتمعہ دولت کا یہ حشر ہر شخص کو
ناگوار معلوم ہوتا تھا لہٰذا صاحب دولت اشخاص اپنی دورانِ زندگی ہی میں
اس کو علیحدہ کر دینے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ لڑکیوں کو کثیر مقدار میں جہیز
عطا کرنا اسی کا ایک طریقہ تھا۔ مثلاً راجہ بھگوان داس نے اپنی بیٹی کو جو جہیز دیا تھا
وہ بدایونی کے بیان کے مطابق حسب ذیل اشیاء پر مشتمل تھا۔ "کئی قطار گھوڑے
اور ایک سو ہاتھی۔ ابی سینیا، ہندوستان اور سیر کیشیا کے لڑکے اور لڑکیاں۔ اور
ہر قسم کے طلائی برتن جو جواہرات سے مرصع تھے۔ سونے کے برتن اور چاندی
کے ظروف۔ اور ہر قسم کا مال و سامان جس کی مقدار شمار سے باہر ہے"۔ بڑی بڑی
عمارتوں کی تعمیر اس کا دوسرا طریقہ تھا۔ لیکن اس زمانے کے رواج کی وجہ سے
عملی فائدے کے کاموں پر اس قدر روپیہ صرف نہیں ہوتا تھا جس قدر کہ مقبروں (۲۶۳)
پر یا ان عمارتوں پر جو یادگار کی غرض سے تعمیر کی جاتی تھیں[1]۔ چنانچہ ہندوستان
کی سرزمین سے اب تک اس واقعہ کی شہادت ملتی ہے۔ کبھی کبھی (اگرچہ بہت
شاذ و نادر) کسی امیر کو یہ اجازت دی جاتی تھی کہ وہ ملک چھوڑ کر ایران میں یا کہیں
اور اپنے وطن کو واپس چلا جائے۔ یا عرب کے مقدس مقامات کی زیارت کرے
اور اپنے ساتھ اپنی مجتمعہ دولت کا بھی کم از کم ایک جزو لیتا جائے۔ لیکن معلوم یہ
ہوتا ہے کہ اس قسم کی اجازت صرف ان صورتوں میں دی جاتی تھی جہاں وہ سیاسی
وجوہ سے پسندیدہ ہوتی تھی اور ملک سے باہر روپیہ لے جانے کی عادت نہایت

[1] ہمیں ایسے مفید مدارس یا اوقات کی کوئی فہرست نہیں ملی جو اکبر کے دور حکومت میں قائم ہوئے ہوں۔
مسٹر این۔ ال۔ لا اس دور کی تعلیمی کارگذاریوں کو جس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ہم اسے صحیح نہیں
سمجھتے لیکن انھوں نے بھی صرف دو مدرسوں کے نام بتائے ہیں جو ان مدارس کے علاوہ تھے جو خود اکبر نے
فتح پور سیکری اور دوسرے مقامات پر قائم کئے تھے۔ (مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے اندر

باب
سختی کے ساتھ روکی جاتی تھی۔ پس مال و دولت کی کثیر مقدار ایک طرح کا بار گراں ثابت ہوتی تھی۔ کچھ لوگ تو اسی بات پر قانع رہتے تھے کہ مال و متاع جمع کرتے جائیں خواہ اس کا فائدہ بالآخر بیر کار ہی کو پہنچے۔ لیکن کثرت ان لوگوں کی تھی جو اپنی آمدنی اس کے حاصل ہوتے ہی خرچ کر دیتے تھے اور جس طور پر خرچ کرتے تھے اس کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ علم و ادب کی ترقی۔ جزو دوم۔ باب چہارم)

تیسری فصل

متوسط طبقے

اکبر کے زمانے میں متوسط طبقوں کی زندگی کے بارے میں ہم اس قدر
نہیں جانتے جس قدر کہ اُن طبقوں کے بارے میں جو معاشرتی نقطۂ نظر سے اُن سے
اعلیٰ یا ادنیٰ ہوتے تھے۔ اُن کی تعداد یقیناً بہت تھوڑی تھی۔ اور ہم اپنے
اسناد کے سکوت سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُن کی زندگی کم از کم نام
و نمود سے معرّا تھی۔ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں پیشہ ور لوگ بجز دربار کے کسی اور
مقام پر شاذ و نادر پائے جاتے تھے۔ اور دربار میں وہ کوئی نہ کوئی سرکاری عہدہ
حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے۔ اور کم و بیش مروجہ معیاروں کے مطابق
غالباً زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں تک چھوٹے کارپردازوں کا تعلق ہے یہ لوگ
یقیناً نظم و نسق کے مختلف مرکزوں پر بکثرت موجود ہوتے تھے لیکن ہمیں ان کی
مشکل سے کوئی جھلک نظر آتی ہے۔ اور تنخواہوں کے مروجہ پیمانوں کے متعلق
کسی واقفیت کی عدم موجودگی میں یہ قیاس کرنا ناممکن ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی
اور معقول اسباب راحت کی ارزانی سے کس حد تک مستفید ہوتے تھے لیکن
اس دور کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت جو غالباً اس طبقہ کے افراد کے لکھے
ہوئے ہیں ہم کبھی کبھی محسوس کرتے ہیں کہ معاشی نقطۂ نظر سے لکھنے والوں کی زندگی
تنگی کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ حالاتِ مروجہ کی کوئی مفصل تشریح نہیں (۲۶۴)
کرتے تاہم جب کبھی وہ کسی خاندان یا کسی دور کی خصوصیات کا خلاصہ کرتے ہیں تو
وہ جس طور پر اشیائے خوراک کی قیمتوں کا ذکر کرتے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
اُن کے نزدیک اس مضمون کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ اس قسم کی عبارتوں سے

ہیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کیوں آجکل بھی اکثر و بیشتر تجارتی طبقے خصوصیت کے ساتھ اپنی زندگی کفایت شعاری بلکہ بخالت سے بسر کرتے ہیں۔ البتہ مغربی ساحل پر جو تاجر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں ان میں سے بعض اس خصوصیت سے مستثنیٰ ہیں۔ کالی کٹ میں جو مسلمان بسے ہوئے تھے ان کے متعلق باربوسا کہتا ہے کہ وہ اچھا لباس پہنا کرتے تھے بڑے بڑے مکانوں میں رہتے اور بہت سے ملازمین نوکر رکھتے تھے۔ اور کھانے پینے اور سونے میں بہت ہی عیش پسند تھے۔ اگرچہ وہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ہندوستان میں پرتگالیوں کے وارد ہونے کے بعد سے ان کی حالت میں بہت کچھ انحطاط ہوگیا تھا۔ یہی مصنف کہتا ہے کہ راندیر میں جو مسلمان رہتے تھے وہ اچھا لباس پہنتے تھے اور عمدہ مکانوں میں رہتے تھے جو اچھے طور پر آراستہ رکھے جاتے تھے۔ ایک صدی بعد ڈیلاویل نے سورت میں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کیا مواقع حاصل تھے اُن کے متعلق اظہار رائے کیا ہے۔ چنانچہ اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہاں شان و شوکت اور اظہار دولتمندی میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور وہ سب لوگ عام طور پر شایستہ طریقے پر زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ لکھنے والا خود ایک شایستہ اور تربیت یافتہ شخص تھا لہٰذا اسی کے لحاظ سے ہمیں اس فقرہ کی تعبیر کرنی چاہیئے۔ ساحل پر اس غیر معمولی حالت کی توجیہہ غالباً یہ ہے کہ مسلمان تاجروں کو خاص خاص حقوق حاصل تھے کیونکہ چنگی کی آمدنی قایم رکھنے اور کمیاب چیزیں بہم پہنچانے میں اُن کی بہت اہمیت تھی۔ اور چونکہ انھیں خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی آزادی تھی لہٰذا وہ اپنے میلان طبع کے مطابق عمل کرتے تھے۔ لیکن اندرونی حصوں کے تاجروں کو یہ آزادی میسر نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ ایک خاموش اور غیر نمایشی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے لئے حالات کا اقتضا بھی یہی تھا۔

باب ۴

(۲۶۵)

یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے طبقے جن سے اِن تذکرہ نویسوں کا بھی تعلق تھا معاشی نقطۂ نظر سے غالباً اس زمانے میں بھی وہی معاشی حیثیت رکھتے تھے جو آجکل رکھتے ہیں۔ اور اکبری دور کے محرروں کے حق میں قیمتوں کا مسئلہ کم و بیش ایسا ہی اہم تھا جیسا کہ آجکل اُن کے جانشینوں کے حق میں ہے۔ لیکن جب تک کہ اس سے زیادہ قطعی شہادت دستیاب نہ ہو کوئی قطعی رائے قایم کرنا حق بجانب نہ ہوگا۔

اِس دور کے تاجروں کی حالت کے متعلق البتہ ہمیں کچھ تھوڑی سی اور واقفیت حاصل ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُن کی معاشی حالت میں بڑے بڑے اختلافات کا ہونا لازمی تھا اور اگرچہ ان میں بہت سے دولتمند موجود تھے تاہم اُن کی اوسط آمدنی غالباً زیادہ نہیں تھی علہ لیکن اُن میں سے جو بھی دولتمند ہوتے تھے اُن کے ممکنہ اخراجات بہت ہی محدود ہوتے تھے کیونکہ اظہار شان و شوکت جس قدر اہل دربار کے حق میں مفید تھا اُسی قدر تاجروں کے لئے ضرر رساں تھا۔ ٹری لکھتا ہے کہ "شہروں اور قصبات میں بیشتر ایسے غیر سرکاری لوگ ہیں جو تجارت کرتے ہیں اور بہت دولتمند ہیں لیکن ایسے لوگوں کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ دولتمند نظر آئیں تاکہ اُن کے ساتھ بھرے ہوئے اسپنج کا سا سلوک نہ کیا جائے" برنیر نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دولتمند یہ کوشش کرتے تھے کہ وہ مفلس نظر آئیں" اور یہ کہ "خواہ منافعہ کتنا ہی زیادہ ہو اس کے کمانے والے کے لئے پھر بھی افلاس کا جامہ پہننا ضروری ہے" جہاں تک اندرون ملک کا تعلق ہے اِن خیالات کا اطلاق غالباً عام ہے اور ان سے

علہ ڈیلاویل نے ایک مثال دی ہے جس سے تجارتی دولتمندی کی غیر مستقل نوعیت کا نہایت نمایاں طور پر اظہار ہوتا ہے۔ سورت کے ایک بڑے ذخیرہ آب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد وہ رقم طراز ہے کہ شہر کے ایک خانگی باشندے نے اُسے تعمیر کرایا تھا "اور لوگ کہتے ہیں کہ اُس کی بیٹی یا شاید اسکی اولاد میں سے کوئی اور اب تک زندہ ہے اور نہ معلوم قسمت کے کس منحوس چکر سے بہت غریب ہے حتیٰ کہ اسے کھانے کو روٹی بھی میسر نہیں ہے" (ڈیلاویل۔ ۳۴)

باب ۵

چوتھی فصل

ادنیٰ طبقوں کی معاشی حالت

اب ہم عوام یعنی کسانوں ۔ دستکاروں اور مزدوروں کے حالات زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ ہمیں ان کے طرز زندگی کے متعلق مکمل کیفیت کا علم نہیں ہے ۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ صرف چند حالات ہیں جن سے کچھ تھوڑی سی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہ حالات زیادہ تر بیرونی سیاحوں کے مشاہدات اور ان کی تحریروں سے ماخوذ ہیں اور یہ لوگ صرف ایسے واقعات قلمبند کرتے تھے جن سے خود انھیں کچھ دلچسپی ہوتی تھی ۔ اور جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں ان اتفاقیہ مشاہدات کی وقعت کا دارومدار زیادہ تر ان کی تکرار پر ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی وقت ہندوستان کے کسی حصہ میں کوئی خاص واقعہ مشاہدہ کرے تو یہ امر بجائے خود چنداں قابل اہمیت نہیں ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مذاق اور مختلف اشغال کے لوگ سو سال سے زائد مدت کے دوران میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں کم و بیش ایک ہی قسم کے حالات بیان کرتے ہیں تو پھر اصل حقیقت کو ثابت کرنے میں ہر ایک مشاہدہ بجائے خود کچھ نہ کچھ اہمیت حاصل کر لیتا ہے پس اگر ہم اِن مختلف نقوش کو اکٹھا کر کے ایک کم و بیش مکمل تصویر تیار کر لیں (۲۶۶) جو اُس زمانے کے مصنفین نے نہیں کیا تھا تو ہمارا یہ طرز عمل بالکل حق بجانب ہوگا۔ ایک واقعے کے متعلق تو ہندوستانی اور غیر ملکی دونوں ذرائع سے ہمیں حالات دستیاب ہوتے ہیں اور وہ واقعہ یہ ہے کہ باستثنائے بنگال عموماً پورا ہندوستان وقتاً فوقتاً قحط سالی اور اس کے نتائج سے متاثر ہوتا تھا جو کثرت اموات بچوں کی غلامی اور مردم خواری کی شکل میں معمولاً ظاہر ہوتے تھے ۔ یہ واقعات بالکل یقینی ہیں اور اس قسم کے مصائب کا اندیشہ ہمیشہ باشندوں کے دلوں پر مسلط رہتا ہوگا

باب۲ لیکن یہ واقعات تو تصویر کا پس منظر ہیں۔ خود تصویر نہیں ہیں۔ مردم خواری ہر قحط کی ایک معمولی خصوصیت تھی لیکن خود قحط سالی اس ملک یا اس دور کی کوئی معمولی خصوصیت نہیں بلکہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اور ہماری موجودہ غرض کے لئے تو اس کی یہ اہمیت ہے کہ اس سے یہ شہادت ملتی ہے کہ عوام معاشی اندوختوں سے قطعاً محروم تھے۔

سولھویں صدی کے اوائل میں باربوسا نے ساحل کارومنڈل کے بارے میں لکھا ہے کہ اگرچہ ملک میں ضروریات افراط کے ساتھ مہیا تھیں تاہم اگر بارش نہ ہو تو قحط کی بدولت سخت ہلاکت واقع ہوتی تھی اور بچے ایک ایک روپیہ سے کم قیمت پر فروخت کئے جاتے تھے۔ آگے چلکر یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ کیونکر ان موسموں میں مالابار کے جہاز بھوکوں کے لئے خوراک لاتے تھے اور غلاموں سے جو مبادلے میں ملتے تھے لدے ہوے واپس جاتے تھے۔ ایک نسل کے بعد کوریا پھر اس ساحل پر ہلاکت وتباہی اور مردم خواری کا ذکر کرتا ہے۔ کوریا کے دس سال بعد بدآیونی نے آگرے اور دہلی کے قریب اسی قسم کے مناظر کا حال قلمبند کیا ہے۔ ۱۵۹۰ء کے قریب سینزر فریڈرک گجرات میں بچوں کی فروخت کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ لنچوٹن جب گووا میں رہتا تھا تو اس نے دیکھا کہ بچے فروخت کے لئے لائے جاتے تھے اور جوان آدمی غلام بننے کے جویا رہتے تھے۔ اختتام صدی پر پھر شمالی ہند کی باری تھی۔ غرض مجموعی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کی بسر اوقات کا انحصار موسم پر ہوتا تھا اور جب بارش نہیں ہوتی تھی تو معاشی تباہی اس کا فوری نتیجہ ہوتا تھا۔ اس طور پر ہم اس تصویر کے پس منظر کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

جب ہم غیر معمولی حالات کو چھوڑ کر معمولی حالات کے متعلق شہادت جمع کرنا چاہیں تو مناسب یہ ہے کہ حال کے مصنفین میں جو سب سے زیادہ قدیم ہیں انھیں سے آغاز کریں۔ ہمارا اشارہ اطالوی کونٹی اور روسی راہب نکیتین کی طرف ہے۔ کونٹی عوام کے بارے میں کوئی بات نہیں بتاتا۔ البتہ اعلی طبقوں کی شان وشوکت کا حال وہ نہایت جوش سے بیان کرتا ہے۔

(۲۶۷) نکیتین نے پندرھویں صدی کے اوائل میں دکن اور وجیانگر کے بعض حصوں کی سیاحت کی تھی۔ اگر اس کے لکھے ہوے حالات کے ترجمے پر اعتماد کیا جائے تو

باندھ لیں بالکل برہنہ پھرا کرتے تھے"۔ یہ واقعات مضمون زیر بحث سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس سے یہ پتا لگایا جا سکے کہ وہ کسی مقام پر لوگوں کی خوشحالی سے متاثر ہوا ہو۔ بلکہ اکثر مقامات کے متعلق جن کے اور حالات بیان کئے گئے ہیں وہ اس مضمون کو بالکل ترک کر دیتا ہے[ف۱]۔

(۴۶۸) ورتھما اور باربوسا کے تقریباً ربع صدی بعد ہمیں وجیانگر کے پرتگالی وقائع نگار پیز اور نونیز نظر آتے ہیں۔ اُن کی شہادت ہم مسٹر سیویل کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو طرز مالگزاری کے متعلق نونز کی بیان کردہ کیفیت کا اقتباس پیش کرنے کے بعد یوں حرف زن ہے: "ایک قطعیتاً بیرونی ذریعے سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے یہ بیان اس رائے کی جو کہ بارہا ظاہر کی جا چکی ہے پُرزور تائید کرتا ہے کہ جب جنوبی ہند کے امرا ہندو حکومت کے زیر نگیں تھے تو وہ رعیت پر نہایت افسوسناک طریقے سے سختیاں کرتے تھے۔ اِن دونوں تذکروں میں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ قلمبند کیا گیا ہے اور عبارتیں بھی موجود ہیں جن سے اس دعوی کی جو یہاں کیا گیا تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ عوام بالکل پسے جاتے تھے اور انتہا درجے کے افلاس اور مصیبت میں زندگی بسر کرتے تھے"۔ یہ شہادت اہم ہے کیونکہ اُس کا تعلق ایک تو اُس دور سے ہے جبکہ وجیانگر کی خوشحالی عروج پر تھی اور دوسرے اُن حالات سے ہے جو موجودہ صوبۂ مدراس کے قریب قریب ہم وسعت رقبہ میں مروج تھے۔

ف۱ ورتھما کے اُس ترجمہ کے مقدمہ میں جو کہ ہاکلوییت سوسائٹی کا مطبوعہ ہے یہ درج ہے (صفحہ ۲۰۳) کہ "ایک اور نتیجہ جو ہمارے تذکرہ سے ماخوذ ہوتا ہے وہ باشندوں کی یکساں خوشحالی ہے۔ مالابار کے ذات باہر پالیوں کو مستثنیٰ کر کے بقیہ آبادی کے مختلف طبقے خوشحال زندگی بسر کرتے تھے"۔ اصل تذکرہ میں ہمیں اس رائے کی حمایت میں ایک بھی اثباتی جملہ نہیں مل سکا۔ اور جو نتیجہ بیان کیا گیا ہے اس کو اخذ کرنے کے لئے ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ جب ورتھما کسی طبقہ کے متعلق کچھ نہیں کہتا تو وہ طبقہ گویا خوشحال ہوتا تھا۔ اور یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جو ہمیں تو بالکل حق بجانب نہیں معلوم ہوتا۔

وہ کہتا ہے[1]: "یہ سرزمین ضرورت سے زیادہ باشندوں سے بھری ہوئی ہے۔
لیکن جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں وہ بہت ہی خستہ حال ہیں اور ان کے برعکس
امرا انتہا درجے کے دولتمند ہیں اور عیش و عشرت میں مست رہتے ہیں" یہ آخری
بیان تو اکبر کے زمانے کی جو حالت ہم معلوم کر چکے ہیں اس سے منطبق ہوتا ہے
اب رہا پہلا بیان اُس سے بھی ہمیں زیادہ متعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے بعد
دوسرا مستند شخص باربوسا ہے جس نے سولھویں صدی کے اوائل میں یہاں کے
حالات لکھے ہیں۔ ساحل ملابار پر جو افلاس موجود تھا اس سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔
کیونکہ جس گھٹیا قسم کے چاول عوام کے استعمال کے لئے جہازوں پر لادے جاتے
تھے اس کو وہ نہایت اہتمام سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس خطے کے بعض
ادنیٰ طبقے بہت ہی مفلس تھے۔ ان میں سے بعض تو لکڑی اور گھانس فروخت
کرنے کے لئے شہر میں لاتے تھے۔ اور بقیہ جڑوں اور جنگلی میووں پر زندگی بسر
کرتے۔ پتوں سے بدن ڈھانکتے اور جنگلی جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ پس
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملابار میں انتہا درجے کا افلاس موجود تھا۔ لیکن کس حد تک
وہ پھیلا ہوا تھا اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ورتھما نے جو حالات بیان کئے
ہیں، اُن سے بھی کم و بیش وہی اندازہ ہوتا ہے جو باربوسا کے بیان کردہ حالات سے ہوتا ہے کیونکہ دونوں
کے تجربے ایک ہی عہد سے متعلق تھے وہ لکھتا ہے کہ ساحل ملابار کے ایک مقام پر لوگ بہت ہی
خستہ حالی کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ کالی کٹ اور دوسرے مقامات میں مکانات
میں گنجائش کی کمی پر وہ اظہار رائے کرتا ہے۔ چنانچہ مکانات کی قیمت کا تخمینہ
وہ "فی مکان نصف ڈکاٹ یا زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ڈکاٹ" کرتا ہے۔
اور وجیانگر کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ عام لوگ "بجز اس کے کہ کمر پر کپڑے کا ایک ٹکڑا

[1] کونٹی اور نکیتن کے تذکروں کا ترجمہ میجر کی کتاب میں کیا گیا ہے جس کا نام "ہندوستان پندرھویں صدی میں" ہے۔ یہ اقتباس کونٹی کے تذکرہ کے صفحہ ۱۴ سے ماخوذ ہے۔ بعض عبارتوں میں نکیتن کا ترجمہ پورے طور پر تشفی بخش نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اصل نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ لہٰذا ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی مترجم ہندوستان کے متعلق ذاتی واقفیت رکھتا ہو تو ممکن ہے کہ وہ بعض جملوں پر جو فی الحال تاریکی میں ہیں کچھ روشنی ڈال سکے۔

اِس کے بعد دوسرا گواہ لنچوٹن ہے جس کے مشاہدات ان حالات سے متعلق ہیں جو ۱۵۸۳ء اور ۱۵۹۰ء کے درمیان مغربی ساحل پر مروج تھے۔ گووا کے عام ہندوستانیوں کے افلاس کے متعلق وہ تفصیلی حالات بیان کرتا ہے۔ اور دیہاتیوں کے بارے میں تو اس کی رائے اور بھی زیادہ ناموافق ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ نہایت مفلسانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ برہنہ پھرتے ہیں اور اُس قدر خستہ حال ہیں کہ ایک پائی کی خاطر کوڑے برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ اس قدر کم کھاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہوا پر زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اکثر وبیشتر نہایت پستہ قامت اور کمزور اعضا کے ہوتے ہیں"۔ لنچوٹن کے بعد ہمیں ابتدائی انگریز سیاحوں کے اتفاقیہ مشاہدات ملتے ہیں۔ مثلاً ہاکنس نے ۱۶۱۰ء کے قریب آگرہ کے دربار میں کچھ وقت گذارا تھا۔ سلطنت کے وسیع حصوں میں جو بے آئینی پھیلی ہوئی تھی اس کا باعث وہ ان مظالم کو بتاتا ہے جو دیہات کے باشندوں پر کئے جاتے تھے۔ کیونکہ ہر عطیہ دار اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ اس کے عطیات دوسرے کے ہاتھوں میں منتقل ہونے سے قبل جس قدر جلد ممکن ہو سکے خود روپیہ وصول کرلے اور اس عجلت میں وہ دیہاتیوں کو خوب نچوڑتے تھے۔ آگرے اور لاہور کے درمیانی علاقے کی گنجان آبادی کا حال لکھتے ہوئے سالبینک یوں اظہار رائے کرتا ہے کہ مغل بادشاہ کی رعایا میں بعض لوگ بہت دولتمند کہے جاتے ہیں۔ میری مراد اُن لوگوں سے ہے جو اُس سے جاگیریں حاصل کرتے تھے۔ (۲۶۹) لیکن عوام اس قدر غریب ہیں کہ اُن کی اکثر وبیشتر تعداد برہنہ رہتی ہے"۔ جوردین نے آگرے اور سورت کے درمیان کا علاقہ دیکھا تھا۔ وہ اپنا تجربہ کچھ دنوں کے بعد اِس کہاوت کے ذریعہ بیان کرتا ہے کہ ہندوستانی سمندر کی مچھلیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں"۔ اِس کے چند سال بعد سر تھامس رو نے یہی خیال زیادہ تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح کہ سمندر میں مچھلیاں جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھالیتی ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے اجارہ دار، کسان کو لوٹتا ہے۔ رئیس اجارہ دار کو لوٹتا ہے۔

یہ خیالات چند کاروباری اشخاص کے اتفاقی مشاہدات پر مبنی ہیں جنھیں عوام کی حالت سے کوئی خاص سروکار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون زیر بحث پر خاص طور سے خواہ محدود پیمانے پر ہی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنگال کو ایک تجارتی مرکز بنانے کے امکان کے متعلق انگریز تاجروں نے جو کچھ معلوم کیا تھا اس کا خلاصہ بھی قابل لحاظ ہے۔ انھیں یہ بتایا گیا تھا کہ بازار صرف "شرفا" تک محدود تھا جو تعداد میں بہت کم تھے اور یہ کہ اکثر باشندے بہت مفلس تھے۔ اس اثنا میں ہیرارڈ مغربی ساحل کی زندگی کے متعلق اپنے مشاہدات کا خلاصہ ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے کہ "عوام ان تمام ممالک میں بہت ہی حقیر اور بالکل غلاموں کی طرح ذلیل و خوار سمجھے جاتے ہیں"۔ ۱۶۲۴ء کے قریب ڈیلا ویل نے سورت کی بھی ایک ایسی ہی جھلک دکھائی تھی حالانکہ سورت اُس زمانے میں تجارت خارجہ کی حالیہ ترقی سے مستفید ہو رہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ تقریباً ہر شخص بڑے پیمانے پر نوکر چاکر رکھتا تھا۔ لوگ کثیر التعداد تھے اجرتیں بہت ادنیٰ تھیں اور غلاموں کو رکھنے میں کوئی صرفہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چند سال بعد ڈی لیٹ نے انگریزی۔ ڈچ اور پرتگالی ذرائع سے تمام مغلیہ سلطنت کے بارے میں جو واقفیت حاصل کی تھی اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جو ایک باقاعدہ کیفیت کے قریب قریب پہنچتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "ان علاقوں میں عوام کی حالت انتہا درجہ ابتر ہے" اجرتیں ادنیٰ ہیں۔ کاریگروں کو روزانہ ایک مرتبہ پورا کھانا ملتا ہے مکانات نہایت مبتذل اور سازوسامان سے کلیتاً معرا ہیں۔ اور سرما میں گرم رہنے کے لئے لوگوں کے پاس کافی پوشاک نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی مختلف سیاحوں نے اسی قسم کے مشاہدات قلمبند کئے ہیں لیکن اُن کا حوالہ دینے میں اپنے دور متعلقہ سے باہر نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ تاہم یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سترھویں صدی کے اختتام سے قبل لوگوں کا افلاس انگلستان میں اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ اس زمانے کے سیاسی مباحث میں اُس سے استدلال کیا جا سکتا تھا[۱]۔

باب ۸

(۲۷۰)

[۱] "این ۔ سی ۔ لندن کے ایک جولاہے" نے ۱۶۹۷ء میں ایک رسالہ موسومہ "ہماری اپنی مصنوعات کو محفوظ رکھنے کی بڑی ضرورت اور اس کا فائدہ" لکھا تھا جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر اپنے وطن کی صنعتوں کو نقصان

باب

پانچویں فصل

خوراک - لباس - و دیگر تفصیلات

معاصر کیفیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عام باشندوں کی غذائیں آجکل جو اشیا شامل ہیں زیادہ تر وہی اُس زمانے میں بھی موجود تھیں یعنی چاول - موٹا اناج اور دالیں اس کے علاوہ بنگال میں اور سواحل پر مچھلی اور جنوب میں گوشت استعمال کیا جاتا تھا - ٹری مالوہ کے شاہی کیمپ میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے اس بات کو واضح کرتا ہے کہ "ادنی قسم کے لوگ" گیہوں نہیں کھاتے تھے بلکہ "ایک موٹے خوش ذائقہ اناج" کا آٹا استعمال کرتے تھے - جس مقام کا یہ ذکر ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال بالکل درست ہے کہ یہ اشارہ جوار کی طرف ہے - آگرے سے لاہور تک مغلیہ صوبوں میں زراعت کی جو حالت تھی اس سے ہمیں یہ بات بہت ہی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اُس حصہ ملک کے کسانوں میں گیہوں کا استعمال اس قدر عام نہیں تھا جس قدر کہ اب ہے - موٹا اناج کثرت سے پیدا کیا جاتا تھا اور وہ مقامی صرف کے لئے ہوتا تھا - کیونکہ اگر معمولی لوگ گیہوں (۲۸۱) استعمال کرنے کے عادی ہوتے تو پھر دربار کے لیے باہر سے گیہوں درآمد کرنا اسر خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے - لیکن اس بارے میں ہمیں براہ راست کوئی شہادت نہیں مل سکی کیونکہ کسی مستند مصنف نے شمال میں عام باشندوں کی غذا کی کیفیت نہیں بیان کی ہے - مقدار خوراک کا مسئلہ اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اُس کے متعلق بھی کامل سکوت سے کام لیا گیا ہے - ڈی لیٹ غالباً تنہا شخص ہے جس نے سرسری طور پر اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ لوگوں کی خاص غذا کھچڑی تھی اور شام کے وقت تھوڑے سے مکھن کے ساتھ کھائی جاتی تھی لیکن

عوام کی حالت کی یہ سرسری کیفیت اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کی بنا پر موجودہ زمانے کی حالت سے کوئی تفصیلی موازنہ کر سکیں۔ ہم اس سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ آیا عوام اب سے کسی قدر بہتر حالت میں تھے یا کسی قدر ابتر حالت میں۔ تاہم ہمارے خیال میں وہ اس بیان کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ عام حالت میں اُس وقت سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ کہ پندرھویں صدی سے سترھویں صدی تک ہندوستانی آبادی کی بڑی کثرت تھی اور معاصر یورپی معیاروں سے جانچا جائے تو انتہا درجہ مفلس تھی۔ اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ معیار آجکل کے مروجہ معیاروں سے ادنیٰ تھے۔ پس ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی عوام کی معاشی زندگی اسی سطح پر تھی جس سطح پر کہ اب ہے۔ اب ہم یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا افلاس کی مقدار میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے یا نہیں اپنی شہادت کی زیادہ مفصل تنقیح کریں گے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ پہنچانے کے الزام میں سخت حملہ کیا گیا تھا۔ کیونکہ کمپنی مذکور ہندوستان کے ووہ مفلس خستہ حال اور کثیر التعداد باشندوں سے کام لیکر اپنا مال نہایت ارزاں تیار کراتی تھی"۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ برٹش میوزم میں موجود ہے۔ اور انگریزی صنعت و تجارت" مصنفہ کننگھم میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (طریق تجاریت" صفحہ ۲۶۳)۔

باب ۸

راے میں قیاس اُسی خیال کے موافق ہے جو پانچویں باب میں ظاہر کیا گیا تھا۔ یعنی باریک شکر ایک تعیش کی چیز اور رغریبوں کی حیثیت سے بالاتر تھی اور رجو مٹھائیاں تیار کی جاتی تھیں وہ کلیتاً خام پیداوار یعنی گڑ کی ہوتی تھیں۔ مٹھائیاں کس حد تک کھائی جاتی تھیں یہ ایک مبہم سی بات ہے سیاحوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ مٹھائیاں آجکل کی طرح اُس وقت بھی مستقل غذا بنی ہوئی تھیں اور اُس زمانے میں شکر یورپ کے اندر اس قدر بیش خرچ تھی کہ اگر وہ اپنے راستہ کے مقامات پر اس شکل میں شکر کا استعمال نمایاں طور پر دیکھتے تو ضرور اُس کا ذکر کرتے ذاتی طور پر ہمارا رجحان اِس خیال کی طرف ہے کہ مٹھائیوں کے استعمال کی زیادتی ہندوستانی زندگی کی ایک مقابلۃً جدید خصوصیت ہے۔ لیکن اس رائے کی موافقت میں جو شہادت موجود ہے وہ کلیتاً منفی ہے اور اُس سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا حق بجانب نہ ہوگا۔ پس ہم فرض کر سکتے ہیں کہ جہاں تک اِس قسم کی ضمنی اشیا کا تعلق ہے جو کچھ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی غیر اہم ہیں۔ نمک اور باریک شکر کی ارزانی سے استعمال کرنے والے یقیناً مستفید ہوئے ہیں اور گھی کی قیمت چڑھ جانے سے انھیں بلاشبہہ نقصان پہنچا ہے اور یہ امر خلاف قیاس نہیں ہے کہ شیریں پیداواروں کی عام شکلوں کی رسد میں تغیرات واقع ہونے سے ملک کے مختلف حصے مختلف طریقوں پر متاثر ہوئے ہوں۔

مکانات کی گنجایش کی حالت بالکل صاف ہے۔ ہندوستان کے کسی حصے میں عام باشندوں کے مکانات کے متعلق کسی سیاح نے کوئی اچھا لفظ استعمال نہیں کیا ہے اور اُن کے حقارت آمیز بیانات کو یہاں تفصیل کے ساتھ دہرانا بے سود ہے۔ ٹری عام طور پر ہر چیز کے روشن پہلو پر نظر ڈالنے کا عادی ہے۔ لیکن وہ بھی دیہات کے جھونپڑوں کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ "انتہا درجہ حقیر۔ چھوٹے اور تبدیل" تھے اور ہندوستان کے ہر حصے کے متعلق ہمیں اسی قسم کے حالات ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان اب بھی بہت کچھ اس عام الزام کا مستحق ہے۔ ملک کے بعض حصوں اور خاصکر بنگال اور متوسط ہند میں چند سال سے عمارتوں کو موسمی اثرات سے محفوظ کرنے کے معاملہ میں جلد جلد ترقی ہو رہی ہے لیکن اس تبدیلی سے قطع نظر

باب۵

دن کے وقت لوگ دال یا کوئی اور چبینہ چاب لیا کرتے تھے۔ پس ڈی لیٹ کے بیان کے مطابق روزانہ صرف ایک باقاعدہ کھانا ہوتا تھا۔ گو اُس کا بیان عام الفاظ میں ہے تاہم سارے ملک پر اس کا اطلاق کرنا حق بجانب نہ ہوگا۔ اسی طرح ٹیرئیرٹ نے کم خوراکی کے متعلق جو قطعی رائے ظاہر کی ہے اس کا اطلاق بجز مغربی ساحل کے جہاں اس کا مشاہدہ کیا گیا تھا کسی اور مقام پر نہیں کیا جا سکتا۔ ان دو مصنفوں کے علاوہ کوئی اور ایسی شہادت نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ معمولی حالات میں لوگ آجکل کے مقابلہ میں کم یا زیادہ غذا کھاتے تھے۔

شکر۔ نمک اور روغنوں کے بارے میں جو کہ عام باشندوں کی غذا سے خصوصیت کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں کافی مواد موجود نہیں ہے جس سے ایسے نتائج اخذ کئے جا سکیں جو کل ہندوستان پر قابل اطلاق ہوں۔ لیکن ابوالفضل نے ان اشیا کی جو قیمتیں قلمبند کی ہیں اُن سے شاہی کیمپ اور اس کے اطراف و اکناف کی حالت کافی صحت کے ساتھ واضح ہوتی ہے۔ اور اسی سے ہم شمالی ہند کے ایک بڑے وسیع رقبے میں جو حالات مروّج تھے ان کا سرسری اندازہ کر سکتے ہیں ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ روغن یعنی گھی۔ اور ایسے تخم جن سے کھانے کے قابل تیل نکلتا ہے بمقابل اناج کے اب سے بدیہی طور پر ارزاں تھے۔ اور اس لحاظ سے ادنیٰ طبقے گو بہ حیثیت پیدا کرنے والوں کے نہیں تاہم بہ حیثیت صرف کرنے والوں کے بہتر حالت میں تھے۔ ڈی لیٹ نے مکھن کا جو ذکر کیا ہے اور جس کا ہم ابھی حوالہ دے چکے ہیں اس سے بھی ایک حد تک اس نتیجے کی تائید ہوتی ہے اور دوسرے مصنفین نے اتفاقی طور پر جو رائیں ظاہر کی ہیں وہ بھی اسی خیال کے مطابق ہیں۔ اس کے برعکس نمک اور کم از کم بہتر قسم کی شکر بہ مقابل آجکل کے گراں تھی۔ اناج کے معیار سے نمک کی قیمت اب کی سے دوگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ دربار بالعموم نمک کی رسد کے خاص خاص مرکزوں سے مقابلۃً قریب تر واقع ہوتا تھا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جنوب اور مشرق کی طرف ملک کے دور دراز حصوں میں مزید مصارف اور بھی زیادہ ہو جاتے تھے۔ شکر کی حالت اس سے زیادہ مشتبہ ہے لیکن ہماری

۲۷۲

باشندوں کے مکانات کی کیفیت اب بھی انھیں الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے جو آج سے تین صدی قبل اُن کے متعلق استعمال کیے جاتے تھے۔ اور ان کیفیتوں کی بنا پر دولتمندی یا افلاس کا کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ بعض امور سے یہ پتا چلتا ہے کہ شہروں میں عام لوگ جس قسم کے مکانوں میں رہتے ہیں وہ اب پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔ مثلاً آگرے کے متعلق جورڈین نے کہا تھا کہ "شہر کے اکثر حصے میں پھوس کے مکانات ہیں جو سال میں ایک یا دو مرتبہ جلکر زمین کے برابر ہو جاتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اب اُس شہر کے بارے میں یہ بیان صحیح نہ ہوگا۔ لیکن اس صورت میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اُس کا باعث غالباً یہ ہے کہ دارالسلطنت کی اکثر آبادی کو شاہی کیمپ کے ساتھ ساتھ جانے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ لہذا عام لوگ مستقل مکانات تعمیر کرنے کے مصارف برداشت کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔

(۲۸۳)

فرنیچر یا سامان خانہ داری بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ اور اب بھی یہی حالت ہے۔ ڈی لیٹ لکھتا ہے کہ ساز و سامان بہت ہی کم ہوتا تھا۔ چند مٹی کے برتن۔ چارپائیاں اور چھوٹا سا نہایت معمولی بستر بس یہی سارا ساز و سامان تھا۔ اور لنچوٹن مغربی ساحل کے بارے میں لکھتا ہے کہ "لوگوں کا اسباب خانہ داری پتوں کی چٹائیاں ہیں جن پر وہ بیٹھتے بھی ہیں اور لیٹتے بھی ہیں"، اور یہ کہ اُن کی میزیں۔ میز پوش اور رومال کیلے کے پتوں سے بنائے جاتے ہیں یہی حالات اکثر و بیشتر صورتوں میں اب بھی قائم ہیں۔ لیکن جہاں تک دھات کی اشیا اور خاصکر ظروف خانہ داری کا تعلق ہے ایک قطعی تغیر واقع ہوا ہے۔ ہم ایسے سیاحوں سے جو ہمیشہ غیر مانوس اشیاء کے جویا رہتے تھے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ پیتل یا تانبے کے ظروف کی طرف جو آجکل اس قدر عام طور پر دکھائی دیتے ہیں خصوصیت کے ساتھ توجہ کرتے۔ ان ظروف کی شکل اور اُن کی چمک دمک اور اُن کو برتنے کے پرتکلف اور محتاط طریقے یہ سب غیر ملکی اشخاص کے لئے نہایت نمایاں امور ہیں۔ لیکن درحقیقت اس قسم کے ساز و سامان کا بہت ہی شاذ و نادر ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ لنچوٹن لکھتا ہے کہ گووا میں عام لوگ "تانبے کے پیالوں" میں پانی پیتے تھے لیکن پکانے کے لئے

مٹی کے برتن استعمال کرتے تھے۔ اور اسی علاقہ کے دیہاتی در ٹونٹی دار تانبے کے پیالوں میں پانی پیتے ہیں اور یہی اُن کے مکانوں میں تنہا تانبے کی چیز ہوتی ہے"۔ لیکن بجز اس مصنف کے اس قسم کے ظروف کا ہم نے کہیں اور ذکر نہیں سنا۔ نکیٹن نے پندرھویں اور ڈی لیٹ نے سترھویں صدی میں صرف مٹی کے برتنوں کا ذکر کیا ہے[1] حتیٰ کہ ٹری بھی پیتل کے ظروف کے بارے میں کچھ نہیں کہتا حالانکہ وہ اس قدر باخبر تھا کہ اُس نے "پتیلے آہنی پتروں" کا ذکر کیا ہے جو روٹی پکانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ پس اگر اس سے زیادہ نمایاں ظروف اس کے مشاہدے میں آتے تو وہ یقیناً اُن کی طرف بھی مساوی طور پر توجہ کرتا۔ قیمتوں کے متعلق جو واقعات کسی گذشتہ باب میں پیش کئے جا چکے ہیں اُن سے یہ خیال جو مستند اشخاص کے سکوت سے پیدا ہوتا ہے اور بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ عوام بمقابل آجکل کے بہت کم دھات استعمال کرتے تھے۔ یہ یاد ہوگا کہ تانبے کے سکے آجکل کی طرح بہ حیثیت زر وضعی کے نہیں بلکہ اپنی دھات کی قدر کے حساب سے چلتے تھے۔ پس ہر پیالے یا تھال کی قیمت قریب قریب اُس کے ہم وزن سکوں کے برابر ہوتی تھی۔ اکبر کے دارالسلطنت کے پڑوس میں تانبے کی قیمت اناج کی شکل میں اب سے پانچ گنی زیادہ تھی اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ جنوب میں بہت زیادہ ارزاں نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی حالت میں تانبے کے ظروف کا اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہونا جس قدر کہ وہ آجکل نظر آتے ہیں ایک کثیر المقدار مجتمعہ دولت کے قائم مقام ہوگا۔ پس معقول نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے دھات کی چیزیں بالعموم تعیشات میں شامل تھیں اور شاید اتنی ہی پسندیدہ تھیں جتنی کہ اب ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس قدر گراں تھیں کہ جس مقدار میں وہ اب حاصل ہوتی ہیں اسوقت میسر نہیں ہو سکتی تھیں۔

بہ مقابل اسباب خانہ داری کے پوشاک کے متعلق معاصر شہادت

[1] نکیٹن کا مترجم وو ایکسبہ عنصر کے گھڑے" کا حال لکھتا ہے (صفحہ ۱۰)۔ ہمارے خیال میں اس سے مٹی کے برتن کی طرف اشارہ ہے۔

باب ۸

زیادہ افراط کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس کا عام نتیجہ یہ ہے کہ باشندوں کی برہنگی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے نہ یہ کہ جو مختلف کپڑے پہنے جاتے تھے ان کے متعلق مفصل حالات معلوم ہوں۔ پوشاک کی اہمیت کا آب وہوا پر اس قدر انحصار ہے کہ اس کی متعلقہ شہادت کو دو عنوانوں میں تقسیم کرنا زیادہ مناسب ہوگا پہلے اُن مشاہدات کو لیا جائے جو جنوب سے متعلق ہوں جہاں لباس کا مسئلہ زیادہ تر رسمی ہے۔ بعد ازاں شمالی اور متوسط ہند کی طرف توجہ کی جائے جہاں سال کے کچھ حصے میں کافی پوشاک ضروری ہے جنوبی ہند کی برہنگی کی روایت نہایت قدیم ہے۔ چنانچہ چودھویں صدی کے آغاز سے مختلف اشخاص کی تحریروں میں اُس کا پتا ملتا ہے چودھویں صدی کے آغاز میں جان آف مونٹی کوروینو نے لکھا ہے کہ وہاں درزیوں کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ لوگ برہنہ پھرتے تھے اور صرف کمر کو ڈھانکتے تھے۔ پندرھویں صدی میں نیکیٹن کہتا ہے کہ دکن کے ہندو بالکل ننگے اور برہنہ پا رہتے ہیں۔ باربوسا لکھتا ہے کہ دکن کے ہندو کمر سے اوپر برہنہ رہتے ہیں اور سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ورتھما گجرات کے ہندوؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ اُن میں سے بعض تو برہنہ رہتے ہیں اور بقیہ صرف اپنی ستر ڈھانکتے ہیں۔ اور وجیانگر کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ "عوام بجز کمر پر ایک کپڑا باندھ لینے کے بالکل برہنہ پھرتے ہیں"۔ فریچ تحریر کرتا ہے کہ گولکنڈہ میں "مرد اور عورتیں اپنی کمر کے

(۲۷۵) اطراف ایک کپڑا لپیٹ لیتی ہیں اور بغیر کسی اور پوشاک کے چلتی پھرتی ہیں" لنکوٹن کہتا ہے کہ گووا کے قرب وجوار میں کسان "برہنہ پھرتے ہیں۔ صرف ان کے پوشیدہ حصے ایک کپڑے سے ڈھکے ہوتے ہیں"۔ اور اُس شہر کی آبادی کے متعلق ڈیلا ویل لکھتا ہے کہ "لوگ بہ کثرت ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا حصہ غلاموں پر مشتمل ہے۔ یہ سیاہ اور بدنسل لوگ ہیں۔ اکثر و بیشتر برہنہ رہتے ہیں یا بہت ہی بری طرح ملبوس ہوتے ہیں"۔ کالی کٹ کے باشندوں کے متعلق اسی مصنف کی یہ رائے ہے کہ "جہاں تک کپڑوں کا تعلق ہے اِن لوگوں کو اُس کی بہت کم ضرورت ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں بالکل برہنہ رہتے ہیں۔ البتہ سوتی یا ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا کمر سے گھٹنوں تک لٹکتا رہتا ہے"۔ ڈی لیٹ عوام کے کپڑوں کی حالت بیان نہیں کرتا بلکہ وہ اُن کے بستروں کی قلت کو پیش نظر

رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ "وہ سخت گرمی میں تو آرام وہ ہوتے ہیں لیکن جب موسم درحقیقت سرد ہو جاتا ہے تو کسی کام کے نہیں رہتے"۔ یہ رائے گویا سابقہ تمام شاہدات کا خلاصہ ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کوٹ یا اوپر کے لباس کا کوئی ذکر نہیں ہے آجکل یہ چیزیں گو کلیتاً نہیں تاہم بہت کچھ عام ہو گئی ہیں۔

جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے سب سے پہلے تو ہمارے سامنے شاہنشاہ بابر کے مشاہدات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "کسان اور ادنی حیثیت کے لوگ برہنہ پھرتے ہیں۔ وہ ایک چیز جو لنگوٹی کہلاتی ہے باندھ لیتے ہیں یہ ستر ڈھانکنے کا ایک چیتھڑا ہے جو ناف سے دو بالشت نیچے لٹکتا ہے۔ اس لٹکتے ہوئے چیتھڑے کی گرہ سے ایک اور چیتھڑا بندھا ہوتا ہے جسے رانوں کے بیچ میں سے لگاکر پیچھے کی طرف مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ عورتیں بھی ایک کپڑا (لنگ) باندھتی ہیں جس کا نصف حصہ تو کمر کے اطراف لپٹا ہوتا ہے اور بقیہ نصف سر کے اوپر ڈالا جاتا ہے"۔ یہ کیفیت اس قدر مفصل ہے کہ اگر ہم اس کو کلی تسلیم کرلیں تو بجا ہے۔ سولھویں صدی کے اختتام پر فیچ نے اُن کپڑوں کے کچھ حالات لکھے ہیں جو گنگا کے میدانی علاقے میں پہنے جاتے تھے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بنارس میں "لوگ بالکل برہنہ رہتے ہیں بجز تھوڑے سے کپڑے کے جو کمر کے اطراف باندھا جاتا ہے۔ موسم سرما میں جبکہ ہمارے یہاں مئی کا مہینہ ہوتا ہے[1] لوگ روئی کے جبّے اور روئی کی ٹوپیاں پہنتے ہیں"۔ قدیم دار السلطنت غور کے قریب ٹانڈا (۲۷۶) مقام پر وہ لکھتا ہے کہ "لوگ اپنی کمر کے اطراف تھوڑا سا کپڑا باندھ کر برہنہ پھرتے رہتے ہیں"۔ ایسے ہی جملے وہ بانڈگان بکولا کے متعلق بھی استعمال کرتا ہے جو کہ چٹا گانگ کے

---

[1] فیچ اپنی تاریخیں تفصیل سے نہیں بیان کرتا۔ لیکن وہ آگرہ سے ستمبر کے ختم پر روانہ ہوا اور پانچ مہینوں میں بنگال پہنچا۔ پس وہ اصلی سرما کے زمانے میں بنارس میں ہوگا۔ مئی کے مہینہ کا حوالہ ایک بدیہی غلطی ہے۔ مغربی ساحل پر پرتگالیوں نے بارش کے موسم کو سرما کہا تھا۔ اور اُس جانب سے جو سیاح ہندوستان میں داخل ہوئے وہ کبھی کبھی یہ کہتے ہیں کہ سرما مئی کے مہینہ میں شروع ہوتا ہے۔ ہمارا گمان ہے کہ جب فیچ نے یہ جملہ معترضہ لکھا تو اس کے ذہن میں اس لفظ کا یہی استعمال تھا۔ ورنہ وہ پڑھنے والے کو بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے!

بابـ۶ قریب واقع تھا۔ اور شہر سونارگاؤں کے بارے میں جو دارالسلطنت تھا وہ کہتا ہے کہ لوگ " اپنے آگے کی طرف تھوڑا سا کپڑا لگا لیتے ہیں اور ان کا باقی تمام بدن برہنہ رہتا ہے"! بنگال کے متعلق اِن اقوال کی تصدیق آئین اکبری کے اِس بیان سے ہوتی ہے کہ مرد عورتیں زیادہ تر برہنہ رہتی ہیں اور صرف ایک کپڑا پہنتی ہیں۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لئے یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ ابوالفضل نے سلطنت کے بقیہ صوبوں کے بارے میں اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ اِن صوبوں کی حالت کے متعلق ہمارا انحصار ان بیانات پر ہے جن کا ہم ابھی حوالہ دیچکے ہیں و نیز ساکبینک کے ایک اتفاقی مشاہدہ پر جو آگرے اور لاہور کے درمیانی علاقے سے متعلق ہے ساالبینک لکھتا ہے کہ "عوام اس قدر مفلس ہیں کہ اُن کی سب سے بڑی تعداد اپنا سارا بدن برہنہ رکھتی ہے بجز اپنی شرمگاہوں کے جنھیں وہ ایک روئی کے کپڑے سے ڈھانک لیتے ہیں"۔ اِن تمام حالات کی سب سے نمایاں خصوصیت بدن کے بالائی حصے کے لئے کسی پوشش کی عدم موجودگی ہے اور اِس لحاظ سے یہ بیانات موجودہ زمانے میں شمالی ہندوستان پر یقیناً ناقابل اطلاق ہیں۔ نیز ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اگر بابر جیسا لکھنے والا اُن پگڑیوں کا مشاہدہ کرتا جو آجکل پنجاب میں اس قدر عمومیت کے ساتھ پہنی جاتی ہیں تو وہ لازمی طور پر اُن کی کیفیت بیان کرتا۔ پس یہ نتیجہ معقول معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر کمتر کپڑا پہنا جاتا تھا۔ ادنیٰ لباس کے استعمال کا ہندوستان کے کسی حصے میں ہم نے کوئی ذکر نہیں سنا۔ اور نہ ہمیں یہ پتہ لگا کہ عوام کمبل اپنے ساتھ رکھتے یا استعمال کرتے تھے۔

برہنگی کی روایت جنوب میں قدموں تک پہنچتی ہے چنانچہ جان آف منی کو نے خبر دی ہے کہ موچیوں کی بھی اُتنی ہی کم ضرورت تھی جتنی کہ درزیوں کی۔ اِس کے علاوہ

ملہ یورپ سے آنے والے سیاح اس زمانے میں لفظ "Linen" کا اطلاق بسا اوقات روئی کے کپڑے پر کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اِن دو کپڑوں میں (Linen) سے زیادہ مانوس تھے۔ مثلاً ڈیلاویل کہتا ہے۔ (صفحہ ۴۳) کہ "لینن بالکل تماماً سٹ یا روئی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں کتان ملتا ہی نہیں"۔

باب۴ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں نیکیٹن نے کہا ہے کہ دکن کے لوگ برہنہ پا چلا کرتے تھے یہیں یہی واقعہ وجیانگر کے "اکثر یا قریب قریب تمام باشندوں" کے متعلق بیان کرتا ہے۔ اور چونکہ نیچو ٹن گوا کے قرب وجوار میں بہتر طبقوں کے جوتوں کا حال بیان کرتا (۲۴۸) ہے اس لئے ہم ادنیٰ طبقوں کے بارے میں اُس کی خاموشی کو معنی خیز سمجھتے ہیں۔

جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے اس بارے میں جس قدر شہادت موجود ہے وہ قریب قریب مکمل طور پر منفی ہے۔ بار بوسا کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں شہر بنگالہ میں عام لوگ جوتے پہنتے تھے۔ لیکن اس بیان کو مستثنیٰ کر کے ہم نے زیدا کے شمال کہیں کسی مقام پر جوتے کا ذکر نہیں سنا اور اگرچہ یہ کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہے تاہم بابر جیسے مصنف کا سکوت ہمارے خیال میں معنی خیز ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ اُس زمانے میں بھی جوتے اسی کثرت کے ساتھ پہنے جاتے ہوں جیسے کہ اب پہنے جاتے ہیں۔ لیکن قیاس اُس کے مخالف ہے۔ جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ اگر اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر جوتے مقابلۃً کم پہنے جاتے تھے تو اس کا باعث چمڑے کی گراں قیمت نہیں تھی۔ کیونکہ ہم کسی سابقہ باب میں معلوم کر چکے ہیں کہ چمڑا کم از کم خام حالت میں نہایت افراط سے موجود تھا۔ لہٰذا ہمیں یہ فرض کرنا چاہئے کہ گو اس کی قیمت بہت کم تھی تاہم لوگوں کے ذرائع اس قدر نا کافی تھے کہ جو اشیا مایحتاج زندگی میں شامل نہیں تھیں ان پر وہ کچھ نہیں خرچ کر سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ملبوسات میں خام پیداوار کی قیمت اہمیت رکھتی ہو۔ چنانچہ ابوالفضل نے قیمتوں کے جو اعداد و شمار بہم پہنچائے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوتی اور اونی دونوں قسم کی اشیا بہ شکل انآج آب سے زیادہ گراں تھیں۔ لیکن وہ بجائے خود اس بات کے لئے کافی نہیں ہیں کہ اُن سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ پس ہم اُن کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا سیاحوں کے بیانات سے انکشاف ہوتا ہے اور عوام کی برہنگی پر جو اصرار کیا گیا ہے وہ اُن کی بدولت زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

دوسرے معاملات میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اکبر کے زمانے میں بھی

کم و بیش اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے جس طرح کہ وہ آجکل بسر کرتے ہیں۔ اور دونوں زمانوں میں بہ لحاظ مقدار کے اُن کے مصارف کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ جاتراؤں اور مقدس مقامات کی زیارت کا رواج بہت عام تھا۔ اور تیز رفتار ذرایع آمدورفت کی عدم موجودگی میں اُس کے مصارف آجکل سے زیادہ ہوتے ہوں گے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ کتنے لوگ ایسے سفر اختیار کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ شادیاں اسی طریقے پر منائی جاتی تھیں جس سے ہم اب بھی مانوس ہیں۔ لیکن جو مصارف لاحق ہوتے تھے ہم ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جواہرات اور دھات کے زیور بہ کثرت پہنے جاتے تھے۔ لیکن کس حدتک یہ عادت مروج تھی اس کے اظہار کے لئے بھی کوئی مواد موجود نہیں ہے۔ لہذا ہماری واقفیت کا خلاصہ ڈیلاول کے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "جن لوگوں کے پاس وہ موجود ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو بہت سی طلائی گلکاریوں اور زیورات سے آراستہ کرتے ہیں"۔ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ معمولی آرام کی چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً جیبی چاقو۔ گھڑیاں۔ آئینے وغیرہ جو آجکل ہر مقام پر دکھائی دیتی ہیں اس وقت اس قدر افراط سے نہیں ملتی تھیں اور اور اُن پر روپیہ خرچ کرنے کا امکان مقابلۃً بہت کم تھا۔ یہ چیزیں اُس وقت بازار میں نہیں تھیں اور نہ لوگوں کو ان کی عدم موجودگی کا کچھ احساس ہی تھا۔ مسکرات۔ افیون اور دوائیں ملک کے اکثر حصوں میں باآسانی دستیاب ہوتی تھیں کیونکہ جیسا کہ ہم کسی سابقہ باب میں کہہ چکے ہیں اکبر کی عائد کردہ موانعات پر غالباً باضابطہ عملدرآمد نہیں ہوتا تھا۔ لیکن عوام کے بارے میں ہمیں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال اس قدر بڑے پیمانے پر نہیں تھا کہ غیر ملکی سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ تمباکو ابھی تک عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا تھا اور نہ ہمیں کسی بات سے یہ پتا چل سکا کہ عام لوگ کوئی دیسی تمباکو پیا کرتے تھے۔ پس بہ ظاہر ہمیں یہی نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ تمباکو نوشی کی عادت ایک مقابلۃً نئی بات ہے۔ یہ خیال بالکل بجا ہے کہ مقدمہ بازی پر روپیہ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ پیشہ ور وکلا موجود نہ تھے۔ اور ہمیں شبہ ہے کہ آیا اُس زمانے کے اعلیٰ عہدہ دار ایسے اشخاص کے تنازعات کی تفتیش میں کافی وقت صرف کرتے تھے جو بڑی مقداروں میں رشوتیں

(۲۷۸)

باب ۸

نہیں دے سکتے تھے ۔ یا انھیں اس کے برعکس مختلف طبقوں کے چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کے مطالبات پورا کرنے میں غالباً اب سے زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا لیکن اس عنوان کے اندر ضروری خرچ کا ٹھیک اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔

باشندوں کے حالات کی کیفیت مکمل کرنے کے لئے چند الفاظ ان فوائد کے بارے میں کہنا ضروری ہیں جو بغیر کچھ ادا کئے ہوئے انھیں حاصل ہو سکتے تھے ۔ جہاں تک مملکت کی جدوجہد کا تعلق ہے اس قسم کے فوائد بہت ہی قلیل معلوم ہوتے ہیں ۔ ملک میں چند کچی سڑکیں اور بہت تھوڑے پل موجود تھے ۔ تنظیم یافتہ طبی امداد کا قطعاً کوئی وجود نہ تھا ۔ عوام کے لئے تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا[1] اور نہ ابھی وہ وقت آیا تھا کہ صنعتی یا زرعی ترقی کی تجویزیں عمل میں لائی جائیں یا جانوروں کے معالجے کا اہتمام کیا جائے یا سرکاری جدوجہد کی دوسری جدید شکلوں پر عمل کیا جائے ۔ (۲۶۹) ان تمام معاملات میں عوام معاشی نقطۂ نظر سے آجکل بہت بہتر حالت میں ہیں ۔ خیراتی اوقاف سے فائدے حاصل کرنے کا مسئلہ پورے طور پر واضح نہیں ہے ۔ لیکن اگر باقیماندہ ادارات کی بنا پر فیصلہ کیا جائے تو ہم اپنا رجحان اس نتیجے کی طرف پاتے ہیں کہ عام باشندوں کے لئے یہ فوائد کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ خاص خاص مقامات پر یا آبادی کے خاص خاص طبقوں کے حق میں ان فوائد کی مقدار کافی ہوتی ہوگی عوام کو تو بہ حیثیت مجموعی اپنی ضروریات کا خود ہی اہتمام کرنا پڑتا تھا ۔

اس باب کے شروع میں ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جو جزئی اور منتشر مشاہدات ہمارے پاس موجود ہیں ان کو جوڑ کر ہم ایک کم و بیش مکمل تصویر تیار کر سکتے ہیں جس سے اکبر کے دور حکومت کے اختتام پر ہندوستان کی معاشی زندگی کا

[1] مسٹر این ۔ ال ۔ لا نے اپنی کتاب (مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے اندر علم و ادب کی ترقی ۔ صفحہ ۱۶۰ ۔ ۱۶۲) میں اکبر کے جاری کئے ہوئے اصلاح یافتہ نظام تعلیم پر جو اظہار رائے کیا ہے ہم اس کا پورا احترام کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں ۔ ابوالفضل کی کتاب کے جس باب پر مسٹر لا نے بھروسہ کیا ہے اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت کوئی تجویز عمل میں آئی تھی ۔ یہ سچ ہے کہ اکبر نے ایک جدید اور انتہا درجہ بلند حوصلہ نصاب تجویز کیا تھا لیکن جیسا کہ ہم تیسرے باب کے کسی تعلیقہ میں بتا چکے ہیں انتظامی تفصیلات کی عدم موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ معاملہ نہیں تک پہنچکر ختم ہو گیا تھا ۔

باب۳

کچھ اندازہ ہو سکے۔ اس طور پر ہمیں جو تصویر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اعلیٰ طبقے تعداد میں بہت کم اور زیادہ تر غیر ملکی اشخاص پر مشتمل تھے۔ معقول ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اُن کی آمدنیاں بہت زیادہ تھیں۔ اور وہ بالعموم تعیش اور نمائش کی چیزوں پر اسراف کے ساتھ خرچ کی جاتی تھیں۔ ملک کے معاشی نشو ونما کے لئے یہ لوگ عملاً کچھ نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کی آمدنی کا جو حصہ خرچ نہیں ہوتا تھا وہ غیر مفید شکلوں میں مدفون رہتا تھا۔ اُن کی جدوجہد سے جو تنہا فائدہ برآمد ہوتا تھا وہ بالواسطہ تھا۔ یہ لوگ محض نئی نئی چیزیں حاصل کرنے کے شوق میں غیر ملکی تاجروں کی سرپرستی کرتے تھے جس کی بدولت تجارت کے نئے نئے راستے کھلنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی اور اس طرح آئندہ معاشی ترقیوں کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ سرپرستی حاصل کرکے ساحل کے تاجروں نے خود بھی اُنھی کے مشابہ طرز زندگی اختیار کرلیا۔ لیکن اور مقامات پر تاجروں یا کاروباری اشخاص کے لئے کھلے بندوں روپیہ خرچ کرنا خطرناک تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ بھی دوسرے متوسط طبقوں کی طرح غیر معروف بلکہ کم خرچ زندگی بسر کرتے تھے۔ آبادی کی بہت بڑی تعداد اسی معاشی سطح پر زندگی بسر کرتی تھی جس پر کہ وہ اب نظر آتی ہے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آیا انھیں کھانے کے لئے اب سے کم ملتا تھا یا زیادہ۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کپڑے اُن کے پاس بمقابل آجکل کے کم ہوتے تھے اور جہاں تک ظروف خانہ داری اور چھوٹی موٹی اشیائے راحت کا تعلق ہے اُن کی حالت یقیناً اب سے زیادہ خراب تھی۔ اور قومی خدمات اور فوائد کی شکل میں تو انھیں (۲۸۰) قطعاً کوئی بات حاصل نہیں تھی۔ یہ تو خود تصویر ہے۔ اب اُس کے پس منظر میں قحط سالی کی تاریکی ہے۔ اور خود اس لفظ کے معنی گذشتہ ایک صدی کے عرصے میں متغیر ہو چکے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ایک طویل مدت تک اُس سے مراد ایک مکمل گو عارضی معاشی ابتری ہوتی تھی جس کی نمایاں خصوصیات خواہ کتنی ہی ناگوار بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتیں مکانات کی بربادی۔ بچوں کا غلاموں کی حیثیت سے

باب ۸

فروخت ہونا۔ خوراک کی تلاش میں مایوس کن سرگردانی۔ اور بالآخر بھوکوں مرنا یا اگر ممکن ہو تو عدم خوری اختیار کرنا۔ یہ تھے اس دور کی قحط سالی کے لوازم۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ اس پس منظر کو مقابل رکھکر آگرے یا وجیانگر کی عظمت اور شان و شوکت کا معائنہ کریں۔

اسنادِ برائے باب (۷)

پہلی فصل ۔ ندارد

دوسری فصل ۔ برف کی رسد کے متعلق تفصیلی خبریں آئین میں دی گئی ہیں (ترجمہ ۱ ۔ ۵۶) میوے کے لئے ملاحظہ ہو ۱ ۔ ۶۵ ۔ نیز توزک بابری (۳ ۔ ۵۰۳)
غذا کے طرز کے لئے ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۱ ۔ ۵۷) ۔ ٹیری (۱۹۵) اور منریق (۶۶)
آصف خاں کی ضیافت کی جو کیفیت ٹیری نے بیان کی ہے وہ ونسنٹ اسمتھ کی کتاب "اکبر" (۵۰۴) میں مفصل طور پر نقل کی گئی ہے۔

لباس کے متعلق جو تفصیلی باتیں بیان کی گئی ہیں وہ آئین (ترجمہ ۱ ۔ ۲۸ اور ۸۷ تا ۹۴) سے ماخوذ ہیں۔ اور اصطبل سے متعلق خبریں ۱ ۔ ۱۱۸ ۔ ۱۲۶ و ۱۲۹ ۔ ۱۴۳ سے
جوئے اور کھیل کے لئے ملاحظہ ہو ۱ ۔ ۲۱۹ ۔ خیموں کی کیفیت ۱ ۔ ۴۵ تا ۵۵ میں بیان کی گئی ہے۔

مغلیہ دربار میں ملازمین کے عملے کے متعلق تفصیلی حالات تیسرے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لئے حوالے یہ ہیں: ڈیلا ویل (۴۲)۔ تھیونوٹ (۳۰۷)۔ پیرارڈ (۲ ۔ ۷۵ ۔ ۸۰ ۔ ۱۳۵)۔ جے (۷۵۰)۔ ڈی لیٹ کا عام نتیجہ صفحہ ۱۱۹ پر درج ہے اور اس بارے میں رو کے خیالات خطوط موصولہ (۶ ۔ ۲۹۸) میں موجود ہیں۔

تحائف کے لئے ملاحظہ ہو توزک (۱ ۔ ۱۰۳ و ۱۳۲ و ۱۳۴ وغیرہ) جے (۲۳ ۔ ۶۷ ۔ ۹۶ و ۹۹)۔ رو (۱۱۰)۔ سیول (۲۸۱)۔ مانریق (۶۴)۔ لیکن حوالوں کی یہ فہرست بالکل نامکمل ہے متن میں برنیر کے جو حوالے دیے گئے ہیں ان کا اشارہ

باب ۵

صفحات ۲۱۲ و ۲۲۶ و ۲۳۰ کی طرف ہے۔ راجہ بھگوان داس نے جو جہیز فراہم کیا تھا اس کی کیفیت بدآیونی (۲-۳۵۲) میں موجود ہے۔ ٹیورنیر خصوصیت کے ساتھ اُن مشکلات کا ذکر کرتا ہے (صفحہ ۷۵) جو ملک سے باہر روپیہ لیجانے میں پیش آتی تھیں۔ اور بار بزیق اس قاعدہ کی اہمیت کی مثال پیش کرتا ہے۔

تیسری فصل ۔۔ معاشی نقطۂ نظر سے وقایع نگاروں کی وسعتِ نظر کی مثالیں ایلیٹ کی تاریخ (۴-۲۴۶ و ۴۷۶) میں ملیں گی۔ اظہار شان و شوکت کے خطرات کا ٹری (۳۹۱) اور برنیر (۲۲۳ و ۲۲۹) نے حوالہ دیا ہے۔ مغربی ساحل کے تاجروں کے بارے میں ملاحظہ ہو بار بوسا (۲۸۰ و ۳۴۲) اور ڈیلاویل (۴۲)

چوتھی فصل ۔۔ حالات قحط کے حوالے یہ ہیں بار بوسا (۳۵۸)۔ ہابسن جابسن (Xerafine) ایلیٹ کی تاریخ (۵-۴۹۰ اور ۶-۱۹۳)۔ پرچاس (۲-۱۰-۱۷۰۳) اور لنچوٹن (سی-۱۴) یہ فہرست کسی طرح مکمل نہیں ہے معمولی حالات کے بارے میں جن عبارتوں کے اقتباس پیش کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں ہیجر (۱۴)، بار بوسا (۲۹۵-۳۳۰-۳۳۹)۔ ورتھما (۱۲۹-۱۳۲-۱۳۶) سیویل (۳۷۹)۔ لنچوٹن (سی-۳۳ و ۳۹)۔ پرچاس (۱-۳-۲۲۱) خطوط موصولہ (۴-۳۰۷ و ۶-۱۸۲)۔ جورڈین (۱۶۲)۔ رو (۳۹۷)۔ پیرارڈ (ترجمہ ۱-۳۸۶)۔ ڈیلاویل (۴۲)۔ (۲۸۱)

پانچویں فصل ۔۔ جس قسم کی غذا معمولی طور پر استعمال کی جاتی تھی اس کے بارے میں ملاحظہ ہو آئین (ترجمہ ۲-۱۲۲ و ۱۵۱ و ۲۳۹ و ۳۳۸) نیز بار بوسا (۲۹۱) سیویل (۳۶۶)۔ ڈیلاویل (۴۲)۔ لنچوٹن (سی-۳۳) اور ٹری (۱۹۸)۔ مقدار کے بارے میں ملاحظہ ہو ڈی لیٹ (۱۱۶) اشیائے متعلقہ خوراک اور لباس کی قیمتوں کے لئے ملاحظہ ہو جرنل رایل ایشاٹک سوسائٹی بابتہ اکتوبر ۱۹۱۸ء (۳۷۵ و مابعد)

مکانات کے متعلق منجملہ اور اسناد کے ملاحظہ ہو مانسریٹ۔ پرچاس (۲-۱۰-۱۷۳۲-۱۷۳۵) ٹری (۱۷۹)۔ تھیونوٹ (۴۸-۱۰۴-۱۲۹-۳۰۱) اور آگرہ کے مکانات کے متعلق جورڈین (۱۶۲)۔ فرنیچر کے بارے میں ملاحظہ ہو ڈی لیٹ (۱۱۶)۔ لنچوٹن (سی-۳۳ و ۳۹) ہیجر (۱۷) اور ٹری (۱۹۸)۔

جنوبی ہند میں لباس کے متعلق یہ حوالے ہیں: "کیتھے" مصنفۂ یول (۳-۵۰) میجر (۱۲) - بار بوسا (۲۹۰) - ورتھما (۱۲۹) - لنچوٹن (سی-۳۹) - ڈیلاویل (۱۵۷-۳۶۰) - پرچاس (۲-۱۰-۱۷۳۲) اور ڈی لیٹ (۱۱۶) - شمال کے بارے میں بابر (۵۱۹) - آئین (ترجمہ ۲-۱۲۲) - پرچاس (۲-۱۰-۱۷۳۵-۱۷۳۷) - خطوط موصولہ (۶-۱۸۶) - جوتوں کے متعلق ملاحظہ ہو "کیتھے" مصنفۂ یول (۳-۵۷) - میجر (۱۲) - سیویل (۲۵۲) - لنچوٹن (سی ۲۸۷ و ۲۹) اور باربوسا (۳۶۵) -

جاتراؤں اور زیارت کے مقامات مقدسہ کے بارے میں ملاحظہ ہو ہئے (۱۹۷) - شادیوں کے بارے میں پرچاس (۲-۱۰-۱۷۳۲) زیورات کے بارے میں ڈیلاویل (۶۵) -

(۲۸۲)

آٹھواں باب

ہندوستان کی دولت

پہلی فصل

معاصر خیالات

آیا ہندوستان اکبر کے زمانے میں ایک دولتمند ملک تھا اس سوال کا جواب مختلف طریقوں پر دیا جا سکتا ہے اور اُس کا انحصار دولتِ اقوام کی اس کسوٹی پر ہوگا جو ہم منتخب کریں گے۔ ہمارے خیال میں اُس دور کے عام یورپی اشخاص تو دولتمندی کی شہادت میں قیمتی اشیا کے بدیہی ذخیرے کو پیش کرتے۔ مدبرین سیاست اور ماہران مالیات سونے چاندی کی مستقل درآمد اور زیادتی پر خاص زور دیتے۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں معیار اب متروک ہو چکے ہیں۔ تاہم قبل اس کے کہ زمانہ موجودہ کے معاشیین کے نقطۂ خیال سے اِس مسئلے کی تنقیح کی جائے ان کی تاریخی اہمیت کا یہ اقتضا ہے کہ مختصر طور پر اُن کی تشریح کی جائے۔

جیسا کہ ہم پہلے باب میں کہہ چکے ہیں سولھویں صدی میں دنیا کے اس وسیع حصے کے متعلق جو عام اصطلاح میں انڈیز کہلاتا تھا یورپ کے عام لوگوں کے خیالات بہت ہی مبہم تھے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ صرف اِس قدر جانتے تھے کہ یہ چند دور دراز

حاشیہ

ممالک ہیں جہاں پر مصالحے اور اسی قسم کی دوسری اشیا جو انھیں اور اُن کے پڑوسیوں کو کافی طور پر میسر نہیں تھیں غیر محدود مقداروں میں موجود تھیں۔ یورپ میں ان اشیا کی بہت اعلیٰ قیمتیں ملتی تھیں لیکن اپنے اصلی مقامات میں اُن کی بہت کم قدر کی جاتی تھی مغربی ممالک کے لوگ جو ان چیزوں کو استعمال کرتے تھے اُن کی اس کم قدری کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ انڈیز میں مصالحے اور اسی قسم کی اشیا کی رسد بہت زیادہ تھی۔ درباروں اور بادشاہوں کی شان و شوکت کے قصے جو لازمی طور پر مبالغہ آمیز نہیں ہوتے تھے سیاحوں سے معلوم ہوتے تھے۔ اور ہندوستان کی دولتمندی کے متعلق عام طور پر جو خیال پھیلا ہوا تھا وہ کسی مزید توثیق کا محتاج نہ تھا۔ باشندگان مغرب کے دلوں میں یہ خیال جس مضبوطی کے ساتھ جما ہوا تھا اس کا بہترین ثبوت شاید اس واقعے سے ملتا ہے کہ ہندوستان کی ارزاں محنت کا اندیشہ مسلّم ہونے کے بعد بھی اُس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان کے باشندے تو بدترین افلاس میں مبتلا تھے لیکن ہندوستان کی دولتمندی کا افسانہ حسب دستور برقرار تھا۔ (۲۰۳)

دور اکبر اعظم کے مدبرین سیاست اور ماہرین مالیات نے اس کی بجائے جو دوسرا معیار اختیار کیا تھا اس کی صحت پر آج بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو ان کا فیصلہ بلاشبہ صحیح تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں سونے اور چاندی کی درآمد دنیا کی تجارت کی ایک دوامی اور نمایاں خصوصیت ہے۔ سولھویں صدی کی طرح روما کی شاہنشاہی کے ابتدائی ایام میں بھی ہندوستان اپنی پیداوار فروخت کرنے کا شوقین تھا۔ لیکن اس کے معاوضے میں بہت کم مال تجارت لینے کا خواہشمند اور آجکل کی طرح اُسوقت بھی توازن تجارت ٹھیک کرنے کے لئے سونا چاندی جس کثرت کے ساتھ درآمد کرنا پڑتا تھا وہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ جس دور سے ہمیں سروکار ہے۔ اُس وقت اُن سیاحوں کے نزدیک جو کاروبار میں بھی حصہ لیتے تھے یہ مبحث بہت ہی عام تھا۔ چنانچہ برنیر نے کالبرٹ کو جو خط لکھا تھا اسمیں اس مضمون پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اور مصنفین نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لئے سر تھامس رو کی اس رائے کا حوالہ شاید کافی ہے کہ "ایشیا کو دولتمند بنانے کے لئے

باب ۵

یورپ کا خون بہتا ہے" معاصر نقطۂ خیال کی یہ ایک مختصر مثال ہے۔
سونے چاندی کی درآمد مختلف ذرائع سے ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں پرتگال سے سرکاری برآمد کم و بیش پورے طور پر چاندی کی شکل میں ہوتی تھی۔ اور یہ چاندی ہندوستانی اشیا پر خرچ کی جاتی تھی جو مشرق اور مغرب دونوں طرف جانے والے جہازوں پر لادی جاتی تھی۔ بحیرۂ احمر کی تجارت سے کثیر رقمیں حاصل ہوتی تھیں کیونکہ ہندوستانی اشیائے برآمد کا ایک بڑا حصہ موچا میں نقد کے عوض فروخت کیا جاتا تھا۔ چاندی کی بہم رسانی میں ایرانی تجارت کا بہت بڑا حصہ تھا اور سوفالہ اور موزمبیق کی پرتگالی آبادیوں کا خاص مقصد وہ سونا تھا جو مشرقی افریقہ میں حاصل ہوتا تھا۔ مغرب کی طرح مشرق سے بھی چاندی اور سونا لایا جاتا تھا چنانچہ پیگو۔ سیام۔ مجمع الجزائر اور جاپان غرض چین کے سوا جہاں برآمد ممنوع تھی تمام ممالک سے درآمد جاری تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی اسی قسم کا قاعدہ نافذ تھا۔ جیسا کہ ٹیری نے لکھا ہے ہر ایسی قوم کے لوگوں کی "بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی جو اپنا سونا چاندی لا کر دوسرے کا تجارتی مال لیجاتے تھے۔ لیکن وہاں سے چاندی کی کچھ مقدار روانہ کر دینا یہ ایک بڑا جرم تصور کیا جاتا تھا جس کا جواب دینا آسان نہ تھا" پس درآمد (۲۸۳) تو نہایت کثیر اور باقاعدہ تھی لیکن برآمد اگر کچھ تھی بھی تو نہایت قلیل مقداروں میں۔ نتیجہ یہ کہ ملک کے سابقہ ذخیرہ میں متواتر اضافہ ہوتا تھا۔ یہ درآمد شدہ مقداریں پہنچتی کہاں تھیں معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت ہی اہم سوال ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو بتدریج تسکیک میں لگ جاتا تھا جس کی بدولت شمال میں زیادہ تر چاندی اور جنوب میں چاندی اور سونا دونوں صرف ہوتے تھے۔ صنعتوں میں بھی ایک بڑی مقدار خرچ ہوتی تھی۔ مثلاً زیادہ قیمتی سوتی کپڑوں میں طلائی تاگ لگایا جاتا تھا۔ دولتمند گھرانوں میں چاندی کی رکابیاں عام تھیں۔ ہر شخص جو مقدور رکھتا زیور پہنتا تھا اور جانور و بیل گاڑیوں اور دوسری اشیائے تعیش پر بہ غرض نمائش یہ دونوں دھاتیں صرف کرنے کی بہت وسیع گنجائش موجود تھی۔ لیکن ان اغراض پر درآمد شدہ مقدار کا صرف ایک حصہ خرچ ہوتا تھا اور بقیہ حصہ بہ طور ذخیرے کے رکھ دیا جاتا تھا کیونکہ حالات حاضرہ اس بات میں مانع ہوتے تھے کہ ان دھاتوں کو پیدائش دولت کے کام میں لگایا جائے۔

باب بڑے بڑے دفینوں کا اجتماع ہندو تہذیب کی ایک لازمی خصوصیت تھی۔ یہ دفینے مندروں اور درباروں میں اکٹھا کئے جاتے تھے۔ ہر ایک مذہبی ادارہ اپنی اپنی مقبوضہ مقدار میں متواتر اضافہ کرتا تھا اور یہ افسانہ کہ کوئی بادشاہ کبھی اپنے پیشروؤں کے خزانے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا سولھویں صدی میں اس قدر عالمگیر تھا کہ وہ درحقیقت واقعات کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً پیس تحریر کرتا ہے کہ وجیانگر میں ہر بادشاہ کی وفات کے بعد خزانہ پر مُہر لگا دی جاتی تھی جو صرف سخت ضرورت کے وقت توڑی جاتی تھی۔ اور باربر کہتا ہے کہ بنگالیوں کے نزدیک خزانہ جمع کرنا ایک نشانِ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کسی نئے حکمراں کے لئے اپنے پیشروؤں کی مجتمعہ دولت خرچ کر دینا باعث ذلت خیال کیا جاتا تھا۔ ان دفینوں کی مقدار کے متعلق بہترین شہادت وہ واقفیت ہے جو وقتاً فوقتاً اُن کی شدید بربادی کے بارے میں ہمیں حاصل ہے۔ مثلاً گیارھویں اور بارھویں صدی میں ابتدائی مسلمان حملہ آوروں نے شمالی ہند کو قریب قریب پورے طور پر لوٹ لیا تھا اور جب تک کہ علاء الدین نے جنوب کے ہندوؤں پر فوج کشیاں کر کے اس کی تلافی نہ کر دی وہاں سونے چاندی کا ذخیرہ بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ علاء الدین کی مُہموں میں سپاہیوں نے چاندی پھینکدی تھی کیونکہ زیادہ وزنی ہونے سے اس کا لیجانا بہت مشکل تھا اور سونا۔ موتی۔ ہیرے۔ الماس منوں لُوٹے گئے تھے۔ پندرھویں صدی میں شمالی ہند کا ذخیرہ پھر خالی ہو گیا تھا۔ (۲۸۵) چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم لودھی کے زمانے میں سونا اور چاندی سخت مشکل سے دستیاب ہوتے تھے اور یہ کمی اُس وقت تک جاری رہی جب تک کہ شاہان مغلیہ نے گجرات۔ متوسط ہند اور دکن سے اُس کی تلافی نہ کر دی۔ اِن موقعوں و نیز اسی قسم کے دوسرے مواقع پر جو رقوم مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوئیں اُن کی کیفیت وقائع نگاروں نے قلمبند کی ہے لیکن یہاں اس کا دہرانا چنداں فائدہ مند نہیں ہے البتہ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جنگ تالیکوٹ کے بعد وجیانگر کے شاہی خاندان کو سونا۔ جواہرات اور ہیرے۔ الماس کی شکل میں جو خزانہ دستیاب ہوا کہا جاتا ہے کہ اس کی مالیت ایک سو ملین اسٹرلنگ سے بھی زیادہ تھی[1]۔

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ اس خزانے کی ایک سرسری جھلک ایک جیسوئیٹ پادری کے خط میں نظر آتی ہے (دیکھئے ۸۰)

اس رقم کے مقابلے میں اکبر کی جمع کردہ دولت جس کا تخمینہ مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے صرف بشکل نقد چالیس ملین اسٹرلنگ کیا ہے مقابلۃً کم نظر آتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہے کہ جب اکبر نے آغاز کیا تھا تو اس کے پاس پہلے سے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے برعکس وجیانگر کے خزانے کا کم از کم ایک حصہ قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔

حکمرانوں اور مذہبی ادارات کے محافظین سے قطع نظر عام باشندوں میں دفینہ رکھنے کی عادت کس حد تک پھیلی ہوئی تھی اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے ٹیورنیر کا دعویٰ ہے کہ مغلیہ دربار کے بہت سے اُمرا سونا جمع کرتے تھے اور اگرچہ اس بارے میں براہ راست کسی سند کا ہمیں علم نہیں ہے تاہم یہ بات بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ سرداران وجیانگر اس زمانے میں ایسی ہی صورت حال پر نظر کرتے ہوئے سونا چاندی اکٹھا کرنے پر مائل تھے۔ اس کے علاوہ کامیاب تاجروں کے پاس بھی بہ حیثیت مجموعی کثیر مقدار میں نقد جمع رہتا ہوگا۔ یہ گویا وہ رقوم تھیں جو آجکل ذخیرۂ محفوظ کہلاتی ہیں اور کام میں لگائے جانے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ لیکن ذخائر محفوظ اور دفینوں کے درمیان کوئی امتیازی خط کھینچنا بہت مشکل ہے۔ چونکہ بہ شکل اشیا سونے کی قدر بہت اعلیٰ تھی ادنیٰ طبقے بہت کم سونا جمع کر سکتے تھے۔ صرف ایک طلائی مہر کی قیمت میں کسان کو دو ایکڑ سے تین ایکڑ تک کی مجموعی پیداوار گیہوں کی شکل میں ادا کرنی پڑتی اور کسی قصبے کے مزدور کے لئے وہ دو سو دن کی اجرت کے مساوی ہوتی تھی (۱)۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ چند سکّے یا زیورات ڈال رکھنے اور جب کبھی ممکن ہو اپنے ذخیرہ کو بڑھانے کی عادت جو کہ اب تک بھی مروج ہے بدیہی طور پر نہایت قدیم معلوم ہوتی ہے اور ہمیں اس بارے میں کوئی

(۲۸۹)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ جس نے ۱۵۹۹ء میں اس خزانے کو وجیانگر کے سپہ سالار کے زیر نگرانی دیکھا تھا اور جس کو معلوم ہوا تھا کہ یہ خزانہ کسی وقت بادشاہ کی مِلک تھا۔

عله یہ مثال خاصکر شمالی ہند سے متعلق ہے۔ جنوب میں سونے کا چلن جاری تھا، اور چھوٹی چھوٹی مالیت کے سکّے بھی چلتے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ وہاں پر ادنیٰ طبقوں کے لوگ اُس کی ایک کافی مقدار جذب کر لیتے ہوں گے۔

باب ۸

شبہ نہیں ہے کہ درآمد شدہ چاندی کا کچھ حصہ ادنی طبقوں کے زیادہ خوشحال افراد جذب کر لیتے تھے۔ مختصر یہ کہ جتنی قیمتی دھاتیں ہندوستان میں داخل ہوتیں وہ کسی نہ کسی طریقے پر صرف ہو جاتی تھیں یا جیسے کہ ہاکنس نے اس زمانے میں لکھا تھا "تمام قومیں سکہ لاتی ہیں اور اس کے عوض اشیا لیجاتی ہیں۔ اور یہ سکہ ہندوستان میں دفن کر دیا جاتا ہے اور باہر نہیں جانے پاتا"۔

باب

دوسری فصل

جدید خیالات

یہاں تک تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سولھویں صدی میں یورپ کے لوگ ہندوستان کو دولتمند تصور کرتے تھے۔ یا تو اس وجہ سے کہ جو چیزیں ان کی دانست میں گراں تھیں ان کا یہاں بہت بڑا ذخیرہ نظر آتا تھا یا اس بنا پر کہ یہاں سونا چاندی دونوں متواتر جذب ہوتے تھے۔ اور ان دونوں صورتوں میں رائے بہت کچھ واقعات کے مطابق تھی۔ اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ جدید معاشیین کے نزدیک دولتمندی کا جو مفہوم ہے آیا اس کے مطابق بھی ہندوستان دولتمند تھا یا نہیں۔ دولتمندی کا جدید معیار اشیا کی آمدنی ہے یا اگر اور تحقیق کی جائے تو آبادی کی تعداد اور اس آمدنی کی باہمی نسبت ہے جب ہم دولت کو چھوڑ کر خوشحالی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو ہمیں اس بات کا مزید لحاظ کرنا پڑتا ہے کہ آمدنی کس طریقے پر تقسیم ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ مساوات سے قریب تر ہو تو اس سے بالعموم زیادہ اجتماعی تسلی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جب تک ہمیں کسی ملک کی دولت سے بحیثیت ایک اکائی کے سروکار ہوتا ہے تقسیم کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ سابقہ بابوں میں ہم نے ان تبدیلیوں کا تخمینہ کرنے کی کوشش کی ہے جو "اوسط آمدنی" میں واقع ہوئی ہیں۔ یعنی اس آمدنی میں جو بہ لحاظ تعداد آبادی مختلف اشیا سے باری باری سے حاصل ہوتی تھی۔ اور اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں اُن کا خلاصہ کرتے ہوئے ہم یہ تحقیق شروع کریں گے۔

زراعت کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملک کے مختلف حصے مختلف طریقوں پر متاثر ہوئے ہیں۔ تاہم اگر سارے ہندوستان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ بات خلافِ قیاس ہے کہ زرعی آبادی کی فی کس خام آمدنی

باب میں کوئی بڑا تغیر واقع ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ کسی قدر کم ہو گئی ہو۔ قیاس یہ ہے کہ پہلے سے اُس میں کسی قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن بہرصورت فرق اس قدر بڑا نہ ہو گا کہ اس کی وجہ سے معاشی حیثیت میں کوئی قطعی تبدیلی ظاہر ہو۔ ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ مجموعی آبادی سے زرعی آبادی کا اُس وقت جو تناسب تھا اُس میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آجکل کی طرح اکبر کے زمانے میں بھی آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ تھی۔ اور اگر اُس وقت نسبتاً زیادہ سپاہی اور زیادہ خانگی ملازمین تھے تو اب قصبات میں کام کرنے والے مقابلۃً زیادہ ہیں۔ پس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ زراعت سے مجموعی آبادی کی فی کس آمدنی کا اوسط کم و بیش ایک ہی سطح پر رہا ہے۔ پس جو نتائج اب تک حاصل ہوئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہو گا:-

(۲۸۸)

جہاں تک ابتدائی پیدائش کا تعلق ہے زراعت سے تقریباً وہی اوسط آمدنی حاصل ہوتی تھی جو اب حاصل ہوتی ہے۔ جنگلات کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ ماہی گیری سے شاید کسی قدر زیادہ آمدنی ملتی تھی اور معدنیات کی آمدنی یقیناً کمتر تھی۔

جہاں تک مصنوعات کا تعلق ہے زراعتی صنعتوں میں بہ حیثیت مجموعی کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ متفرق دستکاریاں۔ پشمینہ بافی اور جہاز سازی کے علاوہ دوسرے ذرائع باربرداری کی پیدائش ان سب کی آمدنی کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن ریشم بافی میں انحطاط نظر آتا ہے۔

جہاز سازی۔ روئی اور سن کی پارچہ بافی یا تجارت خارجہ کی اوسط آمدنی کا اب تک کوئی تخمینہ نہیں کیا گیا ہے۔ اور جہاں تک اندرونی تجارت کا تعلق ہے ہمارے موجودہ مقصد کے لئے اُس کا لحاظ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اشیا کی جو قیمتیں بیان کی جاتی ہیں وہ اُن مقامات سے متعلق ہیں جہاں وہ صرف کی جاتی تھیں نہ کہ ان مقامات سے جہاں وہ پیدا ہوتی تھیں۔

ان نتائج کو اکٹھا کرتے وقت اِسی بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ ان مختلف مدوں میں سے ہر ایک کی اہمیت جداگانہ تھی۔ مثلاً ریشم بافی کی صنعت بہت چھوٹی تھی اور اُس کی مجموعی آمدنی میں خواہ کتنی ہی بڑی تخفیف ہوئی ہو اگر وہ ملک کی

باب ۶

پوری آبادی پر پھیلادی جائے تو قریب قریب نظر انداز کرنے کے قابل ہوگی۔ اسی طرح ماہی گیری کی تخفیف بھی چنداں قابل اہمیت نہیں معلوم ہوتی۔ مزید براں آجکل معدنیات اور بار برداری اور متفرق دستکاریوں کے تحت پیدائش میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے ان نقصانات کی ضرورت سے زیادہ تلافی ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ اضافہ بھی خواہ بجائے خود کتنا ہی کثیر ہو اُس حالت میں بہت ہی تھوڑا معلوم ہوتا ہے جبکہ زرعی آمدنی کی عظیم الشان مد سے جو کہ کثیر حصہ آبادی کی کوششوں کا نتیجہ ہے اُس کا مقابلہ کیا جائے۔ پس جہاں تک اُن تخمینوں کا تعلق ہے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ ہندوستان اکبر کے زمانے میں بہ مقابل آجکل کے ہرگز زیادہ دولتمند نہیں تھا۔ بلکہ قیاس یہ ہے کہ وہ کسی قدر زیادہ مفلس تھا۔ اور اگر کوئی بڑا تغیر جس کی ہمارے سرسری معیاروں سے (کیونکہ ہمیں اس سے بہتر معیار میسر نہیں ہیں) شناخت کی جاسکے واقع ہوا بھی ہے تو ہمیں اس کی تلاش تین ذرایع آمدنی کے تحت جن کے تخمینے ابھی پیش نہیں کئے گئے ہیں کرنی چاہئے۔ اور جیسا کہ ہمیں آگے چلکر معلوم ہوگا یہ تینوں ذرائع ایک دوسرے سے بہت زیادہ متعلق ہیں۔ اگر ہندوستان اب سے زیادہ دولتمند تھا تو یہ مزید آمدنی تین مدوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک تو وہ جہاز جو ہندوستان میں بنائے جاتے تھے۔ دوسرے وہ کپڑے جو اِن جہازوں پر لدکر باہر روانہ کئے جاتے تھے۔ کیونکہ باہر جانے والے مال میں یہی سب سے زیادہ اہم مد تھی۔ اور تیسرے اُن بیرونی اشیا کی زائد قدر جو یہی جہاز واپس لاتے تھے۔ (۲۸۸)

جہاز سازی کی سالانہ پیداوار کے بارے میں براہ راست ہمیں کوئی واقفیت حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اُس کی جو مقدار اس زمانے میں ہندوستان کے اندر موجود تھی اس کا ایک سرسری تخمینہ کیا جائے اور موجودہ رسد کو برقرار رکھنے کے لئے جو پیداوار درکار ہوتی تھی اس کا وسیع حدود کے اندر پتا لگایا جائے۔ ہم یہ معلوم کرچکے ہیں کہ ہر سال جو جہاز غیر ممالک کے بندرگاہوں کی طرف روانہ ہوتے تھے اُن کی مجموعی مقدار غالباً ساٹھ ہزار ٹن (Tun) سے کم تھی۔ پس اگر ہم اس عدد کو بنیاد قرار دیکر سالانہ پیدائش کا تخمینہ کریں تو یہ تخمینہ اصلیت سے کم تو کسی حالت میں نہ ہوگا۔ یورپ میں جو جہاز بنائے جاتے تھے (مجموعی تعداد کا تقریباً

باب ۸ (دسواں حصہ) اُن کی تعداد منہا کرنی چاہیئے لیکن دوسری طرف کچھ اضافہ بھی کرنا پڑے گا کیونکہ بحیرۂ احمر اور پیگو۔ ملاکا۔ جاوا اور سماٹرا کے درمیان براہ راست جو تجارت ہوتی تھی اُس میں ہندوستانی جہاز استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اگرچہ یہ مد غالباً اتنی بڑی نہیں تھی تاہم اُس کو اول الذکر مد کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ جو جہاز محفوظ رکھے جاتے تھے اُن کا کوئی لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ موسمی حالات کے زیر اثر مالکانِ جہاز عملاً مجبور ہوتے تھے کہ اپنے جہاز باہر روانہ کردیں۔ اگر کوئی جہاز ٹھیک وقت پر روانہ نہ ہو تو پورے سال کی آمدنی ضائع ہوجاتی تھی۔ اور ایک طویل مدت تک بندرگاہ میں ٹھہرے رہنے سے جو خرابی پیدا ہوتی تھی وہ شاید اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی [1]۔ پس ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ سمندر پر جانے والے ہندوستانی تجارتی جہازوں کی مجموعی وسعت زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار ٹن (Tun) تھی۔ ساحلی آمد و رفت کے لئے چالیس ہزار ٹن (Tun) کا تخمینہ غالباً فیاضانہ ہے اور جنگی جہازوں کے لئے بیس ہزار ٹن (Tun) کافی ہیں اس طرح مجموعی طور پر کل وسعت ایک لاکھ بیس ہزار ٹن (Tun) تک پہنچتی ہے [2]۔ جہاز رانی کی یہ مقدار برقرار رکھنے کے لئے جو سالانہ پیداوار درکار ہوتی تھی اُس کا انحصار سالانہ شرحِ نقصان پر ہے جو جدید خیالات کے مطابق بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ کیرک کی اوسط عمر تقریباً تین سال معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیرارڈ کہتا ہے کہ وہ بالعموم دو یا زیادہ سے زیادہ تین سفر کرتے تھے۔ لیکن ان جہازوں کے نقصانات کا ایک بڑا حصہ (۲۸۹)

[1] ہندوستانی بندرگاہوں میں جہازوں کو نقصان پہنچنے کا ذکر اُس زمانے کے اکثر جہاز رانوں نے کیا ہے مثلاً پیٹن تاکید کرتا ہے کہ سورت کی طرف جانے والے جہازوں پر دُہرا غلاف ہونا ضروری ہے کیونکہ وہاں کیڑوں کا خطرہ خاصکر بہت زیادہ تھا (پرچاس۔ ۱۔ ۴۔ ۵۲۲)

[2] جنگی جہازوں کے تخمینہ میں پرتگالی بیڑہ اور وہ بحری قزاقوں کے جہاز بھی شامل ہیں۔ آخری دو کتابوں میں بیڑوں کے جو مفصل حالات دئے ہوئے ہیں اُن سے پرتگالی بیڑے کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ "بحری قزاق" جن جہازوں کے مالک تھے وہ یقیناً پرتگالی جہازوں سے تعداد میں کم اور جسامت میں چھوٹے تھے اور ہم نے ان کی مجموعی قوت اُن کے دشمنوں کی مجموعی قوت کے نصف سے کچھ زائد قرار دی ہے۔

اُن سمندروں میں واقع ہوتا تھا جہاں ہندوستانی جہاز نہیں جاتے تھے۔ یعنی راس امید کے قریب یا اور آگے مغرب کی طرف۔ پس یہ کہنا زیادہ قرین صحت ہے کہ آخر الذکر جہاز اوسطاً زیادہ مدت تک چلتے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کس قدر زیادہ قائم رہتے تھے اس کا انحصار محض قیاس پر ہے۔ جہازوں کی تباہی اور آتشزدگی اور گرفتاری کے نقصانات کے بارے میں جو تفصیلی امور قلمبند کئے گئے ہیں اُن پر غور کرتے ہوئے ہمارے خیال میں اوسط عمر پانچ سال سے زائد ہونی چاہئے۔ لیکن یہ امر کہ آیا وہ دس سال کے برابر ہو سکتی ہے مشتبہ ہے۔ اس لحاظ سے سالانہ پیداوار بارہ ہزار اور چوبیس ہزار ٹن (Tun) کے مابین واقع ہوتی ہے اور اگر اوسط عمر ہمارے پیش کردہ قیاس سے زیادہ طویل ہو تو وہ اس سے کمتر ہوگی۔ جو اعداد ہم نے پیش کئے ہیں وہ باربرداری کی گنجایش میں چھ ہزار سے بارہ ہزار خالص رجسٹر شدہ ٹن (Ton) کے مساوی ہیں گویا ۱۹۱۴ء کے ماقبل سالوں میں جو پیداوار تھی اُس سے بڑھ کر ہیں گو بہت زیادہ بڑھکر نہیں۔ کیونکہ اِن سالوں میں چار ہزار پانسو سے سات ہزار آٹھ سو خالص ٹن (Ton) تک ہر سال جہاز تعمیر کئے جاتے تھے [1]۔ پس آبادی کے فرق کا لحاظ کرتے ہوئے جہاز سازی کی صنعت میں تخفیف واقع ہوئی ہے لیکن اس کی بدولت آمدنی کا جو نقصان لاحق ہوا ہے اگر اُس کو تمام ملک کے باشندوں پر پھیلا دیا جائے تو وہ بدیہی طور پر ناقابل لحاظ ہوگا۔

اب ہم اُس آمدنی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو تجارت خارجہ سے حاصل ہوتی تھی۔ یہ یاد ہوگا کہ اکبر کے زمانے میں اس کی بدولت جس شرح سے منافع حاصل ہوتا تھا اس کا کوئی تخمینہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر جہازی گنجایش کی

[1] یہ اعداد "خلاصہ اعداد و شمار متعلقہ برطانوی ہند" کے تختہ نمبری ۱۰۲ سے ماخوذ ہیں۔ ہم نے دفتر رجسٹر سے اس بات کی تحقیق کی ہے کہ اس تختہ میں بہ حساب ٹن جو وزن بتایا گیا ہے وہ خالص ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کے بندرگاہوں میں جو جہاز تعمیر کئے جاتے تھے اُن کے خیال سے ممکن ہے کہ ہمارے پیش کردہ اعداد میں اضافہ کرنا پڑے۔ لیکن اس بارے میں کوئی اطلاع ہمیں فوری طور پر دستیاب نہیں ہوتی اور یہ غلطی بھی کسی حالت میں بہت زیادہ اہم نہیں ہو سکتی۔

فی کس مقدار کا موازنہ کیا جائے تو ہم اس بات کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں کہ تجارت بحری سے ملک کو بہ حیثیت مجموعی کیا فائدہ پہنچتا تھا۔ ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ عظیم ترین گنجایش غالباً چھتیس ہزار خالص رجسٹر شدہ ٹن (Ton) کے مساوی تھی اور آبادی کا قلیل ترین تخمینہ جو پہلے باب میں تجویز کیا گیا ہے استعمال کرتے ہوئے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اوسط آمدنی حاصل کرنے کے لئے ایک ٹن (Ton) کی گنجایش سے جس قدر منافع (خواہ وہ کچھ ہی ہوتا ہو) حاصل ہوتا تھا وہ کم از کم دو ہزار آٹھ سو اشخاص میں تقسیم ہونا چاہئے۔ زمانہ موجودہ میں ایک ٹن کا منافع بینتالیس اشخاص بلکہ اس سے بھی کم تعداد میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ پس بغیر مزید فرضی حسابات کے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بحری تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اوسط اب سے بلا شبہ کمتر تھا۔ اور وہ کسی حالت میں اتنا زیادہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی جملہ آبادی کی مجموعی آمدنی کے اوسط میں کوئی بڑا فرق واقع ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس خشکی کی سرحدوں پر تجارتی حالت کے متعلق جو واقفیت ہمیں حاصل ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ خواہ شرح منافعہ کچھ ہی رہی ہو اس کی مقدار ملک کے لئے بہ حیثیت مجموعی آجکل سے بھی کم اہمیت رکھتی تھی[1]۔

روئی اور سن سے کپڑا تیار کرنا یہ حصول آمدنی کا باقیماندہ ذریعہ ہے۔ اس کے لئے کسی قدر زیادہ مفصل تحقیق درکار ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں یہاں آبادی کی ایک کافی بڑی تعداد میں سن کا کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس بہت ہی محدود رقبے کے باہر جہاں سن

[1] جن ناظرین نے جہاز سازی کے اعداد و شمار کا موازنہ او رمطالعہ نہیں کیا ہے اُن کے فائدے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے ممالک کے چند اعداد بہ طور موازنہ پیش کیے جائیں جنگ سے پہلے جو جہاز جاپان سے مال لیکر روانہ ہوتے تھے اس کا اوسط وزن کل آبادی کے لحاظ سے فی کس ½ ٹن (Ton) ہوتا تھا۔ گویا ہندوستان (بہ شمول برما) کے عدد سے پندرہ گنا زیادہ۔ اسی زمانے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا اوسط فی کس نصف ٹن (Ton) سے زائد۔ آسٹریلیا کا ایک ٹن (Ton) اور سلطنت متحدہ کا تقریباً ڈیڑھ ٹن (Ton) تھا۔ جو قوم زیادہ تر سمندری تجارت کے ذریعہ معاش حاصل کرے اس کے لئے

باب ۷

پیدا کیا جاتا تھا موٹا سوتی کپڑا اُس زمانے میں دوسرا مال باندھکر روانہ کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اور چونکہ اِن دونوں ریشوں کا استعمال ایک دوسرے سے بدل گیا ہے اس لئے موازنہ کی جو کوئی کوشش کی جائے اُس میں یہ لازم ہے کہ پیداوار خام کی نوعیت کا امتیاز ترک کر دیا جائے۔ ہمیں چاہئے کہ محض کپڑے کا خیال کریں اور واقعی امور کو گزوں کے حساب سے بیان کر دیں۔ پیداوار خام اور خوبی کی بنا پر مختلف کپڑوں کا جو باہمی فرق ہو اُسے نظر انداز کرنے سے جو غلطی واقع ہوئی ہے وہ دراصل اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنی کہ وہ نظر آتی ہے کیونکہ زراعت سے حاصل کی ہوئی آمدنی کے ایک جزو کی حیثیت سے خام پیداوار کی قدر کا پہلے ہی سے لحاظ کر لیا جاتا ہے۔ پس اِس وقت ہمیں صرف اس اضافۂ قدر سے سروکار ہے جو کہ صنعت پارچہ بافی کے جدید طریقوں کا نتیجہ ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ خوبی کا اوسط سولھویں صدی میں بمقابل آجکل کے زیادہ بلند تھا کیونکہ اکثر و بیشتر کپڑا روئی سے بنایا جاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف ہمیں اِس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ آجکل جو کپڑا اگر نیوں میں تیار ہوتا ہے اکثر صورتوں میں اس کا عرض پہلے سے زیادہ ہوتا ہے پس اوسط کپڑے کا ایک گز اکبر کے زمانے میں بمقابل آجکل کے کمتر و نیز بہتر ہوتا تھا اور سرسری موازنہ کے لئے (کیونکہ صرف یہی ممکن ہے) وہ فی الجملہ کوئی غیر موزوں اکائی نہیں ہے۔

(۳۹۱)

پس زمانۂ موجودہ کے واقعات سے شروع کر کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۴ء کا اوسط لیا جائے اور پیدائش ۔ درآمد ۔ برآمد ۔ اِن سب کا لحاظ کیا جائے تو ہندوستان میں سَن اور روئی کے کپڑے کا صرف فی کس ساڑھے اٹھارہ گز سالانہ تھا۔ اور اُس کی پیدائش اِسی طرح حساب کرنے پر فی کس پندرہ گز سے ساڑھے پندرہ گز تک معلوم ہوتی ہے۔ اس طور پر خالص درآمد کی مقدار تین گز یا اُس سے زاید تھی۔ پس ہمیں جس سوال پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ آیا پیدائش کی مقدار

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ لازم ہے کہ ہر سال فی کس ایک یا زائد ٹن (Ton) وزن باہر روانہ کرے۔

باب ۸ سولھویں صدی کے اختتام پر فی کس پندرہ گز سے زیادہ تھی یا کم۔ اس زمانے میں
ان پیداواروں سے بنے ہوئے کپڑے کی قطعاً کوئی درآمد نہ تھی اور اس وجہ سے
برآمد اور اندرونی صرف کی مقداریں ملانے سے پیدائش کی مجموعی مقدار حاصل ہوتی
تھی۔ جہاں تک برآمد کا تعلق ہے ہم اس کی ممکنہ مقدار کا ایک سرسری تخمینہ
کر سکتے ہیں اور وہ اس طور پر کہ جہازوں کی جو گنجایش اُس زمانے میں میسر تھی
اُس پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ ہم اوپر اس کی کثیر سے کثیر مقدار ساٹھ ہزار
ٹن (Tun) فرض کر چکے ہیں۔ جہازوں میں آنے جانے والی اشیا میں کپڑا
سب سے زیادہ اہم تھا گو دوسری اشیائے برآمد بھی کثیر تعداد میں موجود تھیں
اور اُن میں سے بعض بڑی اور وزنی بھی تھیں۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کہ کسی
بڑے ملک کی مجموعی برآمد میں نصف مقدار ایک ہی قسم کی چیزوں کی ہو۔
لہذا اگر ہم مجموعی گنجایش کی دو تہائی مقدار صرف کپڑے کے لئے علحدہ کریں
تو پھر ہمارے تخمینے میں گھٹاؤ کا کوئی خطرہ نہیں رہیگا۔ اس مفروضہ کے مطابق
برآمد کی مقدار مشکل سے دو سو ملین گز تک پہنچتی ہے اگرچہ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ
یہ عدد حقیقت سے غالباً بہت زیادہ ہے۔ اور آبادی کا کمترین تخمینہ جو سابق میں تجویز
کیا جا چکا ہے استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ برآمد کی زیادہ سے زیادہ مقدار فی کس
دو گز کے قریب تھی۔ موجودہ پیدائش سے اس کو منہا کیا جائے تو تیرہ گز باقی رہتے ہیں
لہذا ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ آیا سابقہ صرف کی مقدار اس عدد سے زیادہ تھی یا کم۔
واضح رہے کہ کپڑے کے صرف کے دو خاص شعبے ہیں، ایک مال باندھنا (حالیہ مقدار
ڈھائی گز) اور دوسری پوشاک (حالیہ مقدار تقریباً ساڑھے گز)۔ مال باندھنے میں کپڑے کا
استعمال مقدارِ تجارت کے ساتھ کم و بیش وابستہ ہوتا ہے اور جن اعداد کی ہم کیفیت
معلوم کر چکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معیار کے مقابلے میں اس کی مقدار سراسر
ناقابلِ لحاظ تھی۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پہلے دور میں مال باندھنے کے لئے
کپڑے کی جو مقدار درکار ہوتی تھی وہ فی کس ایک گز کی صرف ایک چھوٹی سی کسر کے برابر
ہوتی تھی۔ جہاں تک پوشاک کا تعلق ہے ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ سارے
ہندوستان میں اُس وقت عوام بمقابلِ آجکل کے غالباً کم کپڑے پہنتے تھے۔ لہذا

باب ۴

موجودہ عدد (سولہ گز) اکبری دور کے معیار کے لئے زیادہ ہے۔ لیکن اس زیادتی کی مقدار کیا ہے اس کا انحصار ہماری واقفیت کی موجودہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے محض قیاس پر ہوگا۔ اگر ہم لباس کا اوسط بارہ گز فرض کریں تو پھر مجموعی صرف تیرہ گز سے کم ہونا چاہئے اور مجموعی پیدائش حالیہ عدد یعنی پندرہ گز سے کم۔ اور اگر لباس کی مقدار دس گز فرض کی جائے تو پھر مجموعی پیدائش اب سے بہت کم ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس اگر ہم فی کس پیدائش کی اس سے زیادہ مقدار حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ لوگ عام طور پر اس زمانے میں بھی تقریباً اتنا ہی کپڑا استعمال کرتے تھے جتنا کہ آجکل استعمال کرتے ہیں اگرچہ یہ یقینی ہے کہ وہ علانیہ اس قدر لباس نہیں پہنتے تھے۔ آخر میں ہمیں ڈھاکے کی موجودہ کثیر برآمد کا بھی لحاظ کرنا چاہئے۔ اکبر کے زمانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کا اس سے مقابلہ کیا جا سکے۔ اگر تیار کپڑے کی پیدائش آجکل کے برابر مان لی جائے تب بھی ان غیر مکمل اشیا کو شامل کرنے سے موجودہ دور کا پلہ بھاری ثابت ہوتا ہے۔

اس اکتانے والی تشریح کا عام نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں مندرجۂ ذیل ممکنہ امور کے مابین انتخاب کرنا چاہئے:۔ (۱) مجموعی آبادی جو تعداد میں ہمارے پیش کردہ کمترین تخمینے یعنی ایک سو ملین سے بہت کم ہو۔ (ب) جہازوں میں برآمد ہونے والے مال کی مقدار جو ہمارے پیش کردہ کثیر ترین تخمینے یعنی ساٹھ ہزار ٹن (Tun) سے بہت زیادہ ہو۔ (ج) اندرونی صرف جو اس مقدار سے بہت زیادہ ہو جس کا معاصر حالات سے پتا چلتا ہے۔ (د) کپڑے کی فی کس پیدائش جو بہ مقابل آجکل کے زیادہ تو یقیناً نہیں البتہ کسی قدر کم ہو۔ اس دور کے معاشی حالات کے متعلق سابقہ بابوں میں جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان کو تسلیم کرنے والے ناظرین اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جو تھے امر کا امکان سب سے زیادہ ترین قیاس ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہیں کہ اکبر کے زمانے میں پیدائش اب سے بہت زیادہ تھی انھیں یہ بتانا پڑے گا کہ وہ سب یا ان میں سے بعض نتائج غلط ہیں۔ جو کپڑا تیار کیا جاتا تھا اس کی خوبی کا اوسط بلاشبہ اب سے بلند تر تھا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس فرق کے بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیا جائے۔ مجموعی پیداوار کا بہت ہی تھوڑا حصہ بیرونی بازاروں کے لئے برآمد کیا جاتا تھا۔

(۲۹۳)

ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں میں اس کا صرف بہ لحاظ مقدار کے ناقابل توجہ تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ جو کپڑے بنے جاتے تھے ان میں سے اکثر و بیشتر ویسے ہی کمزور رہے لیکن دیرپا ہوتے تھے جیسے کہ اب تک بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے خیال میں خوبی کے فرق کا اس سے زیادہ لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں کہ آجکل تیار ہونے والے کپڑوں کا اوسطاً بڑا عرض نظر انداز کردیا جائے چنانچہ ہم پہلے ہی ایسا کر چکے ہیں۔

پس جہاز سازی۔ تجارت خارجہ۔ اور مصنوعات پارچہ بانی۔ ان ذرائع آمدنی کی مفصل تحقیق سے یہی نتیجہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بمقابلہ آجکل کے اس قدر زیادہ آمدنی نہیں ملتی تھی کہ اس کی بدولت ملک کی آمدنی کا اوسط موجود سطح سے بہت زیادہ بلند رہتا ہو۔ ہم اپنا نتیجہ زیادہ اختصار کے ساتھ مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں: اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ عوام اب سے کم کپڑے پہنتے تھے تو پھر اس پورے مسئلے کا انحصار جہاز رانی اور آبادی کے باہمی تناسب پر رہجاتا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہندوستان اکبر کے زمانے میں زیادہ دولتمند تھا یہ بتانا پڑے گا کہ آبادی کی ایک کثیر تعداد جہاز بنانے اور ان جہازوں پر لادنے کے لئے کپڑا تیار کرنے میں مشغول رہتی تھی ہم مان سکتے ہیں کہ اس خیال کا کسی ایسے سیاح کے ذہن میں پیدا ہونا ممکن ہے جس کے مشاہدات ڈیو اور گوا کے مابین ساحل تک محدود رہے ہوں لیکن دکن کی گنجان آبادی میں سے ہوتے ہوئے سورت سے گولکنڈہ تک اور گولکنڈہ سے جانب شمال لاہور تک اور پھر لاہور سے دہانہ گنگا تک سفر کرنے کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ ایسا خیال باقی رہ سکتا تھا۔ اگر ہم پورے ہندوستان کو ان سیاحوں کی آنکھوں سے دیکھیں جنھوں نے یہ سفر کئے تھے تو ہمیں اکثر و بیشتر آبادی زراعت پیشہ نظر آئے گی اور ہم محسوس کریں گے کہ تجارت خارجہ میں کام کرنے والوں کی تعداد مجموعی آبادی کا ایک نہایت ہی ادنیٰ جزو تھی۔

سولھویں صدی کے اختتام پر پیدائش کے جس قدر اہم شعبے موجود تھے ہم ان سب کی تحقیق کر چکے۔ اور اب عام الفاظ میں اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں جو ہم نے اس فصل کے آغاز میں پیش کیا تھا۔ وہ یہ کہ آیا ہندوستان آبادی کی

باب ۶

فی کس آمدنی کے لحاظ سے اُس زمانے میں دولتمند تھا یا نہیں۔ جواب یہ ہے کہ ہندوستان قریب قریب یقینی طور پر اب سے زیادہ دولتمند نہیں تھا اور قیاس یہ ہے کہ وہ مقابلۃً کسی قدر زیادہ مفلس تھا۔ یہ سچ ہے کہ ملک میں ایسی اشیا پیدا ہوتی تھیں جن کو دوسری قومیں نہایت شوق کے ساتھ تلاش کرتی تھیں اور ان اشیا کی فروخت سے ملک میں قیمتی دھاتوں کی یکساں درآمد جاری رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ باہر سے ہندوستان پر نظر ڈالتے اور اُن معاشی نظریوں کے زیر اثر رہتے تھے۔ جواب متروک ہو چکے ہیں وہ ہندوستان کی دولت کا غلط اندازہ کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی یہ غلطی قابل معافی تھی۔ لیکن جب ہم اس نمائش تجارت خارجہ کے دلفریب اثر سے بچکر تمام ملک کے وسائل پر اپنی توجہ منعطف کرتے ہیں تو ہمارا آخری فیصلہ لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ آجکل کی طرح اُس وقت بھی ہندوستان کا افلاس مایوس کن تھا۔ جو واقفیت ہمیں حاصل ہے اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں آمدنی کا اوسط بہ شکل اشیا آجکل سے بھی کم تھا۔ اِس بات کا کوئی قطعی ثبوت پیش کرنا کہ دولتمندی کی رفتار پہلے سے بڑھ گئی ہے کافی نہیں ہے لیکن اس سے کم از کم یہ نتیجہ نکالنا تو درست معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کی کمی جو کہ آجکل کا ایک بدیہی واقعہ ہے سولھویں صدی کے اختتام پر بھی کم از کم اتنی ہی نمایاں تھی۔

باب ۸

تیسری فصل

تقسیم

یہاں تک تو ہم ہندوستان کی مجموعی آمدنی پر اس طرح بحث کر رہے تھے گویا وہ تمام آبادی میں مساوی حصوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ اب ہمیں اُس آمدنی کی واقعی تقسیم پر غور کرنا ہے۔ اس بارے میں ہم جن خاص نتائج پر پہنچے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) اعلیٰ طبقوں کے افراد اکبر کے زمانے میں اب سے بہت زیادہ تعیشانہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

(۲) متوسط طبقوں کی معاشی حالت جس حد تک کہ ہماری قلیل واقفیت سے پتا چلتا ہے کم و بیش ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی کہ آجکل ہے۔ البتہ ان کی تعداد نسبتاً بہت تھوڑی تھی اور آبادی کے ایک طبقے کی حیثیت سے اُن کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔

(۲۹۵) (۳) ادنیٰ طبقوں کے لوگ جن میں قریب قریب تمام دولت پیدا کرنے والے عناصر شامل تھے اب سے بھی زیادہ عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اس دور کا معاشی نظام اس قدر سادہ تھا کہ ہم بہ آسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیونکر یہ اختلافات نمودار ہوئے۔ ہندوستان کے متعلق بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دولت پیدا کرنے والے فرقہ واری تنظیم کے فوائد سے قطعاً محروم تھے۔ پیداوار کا جو حصہ اُن سے لے نہ لیا جائے بس وہی اُن کے پاس بچ رہتا تھا۔ اس کے برعکس صرف کرنے والے طبقے جس قدر ممکن ہوتا پیدا کرنے والوں سے لے لیتے تھے اور چونکہ اکثر و بیشتر صرف کرنے والوں کا انحصار بالواسطہ یا بلاواسطہ مملکت پر ہوتا تھا تقسیم دولت کا سب سے بڑا عامل مروجہ طریق مالگزاری تھا۔ اس طریق کا جو

باب

اثر پیدا کرنے والوں کی کثیر ترین تعداد یعنی زمین کاشت کرنے والوں پر پڑتا تھا اس کا ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے آئینی صوبوں میں جن میں بنگال کے مغرب تک تقریباً تمام شمالی میدان اور جانب جنوب ملک کا ایک بڑا حصہ شامل تھا مطالبہ مالگزاری کا معیار موجودہ لگان کے معیار سے تقریباً دگنا تھا و نیز ہم اس نتیجے کی وجہ معلوم کر چکے ہیں کہ قلمرو وجیانگر اور دکن کی سلطنتوں میں بھی مملکت کا حصہ کم از کم اتنا ہی بڑا تھا[1] اس واقعے کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مالگزاری کا حساب تو خام پیداوار پر کیا جاتا تھا لیکن وہ خالص آمدنی سے ادا کی جاتی تھی۔ اگر کسی کھیت کی قوت پیداوار برقرار رکھنی ہو تو مجموعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ ایسے کاموں پر صرف کرنا پڑتا ہے جو درحقیقت لازمی کہے جا سکتے ہیں۔ اول تو کسان کو چاہئے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو زندہ اور کامل رکھے۔ اسے چاہئے کہ اپنے مویشیوں کی کارکردگی قایم رکھے اور وقت ضرورت ان کی جگہ دوسرے مویشی حاصل کرنے کا اہتمام کرے حسب ضرورت اپنے آلات و اوزار بدلتا رہے۔ اجرت اور دوسرے مختلف مصارف کاشت ادا کرے۔ اس ضروری خرچ کا بار ہر جگہ مختلف ہوتا ہے لیکن شمالی ہند کے معیاری کھیت پر وہ غالباً مجموعی پیداوار کے نصف حصے کے قریب ہوتا ہے اور مجموعی پیداوار سے ہماری مراد وہ پیداوار ہے جس کو حاصل کرنے کی کاشتکار موافق موسموں میں توقع رکھے۔ ان مصارف کو نکالنے کے بعد جو خالص آمدنی (۲۹۶) بچ رہے اس پر پہلا حق مالگزاری یا لگان کا ہے۔ اور جب یہ ادا ہو چکے تو پھر بقیہ آمدنی کسان کے اختیار میں رہے۔ خواہ وہ اس سے ضروریات راحت پوری کرے

---

[1] یہاں یہ دہرا دینا مناسب ہے کہ اس نتیجہ کا اطلاق مغلیہ شاہنشاہی کے ان حصوں پر نہیں ہوتا جہاں تشخیص مالگزاری کا آئینی طریقہ نافذ نہیں ان میں خاصکر بنگال اور برار یا بعض دوسرے صوبوں کے کچھ حصے شامل تھے لیکن بہ لحاظ پیدا آوری کے وہ اکثر و بیشتر ادنی ترین علاقے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان خطوں میں مالگزاری کا کیا بار تھا لیکن ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ شاہنشاہی کے بقیہ علاقوں سے بہت زیادہ ہلکا نہ تھا۔

باب۶ یا اُسے تعیشات میں اڑا دے۔ خواہ اُس کے ذریعے سے اپنے کھیت کی اصلاح کرے یا اپنے قرضوں سے سبکدوشی حاصل کرے۔ غرض اس کی مالی حالت کا انحصار اُس کی مجموعی آمدنی پر نہیں بلکہ ماحصل زائد کی اُس مقدار پر ہوتا ہے جو اُس کے پاس بچ رہے اور جسے خرچ کرنے کی اُسے آزادی حاصل ہو۔ اکبری دور کے کسان جس ماحصل زائد کی توقع رکھ سکتے تھے اُس کی مقدار بے انتہا قلیل تھی۔ اگر ضروری اخراجات کی تکمیل کے لئے نصف پیداوار درکار تھی اور ایک ثلث پیداوار بہ طور مالگزاری کے طلب کرلی جاتی تھی تو پھر مجموعی آمدنی کا صرف چھٹا حصہ بچ رہتا تھا جس کی موافق موسموں میں توقع کیجاسکتی تھی۔ اور اگر موسمی حوادث کی وجہ سے بہت ہی خفیف سا نقصان بھی ہوجاسے تو متوقع بچت کا پورے طور پر غائب ہوجانا امکان تھا۔ اگر مطالبۂ مالگزاری میں نصف کی تخفیف ہوجائے تو کسان کے اختیاری ماحصل زائد کی مقدار بدیہی طور پر دوگنی ہوجائیگی اور اس کے پاس مقابلۃً بہت زیادہ رقم بچ رہیگی جسے وہ خوشحالی کے زمانے میں خرچ کرسکے گا اور جس کی بدولت ناموافق موسموں میں وہ بلا بیرونی امداد کے اپنا کاروبار جاری رکھ سکے گا۔ پس اکبری دور اور موجودہ زمانے کے مابین اجمالی طور پر اتنا ہی فرق ہے۔ جب فصلیں اچھی ہوتی ہیں تو آجکل کے کسانوں کے پاس خرچ کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ روپیہ ہوتا ہے۔ اور جب فصلیں خراب ہوتی ہیں تو وہ زیادہ نقصان برداشت کرسکتا ہے۔ جو کسان براہ راست مملکت کے ماتحت کاشت کرتے ہیں انھیں تو اس سے بھی زیادہ بہتر حالت میں ہونا چاہئے کیونکہ موجودہ زمانے میں مالگزاری لگان سے کم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ فرق محض نظری ہے اور عملاً اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ رعیت واری علاقوں کے کسان خاصکر رسمی ضروریات کی حد تک کسی قدر اعلیٰ معیار زندگی پر پہنچ چکے ہیں۔ بہر حال جبری محصولوں کے بارے میں دور اکبری کے بعد سے جو تخفیف واقع ہوی ہے وہ کسانوں کی بہتر حالت کی توجیہ کے لئے بالکل کافی ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے سے زیادہ خام پیداوار اس کے ہاتھ لگ نہ آتی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اُس پیداوار کا مقابلۃً زیادہ حصہ اب اپنی ذات کیلئے حاصل کرسکتا ہے۔

باب ۶

یہ نتیجہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ زرعی مزدوروں کا معیار زندگی اُن کو نوکر رکھنے والے کسانوں کے معیار کے تابع ہوتا تھا کیونکہ وہ معمولاً اپنے آقاؤں سے کسی قدر ابتر حالت میں رہتے تھے۔ اب ہم ہندوستان کی کل زرعی آبادی کے متعلق اُن معاصر خیالات کو سمجھ سکتے ہیں جن کا خلاصہ گذشتہ باب میں پیش ہو چکا ہے۔ معیار زندگی بالعموم اب سے ادنیٰ تھا اور محض اس وجہ سے کہ دیہات میں حاصل کی ہوئی آمدنی کا بڑا حصہ مملکت کے مصارف میں لگ جاتا تھا۔ پیشہ وروں اور دستکاروں کی کیفیت اسی اعتماد کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جو جو بار وہ برداشت کرتے تھے اُن کے متعلق ہمیں بہت کم واقفیت حاصل ہے لیکن جس حد تک کہ انھیں ٹکس یا محاصل کے طور پر کچھ ادا کرنا پڑتا تھا وہ مقابلۃً ابتر حالت میں تھے۔ لیکن ان کی تعداد زرعی آبادی کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی اور اسی وجہ سے سولھویں صدی کے اختتام پر تقسیم دولت کی نمایاں خصوصیت ہی یہ تھی کہ دیہات کی پیدا کی ہوئی دولت بمقابل شہروں کے بہت زیادہ تھی۔

کسانوں کے اختیاری ماحصل زائد کے اس قدر کثیر حصے کا مملکت کے تصرف میں چلا جانا لازمی طور پر کوئی معاشی خرابی کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس حد تک تو دورِ اکبری کے مروجہ حالات دورِ حاضرہ کے بعض اشتراکیین کے حسب منشا معلوم ہوتے ہیں لہذا اس تقسیم کی مناسبت کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو ماحصل زائد اس طور پر وصول کر لیا جاتا تھا وہ کن چیزوں پر صرف کیا جاتا تھا۔ اگر وہ کسانوں کی ضروریات کی تکمیل میں خرچ کیا جاتا جس کی بدولت وہ ایک زیادہ معقول زندگی بسر کر سکتے مثلاً زرعی پیدائش کے مختلف عامل مہیا کئے جاتے۔ تعلیم کے مواقع بہم پہنچائے جاتے یا طبی امداد و حفظان صحت کے مناسب ذرایع فراہم کئے جاتے تو اُس صورت میں نکتہ چیں کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا کہ آیا بہ حیثیت مجموعی باشندوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا تھا یا نہیں اور آیا مملکت کے فراہم کردہ فوائد سے بمقابل اُس صورت حال کے جبکہ آمدنی خود کمانے والوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دی جائے زیادہ اطمینان حاصل ہوتا تھا یا کم۔ لیکن یہاں پر تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بجز ایک غیر مستقل اور ناقص حالتِ امن و امان کے

باب۸ کسان کو قطعاً کوئی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کے اختیاری ما حصل زائد کا بڑا حصہ جو مملکت وصول کر لیتی تھی دوسرے طبقوں کے مفاد پر جو آبادی کا ایک بہت ہی قلیل جزو تھے خرچ کیا جاتا تھا۔ ہم سابق بابوں میں دیکھ چکے ہیں کہ کس طور پر مملکت کا حصہ بالآخر تقسیم ہوتا تھا۔ اس کا اکثر و بیشتر حصہ اشیائے تعیش کی خریداری۔ ذخیرۂ سیم و زر کے اضافے اور کثیر التعداد غیر مفید ملازمین کی تنخواہوں میں لگ جاتا تھا اور اگرچہ یہ خصوصیات (۲۹۸) اب تک ہند کی معاشی زندگی میں نمایاں ہیں تاہم ان کی اضافی اہمیت میں بلا شبہ تخفیف ہو گئی ہے۔ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ مکمل کرنے کے لئے مناسب ہے کہ ملک کی آمدنی کا جو حصہ اب ان چیزوں سے بچ رہتا ہے اس کے مصرف کا پتا لگایا جائے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں تین خاص مدیں نظر آتی ہیں جو اس حساب میں توازن قائم کر دیتی ہیں: ایک جمہوری خرچ کا اضافہ۔ دوسرے متوسط طبقوں کی ترقی۔ تیسرے وہ خفیف اصلاح جو عوام کے معیار زندگی میں ہماری تحقیق کے مطابق نمودار ہوئی ہے۔ تعلیم۔ طبی امداد اور حفظان صحت۔ ذرائع آمد و رفت اور مختلف اشکال میں پیدائش دولت کی امداد ان شعبوں میں آجکل جو اہتمام کیا جاتا ہے وہ جمہوری خرچ کی توسیع کا بدیہی ثبوت ہے۔ یہ دعویٰ تو کسی طرح نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی ضروریات ابھی کافی طور پر پوری ہوتی ہیں تاہم دور اکبری کے بعد سے جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کے اظہار کے لئے کسی موجودہ نظم و نسق کے مقاصد کا محض شمار ہی کافی ہے۔ متوسط طبقوں کی ترقی بھی خواہ۔ لحاظ تعداد اور خواہ۔ لحاظ وسائل کچھ کم نمایاں نہیں ہے۔ جہاں تک بڑے بڑے علاقے رکھنے والے امرا کا تعلق ہے انھیں ہم سولھویں صدی کے سرکاری امرا کے جانشین اور قائم مقام تصور کر سکتے ہیں لیکن شمالی ہند کا معمولی زمیندار دور جدید کی ایک نئی اور امتیازی خصوصیت ہے۔ یہی حال وکیلوں۔ طبیبوں۔ استادوں۔ اخبار نویسوں انجنیروں اور باقی تمام اہل علم طبقوں کا ہے زمینداروں اور وکلا کو چھوڑ کر یہاں بھی کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ملک کی ضروریات کافی طور پر پوری ہو جاتی ہیں لیکن جو کچھ ترقی ہو چکی ہے وہ بھی بہت کچھ ہے اور بہ حیثیت مجموعی ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ گو ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہ ہو تاہم اس کی

باب ۳ تقسیم میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کی بدولت اجتماعی طور پر باشندوں کی خوشحالی میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ ہم موجودہ تقسیم کو پورے طور پر قابل اطمینان سمجھتے ہیں۔ حل طلب مسائل جو اس سے براہ راست متعلق ہیں آجکل بہت اہم ہیں اور مستقبل قریب میں اور بھی زیادہ اہم ہو جائینگے لیکن خوشحالی کا معیار (۲۹۹) باوجود اس میں ترقی ہونے کے اب بھی اس قدر افسوسناک حد تک ادنی ہے کہ بجز قومی مقسوم میں نہایت زبردست اضافہ ہونے کے کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی خواہ ہم تقسیم دولت میں کتنی ہی تبدیلیاں کریں بحالت موجودہ دولت کی مقدار ہی اتنی نہیں ہے کہ سب کو کافی ہوسکے۔ اور اگر دوازدہ مختلف زمانوں کے اس موازنے سے زمانۂ حال کے مدبرین اور کارکنان نظم ونسق کے لئے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے تو وہ یہی ہے کہ انھیں اپنی تمامتر جدوجہد پیدائش دولت میں کافی اضافہ کرنے پر صرف کرنی چاہیئے۔

چوتھی فصل

خاتمہ

اب ہم اپنے مطالعے کے آخری درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ ہم دیکھ چکے کہ سولھویں صدی کے اختتام پر ہند کی معاشی زندگی میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں، ایک ناکافی پیدایش۔ او دوسرے ناقص تقسیم۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ اُس زمانے میں جو اثرات کام کر رہے تھے اُن کا رجحان کس جانب تھا۔ اکبر کی وفات کے وقت جو صورت حال تھی آیا وہ ملک کی آیندہ خوشحالی کے لئے امید افزا تھی یا خطرناک۔ اِس سوال کا یہ جواب ہونا چاہیے کہ معاشی ماحول کا سارا رجحان پیدائش کو اور بھی زیادہ پست کرنے اور تقسیم کے موجودہ نقائص میں مزید اضافہ کرنے کی طرف تھا۔ نتیجہ یہ کہ دور آئندہ میں اور بھی بدتر افلاس کی توقع کی جاتی تھی۔ البتہ چند اور قوتیں بھی جو اس قدر نمایاں نہیں تھیں اُسی زمانے میں کام کرنے لگیں تھیں اور ان کی بدولت مستقبل بعید کے لئے کسی قدر امید افزا حالت کی توقع ہوتی تھی۔ لیکن مستقبل قریب کے متعلق صرف یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ دولت پیدا کرنے والے بہ حیثیت مجموعی ایک ایسے نظم و نسق کے رحم و کرم پر تھے جس کے کارکن انتہائی درجے کے تعیش اور اظہار شان کے عادی تھے جنھیں اپنی ملازمت کی نوعیت اور اس کے خاص حالات کی بدولت یہ ترغیب ہی نہیں ہوتی تھی کہ اپنے علاقے کی ترقی کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کریں اور جو چند نہایت قومی اثرات کے تحت ہمیشہ اس بات پر آمادہ رہتے تھے کہ دولت پیدا کرنے والے ہر فرد کی آمدنی کا جس قدر کثیر حصہ ممکن ہو سکے خود ہضم کر جائیں۔ کارکنانِ نظم و نسق کے مطالبات میں ہر وقت اضافہ یقینی تھا جس کی وجہ سے دولت پیدا کرنے والے ذی حوصلہ اشخاص کی ہمتیں پست ہو جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں یہ لازمی تھا کہ جد و جہد کی طرف لوگوں کی

رغبت میں کمی واقع ہو اور آبادی کے محنت پسند طبقوں کے سامنے غیر پیدا وار باش زندگی کی دلربائیاں روز بروز نمایاں ہوتی جائیں۔ غرض یہ تصورات و توقعات مستقبل قریب کے متعلق قائم کی جاسکتی تھیں۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کس حد تک پوری ہوئیں اُس کی کیفیت سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی تاریخ سے معلوم ہوگی۔ پس ہمارا یہ کہنا کہ حالت غیر مستقل تھی اور معاشی اور سیاسی تباہی کا تخم بویا جا چکا تھا درست اور قابل تسلیم ہے۔ (۴۰۰)

اس دور کے ہندوستانی مدبّر اُن خطرات کو تو پہچان سکتے تھے جو اُن کے سامنے ہی موجود تھے لیکن امد آگے پیدا ہونے والے تغیر کی ابتدائی غیر ظاہر علامتوں کا وہ مشکل ہی سے پتا لگا سکتے تھے۔ ہم کسی سابقہ باب میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ تعیشات اور نئی نئی اشیا کے لئے اعلیٰ طبقوں کی طلب کا یہ نتیجہ ہوا کہ غیر ملکی تاجروں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی جانے لگی اور رقبۂ تجارت کی توسیع کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ بالآخر معاشی حالت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ جو غیر ملکی اس ملک کی طرف مائل ہوئے انھوں نے درحقیقت نہایت سختی کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض پر نگاہ رکھی گو ان کی جد وجہد سے اشیا کی طلب میں اضافہ ہوا نئی پیداواریں اور اصلاح یافتہ طریقے جاری ہوئے اور اس ذریعے سے اتفاقی طور پر پیدائش دولت کی طرف ترغیب و تحریک پیدا ہو گئی۔ لیکن کارکنان نظم ونسق کا جو استحصال اکبر کے زمانے میں وینز اس کے بہت پہلے سے باشندگان ہند کی قوتوں پر حاوی اور انھیں بیکار کر رکھا تھا اُس پر ابتداءً ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس بنیادی خرابی کے ساتھ اُن کا تعلق تو صرف اٹھارھویں صدی کی سیاسی تبدیلیوں کی بدولت پیدا ہوا اور اس کے بعد سے اب تک ہندوستان کی معاشی تاریخ میں جو بات خاص طور پر دلچسپ ہے وہ اُس تدریجی تغیر میں مضمر ہے جو دورِ استحصال کے بعد ایک طرح کی بے اعتنائی اور اس کے بعد اصلاح و ترقی کی دانستہ کوشش کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے دوران میں انگلستان کے اندر جو نظریے مروج تھے ان کے مطابق اس قدر تبدیلی کافی تھی کہ کارکنان نظم ونسق

باب ۹

اِن امور میں بے پروا ہو جائیں یا مداخلت نہ کریں لیکن بعد کے تجربے سے ظاہر ہو چکا ہے کہ ہم زمانۂ گذشتہ کے حالات سے زائد از ضرورت سبق حاصل کر چکے ہیں۔ اور حالیہ سالوں میں جیسی کچھ سست رفتار اور غیر اطمینان بخش ترقی ہم نے کی ہے اُس سے ایک طرف تو یہاں کی قدیم بڑی روایات کی قوت کا بدیہی ثبوت ملتا ہے اور دوسری طرف ایک دانستہ اور منظم جد و جہد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کی بدولت اُس کی کامل اور قطعی بیخکنی ہو سکے۔

اسناد برائے باب

فصل ۱۔ قیمتی دھاتوں کے جذب ہونے کا حوالہ برنیر (۲۰۲)۔ ۲۰۳ (۴۹۶)۔ پرچاس (۱، ۲۰۱۔ ۲۲۱)۔ ٹری (۱۱۲) اور مختلف دوسرے مصنفین نے دیا ہے۔ برنیر (ال۔ سی) و نیز تھیوینیر (۳۹۳) اور دوسرے مستند اشخاص نے جن کا حوالہ باب ۶ میں دیا گیا ہے اپنے ماخذ کا اظہار کیا ہے۔ شہنشاہیت روما کے ابتدائی ایام میں جو صورت حال تھی اس کے لئے ملاحظہ ہو باب ۲۔ ''شہنشاہیت روما کا زوال اور تباہی'' مصنفہ گبن۔ (مع تعلیقہ پروفیسر بیوری ا۔ ۵۔ ۵۔ اڈیشن سنہ ۱۹۰۰ء)۔ اس مضمون پر شہادت البنس میں موجود ہے۔

(۳۰۱) مجتمعہ دولت کی شدید منتقلیوں کی کیفیت ''تذکرات'' مصنفہ تھامس میں درج ہے۔ اور اس کے تفصیلی حالات تاریخ فرشتہ کے صفحات میں مل سکتے ہیں شمالی ہند میں طلائی سکوں کے متعلق ملاحظہ ہو تھیوینیر (۱۴۔ ۱۶) اور ٹری (۱۱۲ و ۱۱۳)۔ دفینوں کے تقدس کے بارے میں ملاحظہ ہو سیویل (۲۸۲) اور بابر (۴۸۳)۔ ابراہیم لودھی کے تحت سونے اور چاندی کے تقدس کے متعلق ملاحظہ ہو تاریخ ایلیٹ (۴۔ ۴۷۶)۔ خزانۂ وجیانگر کے لئے ملاحظہ ہو سیویل (۱۹۹) اور اکبر کے خزانہ کے لئے دی اسمتھ کی تصنیف ''اکبر'' (۳۴۷)۔

بقیہ فصلوں میں وہی نتائج جو سابقہ بابوں میں اخذ کئے گئے تھے دوبارہ مختصراً بیان کئے گئے ہیں۔ لہٰذا جو اسناد پہلے پیش کئے جا چکے ہیں ان کا دہرانا غیر ضروری ہے۔

ضمیمہ (الف)

فصلیں جو سولھویں صدی میں ہندوستان میں پیدا کی جاتی تھیں

(ا) اعداد و شمارِ مال مندرجہ آئین میں جو فصلیں بیان کی گئی ہیں جدید طریق تقسیم کے مطابق ان کی ترتیب حسب ذیل ہوگی :۔

اناج ۔ گیہوں ۔ جَو ۔ چاول ۔

گرما کے چاول کا داخلہ اُن دو درجوں (نہ کہ قسموں) سے بالکل علٰحدہ ہے جن کا شمار خریف کی فصلوں میں کیا گیا ہے ۔

موٹا اناج ۔ جوار ۔ باجرا ۔ چینا ۔ ساوَن ۔ کودَن ۔ کاکون ۔ مَنڈوہ ۔ کُدیری یا کوری ۔ بارتی ۔

باجرے کا داخلہ لدھرا کے نام سے جو کہ اب قریب قریب متروک کیا گیا ہے ۔ کاکون کال یا گال کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اور کنگنی اس کا مرادف بتایا گیا ہے ۔ کدیری (یا کوری) اور بارتی ان دونوں کو ساوَن کے مشابہ بتایا ہے ۔ اور اُن سے غالباً ادنیٰ ترین درجہ کا موٹا اناج مراد ہے جیسے کہ کنگی یا مجھری ہے ۔ ممکن ہے کہ اِن گھٹیا فصلوں میں سے کوئی فصل خارج از کاشت ہوگئی ہو ۔ لیکن جو تصحیح کی گئی ہے وہ اِس بات کا یقین کرنے کے لئے کافی طور پر مفصل نہیں ہے ۔

دالیں ۔ نخود ۔ مسور ۔ مٹر ۔ مونگ ۔ اڑد ۔ کلتھی ۔ اَرہر ۔

تشخیص مالگزاری میں نخود کی دو قسمیں کی جاتی تھیں ، ایک نخود کابلی دوسرے نخود ہندی ۔

شروع کے تختوں میں کساری کو نہیں بتایا ہے۔ لیکن بہار کی کیفیت میں (جس کے لئے کوئی شرح نہیں بیان کی گئی ہے) یہ ذکر کیا گیا ہے کہ غربا اُس کو کھاتے تھے اور وہ مضر صحت تھا۔

روغندار تخم۔ تل۔ السی۔ سرسوں۔ کُسُمب۔ (Toria)

گنّا۔ اس کے دو درجہ کئے گئے ہیں یعنی ایک عام دوسرے موٹا Paunda

ریشے۔ روئی۔ پٹ سن

رنگ۔ نیل۔ آل

شربات وغیرہ۔ خشخاس۔ پان

متفرقات - اور بھی مختلف چھوٹی فصلیں بیان کی گئی ہیں جن میں ترکاریاں مصالحے یا چٹنیاں۔ سنگھاڑے۔ تربوز (ہندی اور ایرانی دونوں قسم کا) اور پیٹھے۔ کدو۔ اور لوکیوں کی ایک طویل فہرست شامل ہے۔

(۲) جن صوبوں میں آئینی طریق تشخیص نافذ تھا اُن کے باہر مغلیہ شہنشاہی میں صرف دو اور فصلوں کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ ہم کتاب میں اس بیان کا حوالہ دے چکے ہیں کہ (۱) بنگال میں ایک قسم کا ٹاٹ بنایا جاتا تھا۔ ہمارے خیال میں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سن اُگایا جاتا تھا۔ (۲) دوسری فصل تمباکو ہے جس کی گجرات میں کاشت کی جاتی تھی اور جو اُسی زمانے میں وہاں کی آب و ہوا کے موافق بنالی گئی تھی۔ (۳۰۴)

(۳) جنوبی ہند کے متعلق۔ پئیس۔ نونز۔ گرشیاڈا اور ٹایا سولھویں صدی کے دیگر مصنفین نے حسب ذیل فصلوں کا ذکر کیا ہے:

اناج۔ چاول۔ گیہوں۔ جوار۔ راگی (سنڈوہ) موٹا اناج ہر قسم کا۔

جوار کا نام (Milhezaburro) دکھائی دیتا ہے جس کے معنی پر آیندہ ضمیمہ میں بحث کی گئی ہے۔ جَو کا ذکر ایک ترجمہ میں کیا گیا ہے لیکن ہمیں شبہ ہے کہ آیا یہ صحیح ہے

دالیں۔ نخود۔ مونگ۔ گھوڑوں کا چنہ۔ دیگر مختلف

والیں (جو بیان نہیں کی گئی ہیں)

دوسری فصلیں۔ گنا۔ روئی۔ نیل۔ تل۔ السی۔ کالی مرچ۔ ناریل۔ ادرک۔ ہلدی۔ پان۔ الائچی۔ سپاری۔ مختلف ترکاریاں (جو نہیں بیان کی گئیں)

ضمیمہ (ب)

وجیانگر میں "ہندی اناج"

مسٹر سیول کی تصنیف "ایک فراموش شدہ سلطنت" میں (صفحات ۲۳۷ و ۳۴۳) دو عبارتیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے نصف اول میں وجیانگر کے اندر مکا ایک نہایت عام اناج تھا۔ نباتیات کے محققین کو جو واقعات معلوم ہیں وہ اس خیال کو بہت ہی خلاف قیاس بنا دیتے ہیں۔ ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ مکا سب سے پہلے پرتگالیوں کے واسطے سے ہندوستان پہنچا۔ (ملاحظہ ہو ڈی کینڈول۔ لفظ (Maize) کے تحت) اب گووا میں پرتگالیوں کے آباد ہونے سے چند ہی سال کے اندر شمال میں مکا کا ایک اہم فصل بنجانا بہت مشکل تھا۔ "ہندی اناج" جس اصطلاح کا ترجمہ ہے وہ (Milho-Zaburro) ہے انگریزی پرتگالی جس قدر لغات ہمیں مل سکیں وہ سب اس ترجمہ کو صحیح بتاتی ہیں تاہم مزید تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے زیر بحث دور پر اُس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس وقت اِس اصطلاح سے مکا نہیں بلکہ مشہور موٹا اناج سوگھم جو ہندوستان میں جوار کہلاتا ہے مراد ہوتی تھی۔ اِس تحقیق کے چند تفصیلی امور طلبہ کے لئے مفید ہوں گے۔ کیونکہ اُن سے یہ پتا چلے گا کہ سولھویں صدی کے مصنفین کی شہادت سے کام لیتے وقت کس قسم کی احتیاط ضروری ہے۔

لفظ (Zaburro) مختلف پرتگالی مصنفین کی کتابوں میں جو کہ نباتیات کے مضمون سے متعلق ہیں نظر آتا ہے۔ اور اسی کا ہم شکل لفظ (Ceburro) ہسپانوی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر اسٹاف آف کیو لکھتے ہیں کہ "وہ گیرڑے (۱۶۶۱) سے کوٹنہو (۱۹۱۳) تک نباتیات کے جتنے مستند اشخاص سے

مدد ملسکی ہے وہ سب لفظ (Zaburro) کو سورگھم سے ملاتے ہیں"۔ اس کے علاوہ ہم
سر ڈیوڈ پرین کے ممنون احسان ہیں کہ انھوں نے ڈو ڈو اینس کی تصنیف
"فرومنٹورم ہسٹوریا" کی طرف ہماری رہنمائی کی جس کے صفحہ ۱۱ پر سورگھم کے زیر عنوان
یہ بیان کیا گیا ہے کہ پرتگالی اس کو Zaburro-Millet کہتے ہیں۔ اس کتاب کی
تاریخ سنہ ۱۵۶۶ء ہے۔ اور مسٹر سیویل نے جن تذکروں کا ترجمہ کیا ہے ان کی تاریخ
سنہ ۱۵۲۰ء سے سنہ ۱۵۳۵ء تک ہے۔ پس ہمارا یہ نتیجہ حق بجانب ہے کہ خواہ اس اصطلاح
Milho-Zaburro کا جدید مفہوم کچھ ہی ہو جس زمانے میں یہ تذکرے لکھے گئے تھے
اس وقت اس سے جوار مراد تھی نہ کہ مکا۔

یہ اطلاع ملنے سے قبل ہم نے کوشش کی تھی کہ اس لفظ Zubarroo
(۲۰۹) کے مادے کا پتا لگائیں اور اس طرح اس کا مفہوم معلوم کریں لیکن جدید لغات میں
سے کسی میں اس کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لاطینی زبانوں میں سے
کسی زبان میں اس کی حقیقی تو کیا ظاہری اصل کا بھی کوئی پتا نہیں چل سکا۔ اس کے
علاوہ یہ توقع ہو سکتی تھی کہ موٹا اناج جزیرہ نمائے ایبیریا میں شاید شمالی افریقہ سے پہنچا ہو
لیکن شمالی افریقہ کی زبانوں میں بھی ہمیں اس کی کوئی اصلیت نہیں ملی۔ مزید براں
امریکہ میں مکا کی دریافت کے متعلق جو ابتدائی تحریریں موجود ہیں ان سے ظاہر ہوا کہ
یہ لفظ وہاں سے بھی نہیں آسکتا تھا۔ جب ان ساری تحقیقوں سے کوئی نتیجہ حاصل
نہیں ہوا تو مسٹر ار۔ برن سی۔ ایس۔ آئی نے ہمیں مشورہ دیا کہ ممکن ہے یہ لفظ
ہندوستانی اصل کا ہو اور جوار کی بگاڑی ہوئی شکل ہو اور یہی خیال صحیح بھی معلوم
ہوتا ہے۔ پرتگالیوں کے پاس ہندوستانی ج کا ہم آواز کوئی حرف نہ تھا۔
اس لئے وہ حرف (Z) کے ذریعہ اس آواز کو نکالتے تھے۔ اسی طرح ان کے پاس
حرف (W) موجود نہ تھا اور وہ اس کی جگہ یا تو حرف (U) استعمال کرتے تھے یا
حرف (V) اس کے علاوہ جب کبھی وہ کوئی نام مستعار لیتے تو بالعموم حرف (O)
اس کے ساتھ شامل کر دیتے تھے۔ ہابسن۔ جابسن میں اس قسم کی تبدیلیوں
کی مثالیں بہ آسانی مل سکتی ہیں (مثلاً Jadwar سے Wasai-Zedoaris
سے Mung-Bacaim سے Mungo) - پس صاف ظاہر ہے کہ لفظ جوار (Jowar)

بہ آسانی (Zubaro) یا تلفظ کی قدرتی تبدیلی کی وجہ سے (Zubarro) بن سکتا تھا۔ اِس نوبت پر یہ رائے سر جارج گریرسن کے سامنے پیش کی گئی۔ انھوں نے لکھا کہ کسی لفظ میں حروفِ تہجی (U) اور (A) کی تبدیلی سے کوئی دقت نہ ہونی چاہیے اور گمان غالب یہ ہے کہ لفظ (Zubarro) جوار (Jowar) کی بگاڑی ہوئی صورت ہے۔

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سولھویں صدی میں (Zubarro) سے یقیناً جوار مراد تھی بلکہ قیاس یہ ہے کہ جوار ہی کا لفظ پرتگالیوں کی بول چال میں متغیر ہو کر (Zubarro) بن گیا ہے۔ اب یہ ایک علحدہ سوال ہے کہ اُس کو مکا کے معنی کیوں دئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ لغات سے ظاہر ہوتا ہے اگر مکا کے لئے کسی موٹے اناج کا کوئی پرتگالی نام اختیار کر لیا گیا ہے تو اسی کے مشابہ مثالیں مختلف دوسری زبانوں میں بھی مل سکتی ہیں، انگریزی میں مکا کو بالعموم اناج (''ہندی اناج'') کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں وہ گیہوں ہے جنوبی افریقہ میں وہ (Mealies) یعنی (Milje) یا موٹا اناج ہے اور اودھ میں وہ ''بڑی جوار'' ہے۔ لیکن زیادہ قرین قیاس یہ امر ہے کہ انگریزی۔ پرتگالی فرہنگ نویسوں نے اِس لفظ کے متعلق غلطی کھائی ہے۔ البتہ فیگوریڈو کی لغت میں جو کہ ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی ہے اُس کی صحیح تعریف کی گئی ہے یعنی یہ کہ وہ ہندی موٹے اناج کی ایک قسم ہے۔ لیکن اِس نوبت پر پہنچکر اِس مبحث کی دلچسپی خالص علم لسان سے متعلق ہو جاتی ہے۔

(۴۰۶)

ضمیمہ (ج)

بنگال کے بندرگاہ

سولھویں صدی کے پرتگالی مصنفین جب کبھی بنگال کی طرف کسی بحری سفر کا ذکر کرتے ہیں تو وہ بالعموم یا تو بڑی بندرگاہ (Porto) کا حوالہ دیتے ہیں یا چھوٹی بندرگاہ (Porto) کا ۔ یہی نام دوسری قوموں کے مصنفین نے بھی اختیار کر لئے (مثلاً پرچاس ۔ ۲ ۔ ۱۰ ۔ ۱۷۳۶) ۔ اور پادریوں نے انھیں لاطینی زبان میں ڈھال لیا (مثلاً ہے ۲۸۷ و مابعد (Pontus Magnus) اور (Portus Parvus) ان ناموں میں لفظ (Porto) جو استعمال کیا گیا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر انگریزی لفظ Porto کا مرادف سمجھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ سولھویں صدی کے بنگال میں موجودہ مصنفین کو صرف دو اہم بندرگاہ نظر آتے ہیں ۔ اور جب یہ رائے کر لی جائے تو پھر اُس دور کے ادبیات سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہوگلی (ریاست گاؤں جو اُس سے بالکل ملا ہوا ہے) "چھوٹی بندرگاہ" تھی اور چٹاگانگ "بڑی بندرگاہ" تھی۔ چنانچہ ہابن ۔ جابن کے مصنفین نے یہی کیا ہے ۔ ہمارے خیال میں یہ رائے غلط ہے ۔ ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے پرتگالی ملاحوں کی بول چال میں لفظ Porto سے دراصل ساحل کا شگاف مراد لی جاتی تھی ۔ نہ کہ کوئی شہر جو ساحل سمندر پر واقع ہو جیسا کہ خشکی کے لوگ اکثر فرض کر لیا کرتے ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر Porto کے معنی خلیج یا سمندر کی شاخ کے تھے جس میں متعدد بندرگاہ شامل ہو سکتے ہیں جدید پرتگالی لغات میں اس لفظ کا یہ مفہوم تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس قسم کے معاملہ میں اُن کی سند چنداں اہمیت نہیں رکھتی ۔ چنانچہ ہماری رائے کہ یہی اُس کے اصلی معنی ہیں

پادری ایف فرنانڈس کی عبارت پر مبنی ہے۔ یہ ایک جیسوئیٹ پادری تھا جو ۱۵۹۸ء میں اس غرض سے بنگال بھیجا گیا تھا کہ پرتگالی آبادیوں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس کا خط جس میں اس نے اپنے سفر کی کیفیت بیان کی ہے ہے میں طبع ہوا ہے (صفحات ۲۷، ومابعد)۔

فرنانڈس Portus Parvus (Sicenim Vocant) یا چھوٹی بندرگاہ کے لئے کوچین سے جہاز پر سوار ہوا۔ فوسٹین کے مندرجہ الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی منزل مقصود کا مروجہ نام استعمال کر رہا تھا۔ بحری سفر کی مختلف پریشانیوں کا حال بیان کرنے کے بعد وہ (Portus) ہی کے اندر ایک زیادہ بڑے خطرے کا ذکر کرتا ہے جو کہ جہاز زمین پر ٹک جانے سے پیش آگیا تھا۔ لیکن وہ ریت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر (Portus) ہی کے اندر آٹھ دن تک سفر کرنے کے بعد پرتگالی اسٹیشن ("Station")[1] یعنی ہوگلی پہ پہنچے۔ صاف ظاہر ہے کہ (Portus) سے فرنانڈس کا مقصد شہر ہگلی نہیں بلکہ دریائے ہگلی تھا۔ اور ہمارے (۴۰۸) خیال میں یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اُسنے یہ اصطلاح معمولی پرتگالیوں سے لی ہوگی خواہ وہ جہازوں کے ملاح ہوں یا وہ اشخاص ہوں جن میں رہکر اس نے خشکی پر اپنا کام کیا۔ وہ خود ان ناموں کو ایجاد نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُس نے معمولی رواج کی تقلید نہیں کی۔ پس (Porto Pequeno) سے لازمی طور پر کوئی ایک شہر مراد نہیں ہے بلکہ وہ دریائے ہگلی پر بھی دلالت کرسکتا ہے جس پر کہ اب کلکتہ قائم ہے۔

چند مہینے قیام کرنے کے بعد فرنانڈس بڑی بندرگاہ (Portus Magnus) کو گیا۔ یہ دریائی سفر نہ تھا کیونکہ وہ راستہ میں شیروں کے خطرہ کا ذکر کرتا ہے۔ پس بلاشبہ اُس کی کشتی نے اندرونِ ملک پانی کے رستوں میں سے کسی راستے پر سفر کیا ہوگا۔ پہلے وہ سہری پور پہنچا جس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ

---

[1] لاطینی لفظ "Statio" ہے۔ کیا اینگلو انڈین لفظ "Station" کا یہی ماخذ ہے؟ ہابسن۔جابسن میں اس اصطلاح کی اصل کا پتا نہیں لگایا گیا ہے۔

یہ بڑی بندرگاہ سے متعلق ایک اسٹیشن ("Station") ہے چنانچہ اسی مقام سے اُس نے اپنے خط میں تاریخ لکھی۔ لیکن اُس میں بہ طور مکرر اس نے اپنے چٹاگانگ پہنچنے کی بھی اطلاع دیدی جو کہ Portus Magnus میں ایک اور اسٹیشن ("Station") ہے۔ پس جب فرنانڈس نے بڑی بندرگاہ (Portus Magnus) لکھا تو یقیناً اُس کا مقصد صرف چٹاگانگ نہ تھا بلکہ اُس میں چٹاگانگ اور سری پور دونوں شامل تھے۔ چٹاگانگ کا موقع تو بہ خوبی معلوم ہے۔ اور سری پور کے موقع کا پتہ فیچ کی اُس کیفیت سے معلوم ہوتا ہے جو اُس نے اپنے سونارگاوں[1] (بنگال کا مشرقی دارالسلطنت) جانے کے متعلق بیان کی ہے۔ (پرچاس ۲-۱۰-۱۷۳۷) سری پور" دریائے گنگا پر سونارگاوں سے چھ فرسنگ کے فاصلہ پر واقع تھا۔ وہ سمندر کو جانے کے لئے ایک بندرگاہ تھی کیونکہ فیچ وہیں سے ایک چھوٹے سے جہاز پر پیگو کی طرف روانہ ہوا۔ پس فرنانڈس کی عبارت میں بڑی بندرگاہ (Porto Grande) کم از کم دریائے کرنافلی سے ڈاکہ کے قرب وجوار تک پھیلی ہوئی تھی، اور چونکہ قیاس یہ ہے کہ وہ اِن اصلاحات کو مروجہ مفہوم کے مطابق استعمال کرتا تھا اس سے ہم اس اصطلاح کو کسی ایک بندرگاہ تک محدود کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ اگر ہم خلیج بنگال کے کسی نقشہ پر نظر ڈالیں اور یہ یاد رکھیں کہ پرتگالی سمندر کے راستہ سے بنگال میں نہ آئے تھے تو اِس اصطلاح کا استعمال واضح ہوجاتا ہے۔ اُن کے بائیں طرف دریائے ہگلی (Porto Pequeno یعنی چھوٹی بندرگاہ) ہوتا تھا۔ دائیں طرف دریائے مگھنا واقع تھا جو کہ ضلع بکرگنج سے چٹاگانگ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ سب ملکر بڑی بندرگاہ (Porto Graude) بنتا ہے۔ پس جغرافی مفہوم کے مطابق اس میں متعدد دوسری بندرگاہیں بھی شامل ہوسکتی تھیں اور چٹاگانگ اور سری پور یہ دونوں تو بہر صورت اس میں شامل تھے۔ پس ہم یہ کہنے پر مجبور نہیں ہیں کہ بنگال

[1] فیچ آواز کے اصول کے مطابق ناموں کا املا تحریر کرتا ہے۔ چنانچہ اُس کے تذکرے میں سونارگاوں کو (Sinnergan) اور سری پور کو (Serrepore) لکھا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اِن کی مطابقت میں کوئی شبہہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرنانڈس اِس آخری نام کو (Syripur) لکھتا ہے۔

میں صرف دو بندرگاہیں تھیں۔ بلکہ وہاں دو سمندر کی شاخیں تھیں جن کے اندر لاتعداد بندرگاہوں کی گنجایش تھی اور سولھویں صدی کے اختتام پر کم از کم تین بندرگاہیں ایسی (۴۰۹) موجود تھیں جو بلحاظ اپنی اہمیت کے نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھیں، ایک ہوگلی جو اسی نام کے دریا پر واقع تھی۔ دوسرے سِرِی پور جو تھوڑی دور ہٹکر دریائے گھنا پر واقع تھی اور تیسرے چٹاگانگ۔

لیکن لفظ (Porto) کا یہ ابتدائی استعمال ہمارے زیر بحث دور میں بہت عام نہیں تھا۔ مثلاً فیچ ست گاؤں اور چھوٹی بندرگاہ (Porto Pequeno) کو ایک سمجھتا ہے (پرچاس ۲ - ۱۰ - ۱۷۳۶)۔ اسی طرح بعض دوسرے مصنفین کی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ ہمارے خیال میں معنی کی اس تبدیلی کا باعث یہ ہے کہ پرتگالیوں نے سِری پور سے براہ راست کچھ زیادہ تجارت نہیں کی۔ اُن کی آمد ورفت یا تو ہوگلی سے تھی یا چٹاگانگ سے یعنی ہر (Porto) کے صرف ایک اسٹیشن ("Station") سے۔ ایسی حالت میں یہ چنداں مشکل نہ تھا کہ (Porto) کا جو نام تھا اس کا اطلاق اسٹیشن ("Station") پر ہونے لگے۔ جیسے کہ مرسے ("The Mersy") قریب قریب لیور پول کا مرادف بن گیا ہے۔ لیکن فرنانڈس کی جن عبارتوں کا اقتباس دیا گیا ہے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے اختتام تک اس لفظ کا اشتقاقی مفہوم عام طور پر اختیار نہیں کیا گیا تھا اور اس لئے یہ خیال حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں یہ مفہوم قرینہ کے مطابق ہو وہاں (Porto) سے سمندر کی شاخ مراد لی جائے۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال کیا جائیگا کہ بار بوسا نے آغاز صدی میں جس "شہر بنگالہ" کا حال بیان کیا ہے وہ ان بندرگاہوں میں سے کس کے مطابق ہے، ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ بار بوسا کا اشارہ سونار گاؤں اور اُس کی ملحقہ بندرگاہ کی طرف تھا۔ لیکن یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ یہاں اُس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ جب تک مسٹر لانگورتھ ڈیمس کا ترجمۂ بار بوسا مکمل نہ ہوجائے ناظرین اپنا فیصلہ ملتوی رکھیں۔

ضمیمہ (د)

جہازی ٹن

جہازی ٹن کی اصل شراب کا ٹن (Tun) ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فلاں جہاز میں کس قدر مال لے جانے کی گنجایش ہے یورپ کے بندرگاہوں میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس میں شراب کے ٹن (Tun) کس تعداد میں لیجائے جا سکتے تھے۔ شراب کا ایک ٹن (Tun) دو پیپوں پر مشتمل ہوتا تھا اور ۴۲،۰۳ کمعب فٹ کے مساوی تھا۔ پیپوں کی جسامت ملا کر اور ساخت کی بے ڈھنگی شکل سے جگہ کا جو نقصان ہوتا تھا اس کو شامل کر کے ایک ٹن (Tun) سے جس قدر جگہ گھرتی تھی وہ تقریباً ۶۰ کمعب فٹ تک پہنچتی ہے[1]۔ ابتداءً ٹنوں کی تعداد بذریعہ پیمایش نہیں معلوم کی جاتی تھی۔ ہر ایسے جہاز کی گنجایش جس پر شراب جا چکی ہو تجربہ سے معلوم کر لی جاتی تھی اور عملی طور پر کام کرنے والے لوگ محض شکل و ساخت دیکھکر دوسرے جہازوں کی گنجایش کا اندازہ کرنے کے لئے کافی واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ جس دور پر ہم غور کر رہے ہیں اس کے متعلق ہمیں اسی قسم کے تخمینے میسر ہیں۔ وہ سب جفت اعداد میں دئے ہوئے ہیں اور بدیہی طور پر ان کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہوں اعداد میں ایک ٹن (Tun) کی بھی غلطی نہ ہو۔ قیاس یہ ہے کہ وہ اوسطاً اصلیت سے بہت کچھ قریب ہیں۔ اگرچہ خاص خاص بیانات میں بلاشبہ غلطیاں موجود ہیں

---

[1] اوپن ہیم ۶۰ کمعب فٹ بیان کرتا ہے۔ ہومز کہتا ہے کہ ۴۲ کمعب فٹ اور ۴۲ کا کم از کم ایک ثلث یہ دونوں ملا کر ایک ٹن کے مساوی ہے۔ اس حساب سے ایک ٹن کم از کم ۵۶ کمعب فٹ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم اس کو ۶۰ فرض کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک آسان جفت عدد ہے اور دوسرے قابل لحاظ امور کا مقابلہ کرتے ہوئے اس میں جو غلطی کا امکان ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔

سولھویں صدی کے اختتام کے قریب یہ ایک اہم سوال بن گیا کہ خاص خاص جہازوں کے ٹنوں کی تعداد کیا ہے کیونکہ جہاز سازی کی امداد میں جو روپیہ دیا جاتا تھا اس کی مقدار اسی کے ذریعہ سے معین ہوتی تھی۔ اور اب تک جو تخمینے کافی سمجھے جاتے تھے وہ خلاف انصاف ثابت ہونے لگے۔ لہٰذا اُن کی جگہ پیمائش کا ایک خاص طریقہ نافذ کیا گیا پہلی مرتبہ تو تجربہ کی مدد سے یہ معلوم کیا گیا کہ کسی خاص جہاز میں کتنے عدد ٹن (Tun) لیجائے جاسکتے ہیں بعد ازاں جہاز کا طول عرض اور عمق ناپا گیا اور مکعب فٹ سے گنجایش کا حساب لگایا گیا۔ اس کے بعد بقیہ عمل محض سادہ تناسب سے متعلق تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ ہر واقعی ٹن (Tun) کے لئے تقریباً ۹۷ مکعب فٹ گنجایش ہمارے اختیار کردہ طریق پیمایش کے مطابق درکار ہوتی تھی چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر ایک عام قاعدہ بنا دیا گیا۔ وہ یہ کہ ایک خاص طریقۂ پیمایش کے مطابق کسی جہاز کی گنجایش معلوم کر لو اور اسے ۹۷ سے تقسیم کر دو۔

اس قاعدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹن (Tun) کی تعریف تو بدل گئی لیکن اس کی وسعت میں پہلے پہل کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ٹن ابھی تک وہ جگہ تھی جو شراب کے ایک ٹن (Tun) کے لئے درکار ہوتی اور جو ایک خاص طریقۂ پیمایش کے لحاظ سے ۹۷ مکعب فٹ کے برابر نکلی تھی۔ یہ طریقہ آج تک بھی برقرار ہے لیکن طریق پیمایش اور مقسوم الیہ جو کہ اس وقت اختیار کیا گیا تھا دونوں وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں۔ چنانچہ اب ایک "رجسٹر شدہ ٹن" (Ton) ۱۰۰ مکعب فٹ جگہ کے برابر ہے جس کی پیمایش ٹھیک ان تصریحات کے مطابق کی گئی ہو جو قوانین جہاز رانی تجارت کے تحت مذکور رہیں۔ پس وہ ایک رسمی اکائی ہے جس کا شراب کے ٹن (Tun) سے ابتدائی تعلق تو مفقود ہو چکا ہے اور موجودہ تعلق صرف اسی وقت ٹھیک طور پر معلوم ہو سکتا ہے جبکہ مال لیجانے والی متعدد جدید کشتیوں کو ٹنوں (Tuns) سے بھر دیا جائے اور یہ ایسا کام ہے جس کا آجکل شاید کوئی شخص بھی ذمہ نہ لے۔ جو بات کہ ہمارے اغراض کے لئے اہم ہے وہ یہ ہے کہ طریق پیمایش میں جس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ ہمیں مال و اسباب کی واقعی گنجایش سے قریب تر کرتی ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی جہاز کا طول و عرض و عمق ناپنے کا جو ابتدائی طریقہ تھا اُس سے مال و اسباب کی واقعی گنجایش صرف اُسی حالت میں معلوم ہو سکتی تھی جب کہ جہاز مستطیل ہوا اور سب سے

اونچے تختے کے نیچے کوئی اندرونی تعمیر نہ ہو۔ یہ امر کہ ۶۰ مکعب فٹ (واقعی) کی سمائی کے لئے ۹۷ مکعب فٹ (اس طریق پیمائش سے) درکار ہوتے تھے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مال واسباب کی گنجایش گویا واقعی حالت سے بہت بڑھا کر بیان کی جاتی تھی۔ اب یہ بات نہیں رہی ہے کیونکہ ہر تختہ کی علیحدہ پیمائش کی جاتی ہے اور بازوؤں کی گولائی کا لحاظ کر لیا جاتا ہے۔ پس اب شراب کا ایک ٹن (Tun) سمانے کے لئے ۶۰ مکعب فٹ (ایک پیمائش کردہ ٹن Ton) سے بہت کم جگہ درکار ہوگی اور درحقیقت حال کے بنے ہوئے جہازوں میں معمولی مال جس مقدار میں جاتا ہے وہ بالعموم اُس مقدار سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو کہ پیمائش سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک ٹن (Tun) شراب کے لئے جدید رجسٹر شدہ ٹن (Ton) کا بقدر ½ تا ⅔ حصہ درکار ہوتا ہوگا نہ کہ ایک مکمل پیمائش کردہ ٹن (Ton) جیسا کہ پیمائش کے آغاز کے وقت تھا تو اس سے سولھویں صدی کے ہندوستانی جہازوں کی گنجایش کو گھٹا کر بیان کرنے کا احتمال نہیں رہے گا۔ اس شرح سے ۶۰۰۰ ٹن (Tun) شراب کے لئے ۴۰۰۰ سے ۶۰۰۰ تک موجودہ جہازی ٹن (Ton) درکار ہوں گے۔ لہذا ہمیں چاہئے کہ سولھویں صدی میں ہندوستانی تجارت کا بہ حساب ٹن (Tun) جو تخمینہ کیا گیا ہے اُس کو بقدر ½ تا ⅔ گھٹا دیں تاکہ اُس کا موازنہ جہازرانی کے اُن اعداد سے کیا جا سکے جو آجکل شایع ہوتے ہیں۔ ہندوستانی تجارت کی کثیر ترین مقدار کا تخمینہ ہم ۶۰۰۰ ٹن (Tun) کر چکے ہیں۔ موجودہ پیمائش کے مطابق اس کے لئے ۲۴۰۰۰ سے ۳۶۰۰۰ ٹن (Ton) تک درکار ہوں گے۔ اور چونکہ اِس عدد کا مقابلہ ۲ ¾ ملین ٹن (Ton) (جنگ سے قبل ہندوستانی تجارت کی مقدار) سے کرنا ہے اس لئے ہم جو بھی کسر اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں کیونکہ اس حالت میں ان کا فرق چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔

خام ٹن (Ton) اور خالص ٹن (Ton) کے باہمی فرق کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔ جہازرانی کے اعداد وشمار جن کا ابھی حوالہ دیا جا چکا ہے (۲۱۴)

خالص رجسٹر شدہ ٹن (Ton) کے حساب سے بتائے جاتے ہیں لیکن جہازوں کے متعلق خشکی والوں کے خیالات بالعموم خام ٹن (Ton) پر مبنی ہوتے ہیں[1] اور اِن دونوں کا فرق اہم ہے۔ کسی جہاز کے خام وزن میں وہ جگہ بھی شامل رہتی ہے جو شین وغیرہ سے گھری ہوتی ہے اور مال و اسباب کے لئے حاصل نہیں ہوتی۔ خالص وزن سے ایسی جگہ خارج رہتی ہے۔ خام اور خالص وزن کا باہمی تعلق مختلف قسم کے جہازوں میں بہت کچھ مختلف ہوتا ہے لیکن جہاں تک زمانۂ موجودہ کے مال و اسباب کی کشتیوں کا تعلق ہے اگر ہم خالص وزن کو خام وزن کا اوسطاً ۶۰ فیصد رکھ دیں تو ہم حقیقت سے بہت دور نہ ہوں گے۔ پس اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کی بحری تجارت ۲۴۰۰۰ سے ۳۶۰۰۰ خالص ٹن (Ton) میں کی جاسکتی تھی تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے لئے ۴۰۰۰۰ سے ۶۰۰۰۰ تک خام ٹن (Ton) درکار ہوتے یا زیادہ سے زیادہ مال و اسباب کی ایک جدید کشتی جو متوسط جسامت کی ہو اور سال کے ہر مہینہ میں روانہ ہوا کرے کافی ہوتی۔

تمّت

---

[1] جہازرانی سے متعلق معمولی اشتہارات میں خام ٹن بتائے جاتے ہیں اور اس بارے میں خشکی والوں کے مبہم خیالات کا غالباً یہی اہم ترین ذریعہ ہوتے ہیں۔

ہند کی معاشی حالت کا غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳	۲۳	غلطی	غلطی	۱۳۴	۱۱	کئے	گرے
۲۲	۷	نکہ	کہ	۱۳۴	۲۸	کرنے لئے	کرنے کے لئے
۲۸	۳	پاک	پات	۱۳۷	۴	دریلے انڈٹس	دریائے انڈس
۲۹	۱۰	مزبیق	مزبیق	۱۳۸	۲۴	موجو	موجود
۳۶	۶	جٹاکانگ	چٹاگانگ	۱۴۱	۷	کی	کے
〃	۸	پیراڈ	پیرارڈ	۱۴۲	۲۵	دبہائی	دیہاتی
۵۶	۱۳	سرونج	سرونج	۱۴۵	۱۱	کرتے	کرنے
۵۸	۱۵	میں	میں بھی	۱۴۶	۱۶	غذر	عذر
۵۹	۲۵	خطوط موصولہ	(خطوط موصولہ ۱۸۲ء)	۱۶۳	۹	رہیے	رہنے
۹۵	۲۲	انداره	اندازه	۱۶۵	۱۷	اس اس	اس
۹۶	۲۱	اندازو	اندازه	۱۶۶	۱۰	ہیں	ہیں
۹۹	۴	ظور	طور	۱۷۱	۱۰	رکے	رکھے
۱۱۲	۳	غذانیں	غذائیں	۱۷۸	۸	۲۵۶	۲۹۶
۱۱۲	۱۳	کوتیوں	گویتوں	۱۹۳	۱۰	میں	ہیں
۱۲۴	۲	لگا	لگی	۱۹۵	۱۳	ہیں	میں
۱۲۷	۱	شرح	شروح	۲۱۲	۱۶	کیپے	کیمپے
۱۲۹	۳	تماچیریں	یہ تمام چیزیں ہیں	۲۱۳	۷	شور	شوز
〃	۱۰	بیل کو	بیل	۲۱۶	۴	آتے	آنے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲۱۷	۱	×	نمایاں اضافہ ہوا ہے اور چرمی سامان میں
۲۱۹	۱۷	نائند	زائد
۲۲۷	۲۴	ہندستانی	ہندوستانی
۲۳۶	۱۴	پہنے	پہننے
"	۲۰	ہیں	میں
۲۳۸	۲۴	سہرپرستی	سرپرستی
۲۴۳	۶	پرتا	پڑتا
۲۵۷	۸	(۱۶۔۳۰ تا ۲۳	(۱۶۔۳۰ تا ۳۳
۲۵۷	۱۴	ڈی کیٹ	ڈیمی لیٹ
۲۵۹	۱۲	برقرار رکھاجلئے	برقرار رکھاجائے
۲۶۰	۷	نقل وحل	نقل وحمل
۲۶۳	۱۰	بیروں	بیڑوں
"	۱۷	فانده	فائده
۲۶۴	۱۳	بے فاوره	بے فائده
۲۷۰	۱۰	ولسین	بسین
۲۷۱	۲۲	بنیلول	بنیگول
۲۷۲	۱۱	سماٹرادرجاوا	سماٹرا اورجاوا
۲۸۴	۲	کرنی پڑلی	کرنی پرتی
۲۹۲	۱۲	شاہ پرتگال	شاہ پرتگال
"	۲۲	جہازوں	جہاز
"	۴	ابور	اور
"	۱۵	راس امیدوار	راس امیداور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۳۰۰	۱۵	ایک ہزار	ایک ایک ہزار
"	۱۹	جہادوں	جہازوں
۳۰۳	۲۰	شاذونادار	شاذونادر
۳۰۵	۷	مسرمیبری ڈلٹن	مسٹرہیری ڈلٹن
"	۲۱	Tous	Tuns
"	۲۴	۱۰۰	۱۰۰۰
۳۰۷	۲۲	جوڈین	جورڈین
۳۱۶	"	کی شش	کی کوشش
"	۲۴	نیٹورنیر	ٹیورنیر
۳۲۲	۲۳	تجریہ	تجربہ
۳۲۵	۵	پیرارد	پیرارڈ گا
۳۲۶	۸	آرز	آرمنر
۳۲۸	۲۳	ایجیین	ایجبین
۳۲۹	۲۴	۱-۱۲۵ اور ۲۲۰-۲ و ۹۶۲	۱-۱۲۵ اور ۲-۲۲۸ و ۲۶۶
۳۳۷	۴	خریوزے	خربوزے
۳۳۹	۲۰	۶۷۰۲	۲-۶۷
۳۴۱	۵	لرا	امرا
۳۴۳	۲۱	اوقات	اوقاف
۳۴۶	۱۵	اسنیج	اسٹیج
۳۵۷	۲	۱-۳۰-۲۲۱	۱-۳-۲۲۱
۰	۰	۰	۰